سرگذشت تاریخ

اس کی
اپنی زبانی

فلسفۂ تاریخ اور تاریخِ تاریخ، عام فہم زبان میں

از

امتیاز محمد خاں

اُردو اکیڈمی سِندھ
کراچی ، حیدرآباد ، لاہور

کتاب ہذا میں تاریخ کی دیوی موسومہ کلائیو بتاتی ہے کہ اس کو لوگوں نے کس طرح فلسفی بنایا؟ نیز تاریخ اپنے فلسفہ کی ابتدا تا حالیہ ارتقاء کی تفصیل بھی بیان کرتی ہے +

بار اوّل ——— نومبر ۱۹۶۹ء
مطبوعہ ——— باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی

دفتر لاہور

اُردو مرکز لاہور

سرگذشت تاریخ اس کی اپنی زبانی

فہرست ابواب

دیباچہ

اردو زبان میں ہر موضوع پر کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ مگر فلسفۂ تاریخ جیسے اہم موضوع پر ابنِ خلدون کے "مقدمہ" کے علاوہ کوئی قابلِ قدر تصنیف ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری لیکن 'مقدمہ ابنِ خلدون' بھی ترجمہ ہے۔ اس لئے اس موضوع پر میری یہ تصنیف اردو میں پہلی کوشش کہی جاسکتی ہے۔

میں زبان کے معاملے میں زباں دانی کا دعویٰ نہیں کرسکتا کیونکہ میں ان انگریزی دانوں میں سے ہوں جو "انگریزی میں سوچتے ہیں اور اردو میں لکھتے ہیں"۔ ویسے بھی فلسفۂ تاریخ کا موضوع عبارت آرائی کا حامل نہیں ہے۔ اگر اس سرگزشت کو کوئی شاعر دل مورخ یا کوئی صاحب طرز ادیب لکھتا تو اس کی دلچسپی میں چار چاند لگ جاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی سرگزشت لکھنے کے لئے فردوسی، شیکسپیئر، غالب یا اقبال جیسے شاعروں کی زبان اور اسلوب درکار ہے۔ زندگی بھر جو کچھ اس سلسلے میں پڑھا وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں سپرد قلم کر دیا ہے کہ شاید تاریخ کے طالب علم میری اس کاوش سے مستفید ہو کر فلسفۂ تاریخ کا مطالعہ کریں۔

فلسفۂ تاریخ دراصل بامعنی ہوتا ہے جو پڑھنے والے کے دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ بقول مولانا رومؒ

آنچہ با معنی است خود پیدا شود — وآنچہ بے معنی است خود رسوا شود

(جو چیز بذاتِ خود کوئی معنی رکھتی ہے وہ خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے اور جو چیز لغو یا بے معنی ہوتی ہے اس کی پول کھل جاتی ہے۔)

اس سرگزشت کو پڑھنے کے بعد بھی فلسفۂ تاریخ پڑھنے والے کے دل پر اثر نہ ہو تو اس کا قصوروار مصنف ہے نہ کہ تاریخ۔ اور اگر باوجود اپنی خامیوں کے مقبول یہ ہو تو اس کا سہرا تاریخ کے سر ہوگا مصنف کے سر نہیں۔

امتیاز محمد خاں

نثار منزل، ۴ جی، ناظم آباد کراچی

پہلا باب

فلسفۂ تاریخ سے تعارف

فلسفۂ تاریخ ہے کیا شے؟ بظاہر فلسفہ اور تاریخ میں کوئی تعلق نہیں نظر آتا۔ فلسفہ ایسے علم کو کہتے ہیں جس کا دار و مدار قیاس پر ہو اور جس میں تصدیق بذریعہ حواس خمسہ ممکن نہ ہو۔ لیکن تاریخ کے واقعات تو صاف دیکھنے اور سُننے میں آتے ہیں۔ ان دونوں علوم میں کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

تاریخ کے ساتھ فلسفہ کا ناتا سب سے پہلے ابن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) نے جوڑا۔ ابن خلدون سے ایک ہزار سال پہلے ایک پادری سینٹ اگسٹائن نامی (۳۵۴ء تا ۴۳۰ء) ایک کتاب موسومہ "خدائی شہر" لکھ چکا تھا جس میں اُس نے رومتہ الکبریٰ کے زوال کو خدا کی ناراضگی پر محمول کیا اور اسی فریضے کے پیشِ نظر اس پادری نے واقعاتِ تاریخ کی تاویلیں کیں۔ لیکن اس نے اپنی اس تصنیف میں لفظ فلسفہ کہیں نہیں استعمال کیا۔ البتہ اس نے رومتہ الکبریٰ کے اسبابِ زوال بتانے کی کوشش ضرور کی۔ لیکن اس کی نظریہ اپنا مذہب حاوی تھا۔

فلسفۂ تاریخ تلاشِ اسباب کا نام ہے

تاریخ کے واقعات کو ہمارے کان سنتے ہیں۔ ہماری آنکھ دیکھتی ہے۔ لیکن کیا یہ واقعات ایک دوسرے سے تعلق بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟ ابن خلدون سے پہلے تک جو تاریخیں لکھی جاتی تھیں ان میں واقعات تاریخ وار لکھے جاتے تھے۔

اور اسی لئے مسلمانوں نے اس علم کا نام تاریخ رکھا۔ غیر مسلموں میں بھی تاریخ اسی طرح لکھی جاتی تھی۔ اِن تاریخوں میں ایک واقعہ دوسرے سے بے تعلق نظر آتا ہے اگر آپ کسی واقعہ کا سبب معلوم کرنا چاہیں تو اس قسم کے مؤرخ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ آپ کو خود اپنے قیاس کی بنا، پر واقعات کے اسباب معلوم کرنے پڑیں گے۔ اور اس طرح ان ٹھوس واقعات کا سبب معلوم کرنے کے لئے آپ کو قیاس سے کام لینا پڑے گا۔ فلسفی بھی اسی قسم کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

مؤرخ کی قیاس آرائیاں بھی قیاس سے آگے نہیں بڑھ سکیں۔ اور خصوصاً اسبابِ واقعات معلوم کرنے کے معاملے میں اس کو خالص قیاس پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ مورخ نہ یہ واقعات بچشم خود دیکھے ہوتے ہیں اور نہ ان کو روزنامچہ نما تاریخوں سے مدد ملتی ہے۔ دو واقعات یکے بعد دیگرے نمودار ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ پہلا واقعہ دوسرے واقعہ کا سبب ہو۔ ہندوستان سے انگریزوں کا فرار ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ اس فرار کا سبب کیا تھا؟ اس سوال کا جواب ہم لوگ بھی جو "چشم دید گواہ" ہیں نہیں دے سکتے۔ کیونکہ انگریزوں کے فرار کا سبب اسی وقت پیدا ہو چکا تھا جب ان کے قائدوں نے ہوسِ حکومت میں گرفتار ہو کر اپنے سامراج کو دُنیا کے ہر گوشے میں پھیلا لیا۔ لیکن کیا یہ توسیع سامراج ہی اصل سبب تھا؟

اسباب بھی دو قسم کے ہوتے ہیں یعنی فوری اور دُور رس۔ اگر انگریزوں کی ہوسِ حکومت کو ہم دُور رس سبب مان لیں اور دو عالمگیر جنگوں کو فوری سبب مانیں تب بھی اس سوالِ زوال کا خاطر خواہ جواب نہیں ملتا۔ علوم سائنس میں جب سبب معلوم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو ہم تجربہ گاہ میں جا کر

سبب "پیدا" کر لیتے ہیں۔ اور اصلی سبب کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا اس قسم کا تجربہ تاریخ سے متعلق واقعات کے معاملے میں کیا جا سکتا ہے؟ اس قسم کا تجربہ کرنے کے لئے یہ ممکن نہیں کہ مؤرخ کسی حکومت کو دنیا کے ہر گوشے میں پھیلا دے اور اس کے بعد بہ طور تجربہ مؤرخ کو دو عالمگیر جنگیں شروع کرنے کی اجازت دیجائے۔

مؤرخ کے سامنے حکومتوں سے متعلق تاریخیں موجود ہیں جن کو پڑھ کر وہ حکومتوں اور قوموں کے اسباب زوال معلوم کر سکتا ہے لیکن ساتھ ہی انسانی تجربہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ہر زمانہ میں ایک ہی قسم کا سبب اسی قسم کے نتائج نہیں پیدا کرتا کیونکہ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ لہٰذا دونوں قسم کا تجربہ یعنی بذریعہ مشاہدہ اور بذریعہ عمل مؤرخ کے لئے ممکن نہیں۔ اسی لئے مؤرخ کو بھی فلسفی کی طرح قیاس پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ تاریخ میں فلسفہ کو جو دخل ہوا اس کی وجہ یہی تھی۔

عبرت آموزی بھی فلسفۂ تاریخ میں شامل ہے

علاوہ تلاشِ اسباب کے فلسفے کو دخل ایک اور سبب سے بھی ہوا۔ وہ سبب یہ تھا کہ مورخوں نے اپنی تاریخوں کے ذریعہ عبرت آموزی اور رشد و ہدایت بھی شروع کی۔ گو سینٹ اگسٹائن نے عبرت آموزی کی بنیاد ڈالی۔ لیکن ابنِ خلدون نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اور اس غرض سے اپنی تاریخ کے لئے اُس نے اپنا مشہور عالم "مقدمہ" لکھا۔ رشد و ہدایت کا تعلق علم اخلاق سے ہے اور یہ علم اخلاق بھی فلسفہ کا جزو اعظم ہے۔

مغرب میں جن فلسفیوں کو تاریخ میں فلسفہ نظر آیا وہ جرمن فلسفی ہرڈر (۱۷۴۴ء تا ۱۸۰۳ء) اور کانٹ (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء) تھے۔ ان کے بعد جرمن فلسفی ہیگل (۱۷۷۰ء تا ۱۸۳۱ء) اور نیطشہ (۱۸۴۴ء تا ۱۹۰۰ء)

کے دماغوں نے تاریخ میں فلسفہ کا مشاہدہ کیا۔ ہیگل اور نیطشہ کے فلسفۂ تاریخ کا ذکر اس سرگذشت میں کسی قدر تفصیل سے ہے۔ اس سلسلے میں یہ واضح رہے کہ جرمن جیسی جنگجو قوم ہمیشہ ایسے فلسفۂ تاریخ کی جستجو میں رہتی ہے جس سے وہ ازروئے فلسفہ و اخلاقیات اپنی جنگوں کا جواز حاصل کر سکے۔

فلسفۂ تاریخ نے زور اس وقت پکڑا جب مؤرخوں نے واقعات کے اسباب تلاش کرنا شروع کئے۔ تلاشِ اسباب کے سلسلے میں وہ تاویل بازی بھی شروع ہوئی جس کا رونا اس سرگذشت میں شروع سے آخر تک ہے۔ ان تاویلوں کو کس طرح روکا جا سکتا ہے جب تلاشِ اسباب مؤرخ کے لئے لازم قرار دی جا چکی ہے؟ اسی طرح عبرت آموزی اور رشد و ہدایت بھی تاریخ کا جزو بن چکی ہے۔ اگر آج کوئی مؤرخ خالص واقعات بغیر علت و معلول اپنی تاریخ میں لکھے تو ایسی تاریخ کو کوئی نہ پڑھے گا۔

مسلمان مؤرخوں میں علت و معلول کا سلسلہ ابن خلدون نے قائم کیا۔ اس نے رشد و ہدایت اور عبرت آموزی کو بھی اپنا شعار بنایا۔ اور اپنی تاریخ کا نام "کتاب العبار" رکھا۔ ابن خلدون سے پہلے مسلمانوں کی نوشتہ تاریخیں روزنامچہ نما ہوتی تھیں یعنی وہ سن وار واقعات درج کرتے تھے اور اسباب و نتائج کے قضیوں میں نہیں پڑتے تھے نیز تاویل سے گریز کرتے تھے۔ طبری (۸۳۸ء تا ۹۲۳ء) کی مشہور "تاریخ الرسل والملوک" روزنامچہ نما تاریخ نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

یہ تاریخیں واقعات کے اسباب سے بری ہوتی تھیں اس لئے ان تاریخوں میں فلسفہ کی گنجائش بھی نہ تھی اور نہ یہ مؤرخ رشد و ہدایت کے جھگڑوں میں پڑتے تھے۔ سیدھی سادی واقعہ نگاری ان کا کام تھا۔ تلاشِ اسباب اور

رشد و ہدایت کا سلسلہ ابن خلدون نے شروع کیا۔ اسی لیے اس کو تاریخ میں فلسفہ نظر آیا۔ فلسفہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی یونانی زبان میں یہ تھے :۔ (حوالہ نمبرا)

"حکمت سے شغف یا اس کا مطالعہ یا اشیاء کا علم بمعہ اُن کے اسباب خواہ یہ اسباب خیالی ہوں یا عملی۔"

چنانچہ سقراط۔ افلاطون و ارسطو نے اپنے فلسفوں کا مقصد یہی ٹھہرایا۔ اور اسی لئے وہ فلسفی کہلائے۔ جس طرح اصل فلسفہ میں تلاشِ اسباب اور حکمت آموزی شامل ہے اسی طرح فلسفۂ تاریخ میں بھی یہ چیزیں شامل ہیں۔ اسی بنار پر ابن خلدون نے دعویٰ کیا کہ تاریخ میں بھی فلسفہ مضمر ہے۔ حکمت میں اخلاق بھی شامل ہے کیونکہ انسان بغیر درستیٔ اخلاق حکمت حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی لئے تعلیم اخلاق بھی فلسفہ کا جز و بنی۔

مسائلِ تقدیر و تدبیر اور خیر و شر کس طرح فلسفۂ تاریخ میں داخل ہوئے

مگر ساتھ ہی فطرتِ انسانی میں خیر کے ساتھ ساتھ شر کا مادّہ بھی شامل ہے۔ چنانچہ مسئلہ خیر و شر بھی فلسفہ میں داخل ہوا۔ جب مذہب کے ساتھ انسان کے دماغ میں خدا کا تصوّر آیا تو خیر و شر کا مسئلہ اور پیچیدہ ہو گیا۔ سوال پیدا ہوا کہ شر کا بانی کون ہے؟ اگر خدا خیر و شر دونوں کا بانی ہے تو شر پیدا کرنے میں بھی ضرور کوئی "مصلحت" ہے۔ گویا شر بھی جزوِ حکمت ہے۔ جب انسان کو بحکم خدا خیر و شر دونوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو گویا انسان بندۂ تقدیر ہے۔

اس طرح مسئلہ خیر و شر کے ساتھ مسئلۂ تقدیر و تدبیر بھی فلسفۂ تاریخ میں

داخل ہوا۔ لیکن تقدیر و تدبیر کے معاملے میں انسانوں میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس مسئلہ تقدیر و تدبیر نے مسلمانوں میں ایسا زور پکڑا کہ "اختیاری اور جبری" فرقے علیحدہ علیحدہ قائم ہو گئے۔ جو مسلمان تدبیر کے قائل تھے وہ "اختیاری" کہلاتے تھے۔ قائلینِ تقدیر "جبری" کے نام سے موسوم تھے۔ حامیانِ تقدیر و تدبیر کے درمیان جو اختلاف پیدا ہوا وہ آج تک قائم ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ مذہب کا جزو بن گیا ہے۔ مولانا روم تدبیر کے قائل تھے اور جبریوں کی مذمت کیا کرتے تھے۔ مولانا روم کی مثنوی میں سینکڑوں اشعار تدبیر کے حق میں ہیں۔

فلسفیانِ تاریخ میں بھی اسی بناء پر اختلاف پیدا ہوا جو آج تک موجود ہے۔ تقدیر کے مخالف کہتے ہیں کہ اگر تاریخ میں تقدیر کا تسلط تسلیم کر لیا جائے تو تاریخ کے پڑھنے والے عضوِ معطل بن کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مراقبے میں بیٹھ جائیں گے اور بجائے شر کو دُور کرنے کے شر کو مصلحت خداوندی سمجھ کر برداشت کرنے کی تلقین کرینگے اور اس طرح دُنیا تہ و بالا ہو جائے گی اور اہلِ شر کا تسلط قائم ہو جائے گا۔ چنانچہ تقدیر کے مخالفین فلسفۂ تاریخ کے یکسر منکر ہیں۔ ان منکرین میں انگریز بھی شامل ہیں۔ پروفیسر میکی نن کہتا ہے :۔ (حوالہ نمبر ۲)

"پس ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلسفۂ تاریخ مراقبے کی تلقین کرتا ہے ... اگر شر میں بھی کوئی مصلحت ہے تو سینٹ پال بھی اس بات کا مجرم ہے کہ وہ شر کا خاتمہ کرنے کی تلقین نہیں کرتا..."

کیا فلسفۂ تاریخ کا فیصلہ تقدیر کے حق میں ہے؟ واقعاتِ تاریخ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کبھی تقدیر کارگر ہوتی ہے کبھی تدبیر۔ اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلسفۂ تاریخ کس کے حق میں ہے۔ فلسفۂ تاریخ کے مخالفین کو یہ فلسفہ شر کو

برداشت کرنے کی تلقین کرتا ہے نہ کہ اس کی مخالفت کی۔ لیکن یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ اسی فلسفے کا تقاضہ ہے کہ مؤرخ ہر چیز کے دونوں پہلو دکھلائے یعنی اچھے اور بُرے۔ تاریخ کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ خیر و شر دونوں کے نتائج دکھلائے اور ان نتائج کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بُرے سبب سے اچھا نتیجہ برآمد ہوتا۔ اسی بنا پر قائلین خدا مصلحتِ خداوندی کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔

الغرض تلاش اسباب کے سلسلے میں فلسفہ تاریخ میں داخل ہوا کیونکہ اسباب واقعات معلوم کرنے میں مؤرخ کو قیاس سے کام لینا پڑتا ہے لیکن یہ قیاس آرائی صرف اسباب تک ہی محدود نہیں۔ خالص واقعہ نگاری میں بھی مؤرخ کو قیاس سے کام لینا پڑتا ہے۔ کئی زمانے ایسے ہیں جن کے متعلق کوئی نوشتہ تاریخ نہیں ملتی۔ گویا تاریخ عالم کے کئی صفحے کورے ہیں۔ ان صفحوں کی محض خانہ پُری کرنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات اس خانہ پُری کے لئے مواد صرف عمارات یا روایات کی صورت میں ملتا ہے۔ ان عمارات کو دیکھ کر یا ان روایات کو سُن کر محض قیاس سے واقعات معلوم کرنا پڑتے ہیں۔ کسی عملی تجربہ گاہ میں تجربہ کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔ صرف قیاس پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ (حوالہ نمبر ۳)

"حوادث زمانہ میں سے کوئی حادثہ بھی جب وقوع پذیر ہوتا ہے تو وہ اپنی ذات کے اعتبار سے خاص مزاج اور طبیعت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ممتاز عوارض رکھتا ہے ... اب اگر سامع (یعنی مؤرخ) عالمِ وجود میں آنے والے حوادث اور حالات کے طبائع و مقتضیات سے واقف ہے تو اس کی یہ

واقفیت خبر کے سچ جھوٹ معلوم کرنے میں بہت کچھ مدد دیگی"۔

یہ واقفیت اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ مؤرخ کے آنکھوں پر اپنے زمانے کے ماحول کی عینک ہوتی ہے جس سے وہ پرانے زمانے کو بھی دیکھتا ہے لیکن زمانہ تو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور زمانے کے ساتھ قدریں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ فراعنۂ مصر کے زمانے میں سگے بہن بھائیوں کی شادیاں ہوتی تھیں اور یہ کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس زمانے میں اس قسم کی شادی زنا سے بھی بدتر سمجھی جاتی ہے۔

ہمارے زمانے میں تاویل بھی جزوِ تاریخ بن گئی ہے۔ اس لئے تاریخ میں فلسفہ کا زور بڑھ رہا ہے۔ گذشتہ دو عالمگیر جنگوں نے مورخوں کی "آنکھیں کھول دیں"۔ ان جنگوں کی خون ریزی دیکھ کر جرمن اسپینگلر (۱۸۸۰ء تا ۱۹۳۶ء) اور انگریز پروفیسر ٹوئن بی (ولادت ۱۸۸۹ء) نے مغربی تمدن کے عنقریب خاتمے کا اعلان کیا۔ ان وحشت انگیز مورخوں کا تذکرہ اس سرگذشت میں ایک علیحدہ باب کے تحت کیا گیا ہے۔ ان دونوں نے تاریخ کو فلسفے میں غرق کر دیا لیکن نہ تاریخ اور نہ فلسفہ پیشین گوئی کو جائز قرار دیتا ہے۔ لیکن عوام ہمیشہ علم غیب کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ تاریخ کو پیش گوئی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے یہ دونوں مؤرخ عوام میں مقبول ہوئے۔

پیشین گوئی بھی فلسفۂ تاریخ میں داخل ہو گئی

پیشین گوئی اُس قسم کے رموز میں ہے جس کے اولیا ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان دو پیشین گو مورخوں نے فلسفۂ تاریخ میں رمز شناسی داخل کر کے اس فلسفہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ لیکن اصل فلسفۂ تاریخ کا تعلق صرف اسباب واقعات سے ہے۔ زیادہ سے زیادہ تلاشِ اسباب کی خاطر واقعات کی تاویل کی جا سکتی ہے۔ لیکن اسرار و رموز معلوم کرنا مورخ کے بس کا روگ

نہیں یہ کام صرف اولیار کا ہے۔

اس مختصر تمہیدی باب کو ختم کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ فلسفۂ تاریخ کا زور ایسے زمانوں میں ہوتا ہے جب دُنیا حوادث کا شکار ہوتی ہے۔ سینٹ اگسٹائن کے زمانے میں عالمگیر دولت رومتہ الکبریٰ وحشی حملہ آوروں کے ہاتھوں برباد ہورہی تھی۔ ابن خلدون نے عالم اسلام کی بربادی دیکھی۔ دولتِ روم کی بربادی ایک عالمی حادثہ تھا کیونکہ پوری متمدن دُنیا رومی تزک واحتشام اور رومیوں کے حاصل کردہ امن وامان کی عادی ہوچکی تھی۔ اسی طرح دولتِ عباسیہ دُنیا کے بیشتر متمدن حصّے پر حاوی تھی اور دُنیا کے لئے باعث امن وخیر تھی۔ جب ایسی عالمگیر حکومتیں برباد ہوتی ہیں تو تمام عالم متاثر ہوتا ہے۔

اسی طرح ہمارے زمانے میں دو عالمگیر جنگوں نے دُنیا کو تہ وبالا کردیا۔ غیر معروف ملک اور قومیں بامِ شہرت پر پہنچ گئیں۔ روس اور امریکہ نے انگریزی اور فرانسیسی سامراجیوں کی جگہ لے لی۔ جرمنی کا غرور خاک میں مل گیا۔ چنانچہ انگلستان اور جرمنی ہی سے پروفیسر ٹوئن بی اور اسپینگلر جیسے وحشت انگیز مؤرخ اُٹھے اور مغربی تمدّن کے خاتمے کی پیشین گوئی کی۔

جب حوادث دُنیا کو گھیر لیتے ہیں تو انسان ایسے فلسفے کا طالب ہوتا ہے جو اس کو غیب کا حال بتائے یا بلاؤں سے نجات کی بشارت دے۔ جب کسی چیز کی مانگ ہوتی ہے تو اس کو پورا کرنے والے بھی کہیں نہ کہیں سے پیدا ہوجاتے ہیں۔ ابنِ خلدون نے بھی اس مانگ کو پورا کیا لیکن اس نے غیب دانی یا پیشین گوئی سے اپنا دامن آلودہ نہیں کیا۔ گو اس کی تحریر میں قنوطیت کے آثار نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کو تخریب میں بھی ایک تعمیری پہلو نظر آیا۔ اس نے قوموں کے اسباب زوال کے ساتھ اسباب عروج بھی معلوم کئے اور اس طرح اس نے اپنے تخریبی

زمانے میں علم عمرانیات کی تعمیر کی بنیاد رکھی۔

زمانۂ انتشار و تخریب میں لوگ بشارت اور علم غیب کے طلب گار ہوجاتے ہیں اور ایسے زمانے میں تاریخ کے حدود بھی بڑھ جاتے ہیں مشکل بلکہ لاینحل مسائل مثلاً تقدیر و تدبیر۔ خیر و شر وغیرہ۔ ایسے ہی پُرآشوب زمانے میں فلسفۂ تاریخ میں داخل ہوئے۔

یونانیوں نے تاریخ کو ایک دیوی قرار دیا

فلسفہ بڑی ڈراونی چیز ہے اور خصوصاً جب بیان فلسفہ میں اصطلاحات کو دخل دے دیا جائے اس مصنف کی خوش نصیبی سے آج سے تین ہزار سال پہلے یونانی دیو مالا (مائی تھولوجی) گڑھنے والوں نے تاریخ کو ایک دیوی کی صورت میں پیش کیا اور اس کا نام "کلایو" رکھا۔ یہ دیوی کلایو یونانیوں کے سب سے بڑے معبود "ذی یوس" کی نو(۹) دختروں میں سے تھی جو ذی یوس کی بیوی "بی بی حافظہ" کے بطن سے تھی کیونکہ یونانی زبان میں جو لقب ذی یوس کی بیوی کو دیا گیا۔ اس کے معنی حافظہ ہیں۔ گویا تاریخ کی دیوی باپ کی طرف سے خداؤں سے منسوب تھی اور ماں کی طرف سے وہ قوت حافظہ کی وارث تھی۔ (حوالہ نمبر ۴)

یونانی دیو مالا بہ نسبت ہندی دیو مالا بڑی معنی خیز ہے۔ یونانیوں نے اس تاریخ کی دیوی کلایو کے ہاتھ میں ایک کورا کاغذ دیا۔ دوسرے ہاتھ میں اس کو ایک صُور دیا جس کو پھونک کر وہ تاریخی ہستیوں کی شہرت کا اعلان کرتی ہے۔ اس دیوی کے پہلو میں ایک صندوقچہ بھی رکھ دیا تاکہ اس میں وہ تاریخ کے قلمی نسخے بحفاظت رکھ سکے۔ اس کے کورے کاغذ کے معنی یہ نکالے جاسکتے ہیں کہ ہر زمانے کے لوگ اپنی تاویل کے مطابق

جس طرح چاہیں تاریخ لکھیں۔ اسی طرح اس کے ہاتھ میں صُور دیا گیا تاکہ طلبگارانِ شہرت اس کی پرستش کر کے اپنا نام اس کے کورے کاغذ میں درج کرائیں۔

اس مصنف نے اسی دیوی کی زبانی تاریخ کی سرگذشت بیان کرائی ہے۔ اپنی اس سرگذشت میں وہ بہت سی باتوں کا رونا روتی ہے کہ انسان نے اس کے کورے کاغذ کو تاویلوں اور من گھڑت واقعات سے کس طرح بھر دیا۔ وہ تو صرف واقعات کے اسباب کی تلاش میں نکلی تھی لیکن فلسفیوں نے اس پر فلسفہ بھی لاد دیا۔ اور تمام مسائل فلسفہ مثلاً تقدیر و تدبیر۔ خیر و شر حتیٰ کہ پیشین گوئی بھی اس کے سپرد کر دی۔

اپنی سرگذشت کے باب موسومہ "میری وصیت" میں یہ تاریخ کی دیوی مندرجہ بالا مسائل کو تاریخ سے خارج کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ وہ پیشین گوئی کے تو سخت خلاف ہے۔ اس کے علاوہ تاویل بازی بھی فلسفۂ تاریخ کا جزو بن کر رہ گئی ہے۔ ایسی تاویل بازی کی بدولت آج شیواجی لٹیرے کو "حامئ آزادئ ہند" کے جامے میں پیش کیا جاتا ہے۔ احساس کمتری کی شکار نو آزاد قومیں اپنے زمانۂ ماضی کو "عہدِ زرّیں" قرار دیتی ہیں۔ افریقہ کی ایک نو آزاد قوم کے ایک "مورخ" نے حضرت عیسیٰ کو حبشی نسل سے منسوب کر ڈالا۔ یہ سب احساسِ کمتری کا کرشمہ ہے۔

مورخوں کو احساس کمتری کے اظہار کا موقع تاویل بازی کی بدولت ملا۔ تاریخ کی دیوی کے لئے یہ احساسِ کمتری کوئی نئی چیز نہیں۔ وہ متعدد مفتوحہ قوموں کو فاتحین کے زیر دست دیکھ چکی ہے۔ اس نے ایرانیوں کو عربوں کے ہاتھ مغلوب ہوتے دیکھا کہ ایرانی کس طرح اپنے عرب فاتحین کی

نقالی کرتے تھے اور ساتھ ہی عربوں کو گالیاں بھی دیتے تھے۔ ایرانیوں نے عربی زبان سیکھی۔ اپنے نام عربی طرز پر "ابن" لگا کر لکھنے شروع کئے۔ عربوں کا مذہب بھی اختیار کر لیا۔ مگر ساتھ ہی وہ عربوں کو گالیاں بھی دیتے رہے۔ اور گالیوں سے اپنے دل کی بھڑاس نکالتے رہے۔ فردوسی نے اپنے شاہنامہ میں صاف صاف لکھا :-

زشیر شتر خوردن و سوس مار　　عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاجِ کیان را کند آرزو　　تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

(یہ اونٹ کا دودھ پینے اور گو کا گوشت کھانے والے عرب آج اس عروج کو پہنچ گئے ہیں کہ وہ اب تاجِ کیان کی آرزو کرتے ہیں۔ اے چرخِ گرداں تجھ پر ہزار لعنت)

احساسِ کمتری کا یہ تماشہ آج بھی نظر آ رہا ہے۔ اہلِ مشرق باوجود اپنی نو حاصل "آزادی" اہلِ مغرب کی کُھلّم کھلاّ نقل کر رہے ہیں حتیّٰ کہ ٹیڈی لباس بھی اختیار کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی مغرب کو گالیاں بھی دے رہے ہیں۔ الغرض تاویل بازی کی بدولت یہ احساسِ کمتری تاریخوں میں بھی داخل ہوا۔ مگر مگر اس زمانے کے لوگ "تاویل کے اس قدر شیدا ہیں کہ وہ ایسی تاریخ سے ہاتھ لگانے کے لئے تیار نہیں جو تاویلوں سے مُبرّا ہو۔

اسی طرح دوسری عالمگیر جنگ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کے بعد فلسفۂ تاریخ کا بھی زور بڑھا کیونکہ اس قسم کے فلسفے کی پُر آشوب زمانے میں خاص طور پر مانگ ہوتی ہے۔ اور لوگ زمانۂ حال سے تنگ آکر زمانۂ آئندہ کے لئے بشارت طلب کرتے ہیں۔ اس طرح پیشین گوئی بھی فلسفۂ تاریخ میں داخل ہو جاتی ہے۔ تقدیر کے حامی بھی زور پکڑتے ہیں اور مسئلہ تقدیر و

تدبیر بھی اس فلسفے میں گھس پڑتا ہے۔

پیشین گوئی نوشتۂ تقدیر کی بنا پر کی جاتی ہے۔ جرمن فلسفیٔ تاریخ اسپینگر (سنہ ۱۸۸۰ تا سنہ ۱۹۳۶ء) نے اپنی کتاب موسومہ "زوالِ مغرب" سنہ ۱۹۱۸ تا سنہ ۱۹۲۲ کے دوران میں لکھی جب جرمن ہتھیار ڈال چکے تھے اور سخت مشکلات اور ذلت کا سامنا کر رہے تھے۔ یہ قوم اس وقت بڑی بے چینی سے کسی بشارت کی منتظر تھی۔ چنانچہ اسپینگلر بشیر بن کر نمودار ہوا۔ اس کی متعدد پیشین گوئیوں میں سے صرف ایک دو مثلاً روس کا عروج اور ہٹلر کا خروج صحیح ثابت ہوا مگر باقی پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوئیں۔ دو صحیح پیشین گوئیوں کی بدولت اس کی کتاب "زوالِ مغرب" کی آج بھی مانگ ہے۔ اسپینگلر نے ان پیشینگوئیوں کو مقبول بنانے کی خاطر اپنا فلسفۂ تاریخ بھی پیش کیا جو تفصیل سے آگے ایک مخصوص باب کے تحت بیان کیا جائے گا۔

انگریز پروفیسر ٹوئن بی (ولادت سنہ ۱۸۸۹) نے اپنی پیشین گوئیوں کی خاطر اپنی کتاب موسومہ "مطالعہ تاریخ" دس جلدوں میں لکھی جس کی پہلی چھ جلدیں دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے اور بقیہ چار جلدیں بعد جنگ شائع ہوئیں۔ ان آخری چار جلدوں میں مصنف کے نظریات میں دوسری جنگ نے بڑا تغیر پیدا کیا۔ ان اختتامی جلدوں کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر مذکور نے اپنی پروفیسری کی "گاؤن" اُتار کر پادری کا چُغہ پہن لیا ہے اور اب اس کی تلقین کا موضوع یہ ہے کہ مغرب کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ مذہب عیسوی کو پھر زندہ کرے۔ ان ہی جلدوں میں مصنف نے حضرت عیسیٰ کی طرح بشارت کی صورت میں پیشین گوئیاں بھی کی ہیں لیکن اس کی بشارت مشروط ہے۔ اگر مغرب نے مذہب کو اپنا شعا

نہ بنایا تو ان کی تہذیب اور ان کے کارنامے مٹ کر رہیں گے۔

ان دونوں پیشین گو مورخوں کا تذکرہ بمعہ تذکرۂ ایچ۔ جی۔ ویلز ایک مخصوص باب بعنوان "تین پیشین گو قسم کے مورخ" کے تحت آپ پڑھیں گے۔

تاویل بازی بھی جزوِ تاریخ بن گئی

اس تمہیدی باب کو ختم کرنے سے پہلے اور دوسرا باب بزبان تاریخ شروع کرنے سے قبل ایک لطیفہ پیش کیا جاتا ہے جس سے فلسفۂ تاریخ اور تاویل بازی کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ چار مسافر ایک بیل گاڑی میں ہم سفر ہوئے۔ ایک مولوی صاحب تھے دوسرے پنڈت جی تھے۔ ان کے ہمراہ ایک قصاب اور ایک بنیا تھا۔ جب یہ جنگل میں پہنچے تو صبح ہوئی اور ایک کالے تیتر کی آواز سنائی دی۔ آواز بھی ایک واقعہ ہے لیکن اس ایک آواز کی چار تاویلیں اس طرح کی گئیں :۔

مولوی صاحب : واہ واہ یہ تیتر کیسا صاف کہہ رہا ہے "سُبحان تیری قدرت"

پنڈت جی : مولوی صاحب آپ غلط سمجھے۔ وہ تو صاف کہہ رہا ہے "سری رام دسرت"

قصاب : آپ دونوں غلط۔ وہ تو کہہ رہا ہے "سری پائے ڈھک رکھ"

بنیا : آپ تینوں غلط۔ وہ تو صاف کہہ رہا ہے "نون تیل ادرک"

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہر ایک نے ایک آواز کی چار

تاویلیں ہی نہیں کیں بلکہ ہر ایک کی تاویل اس کے پیشے یعنی اس کے ماحول کے مطابق تھی۔ اسی لئے باہوش اساتذۂ تاریخ اپنے طلبا کو آگاہ کرتے ہیں کہ ہر تاریخ پڑھنے سے پہلے اس کے مصنف کے حالات معلوم کرو۔ تاکہ مصنف کے ماحول سے آگاہ ہو کر اس کی تاویلوں کی نوعیت معلوم ہو جائے

اہلِ دل مؤرخ کو تاریخ میں خدا نظر آتا ہے۔ اشتراکیت پسند مورخ ایسی تاریخ میں تقاضۂ شکم دیکھتا ہے۔ قوم پرست مورخ کو تاریخ میں اپنی قوم کی عظمت نظر آتی ہے۔ ادیب قسم کا مؤرخ تاریخ کو ڈرامہ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ غرض کہ جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں۔

جب ایک تیز کی ایک آواز کی جس کو چاروں نے اپنے کانوں سے سُنا اتنی مختلف تاویلیں کی گئیں تو پھر پُرانے زمانے کے واقعات اور واقعات کے اسباب کس طرح تاویل سے بچ سکتے ہیں۔ ہر مذہب بھی تاویل کا شکار ہوا لیکن ساتھ ہی مذہب تاویلوں کے ذریعہ کشادہ بھی ہوا۔ اسی طرح تاویل سے تاریخ بھی کشادہ ہو کر دلکش بن جاتی ہے۔ بشرطیکہ مؤرخ کی نیت غرض سے پاک ہو۔ لیکن ایسی شرط کو ہر کس و ناکس پورا نہیں کر سکتا۔ جس طرح آتش نے شاعری کے متعلق کہا کہ

شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ نگاری بھی چند صفات کی متقاضی ہے جن میں دیانت سب سے زیادہ اہم ہے۔ لیکن اب دیانت بھی تاویل بازی میں غرق ہو گئی ہے۔ بقول پروفیسر لیو ڈک :-

(حوالہ نمبر ۵)

"خواہش تاویل اب ایسی جاگزیں ہو گئی ہے کہ اب ہمیں

(اس خواہش کی وجہ سے) رموز باطن یا کلبیت میں پھنس
جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے تا وقتیکہ ہم ماضی کو تعمیری
نظر سے نہ دیکھیں۔"

یعنی تاویل کی وجہ سے اب رموز بھی تاریخ میں داخل ہو رہے ہیں۔
یہ واضح رہے کہ پروفیسر پووک اکسفورڈ میں ماڈرن ہسٹری کا پروفیسر
ہے اور لارڈ ایکٹن کا جانشین ہے۔

دوسرا باب

مَیں کون ہوں، کیا ہوں، کیا نہیں ہوں؟

لوگ مجھے تاریخ کے نام سے پکارتے ہیں لیکن یہ نام مجھ کو مسلمانوں نے دیا۔ کیوں کہ مسلمان مؤرخوں نے میرے واقعات تاریخ وار لکھنا شروع کئے۔ یورپ کے وحشیوں نے جو نام مجھے دیا وہ مختلف تھا جو کہانیوں کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن ان وحشیوں نے یہ نام خطۂ یونان سے لیا۔ اس لفظ کے اصل معنی عاقل یا حکیم تھے لیکن ان وحشیوں نے اس لفظ کو مسخ کر کے مجھے "ہسٹری" کہنا شروع کیا۔ جس کے معنی کہانی ہیں۔ گو میں نے ایک عرصے بعد کتابی جامہ پہنا لیکن میری ولادت اور انسانوں کی ولادت ایک ہی زمانے کی ہے۔

ابتدائے تاریخ اور اُس کا پہلا نشیمن!

میں کہاں پیدا ہوئی؟ اس کا جواب میں فی الحال بھی دے سکتی ہوں کہ میں نے سب سے پہلے قلبِ انسانی میں جگہ بنائی اور لاکھوں برس تک میرا نشیمن اسی قلبِ انسانی میں ہی رہا۔ جب اس عجیب الخلقت انسان نے زمین اور پتھروں پر کل کل کانٹے بنانے شروع کئے تو میرا وجود کسی قدر ثبت ہونے لگا۔ انسان نے مجھے اپنے قلب میں کیوں جگہ دی؟ کیا اس لئے کہ میں قابلِ احترام تھی؟ نہیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ خود اپنے آپ کو محترم سمجھتا تھا۔ اُس نے مجھے اپنے احترام کا آلہ بنایا لیکن اس نے میری پرواز ختم کر دی۔ چنانچہ ہزاروں برس انسان نے مجھ سے صرف یہ کام لیا کہ میں اس کے نسب نامے بیان کروں۔

اس طرح میں ہزاروں سال قبیلہ بندی کے جال میں گرفتار رہی اور قبیلوں کی خوں ریزی بیان کرتی رہی۔ عرب جنگجو قبیلے نے مجھے "رجز" کا نام دیا۔ اب علاوہ نسب ناموں کے رجز کا کام بھی میرے سپرد کیا گیا۔ اور میں اس طرح شاعروں کے ہاتھ پڑ گئی۔

جب اس عجیب الخلقت انسان نے قبیلہ بندی سے آگے قدم رکھا اور بادشاہ نمودار ہوئے اور ان بادشاہوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرنا شروع کیں تو مجھے اُمید پیدا ہوئی کہ اب میری پرواز بلند ہو جائے گی۔ لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔ بادشاہوں نے میرے پر و بال تراش کر مجھے خوشامد اور قصیدہ گوئی کے قفس میں مقید کر دیا۔ میں حق گوئی اور حقیقت بینی کے لئے پیدا ہوئی تھی لیکن ان بادشاہوں نے مجھ سے باطل گوئی کا کام لیا۔ پہلے میں قبیلوں کی مدح سرائی کرتی تھی لیکن اب میں صرف ایک فردِ واحد کی خوشامد کرنے لگی۔

جب انسان کا دل بادشاہت سے اُکتا گیا تو چند مغربی ملکوں کے نام نہاد مفکرین نے بادشاہوں کے خلاف بغاوت شروع کی۔ میں صدیوں سے بادشاہوں کی خوشامد کر رہی تھی لیکن اب ان باغیوں نے مجھے بھی اپنی بغاوت کا آلۂ کار بنایا۔ اور میرے بیان کردہ واقعات کو عجیب عجیب معنی "پہنائے" اور یہ ثابت کر دیا کہ انسان غلام نہیں بلکہ آزاد پیدا ہوا۔ اور بادشاہوں نے اُسے طوقِ غلامی پہنایا۔ اس بغاوت کی ابتدا اسی خطۂ یونان سے ہوئی جہاں کے حکما نے مجھے عقل و حکمت کا لقب دیا تھا۔ افلاطون نے جمہوریت کا خواب دیکھا اور میرے بیان کردہ واقعات کی بنا پر ایک کتاب بھی لکھ ماری جس کا نام اُس نے

"جمہوریت" رکھا۔ اس کتاب میں محض خیالی پلاؤ تھے جس کو محض اہلِ قلم کھا سکتے تھے۔ اہلِ سیف نے اس پلاؤ سے کبھی ہاتھ نہ لگایا۔

یہ عجیب بات ہے جس کی وجہ میں بھی بیان نہیں کر سکتی کہ خطۂ یونان، سرزمینِ مشرق کو متاثر نہ کر سکا۔ حالانکہ یہ خطہ ایک طرح سے مشرقی خطہ ہی تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اس خطّے کے خیالی پلاؤ پکانے والوں پر فارس کے بادشاہوں نے چڑھائی شروع کر دی۔ میں اُن دنوں میں ایران میں مقید تھی اور ان ایرانی کسراؤں کی خوشامد میں مصروف تھی۔ جب یونانی خیال آراؤں کی بُری طرح پٹائی ہوئی تو ان میں سے ایک شخص ہرودوتس نامی اُٹھا جس نے میرے نام پر ایک کتاب لکھی حالانکہ میں ان دنوں ایران میں مقید تھی۔ ہرودوتس صاحبِ علم تو ضرور تھا مگر مثل مشہور ہے کہ "جہاں دیدہ بسیار گوید دروغ"۔ چنانچہ اکثر باتوں میں اس نے دروغ گوئی سے کام لیا۔ اس کی دروغ گوئی کا طریقہ عجیب اور بالکل نیا تھا۔ جب ایرانیوں کے ہاتھوں اس کے اہلِ وطن کی بُری طرح پٹائی ہوئی تو اس نے اپنی جلن کو علم و حکمت کا جامہ پہنایا اور سیدھے سادے واقعات سے وہ نتیجے نکالے جو پیٹنے والوں کے دماغ میں بھی نہ تھے۔

ہرودوتس اپنے علم و حکمت کی وجہ سے تاویل بازی کا ماہر تھا چنانچہ اس تاویل بازی کی بنا پر اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کسریٰ کی یونان پر چڑھائی صرف دو بادشاہوں کے درمیان لڑائی نہ تھی بلکہ دراصل مشرق و مغرب کے درمیان محاربہ تھا۔

میرے محرّروں میں ہرودوتس پہلا شخص ہے جس نے مجھ پر تاویل بازی کا دھبّہ لگایا۔ جب میں قلبِ انسانی میں محفوظ تھی تب بھی مجھ سے ثناخوانی

کرائی جاتی تھی لیکن یہ ثنا خوانی محض خود پسندی پر مبنی تھی۔ لیکن اس گپی ہیرودوتس نے اپنی تاویل میں مقامی رنگ و بو دیکھ کر مجھ کو "ملکی اور قومی" جال میں پھنسانے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسریٰ نے یونان پر چڑھائی صرف اس لئے کی کہ وہ ذوقِ حکومت میں گرفتار تھا۔ اس وقت پورے مشرق میں کوئی بھی قومیت کی لعنت میں گرفتار نہ تھا۔ اس زمانے میں تمام مشرق صرف اللہ سے لو لگاتا تھا۔ اور صرف مذہب اس کا نعرہ تھا۔

جب میں نے اپنے ناخلف محرّر ہیرودوتس کی یہ بے جا تاویل دیکھی تو میرے دل میں خیال آیا کہ در اصل یہ بے چارہ خود اپنے حکمار کا شکار ہے یونانی راگ مالا لکھنے والے مجھے ایک دیوی کا درجہ دے چکے تھے اور میرا نام "کلایو" دیوی پڑ گیا تھا۔ سب سے بڑا ظلم ان لوگوں نے میرے ساتھ یہ کیا تھا کہ میری تصویر اس طرح بنائی کہ میرے ہاتھ میں ایک کورا کاغذ تھا۔ جس پر کوئی نقش نہ تھا۔ اس کورے کاغذ سے خطۂ یونان کے حکماء نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کورے کاغذ پر ہر شخص اپنی پسند کے مطابق لکھ سکتا ہے خواہ وہ حق ہو یا ناحق۔

میرے پرستاروں کو یہ تصویر ایسی پسند آئی اور خصوصاً یہ کورا کاغذ ان کو ایسا مرغوب ہوا کہ اس پر ہر کس و ناکس نے اپنے خیال کے مطابق رقم طرازی شروع کر دی۔ اب تک تو یہ رقم طرازی اور تاویل بازی "فی سبیل اللہ" کی جاتی تھی لیکن اب اس تاویل بازی نے میرے حدود میں قدم جمایا اور ایسا جمایا کہ اب اس کو کوئی اکھاڑ نہیں سکتا۔ میں بہت غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس معاملے میں بیچارہ انسان بے بس ہے۔ خواہ وہ شکمِ مادر سے بے عینک کے پیدا ہو لیکن اس کا ماحول اس کی آنکھ پر کسی نہ کسی رنگ

کی عینک لگا دیتا ہے اور وہ ہر چیز کو اسی عینک سے دیکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے موجودہ ماحول کو اس عینک سے دیکھے تو چنداں مضائقہ نہیں لیکن غضب یہ ہے کہ وہ زمانہ گذشتہ کو بھی اسی عینک سے دیکھتا ہے۔ کسی جویائے حق نے کیا خوب کہا ہے :

زا بگینہ زرد چون سازی نقاب
زرد بینی جملہ نورِ آفتاب (مولانا روم)

اسی طرح مسلمانوں کے قرآن میں ایک قصہ ہے جو میرے صحیفہ سے بھی زیادہ عبرت آموز اور سبق آموز ہے۔ وہ قصہ موسیٰ و طور کا ہے کہ کس طرح موسیٰ تلاشِ حقیقت میں طور پر جا کر انسان کی محدود نظر کا شکوہ کرتے ہیں۔ اور تجلیِ حق کی خواہش کرتے ہیں۔ خدا ان کو اس تجلی کا صرف ایک شائبہ دکھاتا ہے۔ مگر موسیٰ ہی نہیں بیہوش ہوتے بلکہ طُور بھی جل جاتا ہے۔ گویا طور بھی حق کی تاب نہ لا سکا۔ یعنی جلوۂ حقیقت انسان کی قسمت ہی میں نہیں ہے۔ اب میرے سمجھ میں آیا کہ میرے محرّر حقیقت نگاری سے کیوں محروم رہے اور میرے کورے کاغذ پر ہر ایک نے کیوں متضاد داستانیں لکھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ راگ مالا گڑھنے والے فطرتِ انسانی سے خوب واقف تھے اور اسی لئے میرے ہاتھ میں کورا کاغذ دیا تھا۔

اب تک میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ میں کون ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں باوجود دیوی ہونے کے خود اپنی اصلیت سے ناآشنا ہوں۔ اب میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں کیا ہوں یعنی میرا مقصدِ حیات کیا ہے۔؟ آپ یہ اعتراض کریں گے کہ جو اپنی ہستی تک سے ناآشنا ہو وہ اپنا مقصدِ حیات کس طرح بیان کر سکتا ہے۔ یہ اعتراض اپنی جگہ بالکل درست

ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنا مقصدِ زندگی بیان کرنا چاہتی ہوں۔ کاش میں اپنا یہ مقصد اپنے کورے کاغذ پر خود لکھ سکتی لیکن میں اس سے معذور ہوں۔ چنانچہ میرے مقصد کو بھی میرے پرستاروں ہی نے بیان کیا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کی آنکھ پر کسی نہ کسی رنگ کی عینک لگی ہوئی تھی۔ اسی عینک سے ان لوگوں نے مجھے دیکھا اور میرا مقصدِ حیات بیان کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مقصد اُن کا اپنا تھا۔ میرا نہ تھا۔ چنانچہ جتنے قسم کے میرے محرّر ہیں اتنی ہی اقسام کے میرے مقاصدِ حیات بھی نظر آتے ہیں۔ گویا میں "جتنے مُنہ اتنی ہی باتیں" کا شکار ہو گئی۔

جیسا زمانہ ویسا ہی بھیس

لیکن ایک طرح سے میں ان محرّروں کی ممنون بھی ہوں وہ اس طرح کہ ان لوگوں نے مجھے مختلف لباس پہنا کر ہر طبقہ کے لوگوں کو میرا شیدا بنا دیا۔ اور اس طرح میرا محیط میری اُمید سے زیادہ وسیع ہو گیا۔ یہ حرکت انسان نے میری خاطر نہیں بلکہ اپنے تقاضائے فطرت کے مطابق کی۔ اسی تقاضے کے تحت اس نے اپنے آسمانی صحیفوں کی تاویلیں کیں جن کو وہ فخریہ "تفسیر" کہتا ہے۔ گویا اس نے اپنے ذاتی خیالات اور تعصّبات کا اظہار خدا کی زبان سے کرایا جب انسان نے خدا تک کو نہیں چھوڑا تو وہ مجھ جیسی حقیر دیوی پر کیوں نہ ہاتھ صاف کرتا۔

جب میں ان بے شمار لباسوں میں ملبوس ہوں تو میں کس طرح اپنی حقیقت یا اپنا مقصدِ حیات بیان کر سکتی ہوں۔ اس لئے خود بیان کرنے کی بجائے میں اپنے پرستاروں کے بیانات پیش کرتی ہوں۔ بیانات پیش کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ میں ایک الزام کے معاملے میں صفائی پیش

کروں جو مجھ پر دیگر علوم کی دیویاں لگاتی ہیں۔ وہ الزام یہ ہے کہ میں بہروپیہ رہی ہوں یعنی میں نے ہر زمانے میں رائج الوقت رنگ کا لباس اختیار کیا۔ یہ الزام درست ہے۔ لیکن یہ لباس میں نے خود نہیں پہنا بلکہ پہنایا گیا ہے انقلاب زمانہ کے ساتھ میرا لباس بھی بدلتا رہا۔ جس زمانے میں جو کام میرے سپرد ہوتا تھا۔ اسی کے مطابق میرا لباس ہوتا تھا۔

گو میری قسمیں بہت ہیں لیکن میرے ذمہ کام صرف تین رہے ہیں:۔

(۱) افراد کی مدح سرائی یا مذمت کرنا یا قوموں کی حمد ثنا کرنا۔ قوموں میں اُمتیں بھی شامل ہیں اور قبائل بھی۔ قوم کا تصوّر بہت بعد کو نمودار ہوا لیکن قبیلے کا تصور بہت پرانا ہے۔ اس قسم کی تاریخ نگاری کو مدحیہ کہا جاسکتا ہے۔

(۲) اپنے ناظرین کو عبرت دلانا۔ آسمانی صحیفوں میں جو میرے واقعات درج ہیں اُن کا مقصد بھی حصولِ عبرت ہے۔ لیکن بعض آسمانی صحیفے مثلاً توریت بمعہ کتاب پیدائش۔ زبور۔ کتاب خروج وغیرہ میرے لئے مخصوص ہیں۔ یہودیوں کے صحیفے کا ایک جزو موسومہ "کتاب سلاطین" تو سراسر تاریخ ہے۔ زمانۂ قدیم میں تو عبرت دلانے کا طریقہ قصہ گوئی ہی تھا۔ اس کا مفصّل ذکر میں آگے چل کر کروں گی۔

(۳) اپنے ناظرین کا دل بہلانا۔ میری تحریری صورت سے پہلے جب لوگ سیر و شکار سے تھک کر اپنے غاروں یا خیموں میں واپس آتے تھے تو میں اپنے قصے سنا کر ان کا دل بہلاتی تھی۔ اور ان کا غم غلط کرتی تھی۔ بچّے تو آج تک کہانیوں کے شیدا ہیں۔ انہیں دنوں میں میں نے "لوریوں" کی شکل بھی اختیار کی۔ آج کل کے لوگ اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں اور غاروں

اور خیموں کے رہنے والوں کو "وحشی" کہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ذہنیت کا تعلق ہے مجھے ان دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ آج کل کے مہذّب لوگ بھی قصے کہانیوں کے اسی طرح شائق ہیں جیسا کہ وحشی تھے۔ بلکہ مہذّب ہو کر تو یہ لوگ ناول نگاری بھی کرنے لگے۔ چنانچہ اس "مہذّب" دور میں جو مقبولیت ناولوں کو حاصل ہے وہ مجھ کو نہیں حاصل۔

میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میرا لباس ہر زمانے میں ان فرائض کے مطابق ہوتا تھا جو مجھ کو اس زمانے میں ادا کرنے پڑتے تھے۔ گویا میں بہروپیہ رہی ہوں۔ اب میرے مختلف لباسوں کا حال بھی سُنئے۔

تاریخ نگاری کی مختلف صورتیں

(۱) جب تک میرا نشیمن قلب انسانی میں رہا تب تک مجھ کو داستان گوئی پر اکتفا کرنا پڑا۔ میرا کام صرف یہ تھا کہ ہر قبیلے کا صرف نسب نامہ بیان کروں اور تعریف کے پُل باندھ دوں۔ اس دور میں صرف یہی شیوہ اختیار کر کے زندہ رہ سکتی تھی۔

(۲) دوسرے دَور میں جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکی ہوں مجھ پر یہ رجزیہ رنگ چڑھایا گیا کیوں کہ اس دَور میں میں قبائلی لڑائیوں کا ذکر کرتی تھی مدّت دراز تک میں اسی لباس میں رہی اور رزمیہ شاعری کا آلہ کار بنی رہی۔ یونان کے شاعر ہومر نے میری ہی بدولت حیاتِ جاوداں حاصل کی۔ اسی طرح ایران کا شاعر فردوسی میری بدولت ہی مشہور رہا۔ اس قسم کی شاعری کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ مفتوحہ قومیں اپنے فاتحین کا مقابلہ میدانِ کارزار میں نہیں کر سکتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان مفتوحوں کو اپنی علیحدہ ہستی کا احساس قائم رکھنا بھی ضروری تھا تاکہ آئندہ کی اُمیدیں

منقطع نہ ہو جائیں اور کسی دن آگے چل کر غلامی کا جُوا گردن سے اُتار سکیں۔ ایران اپنی ہستی فردوسی کی ہی بدولت قائم رکھ سکا۔ میری بدولت رُستم کا نام آج تک زندہ ہے جیساکہ فردوسی خود تسلیم کرتا ہے۔

منش کردہ ام رُستم پہلواں
وگرنہ یلے بود در سیستاں!

سکندر ذوالقرنین کی شہرت کو میں نے ہی روشن کیا۔ گو اس کے ہم وطنوں نے اس کی مشرق پرستی سے ناراض ہو کر اس کے کارناموں کو قعرِ گمنامی میں دفن کرنا چاہا لیکن میں یہ ناانصافی گوارا نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ میں نے مغربی شاعروں کو اس کے افسانے لکھنے پر آمادہ کیا اور میری بدولت سکندر کا چرچا تمام مشرق میں پھیل گیا گو یہ وہی مشرق تھا جس کو سکندر نے نیچا دکھایا تھا۔ میری ہی بدولت مشرق و مغرب میں سکندر کے نام پر بچوں کے نام رکھے جاتے ہیں۔

اسی دور میں میرے سپرد یہ کام ہوا کہ میں سورماؤں کے نام اپنے جریدہ عالم میں ثبت کروں تاکہ آئندہ نسلیں ان ناموں کو پڑھ کر بشارت حاصل کر سکیں اور ایامِ مصیبت میں اُمید نہ کھو بیٹھیں۔ گو میں نے ان سورماؤں کے حالات لکھنے میں بہت کچھ مبالغہ کیا لیکن عالمِ مایوسی میں مغلوبوں کی رہنمائی کر کے میں نے ان کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی اور اس طرح عوام اور بازاری لوگ بھی میرے معتقد ہو گئے۔ بازاروں میں میرا نام لیا جانے لگا۔ افسانہ گو اب تاریخ گو کہلانے لگے۔ عثمانی ترکوں کے زمانے میں میرے یہ پرستار قصہ گو اس حد تک مطلوب تھے کہ یہ مہموں میں فوج کے ساتھ جاتے تھے۔

یں ہندوستان میں بھی پہنچی لیکن یہاں میں نے ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ یہاں صرف برہمن ہی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ ان برہمنوں نے اپنا قابو قائم رکھنے کے لئے یہ ترکیب نکالی تھی کہ مفتوحہ لوگوں کو شودر کا درجہ دے دیا تھا اور فاتح قوم آریہ کو تین پیشوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ قلم دان اپنے ہاتھ میں ہی رکھا تھا۔ شمشیر زنی شتریوں کے سپرد تھی لیکن اُن کی شمشیر زنی کی داستان صرف برہمن ہی لکھ سکتے تھے۔ باوجود اس کے کہ یہ برہمن صرف اپنی دیویوں کو پوجتے تھے لیکن میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ ان کو بھی اپنا پرستار بناؤں تاکہ یہ بھی تاریخ نگاری کر سکیں۔ لیکن مجھے صرف اس حد تک کامیابی ہوئی کہ میں چند برہمنوں سے مہابھارت کی داستانیں لکھوا سکی۔ یہ برہمن ویدوں میں ایسے مستغرق تھے کہ دیگر علوم اور خصوصاً تاریخ کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

ان ویدوں کے مطالعہ سے ان برہمنوں کے دماغوں میں یہ بات جاگزیں ہو گئی تھی کہ ایشور نے افراد کی طرح قوموں کی بھی قسمت لکھ دی ہے وہی ہو کر رہے گا۔ جو ایشور کو منظور ہے۔ اس لئے تاریخ سے سبق حاصل کرنا بے سود ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ہندو بھی میرے پرستار ہو جائیں۔ اس غرض سے میں نے ریحان البیرونی جیسے محقق کو ہندوؤں میں بھیجا تاکہ ان برہمنوں کا مغالطہ رفع کر سکے۔ لیکن اس نے مایوس ہو کر لکھا کہ ہندو تاریخ سے اس حد تک ناآشنا ہیں کہ وہ صرف اپنے آپ کو انسان سمجھتے ہیں۔ میرے اس نامی پرستار کو تنگ آ کر لکھنا پڑا کہ :- (حوالہ نمبر ۱)

" ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ان کے مُلک کے علاوہ دُنیا

میں کوئی ملک نہیں نیز ان کی قوم۔ ان کے راجہ۔ ان کا مذہب اور ان کا علم عالم میں لاثانی ہے۔ وہ بڑے مغرور ہیں اور ان کا غرور حماقت کی حد تک ہے .... اگر وہ باہر نکلیں اور غیر اقوام کو دیکھیں تو ان کے خیالات بدل جائیں کیونکہ ان کے اجداد ایسے تنگ خیال نہ تھے جیسے کہ یہ ہیں ....."

ہندوؤں کی تنگ خیالی کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے اجداد کے احوال سے ناواقف تھے کیونکہ وہ میرے پرستاروں میں نہ تھے۔ اگر وہ میرا مطالعہ کرتے تو وہ بدحالی سے بچ جاتے۔ لیکن یہ محض قیاس آرائیاں ہیں جو میری شریعت میں ممنوع ہیں۔ میرا کام صرف واقعہ نگاری ہے گو آگے چل کر تاویل بھی میرے فرائض میں داخل ہو گئی۔ لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔

یونانی تاریخ نگاری

(حوالہ نمبر ۲)

ہندوؤں سے تو کہیں بہتر میرے یونانی پرستار ثابت ہوئے۔ گو شروع میں تو یونانی بھی راگ مالا میں گرفتار تھے۔ بجائے میرے دیگر دیویوں کی پرستش کرتے تھے۔ لیکن ان کو جلد ہوش آ گیا۔ ہومر نے اپنی رزمیہ افسانوں میں مجھے بھی جگہ دی۔ نسب ناموں کے ساتھ ساتھ واقعات بھی درج کئے۔ گو ان نسب ناموں کو ایسا توڑا مروڑا کہ اپنے سورماؤں کا ناتا اپنے متعدد معبودوں سے جوڑ دیا لیکن اسی زمانے میں غیر یونانی حکومتیں بھی قائم ہونے لگیں جہاں میرے پرستار پیدا ہوئے اور یہ راگ مالا نویس میرے ان غیر یونانی پرستاروں کی تقلید کرنے لگے۔ غیر یونانی پرستار اس لئے ہوش میں آئے کہ ایرانی

کسراؤں نے ان پر چڑھائی شروع کی۔ ان کسراؤں کے دربار میں میرے بہت سے پرستار تھے اور ان میں واقعہ نگاری کا شعور پیدا ہو چکا تھا گو یہ واقعہ نگار بہ نسبت میرے اپنے آقاؤں سے زیادہ مانوس تھے۔

اب میں اپنے گپّی پرستار ہیرودوتس کا حال ذرا تفصیل سے بیان کرتی ہوں کیونکہ بعد کے میرے پرستاروں نے اسی کی تقلید کی۔ چونکہ اس سے پہلے ہومر کا رزمیہ منظوم افسانہ مقبول ہو چکا تھا۔ اس لئے ہیرودوتس کو بھی ہومر کی تقلید کرنی پڑی۔ ہیرودوتس نے کس حد تک ہومر کی تقلید کی اس کی سند اسی دور کے ایک یونانی سے سنئے :۔ (حوالہ نمبر ۳)

"ہیرودوتس خوب جانتا تھا کہ جب کوئی داستان طویل ہو جاتی ہے تو سننے والے اس سے اکتا جاتے ہیں۔ اگر وہ داستان ایک ہی چیز کے متعلق ہے لیکن اگر درمیان میں بطور وقفہ کوئی اور بات آجائے تو اس کا اثر اچھا ہوتا۔ اس لئے ہیرودوتس دیگر باتیں درمیان میں شامل کرتا تھا۔ اور اس طرح وہ ہومر کی تقلید کرتا تھا....."

ہیرودوتس نے دوسری ایجاد یہ کی کہ اس نے اپنی تاریخ میں مکالمہ کا طریقہ رائج کیا۔ اور بعض اپنے افراد تاریخ کی جانب سے تقریریں بھی گڑھ کر لکھ ماریں اسی لئے وہ گپّی کہلاتا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اس کی تحریر کو لوگ دلچسپی سے پڑھیں۔ اس کا مقصد تو ضرور پورا ہوا لیکن اس نے حق کے گلے پر چھری پھیر کر مجھے مجروح کر دیا جیسا کہ میں اوپر بتا چکی ہوں۔ اس نے ایران اور یونان کے درمیان کی چپقلش کو مشرق و مغرب کے تصادم پر محمول کیا۔ اور اس نیت سے کیا کہ یونانیوں کو ایرانیوں پر فضیلت دے اس کی نیت بُری تھی کیونکہ اس طرح وہ خودستائی کا مجرم ہوا۔ اس کے

برعکس میری نیت پر بجز حق کے کوئی اور چیز مسلّط نہ ہوئی۔ کاش میرے محرّر میری نیت کی بھی تقلید کرتے اور بدنیتی سے گریز کرتے۔ میرے ایک نامور پرستار ایڈورڈ گبن نامی نے اس ہردوتس کے متعلق کیا خوب کہا:۔ (حوالہ نمبر ۲۲)

"کبھی تو وہ (ہردوتس) بچوں کو مخاطب کرتا ہے کبھی فلسفیوں کو" گویا یہ یونانی گپّی ناسمجھوں اور سمجھ داروں دونوں میں مقبول ہونا چاہتا تھا اور اسی لئے وہ گپ مارتا تھا۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اس کوشش میں وہ تضاد کا مجرم ہے۔ بچے اور بڈھے ایک ہی لکڑی سے نہیں ہانکے جاسکتے۔"

ہردوتس کے بعد ایک اور یونانی اہلِ قلم میرے پرستاروں کے زُمرے میں شامل ہوا۔ اس کا نام توسی دائیدیس تھا۔ اس کے زمانے میں اس کے اہلِ وطن ڈرامہ کے شائق تھے۔ یونانی ڈراموں کا موضوع ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ انسان کے حسرت ناک انجام کو بیان کرکے اپنے سامعین کو رُلائیں۔ یونانیوں کے نزدیک انسان صرف ناکامی کے لئے پیدا کیا گیا۔ کیونکہ یہ یونانی پیغمبروں کی تعلیمات سے بالکل ناآشنا تھے۔ ان کے معبود صرف انسان کو ستانا جانتے تھے۔ کیونکہ یہ معبود صرف قہار تھے رحمٰن ورحیم نہ تھے۔ ابھی تک حضرت عیسیٰؑ اپنا پیغامِ عفو وکرم لے کر نہیں آئے تھے۔ یونانیوں کے ذہن میں یہ نہیں آیا تھا کہ یہ ظالم انسان عفو وکرم کا بھی اہل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ میرے اس محرّر توسی دائیدیس نے جو خامہ فرسائی کی اُس میں اِس نے انسان کی مظلومیت ہی کا رونا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر مورخ اپنی تاریخ میں اپنی ہی تصویر پیش کرتا ہے اسی لئے میرے باخبر پرستار برابر آگاہ کرتے رہتے ہیں کہ کسی مورخ کی تاریخ

پڑھنے سے پہلے اس مورخ کا حال معلوم کرلو۔

البتہ اس توسی دائیڈیس نے میری ایک خدمت ضرور کی اور وہ اس طرح کہ اس نے میرے پیداکردہ واقعات میں اسباب اور نتائج کا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آپ فوراً اعتراض کریں گے کہ واقعات کا پیدا کرنے والا بجز خدا کے اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ ایک حقیر دیوی کس طرح واقعات پیدا کرسکتی ہے یہ بڑی طویل بحث ہے جس کی وجہ سے میرے پرستاروں میں سخت اختلاف پیدا ہوا۔ یہ تنازعہ دراصل تقدیر و تدبیر کا ہے۔ جس کا تعلق دراصل مذہب سے ہے۔ مجھ سے نہیں۔ بعض پرستاروں نے مجھے کاتبِ تقدیر بھی قرار دیا۔ یہ بحث اتنی طویل ہے کہ آگے چل کر میں اِس بحث کے لئے ایک علیحدہ باب مخصوص کروں گی۔ یہاں یہ جملہ معترضہ اس لئے آگیا کہ توسی دائیڈیس نے واقعات کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی اور بجائے خدا کے مجھے خالقِ واقعات ٹھہرایا یعنی ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ کا سبب قرار دیا۔

گو میرے ہر پرستار نے اپنی داستان اپنے قلم سے لکھی لیکن ساتھ ہی اس کو یہ احساس بھی تھا کہ وہ دوسروں کی خاطر یہ ہرزہ سرائی کررہا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تحریر کو رائج الوقت سانچے میں ڈھالتا تھا تاکہ اس کی نوشتہ تحریر مقبول ہو۔ توسی دائیڈیس کے زمانے میں ڈرامہ کا بڑا زور تھا۔ ڈرامہ میں اصل چیز گفتگو یا تقریر ہوتی ہے چنانچہ توسی دائیڈیس نے بھی اپنی تاریخ کو تقریروں سے بھردیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نے ان تمام تقریروں کو اپنے کانوں سے نہیں سنا تھا۔ اور نہ اس زمانے میں مختصر نویسی (شارٹ ہینڈ) کا دستور تھا۔ اکثر تقریریں اس نے دوسروں کی زبانی سنیں جن کو اس نے میرے نام پر اپنی

"تاریخ" میں شامل کر لیا۔

یونانی ڈرامہ کا موضوع ہمیشہ تقدیر کی چیرہ دستی ہوتا تھا۔ گویا یونانی نوشتۂ تقدیر کے قائل تھے۔ چنانچہ ہرودوتس نے یونانی ریاستوں کا عروج و زوال تقدیر پر محمول کیا۔ لیکن توسی دائیدیس نے "اتفاقِ وقت" کے عنصر کو پیش کیا۔ اس زمانے کے لئے یہ نئی چیز تھی اور ایک طرح یہ چیز عقل کا پیش خیمہ تھی۔ گویا اب عقل عقیدے کی جگہ لینا چاہتی تھی۔ ہرودوتس کا یہ عقیدہ تھا کہ جب کوئی قوم بعد حصول قوت مغرور و متکبّر ہو جاتی ہے تو دیوتا اس قوم سے ناراض ہو جاتے ہیں اور اس کو سرنگوں کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ہرودوتس نے کسراؤں کے زوال کا سبب تکبّر قرار دیا لیکن توسی دائیدیس نے اس زوال کو اتفاق وقت پر محمول کیا۔ اور زوال کا سبب یہ بتایا کہ "ہر انسانی چیز کی فطرت موردِ زوال ہے"۔ لیکن ساتھ ہی توسی دائیدیس کا یہ خیال بھی تھا کہ زوال کا انسداد بھی ممکن ہے اور انسان کے ہاتھ میں ہے۔ اس یونانی نے عقل کا چرچا کر کے خود تو شہرت حاصل کر لی لیکن اس نے مجھے ایسے جھگڑے میں پھنسا دیا جو میرے محیط سے باہر تھا۔ تقدیر و تدبیر کے مسئلہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو علم الٰہیات سے متعلق ہے۔ لیکن یونانی تقدیر کے اس حد تک قائل تھے کہ انہوں نے تقدیر کا طوق میری گردن میں ڈال کر مجھے اس جھگڑے میں ایسا پھنسا دیا کہ آج تک میری رہائی نہ ہو سکی۔ گویا فلسفۂ الٰہیات بھی میرے سر تھوپ دیا۔ کہاں میں اور کہاں فلسفیوں کی بکواس!!!

میں تو شروع ہی سے اہلِ سیف کی مربّی تھی اور انہیں کی شمشیر زنی سے وہ واقعات رونما ہوتے تھے جو میرے محرّر قلم بند کرتے تھے۔

لیکن حضرت انسان کی دار و گیر جتنی بڑھتی گئی اسی حساب سے میرا محیط بھی انسان نے بڑھا دیا۔ حتیٰ کہ اب مجھے ہوائی جہازوں میں بھی اُڑنا پڑتا ہے کیوں کہ ان آہنی پرندوں کا ذکر بھی میرے محیط میں داخل ہے۔ میری محیط کی توسیع کر کے میرے محرّروں نے خود اپنے لئے مشکلات پیدا کرلیں کیونکہ اب ان کو ہر علم پر حاوی ہونا لازم ہو گیا۔ لیکن اس کا رونا میں آگے چل کر روُنگی۔ ابھی تو یونانی محرّروں کا تذکرہ بہت باقی ہے کیونکہ ان لوگوں نے ہی مجھے فلسفی لباس پہنانا شروع کیا۔

تاریخ کی صُورت رومیوں کے زمانے میں!

تیر و ترکش کے ذکر سے مجھے اپنے رومی پرستار یاد آ گئے۔ یہ عجوبہ قوم شمشیر زنی کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ لیکن شمشیر کے ساتھ ان کی زبان بھی خوب چلتی تھی۔ اپنی زبان درازی کی بدولت اس قوم نے ایک عجیب ڈھونگ رچایا۔ جس کو آج کی زبان میں "جمہوریت" کہتے ہیں۔ یہ ڈھونگ دراصل ان کے مفتوحہ یونانیوں کا قائم کردہ تھا۔ لیکن بیچارے یونانی اس ڈھونگ کی تکمیل نہ کر سکے کیونکہ ان کا میدانِ عمل صرف شہری حکومت تک محدود رہا۔ رومیوں نے اپنی تلوار کی بدولت دوسرں کے ملکوں پر بھی قبضہ کیا اور ان کو عالمگیر نظمِ حکومت قائم کرنا پڑا۔ اس ضرورت کے تحت ایک عجیب قسم کا طبقہ پیدا ہوا جن کی روزی کا دار و مدار "لیڈری" پر تھا۔ شروع میں یہ بیشک لیڈر رہتے لیکن بعد کو ایامِ زوال میں یہ لیڈر گیدڑ بن گئے جو ہر وقت چیختے رہتے تھے۔ ان گیدڑوں کی چیخ و پکار فیشن بن گئی۔ ان کی چیخ و پکار میں ایک لفظ صاف سنائی دیتا تھا وہ لفظ "قومیت" تھا۔

(حوالہ نمبر ۵) اس قوم میں جو میرے پرستار ہوئے ان کو بھی نقالی اور قومیت کا فیشن اختیار کرنا پڑا۔ لیڈر اور گیدڑ شہرت پر جان دیتے ہیں۔ چنانچہ نامی رومی مؤرخ قونتی لیان نے صاف صاف کہہ دیا کہ تاریخ نگاری کا مقصد یہ ہے کہ " آئندہ نسلوں کے دلوں میں ان کے اجداد کی یاد تازہ کی جائے۔ اور مورخ کو شہرت حاصل ہو"۔ بقول اس مؤرخ تاریخ کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی چیز کو "ثابت" کرے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ مؤرخ شیریں بیان ہو۔ یعنی اپنی تاریخ میں نقالی اور لسانی بھی شامل کرے۔ چنانچہ یونانیوں کی طرح رومی مؤرخوں نے بھی اپنی تاریخوں کو فرضی تقاریر سے بھر دیا۔

رومی مورخوں کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ معرکوں کو بڑے تفصیل سے بیان کرتے تھے گو یہ مورخ ان معرکوں میں بذات خود موجود نہ ہوتے تھے مگر چونکہ ان کے ناظرین جنگجو اور معرکہ آرائی کے شیدا تھے اس لئے مورخوں کو بھی داستانِ جنگ بڑی تفصیل سے بیان کرنی پڑتی تھی۔ اس معاملے میں میں بالکل بے بس ہوں۔ قلم میرے محرّروں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کے لئے ضروری ہیں کہ وہ وہی باتیں لکھیں جو اُن کے سامعین اور ناظرین کو پسند ہیں۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ہر تاریخ کی کتاب پڑھنے سے پہلے صرف مؤرخ ہی کے نہیں بلکہ اس کے ناظرین کے بھی حالات معلوم کرلو۔ تماشہ گر وہی تماشے دکھاتا ہے جو اس کے تماش بین پسند کرتے ہیں۔

چنانچہ رومی مورخوں کا دستور تھا کہ وہ معرکوں کا بیان اپنے سامعین کے ذوق کے مطابق کرتے تھے۔ اسی طرح یہ رومی مؤرخ اپنے سورماؤں کی زبان سے وہ تقریریں کراتے تھے۔ جو اُن کے سامعین کے ذوق کے مطابق

ہوتی تھیں۔ تقریروں کے سلسلے میں مشہور رومی مؤرخ طاقی توس صاف صاف کہتا ہے کہ "میں نے ہر مقرر کی زبان سے ان جذبات کا اظہار کرایا ہے جو حسب موقع تھے"۔ رومی مؤرخوں نے یہ طریقہ بھی یونانیوں سے سیکھا تھا۔ یونانی نقّاد اپنی تقریروں میں رشد و ہدایت سے بھی کام لیتے تھے تاکہ اپنے سامعین کے اخلاق دُرست کریں۔ شکست کھانے کے بعد وہ اپنے سورماؤں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ سورما صبر و استقلال کا نمونہ تھے۔

گو رومی مؤرخ بھی یونانیوں کی طرح اپنے ماخذوں کا ذکر نہ کرتے تھے لیکن رومی ناظرین باوجود اس خامی کے اپنے مورخوں کی تحریر کو صحیح مانتے تھے۔ چنانچہ سِس رو (جس کا صحیح تلفّظ قیق رو ہے) رومیوں کی نوشتہ تاریخوں کے متعلق کہتا ہے کہ یہ تاریخیں :۔

"شاہدِ وقت ہیں۔ نورِ حق ہیں۔ محافظِ حافظہ اور معلمِ زندگی ہیں"۔

یہ واضح رہے کہ یہ قیق رو خود بڑا لسّان تھا۔ اور لسانی کی خاطر دروغ گوئی کو بھی جائز سمجھتا تھا۔ چنانچہ دروغ گو مؤرخوں کے حق میں اس نے یہ فتوی دیا کہ (حوالہ نمبر ۴)

"نقّادوں کو اجازت ہے کہ وہ تاریخ نگاری میں بھی دروغ گوئی سے کام لیں"۔ قیق رو ایک نامی مؤرخ لوقیوس کا بڑا دوست تھا۔ چنانچہ اس لسّان نے اپنے دوست سے درخواست کی کہ "میری دوستی کی خاطر (میرے متعلق بیان میں) حق کو پس پشت ڈال دو" یعنی میری ثناخوانی کرو حقیقت یہ ہے کہ میرے سب سے بڑے دشمن بھی "لیڈر" رہے ہیں۔ اسی لئے میں ان کو گیدڑ کہتی ہوں۔ یہ بھی گیدڑوں کی طرح حق کی چیر پھاڑ

کرتے ہیں۔ اور اپنی مصلحت پرستی کو حق پرستی قرار دیتے ہیں۔

لیکن باوجود ان خامیوں کے میرے ان رومی پرستاروں نے مجھ پر ایک احسان بھی کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے میرے پیدا کردہ واقعات کو تاریخ وار روزنامچہ کی صورت میں لکھنا شروع کیا۔ میرے مسلمان پیروؤں نے غالباً اسی بنا پر میرا نام بھی "تاریخ" رکھ دیا۔ یہ طریقہ مجھے بہت پسند تھا کیونکہ اس میں تاویل بازی کی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ میرے مسلمان پیروؤں نے یہی طریقہ قائم رکھا۔

رومی مورخوں میں ایک خامی یہ تھی کہ یہ سب کے سب یا تو تنخواہ دار ملازم یا از قسم لیڈر ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ بڑے مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ لیکن رومیوں کی تہذیب پر یونانی رنگ چڑھ چکا تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے یونانی طرزِ تاریخ نگاری اختیار کیا جس کے ساتھ یونانی مورخوں کی خامیاں بھی ان کی تاریخ نگاری میں داخل ہو گئیں۔ لیکن ساتھ ہی رومی تاریخ نگاروں نے اپنی طرف سے اس فن میں اضافہ بھی کیا۔ جس کی ایک مثال ان کی روزنامچہ نما تاریخیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس قسم کی تاریخ نگاری میں علاوہ تاویل بازی کے لسانی اور لفاظی کی بھی گنجائش نہ تھی۔ چنانچہ قیق رو جیسا لسان اس قسم کی تاریخوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

قیق رو کا ہمعصر مشہور عالم جولی یوئس سیزر تھا۔ (اسی لفظ سیزر سے عربی لفظ "قیصر" مشتق ہے)۔ اس نے خود نوشتہ سرگذشت کا رواج شروع کیا۔ لیکن یہ سرگذشت بظاہر اس کی نوشتہ نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اس نے لفظ "مین" سے گریز کیا۔ بجائے "مین" کے وہ اپنا نام لکھتا ہے۔ مثلاً فتح فرانس کے سلسلے میں وہ لکھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۷)

"جب سیزر نے یہ دیکھا تو اس نے جنگی جہازوں کو حکم دیا کہ وہ..... دشمن کے غیر محفوظ بازو کی طرف اپنا اڈا جمائیں۔"

اس کی خود نوشتہ سرگذشت کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے بڑی انکساری سے کام لیا اور لسانی سے گریز کیا۔ گویا اس معاملے میں اس نے میری ہدایات پر عمل کیا کیونکہ مجھے بیجا خود ستائش پسند نہیں۔ میرے پرستاروں کو مناسب نہیں کہ وہ اپنی تعریف یا اپنے مربیوں کی تعریف کے پل باندھ دیں۔ اس لئے میں جولی یوس سیزر کو فرزند رشید سمجھتی ہوں۔ گو اس کی سرگذشت عوام میں مقبول نہ ہوئی۔

رومتہ الکبریٰ میں میرے بے شمار پرستار پیدا ہوئے۔ جن کا ذکر باعث طوالت ہوگا۔ اس لئے میں صرف رومی مؤرخوں کا ذکر کرتی ہوں۔ ان رومی تاریخ نگاروں نے خاص خاص واقعات کے متعلق علیحدہ رسالے لکھنے کا رواج بھی قائم کیا۔ جولی یوس سیزر کی "فتح فرانس" اس قسم کی تاریخ کی بہترین مثال ہے۔ اس رواج کو رومی مؤرخ سلوسط نے پروان چڑھایا۔ یہ رواج خاص رومی ایجاد تھا۔ جس سے میری وسیع النظری میں تو بیشک اضافہ ہوا لیکن خوشامد اور ستائش کے دروازے بھی کھل گئے۔ کیونکہ بھوکے مؤرخوں نے اپنے مالدار مربیوں کی خوشامد اسی رسالہ نویسی کی آڑ میں کی۔ اسی رسالہ نویسی سے سوانح نگاری کا دستور پیدا ہوا اور اب میری آنکھوں کے سامنے بجائے میرے سورماؤں کی پرستش ہونے لگی۔

اسی تقلید میں جولی یوس سیزر کے متبنیٰ اغسطس سیزر نے قلم اٹھائی اور اپنی سرگذشت کو اپنی تعریفوں سے بھر دیا۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو دیوتا ثابت کر دیا۔ اس کے جدامجد جولی یوس سیزر کے زمانے میں خوشامدی مورخوں نے کہنا شروع

کر دیا تھا کہ سیزر کا ہر قول و فعل بر حق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے جانشین اگسٹس نے بھی اپنی سرگزشت میں دعویٰ کیا۔ اب میں باقی دیگر مورخوں کا تذکرہ کرتی ہوں جنہوں نے رومیوں کے کارناموں پر خامہ فرسائی کی لیکن بجز پولی بیوس کے یہ سب کے سب رومی النسل تھے۔ ان میں سے مندرجہ ذیل رومی مورخ ممتاز تھے:۔

(۱) لِوی (۵۹ ق م تا ۱۷ء قبل مسیح) جس نے تاریخ روم ۱۴۲ جلدوں میں لکھی جو چالیس سال میں تکمیل کو پہنچی۔ ایسی ضخیم تاریخ پھر کبھی نہیں لکھی گئی۔ اس نے اپنے چند ماخذوں کا بھی ذکر کیا۔ اس کا طرزِ تحریر مبالغہ سے بری ہے لیکن وہ اپنے ماخذوں کی صداقت کو بلا ثبوت مان لیتا تھا۔ اس کے ہر لفظ سے وطن پرستی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے شہنشاہ اگسٹس کی بھی پرستش کرتا ہے۔ وطن پرستی کی تلقین کو وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس نے افسانوں کو بھی اپنی تاریخ میں جگہ دی کیونکہ اس کا مقصد رشد و ہدایت تھا۔

مورخ لِوی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے یونانی مورخوں کی طرح تاریخ کے کسی ایک ٹکڑے کو اپنا موضوع نہیں بنایا بلکہ اس نے رومیوں کی تاریخ ابتدا سے لے کر اپنے زمانے تک کی لکھی۔ اور واقعات کو مسلسل بیان کیا۔ گویا رومیوں کے لئے یہ تاریخ درحقیقت تاریخ عالم تھی کیونکہ رومیوں کا عقیدہ تھا کہ اصل دُنیا صرف رومی دُنیا ہے باقی سب ہیچ ہے۔ رومیوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ اُن کے مورثِ اعلیٰ دیوتا تھے لیکن لِوی نے رومیوں کو محض الشان قرار دیا۔

(۲) طاقی توس (۵۵ئہ تا ۱۱۷ء) رومیوں کا دوسرا ممتاز مؤرخ ہے جس نے اپنی تاریخ موسومہ "ہستوریائی" میں چھ رومی شہنشاہوں کے زمانے کے حالات لکھے۔ لیکن اس کی نظر صرف شہر روم تک ہی محدود رہی۔ اس کے خیال میں رومیوں کا اصل فرض حکومت کی تنظیم نہیں بلکہ فتوحات ہیں لیکن یہ درحقیقت نہ مؤرخ ہونے کا مستحق ہے اور نہ فلسفیٔ تاریخ ہونے کا۔ اس کی نظر اپنے دور میں ایسی پھنس گئی کہ وہ ماضی کو دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔

(۳) پلوٹارک (۴۶ئہ تا ۱۲۰ء) جس نے سوانح نگاری میں کمال پیدا کیا۔ اس کا طریقِ نگارش یہ تھا کہ وہ ایک یونانی اور ایک رومی ممتاز ہستی کو لیتا ہے۔ اور دونوں کا موازنہ کرتا ہے چنانچہ اس نے اپنی اس مجموعہ سوانح کا نام "متوازی سوانحات" رکھا۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق پلوٹارک فلسفے کا شیدا تھا۔ اور افلاطون کا پیرو تھا۔ اور ساتھ ہی اُمورِ مملکت میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ اپنی ہر بیان کردہ زندگی سے کوئی نہ کوئی اخلاقی اور عبرت آموز سبق پیش کرتا ہے اور غالباً سوانح نگاری سے پلوٹارک کا مقصد بھی یہی تھا۔ (حوالہ نمبر ۸)

رومی تاریخ نگاری کا ذکر ختم کرنے سے پیشتر مناسب ہے کہ ہم ایک دو اقتباس ان رومی مؤرخوں کی تاریخوں سے پیش کریں تاکہ ان کا طریقِ نگارش آپ پر روشن ہو جائے۔

اقتباس از ابتدائی تاریخ روم مصنفہ لوی

" روم کے ظہور سے پیشتر کے واقعات جو ہم تک پہنچے ہیں وہ

قدیم افسانوں کی صورت میں ہیں۔ تاریخی دستاویز کی صورت میں نہیں۔ یہ افسانے شاعری سے پُر ہونے کی صورت میں بڑے دلکش ہیں۔ میں ان افسانوں کی نہ تصدیق کروں گا اور نہ ان کو رد کروں گا کوئی وجہ نہیں کہ میں ان افسانوں پر اعتراض کروں جب کہ قدیم طریق کے مطابق ان افسانوں میں انسانی عنصر کے ساتھ ساتھ خدائی عنصر بھی شامل ہے۔ اس خدائی عنصر سے ماضی بڑا شاندار ہو جاتا ہے اگر کوئی قوم دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس کی ابتدا الوہیت سے ہوئی تو وہ صرف ہماری قوم ہے۔ رومی قوم نے اپنی لڑائیوں کے ذریعہ جو عظمت حاصل کی ہے وہ ایسی مسلم ہے کہ ان کا یہ دعویٰ کہ ان کی قوم کے بانی کا باپ مریخ ستارہ خود تھا۔ دیگر قوموں کو اسی طرح مان لینا چاہیے جس طرح وہ رومی حکومت کو تسلیم کرتے ہیں" (حوالہ نمبر۹)

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ لوی نے واقعات کے ساتھ افسانے بھی شامل کر دئیے لیکن ساتھ ہی یہ رومی مؤرخ محسوس کرتا ہے کہ اب اس کی قوم رُو بہ زوال ہے۔ اس کی وجہ بقول لوی یہ ہے کہ اب رومی سیدھی سادی زندگی کو چھوڑ کر نشۂ دولت میں مست ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس مؤرخ کو اب اپنی قوم کا زوال صاف نظر آ رہا ہے۔

(۲) اقتباس از تاریخ طاقی توس

طاقی توس نے اپنی تاریخ لوی کے پچاس سال بعد لکھی۔ اس مورخ کے زمانے میں روم کا دورِ جمہوریت بالکل ختم ہو چکا تھا اور مطلق العنانی قائم ہو چکی تھی لیکن دورِ جمہوریت کی آزادی کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب بھی موجزن

تھی۔ چنانچہ طاقی توس ایامِ رفتہ کا رونا روتا ہے اور اپنے زمانے کو دورِ غلامی کہتا ہے۔ لیکن دورِ جمہوریت کو واپس لانے کے لئے وہ کوئی تدبیر نہیں پیش کرتا۔ اس لئے اس کی تاریخ سبق آموز نہیں کہی جا سکتی۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے :۔ (حوالہ نمبر ۱۰)

"اس عرصے میں شہر روم کے باشندے غلامی میں غرق ہو گئے جن میں قونسل ممبرانِ سینٹ اور سردار بھی شامل تھے جس کا جتنا اونچا عہدہ ہوتا تھا اسی حساب سے وہ اظہارِ ریاکاری کرتا تھا۔ یہ لوگ اپنے چہرے سے نہ کسی شہنشاہ کی موت پر خوشی کا اظہار کرتے تھے اور نہ اس کے جانشین کی تخت نشینی پر اظہارِ غم کرتے تھے۔ بلکہ اپنی خوشامد میں خوشی اور غم دونوں کو شامل کرتے تھے۔"

رومیوں کی پیش کردہ صورتِ تاریخ دراصل یونانی تھی

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ تاریخ نگاری میں رومی مؤرخ یونانی مؤرخوں کے نقال تھے۔ جب یونانی رومیوں کے زیرِ نگیں ہو گئے تو یونانیوں نے اپنے رومی حکمرانوں کی خاطر تاریخ نگاری شروع کی۔ یہ رومی نما یونانی مؤرخ دراصل اپنے مورثِ اعلیٰ ہرودوتس کے مقلد رہے۔ اس لئے پہلے ہرودوتس کی تاریخ سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ ہرودوتس کا زمانہ زندگی پانچویں صدی قبل مسیح تھا۔ مندرجہ ذیل اقتباس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہرودوتس کے خیال میں مقصدِ تاریخ کیا تھا۔ یہ مورخ حسب دستور زمانہ لفظ "میں" نہیں استعمال کرتا بلکہ اپنے آپ کو اپنے نام سے پکارتا ہے۔

(۱) اقتباس از تاریخ ہیرودوتس

"یہ ہیرودوتس ساکن ہلی قارناسوس کی تحقیقات ہے جو اس کو اس لئے شائع کر رہا ہے کہ انسان کے کارنامے فراموش نہ ہو جائیں۔ اور ان انسانوں کی یادگار باقی رہے اور یونانی اور وحشیوں کے عجیب و غریب کارناموں کی شان و شوکت باقی رہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی تحریر میں آجائے کہ (یونانیوں اور وحشیوں کے درمیان جو تنازعہ تھا اس کے اسباب کیا تھے"۔ (حوالہ نمبر ۱۱)

ہیرودوتس کے زمانے میں یونانیوں کے سب سے بڑے دشمن ایران کے کسریٰ تھے جو برابر یونانیوں کی ریاستوں پر چڑھائی کرتے رہتے تھے ہیرودوتس کے زمانے میں یونانیوں کو اپنی تہذیب کے متعلق یہ مغالطہ تھا کہ کوئی قوم ان کی طرح مہذب نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ایرانیوں کو "وحشی" کہتے تھے لیکن اس کے باوجود ہیرودوتس ایرانیوں کی چند خوبیاں بھی بیان کرتا ہے۔

(۲) اقتباس از تاریخ پولی بیوس

یہ نامی مؤرخ پولی بیوس (۲۰۵ سنہ تا ۱۲۵ سنہ قبل مسیح) اگرچہ یونانی نسل کا تھا لیکن رومی تہذیب اختیار کر چکا تھا۔ اس نے بھی لوی کی طرح اپنی تاریخ میں تسلسل پیدا کر کے تاریخ کو ایک مسلسل کہانی بنا دیا۔ اس نے مطالعہ تاریخ کا ایک مقصد بھی معین کیا۔ وہ یہ تھا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ تاریخ کو پڑھ کر یہ ضروری نہیں کہ کوئی قوم گمراہ نہ ہو اور سابق اقوام کی غلطیوں کو نہ دہرائے۔ لیکن پولی بیوس کی نظر میں اصل مقصد تاریخ

یہ تھا کہ اس کو پڑھ کر افراد اپنے نفس کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ یہ مؤرخ قسمت کا بھی قائل تھا۔ اس کے بقول تاریخ کے مطالعہ سے کوئی قوم اپنی قسمت تو بدل نہیں سکتی البتہ قسمت کی فرستادہ مصیبتوں کو صبر و استقلال سے جھیل ضرور سکتی ہے۔

اس کی تاریخ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پولی بیوس مورخ کے لئے چند شرائط مقرر کرتا ہے جن کے بغیر اصل تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ وہ لکھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۱۲)

"میں کہتا ہوں کہ تاریخ پوری طرح نہیں لکھی جا سکتی جب تک اس کو اہل عمل لوگ نہ لکھیں یا مورخوں کو پوری طرح نہ معلوم ہو جائے کہ تاریخ نگاری کے لئے امورِ مملکت کا عملی تجربہ ضروری ہے۔۔۔۔ جب تک یہ نہ ہو گا تب تک مؤرخ تاریخ نگاری میں برابر غلطیاں کرتے رہیں گے"۔

یہ واضح رہے کہ پولی بیوس خود ماہرِ سیاست تھا۔ اسی لئے وہ وہ مؤرخ کے لئے یہ شرط مقرر کرتا ہے۔

(۳) اقتباس از تاریخ ہیروڈی ان

یہ رومی مورخ بھی پولی بیوس کی طرح اہل عمل تھا۔ اس نے اپنی تاریخ موسومہ "تاریخ مملکت روما" تیسری صدی عیسوی میں لکھی جس میں ۱۸۰ سنہ سے لے کر ۲۳۸ سنہ تک شہنشاہان روم کے حالات ہیں اس نے اپنے زمانے کے ان مورخوں پر نکتہ چینی کی جو محض اپنی شہرت کی خاطر تاریخ نگاری کرتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۱۳)

"بیشتر اہلِ قلم جنہوں نے تاریخ نگاری اپنا شیوہ بنایا ہے اور پرانے واقعات کو زندہ کیا ہے ان کی نیت یہ ہے کہ وہ عالم کا درجہ حاصل کریں۔ ان کو اندیشہ تھا کہ اگر وہ خاموش رہے تو وہ قعرِ گمنامی میں گر جائیں گے۔ ایسے اہلِ قلم کو پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کے بیان صداقت پر مبنی ہیں یا نہیں۔ صداقت کی بجائے وہ لفاظی اور عبارت آرائی سے کام نکالتے ہیں وہ جانتے ہیں باوجود عدم صداقت ان کی تاریخوں کو لوگ پڑھیں گے اور کوئی ان کی تحقیقات کے متعلق چھان بین نہ کرے گا۔"

تاریخ نگاری سوانح نگاری کی صورت میں

ہیروڈی ان کی تاریخ میں جو واقعات درج ہیں وہ ہر شہنشاہ کے عہد سے علیحدہ علیحدہ منسلک ہیں۔ گویا یہ تاریخ دراصل سولہ شہنشاہان روم کی سوانح حیات ہے۔ لیکن کہیں کہیں رومیوں کی عبادت اور عقیدوں کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ رومی خاص طور سے ایک دیوی کی پرستش کرتے تھے۔ جو "فائی بل" کہلاتی تھی۔ کیونکہ زمین کی زرخیزی اس دیوی کے سپرد تھی۔ اس دیوی کا ایک مجسّمہ بھی تھا۔ جس کے متعلق رومیوں کا عقیدہ تھا کہ وہ کسی انسان کا بنایا ہوا نہ تھا۔ بلکہ آسمان سے نمودار ہوا تھا۔ جس طریقہ سے ہیروڈین نے اس دیوی کا ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مؤرخ بھی ان لغو عقیدوں کا قائل تھا۔

سوانح نگاری کے سلسلے میں ایک اور رومی سوانح نگار کا ذکر ضروری ہے جس کا نام سُوٹونی یوس (دوسری عیسوی) تھا۔ اس نے جولیس سیزر سے لے کر اس کے گیارہ جانشینوں کے سوانح حیات لکھے۔ یہ سوانح نگار

پلوٹارک کا ہم عصر تھا۔ لیکن سُوٹونی یوس کی رسائی سرکاری کاغذات تک بھی تھی۔ کیونکہ وہ شہنشاہ ہیڈریان کا سیکریٹری بھی تھا۔ اس کی نوشتہ سوانح حیات متاخرین کے لئے نمونہ قرار پائی۔

رومیوں کے زوال کے بعد جو دور شروع ہوا وہ دور اعتقاد کہلاتا ہے۔ اس دور میں تاریخ کو جو صورت اختیار کرنی پڑی وہ بجائے خود ایک طویل کہانی ہے۔ جس کو مختصراً ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

دورِ اعتقاد یعنی قرونِ وسطیٰ میں تاریخ نگاری میں انقلاب

گو انسان ہمیشہ سے اعتقاد کا حامی رہا ہے لیکن جب تک متعدد دیوتاؤں کا راج رہا تب تک انسان کا اعتقاد اتنا سخت اور پکا نہ تھا جتنا کہ منظم اور نازل شدہ مذاہب کے بعد ہوا۔ جب خطۂ یونان سے فلسفہ اُٹھا تو انسانی عقل نے زور پکڑا اور عقیدے کا زور کسی قدر کم ہوا۔ میں صدیوں سے دیکھ رہی ہوں کہ عقیدہ اور عقل ایک دوسرے کے ضد ہیں۔ یہ دونوں یکجا نہیں ہو سکتے۔ آزاد رہ کر تو ہرگز یہ دونوں یکجا نہیں ہو سکتے۔ صرف ایک حالت میں ان کو ہم نشین کیا جا سکتا ہے یعنی یا تو عقل عقیدے کی لونڈی ہو جائے یا عقیدہ عقل کا غلام بن جائے۔

یونانی مفکروں کا خیال یہ تھا کہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ انسان بھی جس کی نقل و حرکت سے تاریخی واقعات پیدا ہوتے ہیں زمانے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ گویا فاعل اور افعال دونوں بدلتے ہیں لیکن رومی مورخوں کا نظریہ یہ تھا کہ انسان نہیں بدلتا صرف اس کی حرکات زمانے کے ساتھ بدلتی ہیں۔ اس نظرئے کے مطابق شہر رومتہ الکبریٰ اور اس کے ادارے مکمل صورت میں آسمان سے اُترے اور تا ابد یہ شہر قائم رہے گا۔

گویا شہر روم اچھا پیدا ہوا اور تا ابد اچھا ہی رہے گا۔ جس طرح اچھا انسان بُرا نہیں ہو سکتا اسی طرح اچھا شہر بھی بُرائی سے پاک رہتا ہے۔ چونکہ انسان دائم اور قائم ہے اس لئے انسان بذاتِ خود حدودِ تاریخ سے باہر ہے۔ البتہ اس کے اعمال تاریخ کے حدود میں ہیں۔ کیونکہ یہ اعمال بدلتے رہتے ہیں۔

گو حضرت عیسیٰ رومیوں کے زمانے میں پیدا ہوئے لیکن ان کا مذہب ایک عرصے تک پوشیدہ رہا۔ جب رومیوں کا زوال شروع ہوا تب مذہب عیسوی کھُلم کھلا نمودار ہوا اور اپنے حامیوں کے خیالات پر اثر انداز ہوا۔ جس سے تاریخ نگاری میں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہوا۔ انسانی فطرت کے متعلق رومی مورخوں کا جو خیال تھا کہ یہ فطرت بدل نہیں سکتی اس خیال کو عیسوی مذہب نے بدل دیا۔ از روئے مذہب ہر چیز خدا کی پیدا کردہ ہے اور اس لئے فانی ہے صرف خدا خود لافانی اور قدیم ہے۔ باقی تمام کائنات چونکہ حادث ہے قدیم نہیں ہے اس لئے یہ کل کائنات بھی فانی ہے۔ فانی چیز بدلتی بھی رہتی ہے کیونکہ فنا ہونے سے پہلے ہر چیز کا بدلنا لازمی ہے۔ انسان اور ہر حادث چیز کی شکل و صورت بوقت پیدائش کچھ اور ہوتی ہے۔ شباب کے وقت کچھ اور۔ موت کے وقت یہ شکل و صورت بالکل بدل جاتی ہے۔

اس تبدیلی میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ عقلمند آدمی کو بھی بڈھا ہو کر مرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ از روئے مذہب انسان بندہ عقل نہیں بلکہ محض بندہ خدا ہے۔ اس کی عقل اس کی موت کو روک نہیں سکتی۔ عقل صرف ایک حذنگ کارگر ہوتی ہے لیکن اس کے اعمال عقل پر نہیں بلکہ نفس پر مبنی ہوتے ہیں۔ جب خواہش پیدا ہوتی ہے تو انسان عقل سے مشورہ

نہیں کرتا بلکہ اپنی خواہش کے حکم پر چلتا ہے اور خواہش پر انسان کو کوئی قابو نہیں۔ اگر اس بندۂ خواہش سے کوئی نیک کام ہو جاتا ہے تو وہ نیک کام خدا کے اشارے سے ہوتا ہے۔ بظاہر تو افعال نیک کا فاعل انسان نظر آتا ہے۔ لیکن درحقیقت از روئے مذہب فاعل خدا ہے انسان نہیں۔

رومی مورخوں کا نظریہ تھا کہ انسان حادث نہیں بلکہ قدیم ہے لیکن مذہب عیسوی کے مطابق انسان اور کائنات دونوں قدیم نہیں بلکہ خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ رومی روحِ انسانی کو بھی قدیم مانتے تھے اور تناسخ کے قائل تھے یعنی جب کوئی انسان یا ذی روح چیز مرتی ہے تو اس کی روح کسی اور قالب میں منتقل ہو جاتی ہے لیکن مذہب عیسوی کے مطابق ہر جاندار کی روح نئی ہوتی ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق ہر نئی قوم کی بھی روح نئی ہوتی ہے۔

چونکہ خدا قادرِ مطلق ہے۔ اس لئے وہ انسان کی فطرت بھی بدل سکتا ہے اور اس تبدیلیٔ فطرت سے قوموں کی منزل مقصود بھی بدلتی رہتی ہے قوموں کے منزلِ مقصود کا تعین خدا بذریعہ الہام کرتا ہے۔ یہ الہام پیغمبروں کو ہوتا ہے لیکن خدا کی فطرت کو سمجھنا انسان کے بس میں نہیں حتیٰ کہ خدا اپنی فطرت کو بذریعہ الہام بھی نہیں بتاتا۔ الہام کے ذریعہ صرف قوموں کو اپنی منزلِ مقصود خدا بتاتا ہے اپنی فطرت کی نوعیت نہیں بتاتا صرف خدا کے افعال انسان دیکھ سکتا ہے۔ خدا کی فطرت کو وہ نہ دیکھ سکتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے اس نظرئے سے تاریخ نگاری پر تین اثرات رونما ہوئے۔

(۱) عیسائیت کی اس تعلیم سے تاریخ نگاری کا رُخ بدل گیا۔ عیسائی

مورخوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کی منزل مقصود کا تعین انسان نہیں بلکہ خدا کرتا ہے۔ بظاہر تو یہ تعین انسانی معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل یہ تعین خدا کے اشارے سے ہوتا ہے اسی لئے انسان اس منزل مقصود کو سمجھ تو سکتا ہے لیکن یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ اس نے یہ منزلِ مقصود اپنے لئے کیوں متعین کی۔ انسان یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ اس منزلِ مقصود پر پہنچ کر وہ کیا کرے گا آگے بڑھے گا یا وہیں مقیم ہو جائے گا۔ اس کا علم صرف خدا کو ہے۔ کیونکہ صرف وہ ہی اپنا مقصد جانتا ہے۔

اس عیسوی نظریہ کے مطابق انسان بالکل بے بس اور محض خدا کا آلۂ کار ہے لیکن چونکہ حضرت عیسیٰ خدا کے رحم و کرم کی تلقین کر چکے تھے اس لئے عیسائی مورخ اس بات کے قائل تھے کہ خدا جس راستے پر انسان کو چلاتا ہے اور اس کے لئے منزل مقصود کرتا ہے ہے اس میں خدا کو انسان کی بہتری مقصود ہوتی ہے۔ یہ "مصلحتِ خدا" ہے۔ اس نظریئے سے ایک فائدہ تو ضرور ہوا اور وہ یہ کہ انسان میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی کیونکہ اس کو یقین ہو گیا کہ خدا اس کے ساتھ ہے مگر ساتھ ہی انسان کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس دنیا کی کوئی چیز دائمی نہیں بلکہ فانی ہے۔ واقعات نے بھی اس عقیدے کو پختہ کر دیا۔ سینٹ اگسٹائن (۳۵۴ء تا ۴۳۰ء) نے جس نے روشۃ الکبریٰ کا خاتمہ بچشم خود دیکھا۔ اس نظریہ فنا کی بڑے زور و شور سے تلقین کی اور ساتھ ہی اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ روم کو فنا کرنے میں خدا کی مصلحت یہ تھی کہ اس کے دینِ برحق کی ترقی ہو۔ گویا خدا نے مذہب عیسوی کو بڑھانے کے لئے روم کو گھٹایا۔

(۲) عیسوی مذہب سے تاریخ نگاری ایک اور طرح بھی متاثر ہوئی۔

مورخوں کو معلوم ہو گیا کہ ہر چیز وقتی ہوتی ہے۔ دائمی نہیں ہوتی۔ اس لئے خدا ہر چیز کو نئی صورت میں پیدا کرتا ہے اور نئی چیز پرانی چیزوں کے اثرات سے بری ہوتی ہے اس سے عیسائی مورخوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ مذہب عیسوی نیا ہونے کی وجہ سے بت پرست رومیوں کے اثرات سے متاثر نہ ہوگا۔ بلکہ ایک نیا دَور قائم کرے گا۔ یہ نظریہ کس حد تک صحیح تھا۔ اس کی پول آگے چل کر دورِ جدید کے مورخوں نے کھولی۔ اور یہ ثابت کر دیا کہ جب تاریخ کا نیا دَور شروع ہوتا ہے تو پرانے اثرات بالکل زائل نہیں ہوتے۔ لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

(۳) عیسوی مذہب نے تاریخ نگاری میں ایک اور انقلاب یہ پیدا کیا کہ دُنیا کے تمام انسانوں کو خدا کا بندہ قرار دیا۔ بحیثیت بندہ ہونے کے تمام انسان خدا کی نظر میں یکساں ہیں۔ عیسوی مذہب سے پہلے یہودی مورخوں کا یہ خیال تھا کہ قوم یہود خُدا کی منتخب کردہ قوم ہے اور اس لئے خدا کی چہیتی ہے۔ عیسوی نظریئے کے مطابق تاریخ کے محیط میں تمام عالم آجاتا ہے اور تاریخ کے حدود قومیت سے بڑھ کر عالمگیر ہو جاتے ہیں۔ اور تاریخ نگاری کا مقصد یہ ہو جاتا ہے کہ وہ پوری دنیا کی ترقی کا خاکہ پیش کرے کیونکہ دُنیا کا ہر حصہ اور ہر قوم خدا کے حکم پر چلتی ہے۔

دورِ عیسوی میں تاریخ نگاری کی صورت

ان تین اثرات کی بنا پر میری حدود میں تو بے شک اضافہ ہوا لیکن ساتھ ہی میری اپنی مخصوص ہستی خاک میں مل گئی۔ اب مجھے چار صورتوں میں پیش کیا جانے لگا۔

(۱) عالمگیر شکل میں (۲) نوشتۂ تقدیر کی صورت میں۔ (۳) الہامی لباس میں (۴) جزوی صورت میں۔ یعنی میرے جسم کے ٹکڑے کر دئے گئے۔ اب میں

ذیل میں اپنی چاروں صورتیں پیش کرتی ہوں جو عیسائی مورخوں نے مجھے دیں۔

(۱) میری عالمگیر صورت

اس شکل میں پورا عالم میرے محیط میں آگیا۔ مجھے یہ بھی بتانا پڑا کہ حضرت انسان کس طرح اور کب نمودار ہوئے۔ بابا آدم کی اولاد میں کس طرح تفرقہ پیدا ہوا اور اس تفرقہ کی بنا پر انسان کس طرح قبیلوں میں منقسم ہوا۔ روزی کی تلاش میں یہ قبیلے کس طرح سے منتشر ہوئے۔ عالمگیر صورت میں تمام قوموں کا عروج وزوال بھی میرے حدود میں آگیا۔ رومیوں نے بھی دعویٰ کیا تھا کہ وہ دنیا پر حاوی ہیں لیکن ان کے مؤرخ صرف رومتہ الکبریٰ کو دنیا کا مرکز مانتے ہے گویا پوری دُنیا رومیوں کے تحت تھی۔ چنانچہ یونانی اور رومی مؤرخ غیر یونانیوں اور غیر رومیوں کو "وحشی" کہتے تھے۔ گویا تمام تہذیب و تمدن صرف ان دو قوموں کے لئے مخصوص تھا۔ اور خُدا صرف اُن کا تھا اوروں کا نہ تھا۔ عیسوی مورخوں نے رومیوں کے دعوئے مرکزیت کو رد کیا اور خدا کو مرکز ٹھہرایا۔

(۲) میری تقدیری صورت

اس شکل میں مجھے یہ تلقین کرنی پڑی کہ انسان کی کامیابی اور ناکامی کی وجہ انسان کی اپنی لیاقت اور حماقت نہیں بلکہ یہ کامیابیاں اور ناکامیاں دراصل خدا کی فرستادہ جزا اور سزا ہے گویا انسان نوشتۂ تقدیر کے تحت ہے تدبیر کوئی چیز نہیں۔ جو کامیابی بظاہر تدبیر سے حاصل ہوتی ہے وہ بھی نوشتۂ تقدیر میں پہلے سے موجود تھی۔

یہودی مؤرخ یہ ثابت کر چکے تھے کہ یہودی قوم کا نوشتۂ تقدیر اور قوموں کے نوشتے سے افضل ہے کیونکہ یہودی خدا کے مقبول بندے ہیں۔ لیکن عیسائی مورخوں نے یہ ثابت کیا کہ نوشتۂ تقدیر ایک ڈرامہ ہے جس کا مصنف خدا خود ہے۔ اس ڈرامہ کے اداکار (ایکٹر) مختلف قومیں ہیں جو اسٹیج پر آکر اپنا کھیل دکھاتی ہیں۔ لیکن بقول عیسائی مورخین ان اداکاروں میں کوئی اداکار خدا کا منہ لگا ہوا نہیں ہے۔

(۳) میری الہامی صورت

اس شکل میں مجھے یہ تلقین کرنی پڑی کہ خدا نے دنیا کی تخلیق صرف ایک ہستی کی خاطر کی۔ وہ ہستی عیسیٰؑ تھی۔ چنانچہ بقول عیسائی مورخین میں نے جو تانا بنا اسی ہستی کے ارد گرد تھا۔ گویا اگر عیسیٰؑ نہ پیدا ہوتے تو میرا ظہور بھی نہ ہوتا۔ عیسےٰ سے پہلے جو واقعات میں پیدا کر چکی ہوں وہ محض اس لئے تھے کہ دنیا عیسیٰ کے استقبال کے لئے تیار ہو جائے۔ یہی نظریہ بعد کو مسلمان مؤرخین کا بھی تھا۔ ان کا بھی دعویٰ تھا کہ نور محمدی تخلیق آدم سے پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ اس کا تذکرہ آگے چل کر میں مسلمان مؤرخین سے متعلق باب میں کروں گی۔ اس عیسائی نظریے نے میرے ٹکڑے کر دئیے۔ گویا میرے دو علیحدہ "عہد" قائم کر دئیے گئے۔ یعنی اول وہ عہد جو آمد عیسیٰ سے پہلے تھا جس میں انسان بت پرستی کا شکار تھا۔ دوم وہ عہد جو عیسیٰ نے اپنی تعلیمات سے قائم کیا۔

(۴) میری جزوی صورت

بقول اقبال خدا نے تو صرف ایک عالم پیدا کیا تھا جس کی کہانی

بھی ایک ہونی چاہیئے تھی۔ چنانچہ خدا شاکی ہے کہ :۔

جہاں را از یک آب و گِل آفریدم
تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی!
من از خاک پولاد ناب آفریدم
تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طائرِ نغمہ زن را (اقبال)

(خدا کہتا ہے کہ میں نے کُل جہان کو ایک مٹّی اور پانی سے پیدا کیا لیکن تو نے میرے ایک عالم کو ایران۔ تاتار اور حبش میں منقسم کر دیا۔ میں نے خاک سے فولاد تیرے فائدے کے لئے پیدا کیا لیکن تو نے اس فولاد سے تلوار۔ تیر اور بندوق بنائی۔ تو نے میرے پیدا کردہ چمن کو کاٹنے کے لئے تبر بنائی اور میرے طائرِ نغمہ زن کو قفس میں گرفتار کر دیا)۔

یہ طائرِ نغمہ زن میں ہوں۔ اگر عہدوں میں میرے ٹکڑے نہ کئے جاتے تو میں اپنے نغموں سے سارے عالم کو محظوظ کرتی لیکن جب جسم کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں تو طائرِ روح پرواز کر جاتا ہے اور محض بے جان لاش رہ جاتی ہے۔

عیسائی مورخوں نے اپنے عقیدے کی بنا پر میرے دو ٹکڑے کئے۔ میرا جو عہد قبل از عیسیٰ تھا اس کو "عہدِ جاہلیت" قرار دیا اور جہالت کی بنا پر اس عہد کو ناقابلِ مطالعہ ٹھہرایا۔ میرے دوسرے عہد کو "عہدِ روشن" قرار دیا۔ اور اس عہد کی "روشنی" میں عیسیٰ کو خدا کا درجہ دیا۔ مسلمانوں نے بھی عیسائیوں کی طرح مجھے دو عہدوں میں منقسم کیا۔ اور عہد قبل از اسلام کو "جاہلیہ" کا لقب دیا لیکن انہوں نے یہ کرم کیا کہ اپنے نبی کو خدا کا درجہ نہیں دیا۔

عیسائی مورخوں کی یہ تقسیم بالآخر بیکار ثابت ہوئی کیونکہ اس قسم کی تقسیم محض خیالی ہوتی ہے۔ اصلی نہیں ہوتی۔ آگے چل کر انہیں عیسائیوں نے اس مصنوعی تقسیم کو رد کر کے میری کہانی کا تسلسل قائم کیا اور اس تسلسل کی بدولت مجھے عالمگیر صورت پھر حاصل ہوئی۔ یہ تسلسل دورِ جدید کے مؤرخوں نے اس بنا پر قائم کیا کہ ہر واقعہ دوسرے واقعہ کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اگر آدمؑ اور حواؑ جنّت سے نکالے نہ جاتے اور تلاشِ روزی کے لئے مجبور نہ کیے جاتے تو یہ دُنیا سُنسان رہتی اور میری خامہ فرسائی کے لئے کوئی واقعہ نمودار نہ ہوتا۔ میرا کاغذ کورا ہی رہتا۔

تاریخ کی عہدوں میں تقسیم اور اس کی خرابیاں

مجھے عہدوں میں تقسیم دراصل میرے محرّروں نے محض اپنی آسانی کے لئے کیا۔ لیکن یہ تقسیم سراسر مصنوعی ہے۔ اس تقسیم سے محسوس ہوتا ہے کہ گویا خدا کی خلّاقی میں کوئی تسلسل نہیں۔ یعنی ایک عہد کے خاتمے پر خدا معطّل ہو جاتا ہے۔ اور انسان نئے سرے سے دوبارہ پیدا ہوتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ آدمؑ و حوّاؑ کے اخراجِ جنّت کی سزا انسان ابھی تک بُھگت رہا ہے۔ اہلِ عقیدہ کے اپنے خود عقیدوں کے مطابق اگر نورِ عیسیٰؑ یا نورِ محمدیؐ شروعِ زمانہ کائنات میں نمودار نہ ہوتا تو اس نور سے دُنیا محروم رہتی اور آج بھی یہ عالم تاریک ہوتا۔ اگر عہدِ قدیم کے لوگ مجھے اپنے قلب میں جگہ نہ دیتے تو میرا وجود ہی نہ ہوتا۔ اگر قدیم ایران کے کسریٰ یونان پر چڑھائیاں نہ کرتے تو مشرق و مغرب کی علیحدہ علیحدہ ہستی قائم نہ ہوتی۔ اگر اٹھارھویں صدی کے یوروپین سرمایہ دار اپنے مزدوروں پر ظلم نہ کرتے تو اشتراکیت نہ پیدا ہوتی اور بقول اقبال "خدا کی بستی دکان"

نہ بنتی۔"

مجھے ان مصنوعی قفس عہد میں اس لئے بند کیا گیا کہ ان آسانی پسند مؤرخوں نے یہ فرض کر لیا کہ واقعات کے نتائج دُور رس نہیں ہوتے۔ لیکن کوئی ان مورخوں سے پوچھے کہ کیا عہدِ جدید میں عثمانی ترکوں کے کارنامے کسی کے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اگر "عہدِ وسطیٰ" میں خروج اسلام سے آدمی بے خبر ہو۔

میں دراصل ایک زنجیر ہوں جس کی پہلی اور آخری کڑی کا کسی کو علم نہیں۔ بقول شاعر ؎

سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
(شادؔ عظیم آبادی)

میری داستان ہمیشہ درمیانی کڑی سے شروع ہوتی ہے درمیان ہی میں ختم بھی ہو جاتی ہے۔ درمیان میں بھی بہت سی کڑیاں ایسی ہیں جواب تک انسان کے ہاتھ میں نہیں آئی ہیں۔ کیونکہ مجھ کو کئی مرتبہ بادشاہوں کے ڈر سے پوشیدہ ہونا پڑا ہے۔ عیسائیوں کے عہد میں پادریوں کا خوف لوگوں کے دلوں میں ایسا طاری تھا کہ آزاد خیال لوگ اپنی زبان بند رکھتے تھے۔ اس لئے میرے مصنوعی "عہدوں" کی کہانی بھی نامکمل ہے۔

جن اہلِ عقیدہ نے مجھ کو "تاریک" اور "روشن" عہدوں میں منقسم کیا۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ تاریکی کی للکار سے ہی روشنی نمودار ہوتی ہے، شر کی للکار سے خیر جاگتا ہے۔ اور شر کا مقابلہ کرتا ہے۔ میں ان عقیدت مند مؤرخوں سے چند سوال کرتی ہوں:۔

(۱) ہزاروں برس سے بتوں کا راج تھا اور یہ بُت برابر خدائے حقیقی

کی للکار للکار کر مذمت کرتے تھے۔ کیا عیسٰی کے نمودار ہونے کا باعث یہ للکار نہ تھی؟ گویا عیسٰی کی آمد کا سبب عہدِ قدیم کی بُت پرستی تھی۔ اس طرح سبب عہدِ قدیم میں پیدا ہوا اور نتیجہ عہدِ عیسوی میں نکلا۔

(۲) میں مسلمانوں سے بھی ایک سوال کرتی ہوں۔ کیا ابوجہل کے ہم مشرب سینکڑوں برس سے عرب ذہنیت پر مسلّط نہ تھے۔ کیا بانئِ اسلام کے آنے کا سبب اسی "عہدِ جاہلیہ" میں قائم نہیں ہوا اس لئے مسلمانوں نے مجھ کو جو دو عہدوں یعنی عہد جاہلیہ اور عہد اسلام میں منقسم کیا یہ تقسیم سراسر مصنوعی تھی۔ اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ عہدِ جاہلیہ کی مذمّت کے باوجود بنی اُمیوں کے عہد میں پھر عربوں نے اس عہدِ جاہلیہ کو اپنایا۔ امیر معاویہؓ کا درباری شاعر اخطل نامی تھا۔ یہ شاعر عیسائی تھا مگر ساتھ ہی ٹھیٹھ عرب بھی تھا۔ وہ اپنی غزلوں میں اس مذموم عہد جاہلیہ کی ثنا خوانی کرتا تھا۔

ان وجوہات کی بنا پر میں دعویٰ کر سکتی ہوں کہ باوجود اس مصنوعی تقسیم کے میری روح باقی رہی۔ صرف میرے جسم کے ٹکڑے کئے گئے لیکن میرے ٹکڑوں کا جو لوگ علیحدہ علیحدہ مطالعہ کرتے ہیں وہ میری روح کو محسوس نہیں کر سکتے۔

عیسائی مؤرخوں نے عہدِ قبل از مسیحؑ کو بھی اپنی تاریخوں میں شامل کیا لیکن ان کی نیت یہ نہ تھی کہ تاریخ میں تسلسل پیدا کریں بلکہ وہ یہ ثابت کریں کہ عیسٰی کی آمد سے پہلے جو واقعات ظہور میں آئے ان واقعات کا مقصد یہ تھا کہ دُنیا کو ظہورِ عیسٰی کے لئے تیار کریں۔ ان عقیدت مند عیسائی مؤرخوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ یہودی مذہب۔ یونانی فلسفہ اور رومی قوانین بھی ظہورِ عیسٰی کے منتظر تھے۔ یا یوں کہئے کہ میں بھی عیسٰی کی آمد

کی منتظر تھی۔

بے شک میں بڑے ذوق و شوق سے اپنے صحیفے میں ایسے واقعات درج کرتی ہوں جن کے اثرات سے میرا رُخ بدل جاتا ہے۔ نئے مذہب کا ظہور میری نظر میں بھی اہمیت رکھتا ہے لیکن میں کسی مذہب کے برحق یا باطل ہونے کا فیصلہ نہیں کرتی۔ میں مذاہب کے ظہور کو اپنے صحیفے میں درج محض اس لئے کرتی ہوں کہ اس سے دُور رس نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ بقول میرے نامی محرّر گبن رومتہ الکبریٰ کا تختہ اسی مذہبِ عیسوی نے اُلٹا اور روم کی بربادی کے بعد عیسائی مذہب کے قدم جم گئے۔ لیکن اس مذہب کے حامیوں نے توحید کو تثلیث میں بدل دیا۔ اس لئے یہ بتانا بھی میرا فرض ہے کہ جب مسلمان خالص توحید کو لے کر نمودار ہوئے تو روم کا خاتمہ تو ہو چکا تھا لیکن بازنطینی روم کے وارث بن چکے تھے اور اب یہ بازنطینی تثلیث کے حامی تھے۔ چنانچہ انہیں بازنطینی حامیانِ تثلیث کو پرستارانِ توحید کا مقابلہ کرنا پڑا۔

(حوالہ نمبر ۱۴) دورانِ بازنطینی حکومت میں پادریوں کے ہاتھ پڑ گئی کیونکہ تاریخ نگاری اب کارِ ثواب سمجھی جاتی تھی۔ ایک راہب پادری جان زنوراس نامی نے اپنی تاریخ کے دیباچہ میں لکھا "کہ میرے احباب کا اصرار ہے کہ میں اوقاتِ فرصت میں عوام کے مفاد کے لئے ایک کتاب لکھوں تاکہ خدا کی طرف سے مجھے اجر ملے" ان بازنطینی پادریوں نے عیسائی اولیا کی سوانح عمری بھی لکھی جو بیشتر راہب ہوتے تھے۔ اولیاء کی سوانح حیات ایک نئی چیز تھی۔ اب تک میرے محرّر صرف حکمرانوں اور افرانِ حکومت کے سوانح حیات لکھتے تھے۔ لیکن اب اولیاء بھی میرے حدود میں

آ گئے۔

قرونِ وسطیٰ کی تاریخ نگاری کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ جو راستہ میں اختیار کرتی ہوں وہ میرا پسندیدہ نہیں بلکہ خدائے لایزال کا مقرر کردہ ہے اور اسی مقرر کردہ راستے پر مجھے چلنا پڑتا ہے۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں سبب سے فلاں نتیجے برآمد ہوئے لیکن یہ اسباب بھی مسبب الاسباب پیدا کرتا ہے۔ اس لئے تلاشِ اسباب بے معنی ہے۔ ہر واقعہ کا سبب صرف خدا ہے۔ عیسائی مورخوں کا نظریہ یہی تھا۔

میرے ٹکڑے کرنے کا دستور جو قرون وسطیٰ میں قائم ہوا تھا وہ ختم نہیں ہوا۔ بلکہ نام نہاد "دورِ جدید" میں یہ دستور اور بڑھا۔ عیسائیوں نے تو میرے صرف دو ٹکڑے کئے تھے یعنی "عہدِ تاریک" اور "عہدِ روشن" لیکن دورِ جدید کے مورخوں نے تو ان ٹکڑوں کے بھی ٹکڑے کر ڈالے عہدِ تاریک کے بھی دو ٹکڑے کئے یعنی "عہد قبل از تاریخ" اور "عہدِ تاریخی" اسی طرح عہد روشن کو بھی مختلف ادوار میں منقسم کیا لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں۔ اب میں ان مقاصد کا ذکر کرتی ہوں جو انسان نے میرے لئے مقرر کئے۔

مقصدِ تاریخ

میرا اصل مدّعا تو محض واقعہ نگاری تھا لیکن کم بخت ہومر کے زمانے ہی سے میں شاعروں کے ہاتھ پڑ گئی تھی۔ شاعروں کی ہرزہ سرائی کبھی بے مطلب نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہومر کے مقلدوں نے مجھے بھی خوشامدی بنا دیا۔ غضب یہ کیا کہ میرے متعلق انہوں نے لکھا کہ :- (حوالہ نمبر ۱۵)

وہ تاریخ کی دیوی کے اشارے سے مراثیوں نے انسانی کارناموں

کے گانے گائے "۔

لیکن مراثیوں نے جو رزم نامے لکھے ان کا مقصد دراصل عوام میں مقبولیت حاصل کرنا تھا۔ اپنی مقبولیت کی خاطر گویا مجھے بدنام کیا اور یہ رزم نامے گلی کوچوں میں گائے جانے لگے اور میری صداقت پسندی خاک میں مل گئی۔ ان گانوں سے انسان کو مغالطہ پیدا ہوا کہ وہ "اشرف المخلوقات" بھی ہے۔ (حوالہ نمبر ۱۶)

خدا بھلا کرے چارلس ڈارون کا جس نے ۱۸۵۷ء میں یعنی ڈھائی ہزار سال بعد اس مغالطے کو رفع کرنا چاہا اور اپنے اٹل دلائل سے ثابت کر دیا کہ انسان وہی ہے جو کیڑے مکوڑوں کی صورت میں نمودار ہوا۔ لیکن ان دلائل سے انسان کا یہ مغالطہ بجائے رفع ہونے کے اور بڑھا۔

رزم نامے یہ مغالطہ اس طرح پائیدار کر گئے تھے کہ ان کا دُور کرنا آسان نہ تھا۔ انسان جوں جوں ترقی کرتا گیا یہ مغالطہ اسی حساب سے پائیدار ہوتا گیا۔ اب گویا مجھے "ترقی پسند" بنا دیا لیکن اصلیت یہ ہے کہ میں نے بچشم خود ترقی کے پہلو بہ پہلو بربادی اور تنزل کے مشاہدے بھی کئے ہیں۔ یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ میری آنکھیں صرف ترقی کو دیکھتی ہیں یا دُنیا تنزل سے بالکل ناآشنا ہے۔ میرے یونانی پرستاروں میں بعض تو اس حد تک قنوطیت پسند تھے کہ ان کو بجز زوال کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ میری آنکھوں نے دیکھا اس کی بنا پر میں کہہ سکتی ہوں کہ ؎

عجب سرا ہے یہ دُنیا کہ جس میں شام و سحر
کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

میرے بعض یونانی پرستار کوچ سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ "مقام" ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اسباب کوچ پر صفحے کے صفحے رنگ ڈالے۔ اس خامہ فرسائی کا مقصد کیا تھا؟ اس سوال کے جواب میں ان قنوطیت پسند لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ قوموں کے مرض الموت کی تشخیص کرنا چاہتے ہیں۔ گویا ان پرستاروں نے مجھے طبیب کا بھی درجہ دے دیا جس کی میں اہل نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ تشخیص بعد الموت سے کیا حاصل؟ بقول شاعر "یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد"

میرے پرستار اس اعتراض کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دوا مردوں کے لئے نہیں بلکہ زندوں کے لئے تجویز کی جاتی ہے تاکہ زندہ اس مرض سے خبردار ہو جائیں اور عبرت حاصل کر کے اس مرض کا شکار نہ بنیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی قوم مرض الموت میں گرفتار ہو جاتی ہے تو اس کا احساسِ درد مفقود ہو جاتا ہے۔ ابھی حال میں انگریزی سامراج اسی مرض کا شکار ہوا۔ حالانکہ اسی قوم نے سب سے پہلے اسباب زوال کی تحقیق شروع کی اور ایڈورڈ گبن نے چھ جلدیں زوال روم‌ۃ الکبریٰ پر لکھ ماریں لیکن اس کی قوم اس کتاب سے کوئی عبرت نہ حاصل کر سکی۔

الغرض میرے باریک بین پرستاروں نے عبرت آموزی بھی میرا شعار بنا دیا۔ گویا طبیب کے فرائض کے ساتھ رشد و ہدایت کا کام بھی میرے سپرد کیا۔ توسی دائیڈیس نے رشد و ہدایت کا یہ فریضہ اس لئے مجھے سونپا کہ "گذشتہ واقعات کا صحیح علم بڑا کارآمد ہے۔ کیونکہ آئندہ کے واقعات بھی غالباً اسی نوعیت کے ہوں گے"۔ (حوالہ نمبر ۱) گویا ہر دفعہ ایک ہی مرض قوموں کو لاحق ہو گا۔ لیکن توسی دائیڈیس کو یہ خیال نہ آیا کہ ہر سرزمین کی

آب وہوا مختلف ہوتی ہے اور آب وہوا کے مطابق ہی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ جو آب وہوا ایک قوم کے لئے اکسیر ہوتی ہے۔ دوسری قوم کے لئے وہی آب وہوا زہر کا کام کرتی ہے۔ بقول ایک شاعر:۔

درحق او نیک و درحق تو بد

درحق او خوب درحق تو رد

درحق او مدح و درحق تو ذم

درحق او شہد درحق تو سم (مولانا روم)

علاوہ بریں میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ افراد کی طرح قوموں کے امراض بھی بے شمار ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر قوم ایک ہی مرض کا شکار ہو۔ تبدیلیٔ زمانے کے ساتھ نئے امراض بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ میری جیب میں جو امراض کی تھیلی ہے اس کے امراض کو گننا انسان کے بس کی بات نہیں۔ قوموں کو مارنے کے لئے میں ایک ہی قسم کے جراثیم استعمال نہیں کرتی۔ اس لئے لوگوں کا کہنا غلط ہے کہ ہر دفعہ میں ایک ہی قسم کا وار کرتی ہوں۔ میرے گذشتہ واروں سے آئندہ وار کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ لیکن یہ بے بنیاد مفروضہ میرے یونانی پرستاروں نے اس طرح پیش کیا کہ سادہ لوح لوگ اس کے حامی ہو گئے اور آج تک اس مفروضے کے جال میں گرفتار ہیں۔ ان کے خیال کے بموجب میں محض ایک پہیہ ہوں جو ہر وقت گردش میں رہتا ہے۔ گویا اس مفروضہ کی بنا پر میں اپنے اپنے اعمال کو دہراتی ہوں اور کوئی نئی بات یا عمل نہیں پیدا کر سکتی۔

مندرجہ بالا دلائل میں نے محض اپنی صفائی کے لئے پیش کئے ہیں۔ لوگ اس قسم کی بحث کو فلسفہ کا درجہ دیتے ہیں حالانکہ درحقیقت میں فلسفے

سے مبرّا ہوں۔ میرا تعلق تو صرف واقعات سے ہے۔ مگر یہ بحث بڑی طویل ہے۔ اس بحث کو میں فی الحال آئندہ کے لئے ملتوی کرتی ہوں۔

بغیر میرے مشورہ کے انسان نے میرے لئے مقاصدِ حیات بھی مقرّر کر دئے۔ لیکن یہ مقاصد بھی زمانے کے ساتھ تبدیل ہوتے رہے۔ دراصل یہ مقاصد میری حیات سے متعلق نہ تھے۔ بلکہ ان مقاصد قائم کرنے والوں کے اپنے مقاصد کے مطابق تھے۔ مثلاً جنگجو قبیلوں کا مقصد صرف لڑائی تھا اس لئے ان لڑائیوں کو قلم بند کرنا میرا مقصد قرار دیا گیا۔ یونانی حُسن و جمال کے شیدا تھے اس لئے ان لوگوں نے حُسن نگاری میرا مقصد مقرر کیا۔ خطّہ یونان میں بڑی حسین عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ بڑے خوبصورت مندر تعمیر ہوئے جن میں حسین دیویاں رکھی گئیں۔ اور مجھے حکم ملا کہ ان دیویوں کے افسانے قلم بند کروں۔ چنانچہ میں یونان میں سب سے پہلے راگ مالا نویس کی صورت میں نمودار ہوئی۔ جب اس خطّہ میں سقراط۔ افلاطون اور ارسطو جیسے مفکر پیدا ہوئے تو "خیال نویسی" میرا مقصد مقرر کیا گیا۔ یعنی بزم میرے سپُرد ہوئی۔

جب رومیوں کا دور آیا اور انہوں نے شمشیر زنی شروع کی تو جنگوں کا حال لکھنا میرے سپُرد ہوا۔ گویا اب میرا مقصدِ حیات رزمیہ ہو گیا۔ جب عیسائیت کا رواج ہوا تو عقائد نویسی میرے سپرد کی گئی۔ پادری میرے محرّر بن گئے جنہوں نے تاریخ کو معجزوں سے بھر دیا۔ دراصل یہ عقائد نویسی یہودی عیسیٰؑ سے بہت پہلے میرے سپُرد کر چکے تھے۔ عیسائی محض یہودیوں کے نقشِ قدم پہ چلے۔ جب مسلمان میدان میں آئے تو انہوں نے غزوات نویسی میرے سپرد کی۔ یہ سب قرونِ وسطیٰ کی باتیں ہیں جب ہر طرف مذہب ہی نظر آتا تھا۔ چونکہ میں نے اپنے مسلمان محرّروں

کے لئے ایک علیحدہ باب مخصوص کیا ہے اس لئے میں یہاں صرف ان مقاصد کا ذکر کرتی ہوں جو یورپ والوں نے میرے لئے مقرر کیے۔

یورپ تقریباً ایک ہزار سال اعتقاد کی پرستش میں گرفتار رہا اور میں اعتقاد نویسی کرتی رہی۔ جب یورپ میں دورِ عقل شروع ہوا تو مجھے واقعات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنا پڑا۔ دورِ اعتقاد میں میرا دستور یہ تھا کہ میں ہر واقعہ کا سبب حکمِ ربی بتاتی تھی۔ یہ کام نہایت آسان تھا اور بغیر دلائل اس فیصلہ کو لوگ مان لیتے تھے۔ گو مجھے دورِ اعتقاد میں اخلاق کے سبق بھی دینے پڑتے تھے لیکن پھر بھی میرا کام آسان تھا کیونکہ اس دور میں میرا محیط بہت محدود تھا۔ صرف بادشاہوں کے کارنامے مجھے بیان کرنا پڑتے تھے۔ میں ان کی کامیابی کو رحمتِ خدا سے منسوب کرتی تھی جس سے بادشاہ بہت خوش ہوتے تھے اور میرے محرّروں کو انعام واکرام دیتے تھے۔

مگر جب عقل کا راج شروع ہوا تو معجزوں اور کشف وکرامت کی جگہ ٹھوس واقعات نے لی۔ یعنی ایسے واقعات جن کو عقلِ سلیم تسلیم کرلے اور انسانی تجربے سے باہر نہ ہوں۔ اس کے علاوہ مؤرخ ان واقعات کو اپنی طرف سے بغیر مرچ مسالہ لگائے ہوئے بیان کرے اور زیبِ داستاں کی خاطر اس میں کوئی اضافہ نہ کرے۔ حتیٰ کہ ان واقعات سے مؤرخ کوئی نتیجہ بھی نہ نکالے۔ واقعات کے سچّے ہونے کی کسوٹی یہ مقرر کی گئی کہ دشمن اور دوست دونوں بیان کردہ واقعات کو صحیح مانیں۔ گویا واقعات پر تصرف کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ نتیجہ نکالنے میں مورخ کو اجازت ہے کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق جو چاہے نتیجہ نکالے۔ لیکن نتیجہ نکالنے کی

خاطر واقعات پر تصرف نہ کرے۔ اس لئے ایک زمانہ اُنیسویں صدی میں ایسا آیا جب مؤرخوں نے واقعات سے نتیجے نکالنے بند کر دئے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب میں فلسفے کی بیڑیوں سے آزاد ہوئی لیکن یہ آزادی چند روزہ تھی۔ ایسی تاریخ جس میں صرف ٹھوس واقعات ہوں اور زیبِ داستاں سے بالکل مبّرا ہو مقبول نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اسی اُنیسویں صدی کے آخر میں ایک تحریک اٹھی جس کی رُو سے واقعات میں مروج مسالہ لگانے کا دستور واپس ہی نہیں آیا۔ بلکہ اپنے ساتھ یہ دستور ان چیزوں کو بھی لایا جو اب تک حدودِ تاریخ سے بالکل باہر تھیں کیونکہ اب تاریخ کا موضوع ایسا وسیع ہو گیا کہ اس میں پوری انسانی زندگی داخل ہو گئی۔ حتیٰ کہ گویوں کے گانے اور فلم اسٹاروں کی طلاقیں بھی جزوِ تاریخ بن گئیں۔ کیا انگلستان کی بادشاہت کا تختہ ایک مطلوقہ عورت مسز سمپسن نے نہیں اُلٹا اور بادشاہ ایڈورڈ ہشتم کو تخت سے دست بردار نہیں ہونا پڑا۔

جب پورا انسانی تمدّن میرے حدودِ بیان میں آگیا تو میں سخت مشکل میں پڑ گئی۔ دورِ حاضر کے تو ہر تمدّنی پہلو میرے محرّرِ بیان کر سکتے ہیں کیونکہ ہر چیز ان کے سامنے موجود ہے لیکن زمانۂ ماضی کے سامانِ تمدّن بیشتر مفقود ہو چکے ہیں فراعنۂ مصر کے علاوہ کسی اور بادشاہ نے یہ زحمت گوارا نہ کی کہ اپنی قبر میں اپنے زمانے کے جملہ سامانِ تمدّن یکجا کر دیتے۔ فراعنۂ مصر کی قبریں دراصل قبریں نہیں بلکہ عجائب گھر ہیں جہاں اس زمانے کی ہر چیز موجود ہے۔ فرعون کی بیویوں کی قبروں میں اس زمانے کا رائج غازہ (پاؤڈر) بھی پایا جاتا ہے جو عورتیں اپنا حُسن

بڑھانے کے لئے آج بھی استعمال کرتی ہیں۔

ان فراعنہ مصر نے جو میرے مطالعہ کا سامان بہم پہنچایا اس کا ذکر میں آگے چل کر ایک مخصوص باب بعنوان "میرا ساز و سامان" کے تحت کروں گی اور ساتھ ہی یہ بھی بتاؤں گی کہ حضرت انسان رشک و حسد کے اس درجہ شکار ہیں کہ ایک قوم کا بہم کردہ ساز و سامان دوسری قوم برباد کر دیتی ہے۔

میں نے اپنی ولادت کا حال سُنا دیا کہ کس طرح میں قلبِ انسانی میں پیدا ہوئی۔ ولادت کے بعد میں نے ان صورتوں کا ذکر کیا جو مجھے مختلف زمانوں میں اختیار کرنا پڑیں۔ یونانیوں نے مجھے کیا صورت دی۔ یونانیوں کے بعد رومیوں نے مجھے جنگی لباس پہنا کر مجھے کیا صورت دی۔ رومیوں سے بہت پہلے ایرانی کسریٰ مجھے درباری لباس پہنا چکے تھے۔ جس کا ذکر باب بعنوان "مسلمانوں کے عہد میں میری مختلف صورتیں" کے تحت میں کروں گی۔ لیکن جب میں نقل مکان کرتی تھی تو میں "جیسا دیس ویسا بھیس" کے مقولے پر عمل کرتی تھی۔

اپنی مختلف صورتوں کے ذکر کے بعد میں نے ان مقاصد کا بھی ذکر کیا ہے جو انسان نے بغیر میرے مشورے کے میری زندگی کے لئے مقرر کئے۔ میں تو صرف ایک کورا کاغذ لے کر پیدا ہوئی تھی۔ انسان نے اس کاغذ پر صرف جھوٹے سچے واقعات ہی نہیں لکھے بلکہ اس پر میرے مقاصد حیات بھی اپنی طرف سے لکھ دئے۔

اسلام سے پہلے جب مغرب میں مذہب عیسوی کا دور شروع ہوا تو تو مجھے پادریوں کی ٹوپی پہننی پڑی۔ ساتھ ہی مجھے تثلیث کی تلقین بھی

کرنی پڑی۔ جب مشرق سے اسلام نمودار ہوا تو مجھے مولویوں کا چغہ اور عبا پہننا پڑا اور توحید کی تلقین کرنی پڑی "جیسا دیس ویسا بھیس" کے مقولے پر میں ہمیشہ چلی ہوں۔ جب مجھے بیک وقت تثلیث اور توحید کی تلقین کرنی پڑی تو میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ یہ سب مذاہب بالآخر ایک ہی خدا کے پیدا کردہ ہیں۔ صرف نام کا فرق ہے۔

الغرض میں اتنی صورتوں میں نمودار ہوئی اور میرے لئے اتنے مقاصد حیات معین کئے گئے کہ میں خود نہیں بتا سکتی کہ میں کیا ہوں اور کون ہوں لیکن باوجود اس دریوزہ گری کے میں یہ ضرور بتا سکتی ہوں کہ میں کیا نہیں ہوں۔ یعنی میری شریعت میں کون کون سی باتیں ممنوع ہیں۔

میں کیا نہیں ہوں

اب تک میں نے صرف یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ میں کیا ہوں۔ لیکن میں نے دانستہ لفظ "کوشش" استعمال کیا ہے کیونکہ کوشش اکثر ناتمام رہتی ہے۔ اور خصوصاً ایسے معاملات میں جو انسان سے متعلق ہوں۔ حضرت انسان ابھی خود "ناتمام" ہیں۔ بقول ڈاروِن انسان نے کیڑے مکوڑے سے ترقی کی اور اب وہ اپنے آپ کو "اشرف المخلوقات" کہتا ہے۔ ڈاروِن نے تو انسان کی کہانی اس وقت سے شروع کی جب وہ ذی روح ہو گیا تھا۔ لیکن اہلِ عقیدہ کا تو یہ خیال ہے کہ انسان شروع میں محض ایک مُشتِ خاک تھا۔ بقول ایک شاعر جو اہلِ عقیدہ کا پیر و مرشد ہے۔ انسان کا عقیدہ ہے کہ:۔

صد ہزاراں سال بودم در مطار
ہم چو ذراتِ ہوا بے اختیار (مولانا روم)

(میں لاکھوں برس فضا میں ہوا کے ذروں کی طرح اُڑتا رہا)۔

جو ہستی خاک سے بڑھ کر ذی روح ہو جائے اس کی نظر تو ہمیشہ ارتقار پر ہی لگی رہے گی۔ چنانچہ اسی مرشد انسان نے آئندہ کے مدارج ترقی بھی اس طرح بیان کئے ہیں کہ

حملہ دیگر بہ میرم از بشر   پس بر آرم از ملائک بال و پر

(جب میری انسانی زندگی ختم ہو گی تو مجھ میں فرشتوں کی طرح بال و پر پیدا ہو جائیں گے)

بار دیگر از ملک پراں شوم   آنچہ اندر وہم ناید آں شوم

(اس کے بعد جب میں فرشتہ کی حالت سے گزر کر آگے بڑھوں تو جو درجہ مجھے نصیب ہو گا وہ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا)۔

صاف لفظوں میں یوں کہیئے کہ انسان کا دعویٰ ہے کہ وہ بالآخر خدا کی ہستی میں مدغم ہو جائے گا جہاں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ نیز اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کا وجود اس دنیا میں محض عارضی ہے۔ اس کا اصلی وطن مقامِ قدسی ہے۔ چنانچہ جب تک انسان کیڑا مکوڑا رہا تب تک اس کی سوانح نگاری سائنس دانوں کے سپرد رہی۔ اس کی سوانح نگاری میرے سپرد اس وقت ہوئی جب اس نے "انسانیت" کا جامہ پہنا۔ چنانچہ جب وہ فرشتہ ہو جائے گا تو اس کی داستان صرف فرشتے ہی لکھ سکیں گے۔ میں اس وقت خدا کا شکر کروں گی کہ مجھے اس بارگراں سے چھٹی ملی اور غالباً یہ زمین بھی خدا کا شکر ادا کرے گی کہ اس کو اس بیقرار ہستی سے رہائی ملی۔ اس سلسلے میں انسان کے روحانی مرشد بھی انسان کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہیں کہ کس طرح اس مُشتِ خاک کی آمد سے پہلے زمین نے تخلیق آدم پر خدا سے آہ و زاری کی بلکہ فرشتوں نے بھی تخلیقِ آدم کی مخالفت اس بنا پر کی کہ یہ مُشتِ

خاک ایک دن فرشتوں سے بھی افضل ہونے کا دعویٰ کرے گا۔

گو تخلیقِ آدم کی کہانی میرے حدود سے باہر ہے لیکن میری طرح یہ کہانی بھی بڑی سبق آموز ہے۔ اس لئے میں اس قصہ کو پیش کرتی ہوں تاکہ سب پر روشن ہو جائے کہ زمین کو بھی حضرت انسان کے متعلق بدگمانی تھی جو بہت حد تک صحیح ثابت ہوئی۔ جب خدا نے انسان کو پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اس نے پہلے جبرئیل کو تعینات کیا کہ وہ جا کر زمین سے ایک مشتِ خاک لائیں۔ جب جبرئیل زمین پر پہنچے تو :-

پس زباں بکشاد خاک و لابہ کرد　　　　کز برائے حرمت خلّاق فرد

(زمین نے زبان کھولی اور فریاد کی کہ اے جبرئیل آپ کو خدا کی عظمت کا واسطہ دیتی ہوں)

ترکِ من گو و برو جانم بہ بخش　　　　رُو بہ تاب از من عنانِ خنگ رخش

(کہ میری جان بخشو اور واپس چلے جاؤ)

وز کشاکشہائے تکلیف و خطر　　　　بہرِ اللہ ہل مرا و در گذر

(اللہ کے واسطے مجھے ان تکلیف اور خطروں سے بری کرو جو انسان میرے لئے پیدا کرے گا۔)

چنانچہ جبرئیل کو زمین پر رحم آیا اور وہ ناکام واپس آئے۔ اس پر خدا نے میکائیل کو بھیجا مگر وہ بھی مشتِ خاک نہ لا سکے کیونکہ زمین نے ان سے بھی التجا کی کہ

کہ امانم دہ مرا آزاد کُن　　　　بیں کہ خون آلودہ میگویم سخن

(کہ مجھے معاف رکھ اور مجھے آزاد رہنے دے۔ میں آپ سے خون کے آنسو بہا کر فریاد کرتی ہوں۔)

اسی طرح اسرافیل بھی بھیجے گئے لیکن ناکام رہے۔ آخر کار فرشتۂ موت یعنی عزرائیل کو خدا نے بھیجا۔ زمین نے عزرائیل کو انسان کے "چال چلن" کی ضمانت دی اور کہا

گفت نے بر خیز بنود زین زیاں
من سر و جاں می ہنم رہن ضماں

(عزرائیل نے زمین کو کہا کہ اُٹھ اس سے تجھے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ میں انسان کا ضامن ہوں)۔

عزرائیل نے زمین کو باتوں میں لگا کر مشتِ خاک حاصل کر ہی لی۔ چونکہ عزرائیل نے انسان کی طرف سے ضمانت دی تھی اس لئے خدا نے اس کے صلے میں اس فرشتے کو روح قبض کرنے کا کام سپرد کیا۔ اس پر عزرائیل نے فریاد کی کہ اس فرض کو ادا کرنے سے میں بدنام ہو جاؤں گا۔ اس پر خدا نے اس فرشتۂ موت کو اس طرح تسلّی دی:۔

گفت اسبابے پدید آرم عیاں
از تپ و قولنج و سرسام و سناں

(خدا نے کہا میں ساتھ ہی اسباب موت بھی پیدا کر دوں گا از قسم بخار، قولنج، سرسام وغیرہ

تا بگرداند نظر ہاشاں ز تو
در مرضہا و سبب ہائے زتو

(تاکہ انسان تجھے موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے مرضوں کو سبب موت ٹھہرائے)

گفت یزداں ہر کہ باشد اصل داں
پس ترا کے بیند او اندر میاں

(خدا نے یہ بھی کہا جو حقیقت سے واقف ہیں وہ تجھے موت کا ذمہ دار نہیں ٹھہرائیں گے بلکہ موت کو میرا حکم سمجھیں گے۔)

میں نے یہ طویل افسانہ اس غرض سے بیان کیا ہے کہ میرے بیان کردہ "اسباب موت" کی ماہیت معلوم ہو جائے صرف افراد ہی نہیں مرتے بلکہ قومیں بھی مرتی ہیں۔ میں افراد کے اسبابِ موت نہیں بیان کرتی لیکن انسان نے قوموں

کے اسبابِ موت بتانا میرے سپرد ضرور کر دیا۔ جو قطعاً میری مرضی کے خلاف تھا۔ اگر قومیں بھی خدا کے حکم سے مرتی ہیں تو اسبابِ موت معلوم کرنے سے کیا حاصل؟ متوفی کے لئے تو یہ چھان بین ایسی ہے کہ گویا "یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد" اب رہا یہ سوال کہ زندہ قومیں تو اسبابِ موت معلوم کر کے عبرت حاصل کر سکتی ہیں لیکن کوئی قوم سابقہ اقوام کے اسبابِ موت معلوم کر کے اپنی موت روک سکی ؟

کیا ایڈورڈ گبن رومی سامراج کے اسبابِ موت معلوم کر کے اپنا سامراج بچا سکا؟ حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر میرے محرّر جو خامہ فرسائی کرتے ہیں اس سے ان کا مقصد محض اپنا اظہارِ خودی ہوتا ہے۔ کوئی ایڈورڈ گبن سے پوچھے کہ کیا تو نے رومی سامراج کا زوال بچشم خود دیکھا یا محض سُنی سنائی باتوں پر یہ طویل افسانۂ زوال لکھ مارا۔

تاریخ ہر بار یکساں حالات نہیں پیدا کرتی

اسی لئے میں اپنے محرّروں کو برابر تاکید کرتی رہی ہوں کہ سُنی سنائی باتوں پر اعتبار مت کرو خواہ وہ باتیں ضبطِ تحریر میں آ چکی ہوں۔ جب انسان کی زبان جھوٹ بول سکتی ہے تو کیا اس کا قلم جھوٹ نہیں لکھ سکتا؟ میرے خیال میں میرے جو محرّر اسبابِ زوال کے جھگڑوں میں پڑتے ہیں وہ محض "زیبِ داستان" کی خاطر یا خود نمائی کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ لیکن خود نمائی اور حق گوئی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس کے علاوہ جب ایک قوم مرتی ہے تو اس کے ساتھ ترقی ختم نہیں ہو جاتی۔ ارتقاء بذاتِ خود اپنی ہستی رکھتا ہے۔ بقول برگساں اگر موت کسی تقاضے کے تحت ہے تو ترقی بھی کسی ایسے تقاضے کے تحت ہے جس کو ہماری آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ گویا ارتقاء کا اصل مدعا تعمیر ہے تخریب

نہیں۔ قوموں کا زوال جو انسان کو نظر آتا ہے وہ ایک لامنتہا زنجیر کی محض ایک کڑی ہے۔ بذاتِ خود اس کڑی کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لئے تاریخِ عالم میں کسی قوم کا زوال محض ایک باب ہے۔ جو درمیان میں یکایک رونما ہو جاتا ہے لیکن میرے بعض محرّر گبن جیسے اس باب کو اس نیت سے اہمیت دیتے ہیں اور طوالت سے بیان کرتے ہیں کہ گویا میں ہر دفعہ وہی حالات پیدا کروں گی۔ لیکن ان کو یہ معلوم نہیں کہ میرے اور خالق کے ترکش میں بہت قسم کے تیر ہیں جو حسب موقع نشانے پر چلائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی قوم میرے پچھلے تیروں کو مدافعت کے لئے کوئی زرہ بکتر بنا لے تو میں ایک ایسا تیر چلاتی ہوں جو اس زرہ بکتر کے پار ہو جاتا ہے۔ اس لئے میرا تیر ہر زمانے میں "جگر کے پار" ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو فراعنہ مصر آج تک دنیا کے مالک ہوتے اور کسی دوسری قوم کی باری نہ آتی۔

الغرض میں طوطا نہیں جو ہر وقت ایک ہی کلمہ دُہراتا رہتا ہے۔ ہر زمانے کے لئے میرا کلمہ جداگانہ ہوتا ہے اور یہ کلمہ تقاضائے وقت کے مطابق ہوتا ہے۔ عیسائیوں نے تثلیث کا کلمہ رٹ لیا۔ لیکن جب مسلمان اپنا کلمۂ توحید لے کر نمودار ہوئے تو تثلیث مقابلے کی تاب نہ لا سکی۔ بیشک ہر قوم اپنے کلمہ کی وجہ سے بامِ ترقی پر پہنچتی لیکن بالآخر وہی کلمہ اس کو نیچے بھی گراتا ہے۔ بار بار ایک ہی کلمہ دہرانے سے سوزِ یقین غائب ہو جاتا ہے اور یہ سوز اس کلمے کے مخالفوں کے پاس چلا جاتا ہے۔ عیسائیوں کا سوز مسلمانوں کے پاس پہنچ گیا۔ میں قدامت پسند نہیں ہوں اس لئے میں نئے کلمے کا ساتھ دیتی ہوں۔ دورِ حاضر میں سرمایہ دار اپنا پرانا کلمہ دہرا رہے ہیں لیکن سوزِ یقین سے محروم ہیں۔ چنانچہ اب میں سرمایہ داروں کے مخالف اشتراکیوں کا ساتھ

مُبالغے سے تاریخ مسخ ہو جاتی ہے!

دے رہی ہوں۔ میں مبالغہ پسند نہیں کرتی گو میں ایک عرصے تک شاعروں کے مبالغے میں گرفتار رہی۔ شاعروں کی بدولت میں مقبول عام تو ضرور ہوئی لیکن جب میں نے دیکھا کہ یہ مقبولیت مجھے حق گوئی کو قربان کر کے حاصل ہو رہی ہے تو میں نے شاعروں سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ لیکن میں ایک دوسرے جال میں پھنس گئی۔ وہ جال قصیدہ گو مورخوں کا بچھایا ہوا تھا۔ جو بادشاہوں کے حکم سے صرف اپنے آقاؤں کی خوبیوں کی تشہیر کرتے تھے اور ان کی خامیوں کو حذف کر دیتے تھے۔ یہ محض قصیدہ گوئی تھی واقعہ نگاری نہ تھی۔ سب سے پہلے جن بادشاہوں کے جال میں میں گرفتار ہوئی وہ ایرانی کسراؤں کا بچھایا ہوا تھا۔ چنانچہ میرے خوشامدی محرروں نے صدیوں تک اس جال میں مجھے گرفتار رکھا۔ خدا خدا کر کے مجھے اس جال سے رہائی ملی لیکن اب میں مذہب کی لونڈی بنا دی گئی۔ پادریوں نے مجھ سے اپنے عقیدے کی تائید کرائی۔

اصل تاریخ کسی عقیدے کے متعلق فیصلہ نہیں کرتی

میرا اصل کام تو یہ ہے کہ میں انسانی عقائد کا محض تذکرہ کر دوں۔ میرا کام ہرگز یہ نہیں کہ کسی عقیدے کے برحق یا باطل ہونے کا فیصلہ کروں۔ البتہ میرا کام یہ ضرور ہے کہ میں بتاؤں کہ کسی قوم کے عقائد اس قوم کے افعال پر کس طرح اثر انداز ہوئے لیکن جب تک میں مذہب کی لونڈی رہی تب تک مجھے عقائد کے برحق یا باطل ہونے کا بھی فیصلہ کرنا پڑا جو میرے سرشت کے خلاف تھا۔ مجھ سے عقائد کی تلقین و تبلیغ بھی کرائی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے محرر اہلِ علم ہوتے تھے۔ لیکن اس

زمانے میں علم اہلِ دین تک محدود تھا۔

ہندوستان میں تو علم صرف برہمنوں تک محدود تھا لیکن اِن برہمنوں کا عقیدہ تھا کہ صرف وہ ایشور کے راز جانتے ہیں اور تمام عِلم صرف ویدوں تک محدود ہے۔ ان کی نظر میں میری کوئی قیمت اور اہمیت نہ تھی کیونکہ وہ تقدیر کے قائل تھے۔ یورپ میں جب بداعتقادی گناہ ٹھہرائی گئی اور احتسابِ عقائد کے لئے عدالتیں قائم کی گئیں تو پادریوں نے میرے صحیفے میں صرف ان ملزموں کی بداعتقادی تو لکھی لیکن ان کی اعلیٰ سیرت کا ذکر نہ کیا جو خلاف انصاف تھا۔

میرا کام یہ نہیں کہ میں تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کروں اور لوگوں کو دھوکے میں ڈالوں لیکن اہل عقیدہ اپنے عقیدے میں ایسے مست ہو جاتے ہیں کہ وہ تصویر کا دوسرا رُخ دیکھ ہی نہیں سکتے۔ لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ تمام واقعات جنہوں نے میرا رُخ پلٹ دیا انہیں اہل عقیدہ کے پیدا کردہ تھے۔ تصویر کے دونوں رُخ دکھانے والے "اگر مگر" میں ایسے گُم ہو جاتے ہیں کہ ان کی قوتِ عمل مسدود ہو جاتی ہے۔ میرے صحیفے میں جو کارنامے قابل اندراج ہیں وہ انہیں مستانِ عقیدہ کے پیدا کردہ ہیں۔ جنوں کی حکایت شکوک کی کہانی سے کہیں زیادہ موثر اور روح افزا ہوتی ہے۔ اسی لئے "عبرت آموزی" بھی میرے سپرد کی گئی۔

تاریخ میں تاویل بازی داخل نہیں

میں شروع میں محض واقعہ نگار تھی لیکن اوائل عمری ہی میں مجھ پر شاعروں کا تسلط ہو گیا۔ شاعر تو بے لگام ہوتے ہی ہیں اس لئے انہوں نے میرے

واقعات کی تاویلیں کرنا شروع کر دیں۔ تاویل سے سچائی مسخ ہو جاتی ہے۔ فردوسی نے ایک معمولی پہلوان کو رستم بنا دیا۔

جب تک میں روزنامچہ کی صورت میں رہی تب تک میں تاویلوں سے بری رہی لیکن جس دن سے میرے محرّروں نے واقعات کے اسباب تلاش کرنا شروع کئے اسی دن سے تاویل بازی شروع ہوئی۔ تاویل بازی کے موجد یونانی تھے۔ کیونکہ انہیں کے زمانے سے عقل کا راج شروع ہوا۔ اس سے پہلے عقیدے کا راج تھا اور از روئے عقیدہ ہر واقعہ کا سبب دیوتا سمجھے جاتے تھے۔ بُرا کام شیطان کے سر تھوپا جاتا تھا لیکن بازیگرانِ عقل نے ہر واقعہ کا سبب عقل سے معلوم کرنا چاہا مگر یہ بازیگر یہ بھول گئے کہ انسان کی قسمت میں صرف عقل جزوی ہے عقلِ کلّی نہیں۔ یہ عقل جزوی صرف ظاہر کو دیکھ سکتی ہے باطن کو دیکھنے سے قاصر ہے۔ اہلِ دل اپنے پاک جذبات سے وہ کام کر بیٹھتے ہیں جس کو صرف اہلِ نظر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہودیوں کی عقل حضرت عیسٰی کی پاک نیت کو نہ سمجھ سکی۔ اور ان کو صلیب پر چڑھا دیا۔ رومی گورنر نے حضرت عیسٰی کو باغی سمجھا کیونکہ وہ بھی حق کلّی سے محروم تھا بقول مولانا روم :-

آں خطا دیدن ز ضعفِ عقلِ اوست
عقلِ کُل مغز است و عقلِ جزو پوست

(اس کو ضعفِ عقلی سے وہ خطا نظر آئی۔ عقل کل اصل مغز ہے عقل جزوی محض چھلکا ہے)
یہودیوں اور رومیوں دونوں کو حضرت عیسٰے بدنیت نظر آئے کیونکہ یہ دونوں خود بدنیت تھے۔

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ آید در نوشتن شیر، شِیر

(پاک لوگوں کی نیت کا اندازہ اپنی نیت سے نہ کرو۔ گو شیر اور دودھ

ایک ہی املاسے لکھے جاتے ہیں لیکن ان کے معنی برعکس ہیں۔)

جملہ عالم زین سبب گمراہ شد　　　کم کسے ز ابدالِ حق آگاہ شد

(اسی وجہ سے تمام عالم گمراہ ہوا۔ بہت کم لوگ ابدالانِ حق سے واقف ہوسکے)

تاویل کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ تاویل میں تاویل کنندہ کی نیت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ ہر مؤرخ اپنی عقل سے نہیں بلکہ اپنے جذبات کی بنا پر واقعات کی تاویل کرتا ہے۔ یہ فطرت انسانی کی خوبی بھی ہے اور خرابی بھی۔ اگر انسان میں قوتِ تاویل نہ ہوتی تو انسانی علم محدود رہتا۔ لیکن انسان تاویل کا اس حد تک خوگر ہے کہ وہ آسمانی کتابوں کی بھی تاویل کرتا ہے۔ انجیل۔ قرآن اور ویدوں کی سینکڑوں تفسیریں لکھی جاچکی ہیں۔ جب حضرت انسان نے آسمانی صحیفوں پر بھی دست درازی کی تو وہ مجھے کس طرح چھوڑ دیتا۔

انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہر وقت پرستش کے لئے تیار رہتا ہے عقل سے پہلے وہ عقیدے کا پرستار تھا۔ اس کے بعد اس نے عقل کی پرستش کی آج کل وہ وطن پرستی میں گرفتار ہے اور عقل کو توڑ مروڑ کر آج کل وہ اس عقل سے وطنیت کو برحق ثابت کر رہا ہے۔ لیکن غضب یہ ہے کہ یہ تاویل باز زمانہ ماضی کو بھی اسی وطن پرستی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مصر کے وطن پرست حضرت عمرؓ کو بھی آج کل عرب وطن پرست ثابت کرتے ہیں۔ آج کل کے ترک وطن پرست محمود غزنوی کو ترکیت کا علمبردار قرار دیتے ہیں۔

تاویل بازی سے تو ابلیس بھی اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کر سکتا ہے عدالتوں میں وکیل بھی تاویل سے کام لے کر مجرم کو بے گناہ اور بے گناہ کو مجرم ثابت کرتے ہیں۔ چنانچہ میری عدالت میں بھی تاریخی مجرم پیش کئے جاتے ہیں۔ انگریز تاویل بازوں نے کلائیو جیسے بددیانت انسان کو بے گنا؟

ثابت کرنا چاہا۔ محض اس لئے کہ اس نے اپنے ہم قوموں کے لئے سامراج ہندوستان میں قائم کیا لیکن میں جج ہوں وکیل نہیں۔ اس لئے میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے بیان سنتی ہوں اور محض تاویلوں سے متاثر نہیں ہوتی۔ ملزم اپنی صفائی میں اپنی "قومی" خدمات پیش کرتا ہے لیکن میری نظر کسی مخصوص قوم کے مفاد کو نہیں دیکھتی۔ میں جانتی ہوں کہ ایک قوم کے مفاد سے دوسری قوم کو ضرر پہنچتا ہے۔ تمام عالم میرے محیط میں داخل ہے۔ اس لئے فیصلہ دینے سے پہلے مجروحوں کا بیان بھی سنتی ہوں۔

تاریخ نگاری صحیفہ نگاری نہیں ہے

جب سے ہر کس و ناکس خواندہ ہوا ہے تب سے اخباروں کی چڑھ بنی ہے ہر "پانچویں جماعت پاس" اپنے آپ کو عالم سمجھتا ہے اور اخبار کی لڑائی کو خدا کا حکم سمجھتا ہے۔ اخبار اپنی اشاعت بڑھانے کے لئے انہیں نیم خواندہ لوگوں کے مذاق کے مطابق مضامین لکھتے ہیں اب صحیفہ نگاروں نے تاریخ نگاری بھی اختیار کر لی ہے اور تاریخ کو اخباروں کی طرح عام پسند بنانے کے لئے یہ تاریخ نگار نما صحیفہ نگار اُن تاریخی واقعات پر زور دیتے ہیں جن سے ان کے ناظرین میں "سنسنی" پیدا ہو۔ دیول دیوی اور خضر خان کے عشق کی کہانی اسی سنسنی کی خاطر تاریخ میں داخل کی گئی۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ کے واقعہ صلیب کو کسی ہم عصر مورخ نے تاریخ میں درج نہ کیا۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے جس کی وجہ سے تاریخ نگاری اپنے اعلیٰ مقام سے گر کر صحافت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بات ناشران کتب کی ہوس دولت سے متعلق ہے۔ ہر ناشر علم کی اشاعت کی خاطر نہیں بلکہ روپیہ

کمانے کی خاطر کتابیں نشر کرتا ہے۔ جو کتاب مقبول عام ہوتی ہے اس سے ناشر خوب روپیہ کماتا ہے۔ میرا افسانہ محض ٹھوس واقعات پر مبنی ہوتا ہے اس لئے مقبول عام نہیں ہو سکتا۔ لیکن مقبول عام مورخوں کا قول ہے کہ "تاریخ افسانے سے زیادہ دلکش ہوتی ہے"، لیکن یہ دلکشی دراصل واقعات میں نہیں ہوتی بلکہ مقبول عام مورخوں کی قلم میں ہوتی ہے۔

اس مقبول عام تاریخ نگاری کی زندہ مثال امریکی نام نہاد مورخ وِل ڈوران کی ضخیم تاریخ ہے جس کی آٹھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں لیکن باوجود ضخامت اس تاریخ کو پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس کو کسی مورخ نے نہیں بلکہ کسی نامہ نگار نے لکھا ہے تاکہ یہ کتاب اخبار کی طرح مقبول عام ہو اور مصنف سے پہلے ناشر کی جیب بھرے۔ چنانچہ دورِ حاضر میں کسی تاریخ کی قدر و قیمت کا فیصلہ علماء تاریخ نہیں بلکہ ناشر کرتا ہے۔ وِل ڈوران کی تاریخ کے سلسلے میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اس صحیفہ نگار مورخ نے اپنی اس تاریخ کو "تمدن کی کہانی" کا نام دیا۔ گویا یہ تاریخ نہیں، بلکہ کہانی ہے۔ (حوالہ نمبر ۱۸)

تاریخ کو کہانی کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے تاویل لازمی ہے۔ تاویل کے ذریعہ ہی سے تاریخ میں تسلسل پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بلحاظ واقعات درمیان میں "کورے صفحے" بھی آجاتے ہیں۔ کیونکہ چند زمانے ایسے بھی ہیں جن کے متعلق ہماری واقفیت بالکل محدود ہے یا نفی کے برابر ہے۔ تاریخ کو مسلسل کہانی بنانے کے لئے ان کورے صفحوں کو تاویل بازی کے ذریعہ بھرنا پڑتا ہے۔ اس زمانے میں گویا تاریخ کو مقبولیت واقعات کی بناء پر نہیں بلکہ تاویل بازی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ان تاویل بازی کا

زور اس وقت سے شروع ہوا جب واقعات کے اسباب تلاش کرنے کے سلسلہ میں فلسفہ مجھ پر ٹھونسا گیا۔ لیکن اسباب کی تلاش میں مؤرخ ایسے سرگرداں ہوئے کہ واقعات کو فراموش کر بیٹھے۔ واقعہ نگاری تاریخ کی منزلِ مقصود تھی تلاشِ اسباب محض سفر تھا لیکن حضرت انسان کو منزلِ مقصود پر پہنچنے میں وہ مزا نہیں آتا جو سفر میں آتا ہے۔

میں نے تاویل بازی کا رونا باب بعنوان "مجھ پر فلسفہ کس طرح اور کیوں ٹھونسا گیا" کے تحت دل بھر کے رویا ہے جو آپ کی نظر سے گزرے گا۔

تاریخ دیگر علوم کی محتاج نہیں

میں کسی علم کی محتاج نہیں بلکہ دیگر علوم میرے دریوزہ گر ہیں۔ آج کل سائنس کا بڑا زور ہے لیکن سائنس کے نظریے بدلتے رہتے ہیں۔ سائنس ایک زمانے میں دعویٰ کرتی تھی کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے لیکن اب اس کا اُلٹا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس علم نہیں بلکہ عمل ہے۔ سائنس صرف ان باتوں کو قبول کرتی ہے جو عملاً صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ سائنس صرف یہ بتاتی ہے کہ انسان نے کیڑے مکوڑوں سے ترقی کی لیکن اسبابِ ترقی نہیں بتائی۔ وہ کیا چیز تھی جو ان کیڑے مکوڑوں کو آگے ڈھکیلتی رہی اور ان کو پیچھے نہیں جانے دیا۔ لیکن میں اسبابِ ترقی جانتی ہوں اور اس چیز کو بھی جانتی ہوں جس نے ان کیڑوں مکوڑوں کو آگے ڈھکیلا۔ وہ چیز خواہش تھی بقول شاعر:

کبک از شوخیٔ پا رفتار یافت
بلبل از ذوق نوا منقار یافت (اقبالؒ)

جب دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے اور جنون کی حد کو پہنچ جاتی ہے تو

ہر ذی روح اسی آب و گل سے سامانِ خواہش پیدا کر لیتا ہے۔ یہ مسئلہ دراصل علم نفسیات سے متعلق ہے۔ جواب سائنس کا درجہ رکھتی ہے لیکن اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سائنس میری محتاج ہے۔ میں ہی عربوں سے متعلق واقعات بتاتی ہوں جنہوں نے اپنے جنون کے تحت قیصر و کسریٰ کو ہرانے کے لئے اپنے ریگستان سے دُنیا کا سب سے بڑا آلہ حاصل کیا۔ وہ آلہ "آلۂ ذوق" تھا۔ اگر ثبوت کے لئے میں واقعات نہ مہیّا کروں تو علم النفس کے تمام دعوے محض خیالی پلاؤ کی صورت میں رہیں اور اہلِ عقل ان دعوؤں کو تسلیم نہ کریں۔

جب ماہرِ سائنس دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے نظرئے "واقعی" صحیح ہیں یعنی مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہیں تو کوئی اس سے پوچھے کہ کیا تو نے تاریخ سے کام نہیں لیا؟ لفظ واقعی واقعہ سے مشتق ہے اور واقعہ نگاری میرا کام ہے سائنس کا نہیں۔ جب ڈاکٹر جینر نے چیچک کا ٹیکہ ایجاد کیا تو اس نے گذشتہ واقعاتِ سائنس سے کام لیا۔ اسی طرح آئندہ کے ٹیکہ ایجاد کرنے والے میرے صفحے اُلٹ کر دیکھیں گے کہ ڈاکٹر جینر نے کیوں۔ کس طرح اور کس ضرورت کے تحت ٹیکہ ایجاد کیا۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ماہرِ سائنس کو میری ورق گردانی کر کے گذشتہ وباؤں کا حال معلوم کرنا پڑے گا۔

الغرض میں ماہرینِ سائنس کی بھی ہادی ہوں۔ یہ ماہرین اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے میرے مہیّا کردہ واقعات سے کام لیتے ہیں لیکن سائنس دان اپنے تجربوں سے آئندہ کے متعلق بھی پیشین گوئی کرتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ آئندہ جب کبھی تم اپنی اُنگلی آگ میں ڈالو گے تو آگ

تمہاری اُنگلی کو جلا دے گی۔ لیکن میرا تعلق آب و آتش سے نہیں بلکہ انسان سے ہے جس کی فطرت کی گہرائیوں سے میں ابھی تک ناواقف ہوں۔ انسان کی فطرت تغیّر پذیر ہے۔ اسی لئے میں ہر زمانے میں کوئی نیا تیر چلاتی ہوں۔

میرے مہیا کردہ واقعات کی بنا پر انسان کے متعلق کوئی پیشنگوئی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اس کے باوجود میرے چند محرّر پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں۔

تاریخ پیشین گوئی نہیں کرتی!

میں فال گو نہیں کیونکہ میں منجّم نہیں ہوں ۔ یہ پیشہ میرے شایانِ شان نہیں۔ جس شخص نے مجھے فال گوئی سونپنی چاہی وہ کارل مارکس تھا۔ کارل مارکس نے دراصل فال گوئی کا تصوّر قدیم یونانی فال گوؤں سے لیا جو توہمات میں غرق تھے۔ لیکن کارل مارکس کا زمانہ وہ تھا۔ جب سائنس رائج ہو چکی تھی اور توہمات زیر ہو چکے تھے۔ اس لئے اغلب خیال ہے کہ پیشین گوئی کے معاملے میں کارل مارکس سائنس سے بھی متاثر ہوا۔

سائنس دعویٰ کرتی ہے کہ آئندہ جب کبھی تم اپنی انگلی آگ میں دوگے تو آگ تمہاری انگلی کو جلا دے گی۔ اسی طرح سائنس، سورج گرہن اور چاند گرہن کے متعلق پیشین گوئی کرتی ہے۔ اس لئے کارل مارکس نے دعویٰ کیا کہ آئندہ انقلابوں کے متعلق بھی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے چنانچہ کارل مارکس نے اپنے فلسفۂ اشتراکیت کو سائنس کا نام دیا۔ اور پیشین گوئی کے فوائد اس طرح بیان کئے کہ

(۱) جب مُدبّرین ملک کو معلوم ہو جائے کہ آئندہ کیا پیش آنے والا

ہے تو وہ اسی حساب سے اپنے احکامات جاری کریں گے۔

(۲) جب موعودہ واقعہ یا انقلاب پیش آئے گا تو ملک انقلاب کے لئے پہلے سے تیار ہوگا اور ملک اس گڑبڑ سے بچ جائے گا جو بوقت انقلاب پیدا ہوتی ہے۔ اس گڑبڑ کو کارل مارکس نے دردِ زہ سے تشبیہہ دی۔

(۳) فطرت (خدا نے نہیں) دنیا کے لئے انقلابات پہلے سے متعیّن کردئے ہیں یعنی انقلاب فطرت کا تقاضہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔

درحقیقت انقلاب کا تصوّر کارل مارکس کا پیدا کردہ نہیں۔ بلکہ بہت قدیم ہے۔ افلاطون بھی انقلاب کا قائل تھا۔ یہودیوں کو تو کامل یقین تھا کہ خدا نے روزِ ازل سے یہودیوں کو دنیا کا مالک بنادیا ہے۔ اور جتنے انقلابات اس دنیا میں ہوں گے وہ انہیں کی خاطر ہوں گے۔ یہودیوں کے نزدیک بشارت بھی پیشین گوئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے انبیاء کو "نبی" کہتے تھے۔ جس کے لغوی معنی ہیں "خبر دینے والا"۔

پیشین گوئی سراسر شعبدہ بازی ہے اس لئے ایسا مؤرخ جو پیشین گوئی کرے اس کو تاریخ نگار کی بجائے "تاریخ باز" کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ تاریخ باز اس بنا پر پیش گوئی کرتے ہیں کہ ہمیشہ میں اپنے واقعات کو دہراتی رہتی ہوں۔ لیکن یہ سراسر تہمت ہے۔ تواتر میرے سرشت میں نہیں۔ میں ہزاروں برس سے دیکھ رہی ہوں کہ زمانہ جو میرے قابو سے باہر ہے

ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اس لئے پشین گوئی کرنا عقل سے دشمنی مول لینے کے برابر ہے۔

پشین گوئی کی مذمت کرنے میں اہل عقیدہ بھی میرے ہم نوا ہیں کیونکہ صرف خدا عالم الغیب ہے انسان نہیں۔ جو مؤرخ پشین گوئی کرتا ہے وہ گویا خدائی کا دعویٰ کرتا ہے۔

تیسرا باب

مجھ پر فلسفہ کیوں اور کس طرح لادا گیا؟

حضرت موسیٰؑ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ آگ لینے کو نکلے کہ راستہ میں انہیں پیغمبری مل گئی۔ میرے ساتھ بھی یہی تماشہ ہوا اور اس طرح ہوا کہ جب میرے پاس واقعات بکثرت جمع ہو گئے تو میں ان واقعات کے اسباب معلوم کرنے نکلی۔ راستے میں لوگوں نے مجھے فلسفی کہنا شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس دنیا میں فلسفی پیدا نہیں ہوئے تھے اور فلسفہ کو کوئی نہ جانتا تھا اور نہ اس کی کوئی تعریف مقرر تھی۔

جب مجھ پر فلسفہ لادا جانا شروع ہوا تو میں نے فلسفے کی نوعیت معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ فلسفہ کیا بلا ہے اور میں تلاش اسباب کو فلسفہ سمجھنے لگی۔ جب یونان وچین میں ایک قسم کے لوگ اُٹھے جو اپنے آپ کو فلسفی کہتے تھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ فلسفہ کس کو کہتے ہیں۔ وہ بھی فلسفے کی نوعیت نہ بتا سکے صرف یہ بتایا کہ ہم اندھیرے میں ڈھونڈتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق کے اسباب ومقاصد کیا ہیں۔ جب ہمیں کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جس کے متعلق ہم عملی تجربہ کر سکتے ہیں تو وہ چیز فوراً سائنس کے زمرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہم ایسی باتوں کو فلسفہ کہتے ہیں۔ جن کے اسباب ہم نہیں معلوم کر سکتے۔ سبب تخلیق کائنات ایسا معاملہ ہے جس کا سراغ ہم ابھی تک نہیں چلا سکے۔ کیونکہ ہم کسی عملی تجربہ گاہ میں

جاکر دوسری کائنات نہیں پیدا کر سکتے۔ اس لئے سببِ کائنات کے معاملے میں ہم کو قیاس آرائی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ فلسفے کا نام سن کر میں گھبرائی کہ اگر میں بھی فلسفی بن گئی تو مجھے بھی تلاشِ اسباب میں قیاس آرائیوں کے سمندر میں غوطے لگانے پڑیں گے۔ اب میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میرا واسطہ تو ٹھوس واقعات سے ہے اس لئے میں ٹھوس واقعات کے ٹھوس اسباب بھی معلوم کر سکوں گی لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا۔ کیونکہ میں واقعات کے اسباب معلوم نہ کر سکی۔

جب میں نے اسباب کی تلاش شروع کی تو معلوم ہوا کہ اسباب کی بھی کئی قسمیں ہیں جن کو فلسفی فوری اور دُور رس زمروں میں منقسم کرتے ہیں۔ میں نے ان دونوں قسم کے اسباب کی تلاش شروع کی تو پتہ چلا کہ اسباب کی ایک اور قسم بھی ہے جو انسان کی نظر سے پوشیدہ ہے۔ میں نے اس سبب کی بھی تلاش شروع کی کیونکہ میں اس مغالطے میں تھی کہ میں یونانیوں کی قائم کردہ دیوی ہوں۔ لیکن چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ اس کائنات کا خالق ایک ایسی ہستی ہے جس تک دیویوں کی رسائی بھی ممکن نہیں۔

بالآخر مایوس ہو کر مجھے ماننا پڑا کہ واقعات کا اصل سبب وہی ہے جس نے کائنات کو پیدا کیا۔ اور اس کائنات کا سببِ تخلیق انسان کو نہیں بتایا۔ جب میں نے فوری اور دُور رس اسباب کا اپنے نزدیک پورا پتہ چلا لیا تو معلوم ہوا کہ خالقِ کائنات مسبب الاسباب بھی ہے۔ جب اس ہستی تک رسائی میرے لئے ناممکن ثابت ہوئی تو مجھے فلسفیوں کی طرح قیاس آرائیوں پر ناچار اکتفا کرنا پڑا۔ اب یہ ثابت ہو گیا کہ میں بھی فلسفیوں کی طرح ناچار ہوں لیکن

میں تو اس مغالطے میں تھی کہ میں بحیثیت دیوی مسبب الاسباب تک پہنچ سکتی ہوں۔ اس سلسلے میں میَں انسان کو داد دیتی ہوں کہ اس نے اپنی بیچارگی کو فوراً تسلیم کر لیا۔ چنانچہ میرے محرّروں نے جو اپنے صحیفے شروع میں لکھے وہ اس تلاشِ اسباب سے بری ہیں۔ لیکن بعد کو ان محرّروں میں ایک طبقہ پیدا ہوا جس نے باوجود بے چارگیٔ عقل اسباب کی تلاش شروع کر دی اور اب مجھ پر وہ دست درازیاں شروع ہوئیں جن کا رونا میں نے اس سرگذشت میں رویا ہے۔ الغرض تلاش سبب نے مجھے فلسفی بنایا۔ چونکہ میں ناچار ہو کر فلسفی بنی اس لئے میں فلسفہ کو ایک بوجھ سمجھتی ہوں اور اسی لئے میں نے اپنے اس باب کے لئے یہ بھونڈا عنوان قائم کیا۔

انسان نے مجھ پر جو دست درازیاں کی ہیں ان میں سب سے زیادہ ظلم آمیز یہ تصرّف ہے کہ میرے کندھوں پر فلسفے کا بوجھ لادا گیا۔ سب سے پہلے جو شخص میرے نام پر فلسفے کے سمندر میں کودا وہ ابن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) تھا۔ لیکن درحقیقت اس مفکر انسان کا مقصد کچھ اور ہی تھا اس نے میرے پیدا کردہ واقعات سے جو نتیجے نکالے وہ فلسفہ نہ تھے بلکہ محض ایک علیحدہ علم کے پُرزے تھے۔ جن کو جوڑ کر پانچسو سال بعد مفکّرین نے ایک مخصوص علم ایجاد کیا۔ جو اس زمانے میں عمرانیات یعنی سوشلوجی کہلاتا ہے۔ ان پُرزوں کی بنا پر ابن خلدون نے "صوفیانہ" اور "عالمانہ" تصوّرات کے وزن پر "تاریخانہ" تصوّرات قائم کئے۔ تاریخانہ تصوّر اس زمانے کی دنیا کے لئے ایک عجیب چیز تھی۔ کیونکہ ابن خلدون کے زمانے میں میں صرف مذہب کی لونڈی تھی۔ اس لئے میں اس مسلمان مفکّر کی ممنون ہوں کہ اس نے مجھے اس غلامی سے آزاد کیا۔ اور میرے پیدا کردہ واقعات

کی بنا پر ایک نیا علم جاری کیا۔ اسی لئے میں نے اپنی اس سرگذشت میں ایک علیحدہ باب اس مفکرِ اعظم کے لئے مخصوص کیا ہے۔

میرے پرستاروں کا مقصد کیا تھا؟ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ گزشتہ زمانے کو پھر زندہ کریں۔ دورِ حاضر کا جائزہ لینے کے لئے تو سائنس داں موجود ہیں لیکن سائنس کا دار و مدار انسان کے حواس خمسہ پر ہے برعکس اس کے میرا دار و مدار انسان کے حافظے پر ہے۔ اسی لئے سب سے پہلے میں قلب انسانی میں نمودار ہوئی۔ جہاں خدا خود رہتا ہے۔ بقول مولانا روم :-

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است　　　من نہ گنجم ہیچ در بالا و پست

(پیغمبرؐ نے کہا کہ خدا نے کہا ہے کہ میں بالا و پست میں کہیں نہیں سما جا سکتا)

در زمین و آسمان و عرش نیز　　　من نہ گنجم این یقین داں اے عزیز

(یقین رکھو کہ میں نہ زمین میں نہ عرش میں نہ آسمان میں سما سکتا ہوں) -

در دلے مومن بہ گنجم اے عجب　　　گر مرا جوئی دران دلہا طلب

(لیکن میں مومن انسان کے دل میں سما سکتا ہوں۔ اگر میری تلاش ہے تو انسان کے دل میں مجھے ڈھونڈو۔)

لیکن میں نے انسان کے قلب میں اس وقت جگہ لی جب وہ حیوانیت کے مدارج طے کر کے انسان بن چکا تھا۔ چونکہ میرا واسطہ صرف اعمالِ انسان سے ہے جن سے واقعات پیدا ہوتے ہیں اس لئے میں نے اپنے پرستاروں کو تاکید کی کہ وہ انسان کے دورِ حیوانیت کی کہانی سائنس دانوں پر چھوڑ دیں۔ لیکن میرے محرّروں کو حدودِ سائنس میں مداخلت کرنی پڑی کیونکہ انسانی زندگی بعض حوادثِ فطرت مثلاً زلزلہ سیلاب۔ خشک سالی

وغیرہ سے بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس لئے واقعات میں ان حوادث کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ایسے حوادث ماحول کو بھی بدل دیتے ہیں اور انسان اپنے ماحول کا جزو ہے۔ میرے محرروں کے ذمہ جو کام تھا یعنی واقعہ نگاری وہ بذات خود بڑا اہم تھا۔ لیکن تاریخ میں ان حوادث کی شمولیت سے مورخوں کی دقتوں میں اور اضافہ ہوا۔ یہ دقتیں درج ذیل ہیں :۔

مؤرخ کی دقتیں

(۱) مورخ کے لئے ان حوادث کا ذکر اس لئے ضروری ہو گیا کہ بعض مؤرخوں نے واقعات کے اسباب بیان کرنے کا فیشن جاری کر دیا۔ تاکہ واقعات "معنی خیز" ہو جائیں۔ لیکن معنی خیزی پیدا کرنے کی خاطر میرے محرروں کو میدانِ سائنس میں قدم رکھنا پڑا۔ مثلاً مورخ کو بتانا پڑتا ہے کہ ہندوستان کو شمالی باشندوں نے کیوں ہمیشہ پامال کیا اور اہل ہند اپنی گرم آب و ہوا کی وجہ سے ان سرد ملکوں کے لوگوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس قسم کے اسباب کا تعلق سائنس سے ہے اس لئے ایک فرد واحد دو علوم کا ماہر نہیں ہو سکتا لیکن اگر واقعات کے اسباب نہ بتائے جائیں تو تاریخ محض روزنامچہ بن کر رہ جاتی ہے۔

(۲) مؤرخ کو ایک اور دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ انسان اپنے عہد کے ماحول سے تو خوب واقف ہوتا ہے اور اپنے زمانے کو خوب سمجھتا ہے لیکن زمانۂ قدیم کا ماحول اس کے تجربے سے باہر ہے اس لئے مؤرخ اپنے زمانے کے یا قریب العہد واقعات تو خوب بیان کر سکتا ہے اور اس کے ناظرین بھی ان واقعات کو خوب سمجھتے ہیں۔ اسی لئے بہ نسبت تاریخ ماضی کے دورِ حاضر سے متعلق ناول زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔

کیونکہ ان ناولوں کے مندرجہ واقعات ایک دوسرے سے اس طرح منسلک ہوتے ہیں کہ پوری کہانی بن جاتے ہیں۔ لیکن زمانۂ قدیم کے حالات میں یہ تسلسل نہیں پایا جاتا۔ ایک دور کے حالات تو پوری طرح معلوم نہیں دوسرے دور کے حالات نسبتاً کم معلوم ہیں۔

(۳) تیسری دقت یہ ہے کہ تاریخ کو دلچسپ بنانے کے لئے واقعات سے نتائج بھی اخذ کرنے پڑتے ہیں۔ تاکہ لوگ "عبرت" حاصل کریں۔ ابن خلدون کی نظر میں "تاریخ عبرت نامہ ہے۔ چنانچہ اس نامور فلسفیٔ تاریخ نے اپنے مشہور عالم "مقدمہ کا نام کتاب العبار" رکھا۔ مؤرخ کو اس سلسلے میں واقعاتِ تاریخ سے چند اصول بھی وضع کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً مؤرخ دیکھتا ہے کہ شخصی حکومت میں بادشاہ مطلق العنان ہو جاتا ہے جس سے بادشاہ خود ہی ناکارہ نہیں ہو جاتا بلکہ ملک کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ واجد علی شاہ اپنی مطلق العنانی کے باعث صرف خود ہی برباد نہ ہوا بلکہ ملک بھی انگریزوں کے قبضے میں آگیا۔ اس بنا پر مؤرخ یہ اصول وضع کرتا ہے کہ مطلق العنانی بادشاہ اور ملک دونوں کے لئے بربادکن ثابت ہوتی ہے لیکن ایسے وضع کردہ اصولوں کا اطلاق صرف ایک خاص علاقے میں ہو سکتا ہے۔ اور ایک خاص عہد میں۔ بیشک واجد علی کی رعیّت ایسی ناکارہ ہوگئی تھی کہ وہ اپنے بادشاہ کی مطلق العنانی کے خلاف صدا بلند نہ کر سکی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اس زمانے میں تمام دُنیا کے لوگ ناکارہ ہو گئے تھے۔ کیونکہ اسی زمانے میں یورپ کے لوگ اپنے بادشاہوں کی مطلق العنانی ختم کر چکے تھے۔ اس قسم کے وضع کردہ اصولوں کا اطلاق صرف ایک خاص زمانے میں اور ایک خاص علاقے میں

ہو سکتا ہے۔ برعکس اس کے سائنس کے اصول زمانہ حال اور زمانہ آئندہ پر بھی قابل اطلاق ہیں۔ مثلاً سائنس بتاتی ہے کہ جب کبھی تم اپنی انگلی آگ میں دو گے تو آگ تمہاری انگلی کو جلا دے گی۔ برعکس اس کے مورخوں کے وضع کردہ اصول صرف ایک خاص زمانے میں صحیح ہوتے ہیں اس لئے ان اصولوں کی بنا پر مؤرخ آئندہ کے متعلق پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ میں اپنے محرّروں کو تاکید کرتی رہتی ہوں کہ آئندہ کے جھگڑوں میں نہ پڑو۔

(۴) مؤرخوں کی چوتھی دقّت یہ ہے کہ اس کے ناظرین اس کے ہم عصر ہوتے ہیں لیکن زمانہ ماضی کے حالات کو یہ ناظرین اس نیت سے پڑھتے ہیں کہ ان حالات کو پڑھ کر وہ اپنے زمانے کو بہتر طریق سے سمجھ سکیں گے جب اپنے زمانے کو وہ پوری طرح سمجھ لیں گے تو آئندہ زمانے کے لئے بھی وہ تیار ہو جائینگے۔ مثلاً جرمن قوم کے متعلق ہمیں معلوم ہو جائے کہ یہ قوم ماضی میں بھی دوسروں پر دست درازی کرتی رہی ہے تو زمانہ حال کے لوگ اس قوم کی طرف سے آئندہ کے لئے بھی ہوشیار ہو جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ حالات ماضی کی بنا پر ہمیں آگاہ کرتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ حال ماضی کی طرح ہے۔ اور اس لئے مستقبل بھی حال کی طرح ہوگا۔ یعنی یہ دنیا ساکت ہے متحرک نہیں۔ انگریز جیسی باخبر قوم اپنی حماقت کا شکار ہوئی۔ چرچل جیسے سامراجی یہی کہتے رہے کہ مشرق جس طرح ماضی میں سوتا رہا ہے اور کمزور رہا ہے اسی طرح وہ آئندہ بھی سوتا رہے گا۔ چنانچہ انگریز قوم اپنا سامراج کھو بیٹھی اور زمانہ آخر بدل کر رہا۔

(۵) پانچویں دقت یہ ہے کہ مؤرخ بھی آخر انسان ہے فرشتہ نہیں۔ بحیثیت انسان اس سے کس طرح ممکن ہے کہ وہ اپنے تمام عقائد تعصبات وغیرہ سے دست بردار ہوکر فرشتوں کی طرح اس دنیا کے حال یا ماضی کا جائزہ لے سکے۔ ہر انسان پر کوئی نہ کوئی جنون سوار ہوتا ہے اور وہ جنون اس کی آنکھ پر ایک عینک لگا دیتا ہے جس کا رنگ اس کے جنون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس عینک سے وہ صرف حال ہی کو نہیں بلکہ ماضی کو بھی دیکھتا ہے۔ اسی طرح ہر شخص کا کوئی نہ کوئی مذہب ہوتا ہے حضرت عیسیٰ کا صلیب پر چڑھایا جانا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ لیکن اس واقعہ کو تاریخی اہمیت بہت بعد کو ہوئی۔ اس لئے ہم عصر مؤرخین نے اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ کے صلیب چڑھائے جانے کے زمانے میں رومیوں کی تاریخ نگاری عروج پر تھی۔ صرف یہودی مورخ (یوسف) جوزفوس (۳۷ء تا ۱۰۰ء) نے واقعہ صلیب کو لکھا۔ اور وہ بھی از راہِ تذکرہ۔ علاوہ عقائد کے مؤرخ کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ہر واقعہ کی اہمیت کا اندازہ لگا سکے۔ کیونکہ اکثر واقعات بعد کو اہمیت حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً معرکہ پلاسی واقع ۱۷۵۷ء کے اثرات بعد کو نمایاں ہوئے۔

اگر کوئی مؤرخ اپنے زمانے میں کسی واقعہ کو خاص اہمیت دیتا ہے تو یہ اہمیت مؤرخ کے اپنے ذاتی عقائد اور تعصبات کی بنا پر ہوتی ہے۔ انگریز مورخوں نے معرکہ پلاسی کو اہمیت دی کیونکہ اس معرکے کا نتیجہ انگریزوں کی خواہش کے مطابق تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ ہر مورخ کا کوئی نہ کوئی مذہب بھی ہوتا ہے اس لئے وہ اُن واقعات کو نہیں لکھتا جو اس کے

مذہبی عقائد کے خلاف پڑتے ہیں۔ عیسائی مؤرخ کے لئے یہ ماننا مشکل ہے کہ حضرت عیسیٰ صلیب پر فوت نہیں ہوئے لیکن مسلمان مؤرخ از روئے قرآن یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جو شخص صلیب پر مرا وہ حضرت عیسیٰ نہ تھے کیونکہ حضرت عیسیٰ کو خدا نے پہلے ہی زمین سے اُٹھا لیا تھا۔

اس کے علاوہ اکثر مؤرخ اُن واقعات کو حذف کر دیتے ہیں جو ان کے عقائد کے خلاف پڑتے ہیں۔ اگر لکھتا ہے تو ان واقعات کو توڑ مروڑ کر لکھتا ہے الغرض محض حق کی بنا پر تاریخ نگاری مشکل ہے۔

کیا تاریخ کی بنا پر کلیات قائم کئے جا سکتے ہیں؟

سائنس داں دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جب کبھی تم اپنی انگلی آگ میں ڈالو گے تو آگ اُنگلی کو جلا دے گی۔ کیا تاریخ داں اس قسم کا کلیہ قائم کر سکتا ہے؟ کوئی تاریخ داں کہہ سکتا ہے کہ مطلق العنان شخصی حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ممالک ایشیا میں تمام حکومتیں ہمیشہ شخصی رہیں لیکن اس کے باوجود کامیاب ہوئیں۔ سلطنت مغلیہ بابر کے زمانے سے اورنگ زیب تک یعنی ۱۵۲۶ء سے ۱۷۰۶ء تک بڑے آب و تاب سے قائم رہی۔ ابھی ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت باوجود کونسلوں کے بمشکل تمام یہ مدت طے کر سکی۔ باوجود اس کے کہ تاریخ اپنے واقعات سے کوئی ایسا کلیہ اخذ نہیں کر سکتی جس کا اطلاق ہر زمانے میں اور ہر موقع پر ہو سکے لیکن پھر بھی چند ایسے جوشیلے پرستاران تاریخ ہیں جو تاریخ کو علوم سائنس میں شمار کرتے ہیں۔ وہ یہ ثبوت پیش کرتے ہیں کہ تاریخ چند ایسے کلیئے پیش کرتی ہے جن کا اطلاق خاص حالت کے تحت ہو سکتا ہے۔ جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ سائنس کے بعض کلیئے

مشروط ہوتے ہیں۔ مثلاً ہر بادل مینہ نہیں برساتا۔ اس لئے یہ دعویٰ کرنا کہ بادل بارش کا پیش خیمہ ہے غلط ہے۔ کراچی میں بادل پورے برسات کے موسم میں رہتے ہیں لیکن یہاں سب سے کم بارش ہوتی ہے۔ سائنس محض امکانات پیش کرتی ہے۔ اس لئے بقول مؤرخین سائنس تاریخ سے افضل نہیں ہے۔

مورخین کا دعویٰ ہے کہ سائنس بھی سائنس دان کے ذاتی تاثرات سے متاثر ہوتی ہے۔ بعض سائنس دان خدا کے قائل ہوتے ہیں۔ ان کو سائنس کے کلیات بھی خدا کے وضع کردہ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح مؤرخ کا بھی کوئی نہ کوئی عقیدہ ہوتا ہے۔ مثلاً آج کل کے یوروپین مؤرخ آزادی کے حامی ہیں اس لئے وہ زمانۂ ماضی کو بھی اسی آزادی کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے زمانۂ ماضی میں ان کو آزادی کی صدا سنائی دیتی ہے۔ اشتراکیت (کمیونزم) پسند مورخوں کو زمانۂ ماضی میں بھی اشتراکیت نظر آتی ہے۔ اس طبقے کے مورخین کا دعویٰ ہے کہ انسان ہمیشہ بندۂ شکم رہا ہے اس نے ہر کام تقاضائے شکم کے تحت کیا ہے۔ حتیٰ کہ پیغمبروں نے بھی اسی تقاضہ کے تحت تکلیفیں برداشت کی ہیں خدا کے حکم کی خاطر نہیں۔ بانیٔ اشتراکیت کارل مارکس کو تاریخ میں خدا کہیں بھی نظر نہ آیا۔ کیونکہ کارل مارکس کے خیال کے بموجب انسان بندۂ شکم ہے بندۂ خدا نہیں ہے۔ اس لئے کارل مارکس مشورہ دیتا ہے کہ انسان کے لئے ہر وہ کام جائز ہے جو اس کے تقاضۂ شکم کو پورا کرے۔ اگر آزادی کا خاتمہ کر کے تقاضائے شکم پورا ہو سکتا ہے تو آزادی کو ختم کرنا بھی جائز ہے۔

اس کے برعکس اطالوی فلسفیٔ تاریخ کروچی کو تاریخ کے ہر صفحہ میں آزادی نظر آتی ہے۔ اس نے اس آزادی کی کہانی پر ایک کتاب لکھ ماری

جس کا نام اس نے "تاریخ بحیثیت افسانہ آزادی" رکھا۔

کروچی کا مقولہ ہے کہ انسان" ماضی کی تاریخ کو بھی حال کی نظر سے دیکھتا ہے" وہ صاف صاف کہتا ہے :- (حوالہ نمبر ۱)

"تاریخ نگاری کا جملہ مواد اور تاریخ پر مبنی فیصلوں کے لئے جملہ دستاویزات میرے دماغ میں موجود ہیں" یعنی میرا فیصلہ خارجی مواد پر مبنی نہیں ہوتا۔ بلکہ میں اپنے خیالات اور جذبات کی بناپر واقعات تاریخ کو منتخب کرتا ہوں اور انھیں خیالات کے بموجب میں فیصلہ کرتا ہوں۔ صاف لفظوں میں اگر کہا جائے تو گویا کروچی کہتا ہے کہ تاریخ گروں کی اچھائی یا برائی کا فیصلہ ان کی اچھائیوں اور برائیوں کی بناپر نہیں بلکہ میں اپنے پسند کے مطابق کرتا ہوں۔

یہ دماغی کیفیت صرف کروچی تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر مؤرخ اس کا شکار رہتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کروچی نے اپنی اس کمزوری کو صاف صاف بیان کر دیا۔ جب تمام مؤرخ اس کمزوری کا شکار رہے ہیں تو ان کے قائم کردہ کلیئے کس طرح سائنس کے کلیوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اشتراکی مؤرخوں کی نظر میں انسان صرف "شکم پسند" ہے مگر غیر اشتراکی مورخوں کو انسان" خدا پسند" نظر آتا ہے۔ سینٹ اگسٹائن کو عیسائیوں کا ہر کام بموجب حکم خدا نظر آیا۔ کارل مارکس کو ہر انسانی کام بموجب حکم شکم نظر آیا۔ اس لئے جو کلیات تاریخ قائم کرتی ہے ان کا اطلاق ہر زمانے میں یکساں نہیں ہوتا۔ لیکن ہم بتا چکے ہیں کہ سائنس کے قائم کردہ کلیات بھی بعض اوقات مقامی ہوتے ہیں عالمگیر نہیں ہوتے۔ کراچی میں بادل بارش کی علامت نہیں ہیں لیکن بنگال میں ہر گھٹا ٹوپ بہت مینہ

برساتی ہے۔

تاریخ میں "اتفاق" کا عنصر

جب سائنس اور تاریخ دونوں کے کلیات میں کچھ نہ کچھ خامی ہے تو تاریخ کو سائنس قرار دینا جرم نہیں۔ دونوں کے کلیات میں اتفاق کا عنصر بھی شامل ہے۔ بموجب سائنس ہر چیز زمین پر گرتی ہے لیکن بعض اوقات اس چیز اور زمین کی کشش کے درمیان اتفاق سے کوئی اور چیز حائل ہو جاتی ہے۔ اور وہ چیز زمین پر نہیں گرتی۔ اسی طرح اگر پہلی عالمگیر جنگ میں امریکہ حائل نہ ہو جاتا تو انگریزی سامراج کے پرخچے ۱۹۱۴ء ہی میں اُڑ جاتے جب سائنس اور تاریخ دونوں کے کلیات میں اتفاق کا عنصر بھی شامل ہے تو کیا وجہ ہے کہ تاریخ کے کلیات کو سائنس کے کلیات کا درجہ نہ دیا جائے موجودہ دور میں جو تحقیقات کلیات سائنس کے متعلق ہوئی اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ سائنس کے کلیات یقین پر نہیں بلکہ "اغلبیت" پر مبنی ہیں۔ اب سائنس داں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ آگ یقینی طور پر تمہاری اُنگلی کو جلا دے گی۔ ممکن ہے کہ جب تم آگ میں اُنگلی ڈالو تو "اتفاق" سے کوئی چیز تمہاری اُنگلی اور آگ کے درمیان حائل ہو جائے اور آگ اپنا کام نہ کر سکے۔ جو فلسفیانِ تاریخ خدا کے قائل ہیں وہ اس "اتفاق" کو حکمِ خداوندی قرار دیتے ہیں۔ آتشِ نمرود حضرت ابراہیم کو نہ جلا سکی کیا یہ محض اتفاق تھا یا حکمِ خداوندی تھا۔

اسی "اتفاق" کے تحت مجھ پر فلسفے کا بوجھ لادا گیا۔ قائلینِ خدا نے اتفاق کو حکمِ خداوندی پر محمول کیا۔ منکرین نے اس کو محض اتفاق کہا اور مجھ کو سائنس کا درجہ دیا۔ چنانچہ ان منکرین نے اپنا شعار بنا لیا کہ آتشِ

نمرود جیسی کہانیوں کو درج تاریخ نہ کیا جائے۔لیکن افسانہ پسندی انسان کی فطرت ہیں ہے۔ چنانچہ ہومر اور فردوسی جیسے لوگوں نے مجھے افسانے کے قالب میں ڈھالا۔ اور اسی "اتفاق" کے تحت مفتوحہ ایرانیوں نے اپنے عرب فاتحین پر اپنی فضیلت ثابت کی:-

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسیداست کار

(ان اونٹ کا دودھ پینے والے اور گو کا گوشت کھانے والے عربوں کا دماغ اتنا چل گیا ہے)

کہ تاجِ کیاں را کُند آرزو تُفو بر تو اے چرخِ گرداں تُفو!

(کہ یہ عرب اب تاجِ کیان کے آرزومند ہیں۔ اے چرخِ گرداں تجھ پہ ہزار لعنت)۔

گویا معرکۂ نہاوند میں ایرانیوں کو شکست محض "چرخِ گرداں" کے "اتفاق" سے ہوئی۔ عربوں کی شجاعت اور ایرانیوں کی نااہلی کی وجہ سے نہیں ہوئی۔لیکن میرے جو پرستار مجھ کو سائنس کا درجہ دینا چاہتے ہیں انہوں نے اتفاق کے عنصر کو ماننے سے انکار کیا۔کیونکہ ان کے زمانے میں سائنس دان خود یہ نہ جانتے تھے کہ سائنس میں بھی اتفاق کا عنصر موجود ہے۔ یہ سائنس کا ابتدائی دور تھا۔ اس لئے وہ سائنس کو قادرِ مطلق مانتے تھے۔ اور سائنس کے کلیات کو اٹل سمجھتے تھے۔ چنانچہ میرے ان سائنس پسند محرّروں نے میرے پیدا کردہ واقعات کو صرف اس غرض سے لکھا کہ ان واقعات کی بنا پر سائنس کی طرح میرے کلیات بھی قائم کئے جائیں۔

سائنس پر تاریخ کی فضیلت

میرے پرستاروں میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو مجھ کو سائنس سے

افضل سمجھا تھا۔ ان لوگوں نے میری فضیلت اس طرح ثابت کی کہ سائنس غیر ذی روح چیزوں تک محدود ہے اور صرف خاک۔ باد۔ آب و آتش سے متعلق ہے۔ برعکس اس کے میرا تعلق صرف ذی روح چیزوں سے ہی نہیں بلکہ "اشرف المخلوقات" انسان سے ہے جو آناً فاناً خلوت کو جلوت میں اور سکون کو محشر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ بقول غالب:-

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

دیول دیوی کے حُسن پر خضر خان ایسا فریفتہ ہوا کہ ایک فردِ واحد کے وارداتِ قلب سے ہزاروں انسانوں کے لئے قیامت برپا ہو گئی چنانچہ اس طبقے نے میرے متعلق دعویٰ کیا کہ تاریخ دان کا فرض ہے کہ وہ تاریخ گر کے صرف اعمال ہی بیان نہ کرے۔ یعنی صرف واقعات ہی کا ذکر نہ کرے بلکہ تاریخ گر کی نیت کا بھی جائزہ لے۔ یہ بتانا کافی نہیں کہ خضر خان نے ایک راجہ پر حملہ کیا اور ہزاروں آدمی مارے گئے۔ یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ یہ خون خضر خان کے وارداتِ قلب کی وجہ سے بہا۔ اور خضر خان کے قلب پر چوٹ مارنے والا دیول دیوی کا حُسن و جمال تھا۔

ہومر نے حسینہ ہیلن کا قصّہ لکھا اور ایک آوارہ شادی شدہ عورت کو حیاتِ جاوداں دے دی۔ میرا صحیفہ بُرے اور بھلوں کے لئے یکساں کُھلا رہتا ہے بھلوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اہلِ دل اور اہلِ عقل۔ لیکن میں اہلِ دل کو جو شہرت عطا کرتی ہوں وہ اہلِ عقل کو نہیں دیتی۔ سقراط اہلِ عقل تھا لیکن میں نے اس کو اپنے صحیفہ میں

اعلیٰ مقام اس لئے دیا کہ اس نے اپنے دل کے تقاضے کے تحت جامِ زہر نوش کیا۔ اسی طرح بعض انسانوں نے اسی دل کے تقاضے پر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ میں نے محمود غزنوی کو بقائے دوام بخشی۔ میں نے سکندر کے افسانے لکھوائے۔ کیونکہ یہ فاتح قسمت کا دھنی تھا۔ چنانچہ سکندر کے معنی خوش نصیب کے ہو گئے۔ جرأت اور ہمت کی بنا پر میں نے پیغمبروں کا نام اپنے جریدۂ عالم پر ثبت کیا لیکن جو لوگ محض ہوسِ دولت یا شہرت کی خاطر اپنا نام میرے جریدے میں ثبت کرانا چاہتے ہیں میں اُن کے ناموں کو بجائے ثبت کرنے کے مٹا دیتی ہوں۔ ابراہیمؑ کا نام میں نے اس لئے ثبت کیا کہ وہ عقل کے مشورے کے خلاف بے دھڑک آتشِ نمرود میں کود پڑے۔ میں نے موسیٰؑ کو فرعون پر سبقت دی حالانکہ فرعون جاہ وجلال میں موسیٰؑ سے کہیں زیادہ تھا۔

سائنس دل کے تقاضے نہیں بیان کر سکتی

اہلِ عقل مجھ سے پوچھتے ہیں کہ دل کے تقاضے کس طرح پیدا ہوتے ہیں؟ کیونکہ مجھے فلسفی کا لباس بھی پہنایا گیا۔ اس لئے اہلِ عقل مجھ سے یہ سوال کرتے ہیں لیکن جب اصل فلسفی دل و دماغ کے جھگڑے میں پھنس کر رہ گئے تو میں نقلی فلسفی اس سوال کا جواب کس طرح دے سکتی ہوں۔ اہلِ دل فلسفی اس سوال کا جواب یہ دیتے ہیں کہ دل خدا کا پیدا کردہ ہے کیونکہ وہ خود قلبِ انسانی میں رہتا ہے۔ اسی لئے میں نے سب سے پہلے اسی قلب میں اپنا نشیمن بنایا۔ اور انسان میں وہ نظر پیدا کی جو ماورائے عقل بھی دیکھ سکتی ہے۔ ایسے انسانوں پر بجائے عقل عشق سوار ہو جاتا ہے لیکن بقول مولانا روم :۔

عقل جزوی عشق را منکر بود گرچہ بنماید کہ صاحب سر بود
(عقل جزوی عشق کی منکر ہوتی ہے۔ گو بظاہر اہلِ عقل دانائے راز نظر آتے ہیں)

زیرک و دانا ست امانیست نیست تا فرشتہ لا نشد آہر منی است
(بظاہر اہلِ عقل دانا نظر آتا ہے لیکن درصل وہ دانا نہیں۔ فرشتہ جب تک فنا نہیں ہوتا تب تک شیطان ہے۔)

اس دنیا میں جو روشنی انسان کے لئے پیدا ہوئی جس سے انسان کو راستہ نظر آیا وہ اسی قلبِ انسانی ہی سے نکلی۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں کہ :-

کارِ مرداں روشنی و گرمی است کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است
(اہلِ دل روشنی اور گرمی پھیلاتے ہیں۔ کمینے لوگ بے شرمی پھیلاتے ہیں)

الغرض یہ ثابت ہے کہ واقعہ گرمیں نہیں بلکہ قلب انسانی ہے جہاں نیک و بد تصورات پیدا ہوتے ہیں۔ اچھے تصورات سے انسان کو فیض پہنچتا ہے۔ برُے خیالات انسان کو ضرر پہنچاتے ہیں۔ میں محض ان نیک و بد افعال کو قلم بند کرتی ہوں۔ ہر واقعہ سے پہلے اس واقعہ کا تصور پیدا ہوتا ہے لیکن تصوّرات کا پیدا ہونا ماحول پر منحصر ہے۔ برُے ماحول میں برُے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ اچھے ماحول میں اچھے خیالات رُونما ہوتے ہیں۔ ہٹلر کے زمانے کے جرمن نوجوانوں نے شکست کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ اس لئے وہ ہٹلر کے جھوٹے وعدوں کا شکار ہوئے لیکن ماحول علاوہ حوادث کے انسانی خیالات سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے میرے اہلِ نظر محرّر سب سے پہلے

انسانی خیالات کا پتہ چلاتے ہیں۔

کیا صرف خیال سے افعال پیدا ہوتے ہیں؟

جب انسانی خیالات بھی میرے حدود میں آ گئے تو مجھے لامحالہ فلسفی بننا پڑا لیکن میں ابن خلدون کی مشکور ہوں کہ اس نے بظاہر تو مجھے فلسفے میں پھنسایا لیکن ساتھ ہی اس نے میرے متعلقہ فلسفے کو اتنا وسیع کردیا کہ بعد کے مفکرین نے اس فلسفے کو علیحدہ علم بنادیا جواب "عمرانیات" (سوشیلوجی) کہلاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ علمِ عمرانیات میرے بطن سے پیدا ہوا اور ابھی تک شیر خوار ہے۔ اس لئے ماہر عمرانیات ابھی تک میرا جائزہ لیتے ہیں اور انسان کی نیک بدعادتوں کا مجھے ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ میرا کام صرف انسانی افعال کو قلم بند کرنا ہے۔ پہلے تو میں صرف افعال کو قلم بند کرتی تھی لیکن جب سے تصوراتِ انسانی میرے سپرد کئے گئے تب سے "خیال نویسی" بھی میرے سپرد ہوئی۔ لیکن انسانی خیال جذبات۔ احساسات۔ سنی کا معجون مرکب ہے۔ جس میں انسانی یعنی عقلی دلائل بھی شامل ہیں۔ خیال گویا تمام تجرباتِ زندگی کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس تجربے میں جذبات اور احساسات غالب ہیں۔ مؤرخ خیالات کا عکس تو اتار سکتا ہے لیکن گذشتہ زمانے کے لوگوں کے جذبات اور احساسات کو زندہ کرنا مشکل ہے۔ مثلاً جب کوئی مؤرخ سنہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم ہند کا ذکر کرے گا تو انگریزوں کے اعلان تقسیم اور ان ملکوں کے نئے حدود کا نقشہ تو بڑی آسانی سے پیش کردے گا لیکن اس ہلچل میں جو لاکھوں انسان بے گھر ہوئے اور ہزاروں خاندان تہ تیغ ہوئے اور باقی ماندہ کس حالت میں پہنچے اور ان کے دلوں پر کیا گذری؟ ان سب باتوں کا بیان مؤرخ کے بس کے

باہر ہے۔ کیونکہ مؤرخ کی خاطر ہندوستان کو دوبارہ تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

سائنس دان کو جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو وہ سائنس کی تجربہ گاہ میں جا کر تجربہ کر لیتا ہے اور اس کے شکوک دور ہو جاتے ہیں لیکن مؤرخ کو کوئی تجربہ گاہ میسر نہیں جہاں وہ ۱۹۴۷ء کے واقعات پیدا کر کے مظلوموں کے دل کے حال معلوم کر سکے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتا ہے کہ مظلوموں کے پوتے نواسوں سے ان کے دادا اور نانا کے بیان معلوم کرے۔ لیکن بقول شخصے

"شنیدہ کہ بود مانند دیدہ"

کوئی مورخ زمانہ ماضی کو اس طرح زندہ نہیں کر سکتا کہ مصیبت زدہ لوگوں کے احساسات بھی سامنے آجائیں اور مؤرخ کے دل پر بھی وہی گذرے جو مصیبت زدہ لوگوں کے دل پر گذری تھی۔ لڑائیوں کے پس منظر تو ڈرامائی صورت میں پیش کئے جا سکتے ہیں لیکن معاشی حالات حدود ڈرامہ سے باہر ہیں۔ یہ کس طرح ثابت کیا جائے کہ سکھوں نے جب مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کا خون بہایا تو ان کی نیت گرو گوبند سنگھ کی موت کا بدلہ لینا تھا یا مسلمانوں کے مال پر قبضہ کرنا مقصود تھا۔ خیال اور افعال کا پتہ چلانا تو آسان ہے لیکن نیت کا پتہ چلانا مشکل ہے جب اورنگ زیب نے شیواجی کو گرفتار کرایا تو اورنگ زیب کی نیت کیا تھی؟ کیا وہ محض ملک میں امن و امان قائم کرنا چاہتا تھا یا ہندو دھرم کی بیخ کنی کرنا اس کا مقصد تھا۔ اگر اورنگ زیب ہندو دھرم کو مٹانا چاہتا تھا تو اس نے ہندوؤں کو چند مراعات کیوں دیں؟

نیت معلوم کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے وہ یہ کہ فاعل کے خیالات اور افعال معلوم کئے جائیں۔ لیکن پرانے زمانے کے حکمران اور

وزراء آج کل کی طرح اپنی آپ بیتی سرگذشت نہیں لکھ سکتے تھے۔ اس لئے ان کے خیالات کے معلوم کرنے کا صرف یہی ذریعہ ہے کہ ان کے افعال سے ان کی نیت کا اندازہ لگایا جائے۔ لیکن اس میں ایک بڑی دقت پیدا ہوتی ہے۔ پُرانے زمانے کے مؤرخ مجھ سے بیوفائی کر کے بادشاہوں نوکر ہو گئے تھے اور بجائے میری خوشنودی کے اپنے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے آقاؤں کے ایسے اعمال جن سے بدنیتی ظاہر ہو بالکل حذف کر دیتے تھے۔

اگر تاریخ کو صرف خیالات تک محدود کر دیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ انسانی افعال کا سرچشمہ صرف خیالات ہیں تو ہمیں حوادث آسمانی معلوم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان حوادث سے بھی انسان کی زندگی اور اس کے افعال متاثر ہوتے ہیں۔ وسط ایشیا کے لوگوں کو بوجہ خشک سالی وطن ترک کرنا پڑا اور انہوں نے ہندوستان کا رُخ کیا جہاں کی سرزمین بڑی زرخیز تھی۔ گویا ایک آسمانی حادثے سے صرف وسط ایشیا کے لوگوں ہی کی زندگی متاثر نہیں ہوئی بلکہ اہلِ ہند بھی اغیار کے غلام ہو گئے۔ یہ صحیح ہے کہ کہ بعض اوقات ایک شخص کے خیال سے ایک پوری قوم تہ و بالا ہو جاتی ہے۔ محمود غزنوی کے خیالِ جہاد نے ہندوؤں کو اس طرح بدحال کر دیا کہ جب تقریباً دو سو سال بعد شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر یورش شروع کی تو محمود غزنوی کی پیدا کردہ بدحواسی کی وجہ سے ہندو مقابلے کی تاب نہ لا سکے اور ہندوؤں کی معاشیات بھی زد میں آ گئیں اور محمود غزنوی کے محض ایک خیال کی بدولت مسلمانوں کی سلطنت ہندوستان

میں قائم ہوئی۔ جو کم از کم ۱۲۰۰ء سے ۱۷۰۷ء تک بڑی آب و تاب سے قائم رہی۔

واقعہ گر تاریخ ہے یا افراد ہیں؟

چنانچہ میرے پرستاروں میں ایک طبقہ ہے جس کا خیال ہے کہ اصل واقعہ گر قوم نہیں بلکہ محض چند افراد ہوتے ہیں۔ ایک محمود غزنوی نے ہندوستان کو اس طرح تہ و بالا کر دیا کہ اس کے اثرات سے ایک ہزار سال بعد پاکستان نمودار ہوا۔ اسی طرح ایک فردِ واحد نیپولین نے صرف یورپ ہی کو تہ و بالا نہ کیا بلکہ مصر میں قدم رکھ کر پورے مشرق کو مغربی تہذیب کا چسکا لگا دیا۔ نیپولین صرف تین سال مصر میں رہا لیکن بعد میں محمد علی پاشا (والیٔ مصر ۱۸۰۵ء تا ۱۸۴۸ء) نے جو نظم جدید قائم کیا وہ نیپولین ہی کی بدولت تھا۔ (حوالہ نمبر ۲)

جس خیال کے تحت محمود غزنوی اُٹھا اور نیپولین نے یورپ کا تختہ اُلٹا۔ اس قسم کے خیال کا مخرج کیا ہے؟ کیا یہ خیال محض ان کے دماغوں سے نکلا؟ میرا دعویٰ ہے کہ اس "خیال انگیزی" کا سہرا میرے سر ہے۔ محمود غزنوی میرے صحیفے کا بغور مطالعہ کرتا تھا۔ اسی طرح نیپولین کو لڑکپن ہی سے "تاریخ گر" بننے کا شوق تھا۔ اور اسی نیت سے وہ میرے صحیفے کا مطالعہ کرتا تھا۔ (حوالہ نمبر ۳)

اس کے علاوہ ہر زمانے کی ایک علیحدہ فضا ہوتی ہے۔ محمود غزنوی کے زمانے میں مجاہد سب سے زیادہ محترم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس کے زمانے میں جو لوگ پیدا ہوتے ان کا مقصدِ زندگی جہاد ہوتا تھا۔ اسی طرح نیپولین کے زمانے میں آزادی کا چرچا تھا لیکن نیپولین کا اپنا وطن کارسیکا

اغیار کی غلامی میں تھا۔ اس لئے نپولین نے سپہ گری اس غرض سے اختیار کی کہ اپنے وطن کو کسی دن آزاد کرائے۔ زمانے کی فضائیں ہی خیالات پیدا کرتی ہیں۔

میرا صحیفۂ مشرق تو اسی "خیال انگیزی" کی کہانی ہے۔ تمام انبیا مشرق ہی سے پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے خیال کے زور پر رائج الوقت ماحول تک کو بدل دیا۔ پیغمبر اسلام کے پیروؤں نے صرف ایشیا ہی کو نہیں بلکہ مغرب کو بھی اپنے خیالات سے متاثر کیا۔ میدانِ سیاست میں تو افراد ہی کا راج رہا۔

دولتِ مغلیہ کی بنیاد کا سہرا ایک فردِ واحد بابر کے سر ہے۔ دولتِ عثمانیہ بھی ایک فردِ واحد عثمان خاں نامی نے قائم کی۔ اہلِ مغرب اور خصوصاً امریکی قوم کی صدا بلند کرتے ہیں۔ لیکن کیا امریکہ کو دنیا پر تسلط حاصل ہوتا اگر ایک فردِ واحد روزویلٹ دوسری عالمگیر جنگ میں اپنی قوم کو اس لڑائی میں نہ جھونک دیتا۔ آج بھی محض ایک فردِ واحد صدر جانسن اپنی قوم سے کمزور ویٹ نام پہ حملے کرا رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تاریخ گری کے دعویدار افراد اپنے خیالات کہاں سے لیتے ہیں؟ بیشک مشرق کے واقعہ گر محض چند افراد ہیں لیکن یہ افراد میرے ہی مرہونِ منّت ہیں۔ بعض نے محض اپنے ماحول سے متاثر ہو کر واقعہ گری شروع کی۔ لیکن یہ ماحول میرا ہی پیدا کردہ تھا۔ بعض نے شمشیر زنی محض اس خیال سے شروع کی کہ ان کے نام میرے صحیفے میں درج کئے جائیں۔ اور میری بدولت ان کو شہرتِ دوام حاصل ہو۔ البتہ انبیاء کو شہرتِ دوام کی ہوس نہ تھی لیکن ان میں جرأت و ہمت ایک خیال ہی کے تحت پیدا

ہوئی جس کو وہ "پیغامِ الٰہی" کہتے تھے۔

الغرض انسانی افعال خیال ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لئے مجھے اپنے صحیفے میں انسانی خیال کو اعلیٰ مقام دینا پڑتا ہے۔ اسی "خیال نویسی" کی بدولت مجھے فلسفی بننا پڑا۔ لیکن اس خیال نویسی کی خاطر جو دقتیں میرے محرّروں کو پیش آئیں وہ میں اوپر بیان کر چکی ہوں۔ ان دقتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ مؤرخ گذشتہ لوگوں کے دل کا بھید نہیں معلوم کر سکتا۔ ہر مؤرخ اپنے زمانے کا پیداوار ہوتا ہے۔ مغربی مؤرخ محمود غزنوی کے خیال جہاد تک نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ ان کے ماحول میں مذہب پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ لیکن انسان کا خیال سے چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال کے تحت انسان نے سینکڑوں بُت تراشے اور اپنے خیال کے تحت اس نے ان بُتوں کے آگے سر جھکائے۔ اہلِ مغرب باوجود اپنی "آزاد خیالی" آج بھی قوم کے بُت کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ قوم پرستی بھی بلاشبہ بت پرستی ہے۔ قومی جھنڈا اسی قوم پرستی کے تحت نمودار ہوا۔ قومی ترانے اسی بت کی حمد و ثنا ہیں۔ اس قوم پرستی نے میرے محرّروں کو بھی ستیاناس کیا اور بجائے حق پرستی وہ قوم پرستی کرنے لگے۔ اور میرے پرانے صحیفوں کو قوم پرستی کے سانچے میں ڈھالا۔ ہندو قوم پرست "مورخوں" کو شیواجی اب ہندوؤں کی آزادی کا علمبردار نظر آتا ہے۔ واقعات تو بدلے نہیں جا سکتے لیکن تاویل بازی کا خدا بھلا کرے انہیں واقعات کو توڑ مروڑ کر نئی تاویلیں پیدا کی جا سکتی ہیں۔

بیانِ اسباب بھی میرے سپرد کیا گیا۔ لیکن اس بیانِ اسباب نے تاویل بازی کا دروازہ اس طرح کھول دیا کہ اب کوئی اس دروازے کو

بند نہیں کر سکتا۔ میرے محرّر مجھ کو تاویل بازی میں مبتلا نہ کرتے۔ اگر مجھ پر فلسفہ کا بار نہ لادا جاتا۔ غضب یہ ہے کہ اسی فلسفے کی آڑ میں وکیلوں کی طرح میرے محرّر بھی سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمان مؤرخوں کی نظر میں شیواجی محض ایک لیٹرا ہے لیکن ہندو مورخوں کے خیال کے بموجب وہ آزادی کا علمبردار ہے۔ اسی تاویل بازی کی وجہ سے ہر زمانے میں پرانے زمانے کی بھی "نئی" تاریخ لکھی جاتی ہے۔ شاید اسی لئے میرے بُت کے ہاتھ میں کورا کاغذ دیا گیا تھا تاکہ ہر شخص جو چاہے اس پر لکھ سکے۔ اسی بنا پر نپولین اور ہینری فورڈ جیسے عمل پسند لوگوں نے مجھے افسانہ گو قرار دیا اور مجھ پر دروغ گوئی کی تہمت لگائی۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی مُردے کی نیت معلوم کرنا زندوں کے بس میں نہیں۔ لاش کے ساتھ اس کی نیت بھی دفن ہو جاتی ہے۔ صرف اس کے اعمال کی کہانی" باقی رہ جاتی ہے اور وہ بھی دوسروں کی لکھی ہوئی یہ کہانی نگار محض اہلِ قلم ہوتے ہیں۔ ان کو نہ سیاست سے واسطہ ہوتا ہے نہ سیف سے۔ تاریخ نگاری تو دراصل تاریخ گر ہی کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس تاریخ گر میں اتنی جرأت ہو کہ اپنی ناکامیوں کو بھی صاف صاف بیان کر دے لیکن ایسے صاف گو دُنیا میں شاذونادر ہی ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر میں خود نوشتہ سرگذشت کا رواج عام ہو گیا ہے لیکن یہ سرگذشت دراصل "معذرت نامہ" ہیں۔ بعض اوقات لوگ مُردوں کی طرف سے مجھے معذرت نامہ لکھتے ہیں۔ اور ان مُردوں کو بے گناہ یا گنہگار ثابت کرتے ہیں لیکن ان معذرت ناموں میں جو چیز آشکارا ہوتی ہے وہ مُردے کی نیت نہیں بلکہ مصنف کی اپنی نیت ہوتی ہے

سوانح نگاری بیشتر معذرت پر ہی مبنی ہے۔ سوانح نگاری کا ذکر میں آگے چل کر کروں گی۔ یہاں میں خود ناویل بازی میں مبتلا ہوں اور اپنے محرّروں کی نیت معلوم کرنا چاہتی ہوں لیکن یہ محرّر خواہ تاریخ نگار ہوں یا سوانح نگار اس دنیا سے جا چکے ہیں۔

خیال کا سرچشمہ یعنی نیت

بیشک خیال سے افعال پیدا ہوتے ہیں لیکن خیال بھی نیت کا محتاج ہے۔ بُری نیت سے اچھے افعال نہیں پیدا ہو سکتے۔ اس کے علاوہ ایک ہی نیت ایک فرقے کی نظر میں اچھی ہے دوسرے فرقے کی نظر میں وہی نیت بُری ہے۔ محمود غزنوی کی نیتِ جہاد مسلمانوں کی نظر میں اچھی تھی لیکن ہندوؤں کو اس سے سخت نقصان پہنچا۔ اب سوال یہ ہے کہ مُردوں کی نیت کس طرح معلوم کی جائے؟ کیا مورخ اپنی نیت کے ذریعہ مُردوں کی نیت بھی معلوم کر سکتا ہے؟ مسلمان تو محمود غزنوی کی نیت کا اندازہ کر سکتے ہیں لیکن ہندوؤں کے لئے یہ ممکن نہیں۔ اسی طرح ہندو مورخ خود اپنی نیت کے جال میں ہے۔ وہ کسی طرح محمود غزنوی کو مجاہد فی سبیل اللہ نہیں مان سکتا۔ اسی طرح مغربی مؤرخ کے لئے بھی محمود غزنوی معمّہ ہے۔ کیونکہ عیسائی تصوّرِ جہاد سے بالکل ناآشنا ہیں۔ محمود غزنوی کی نیت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ مؤرخ اسلام سے صرف واقفیت ہی نہ رکھتا ہو بلکہ اسلام کے روشن پہلو سے بخوبی واقف ہو اور اس مذہب سے مانوس ہو اور ساتھ ہی ہندو مذہب کی خامیوں اور خوبیوں کو بھی جانتا ہو کیونکہ محمود غزنوی کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ باطل عقیدوں کو مٹانا چاہتا ہے۔

لیکن عقیدہ صرف عقل پر ہی مبنی نہیں ہوتا۔ عقیدے میں جذبات کا بھی عنصر ہوتا ہے اس لئے ہندوؤں کا عقیدہ معلوم کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہندو تہذیب کس حد تک جذبات پر مبنی تھی۔ اگر مذہب کی بنیاد صرف عقل پر ہوتی تو پوری دُنیا میں صرف ایک مذہب ہوتا۔ مذہب میں وطنیت کا بھی عنصر شامل ہے۔ چنانچہ ہندو بقول البیرونی صرف اپنے مذہب ہی کو لاثانی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اپنے ملک کو بھی بے نظیر قرار دیتے تھے۔ الغرض مذہب کا تعلق ذہنیت سے ہے۔

تاریخ کا وسیع میدان

ذہنیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مؤرخ انسانی نفسیات سے بھی واقف ہو۔ ذہنیت رائج الوقت عقیدوں سے پیدا ہوتی ہے۔ عقیدے خود مختلف تحریکوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ عرب مسلمان ہونے کے بعد اپنے جاہلیہ دور سے شرمانے لگے اور تحریکِ اسلام کو عربوں نے اپنا شعار بنالیا۔ اسی طرح جرمنوں کو پہلی عالمگیر جنگ کی شکست سے ایسی شرمندگی ہوئی کہ انہوں نے اس شکست کا بدلہ لینا اپنا عقیدہ بنا لیا اور ہٹلر کو اپنا "پیغمبر" قرار دیا۔ ہٹلر کی دست درازی کو ہم اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب ہم کو جرمن قوم کے اس وقت کے عقائد معلوم ہوں۔

لیکن بعض تحریکیں از خود بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ سرمایہ داری کا کوئی "پیغمبر" نہ تھا۔ اگر سرمایہ داری کو تحریک کا نام دیا جا سکتا ہے تو یہ محض سرمایہ داروں کی پیدا کردہ تھی جنہوں نے اپنی ذاتی منفعت کے لئے کارخانے قائم کئے۔ اور مفلسوں کی مفلسی سے فائدہ اٹھاکر خود مالدار ہو گئے اسی طرح محض چند انگریز سامراجیوں نے یہ تحریک اٹھائی کہ ہم سامراج

صرف اس لئے قائم کر رہے ہیں کہ ہم "خدمتِ مخلوق" کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ٹھیٹھ انگریزی ترکیب تھی لیکن یہ چند انگریز سامراجی دُنیا کی آنکھوں میں خاک نہ ڈال سکے۔

بعض تحریکیں ایسی ہوتی ہیں جن کو جوابی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی سابقہ "تحریک" کی خرابی دور کرنے کے لئے ظہور میں آتی ہیں۔ گو سرمایہ داری باضابطہ تحریک نہ تھی بلکہ محض چند خود غرضوں کی قائم کردہ تھی لیکن اس سرمایہ داری سے ہزاروں لوگوں پر مصیبتیں آئیں۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی اس کی زد میں آئے۔ چنانچہ سرمایہ داری کے خلاف ایک تحریک کارل مارکس نے چلائی جو اشتراکیت کے نام سے موسوم ہے۔ باضابطہ اور عوامی تحریک کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کا عقیدہ بن جاتی ہے۔ اور اس عقیدے کی خاطر اس کے حامی سرفروشی پر تیار ہو جاتے ہیں۔ تحریکِ اسلام اس کی بہترین مثال ہے۔ جس نے اپنے حامیوں میں "شہادت" کا تصوّر پیدا کیا گویا جو کوئی بھی اسلام کی خاطر جان دیتا تھا وہ شہید کہلاتا تھا۔

اسی طرح چند انگریزوں کی قائم کردہ سامراجیت کے خلاف انگریزوں کے زیرِ نگیں علاقوں میں جوابی تحریک بنام "تحریکِ آزادی" شروع ہوئی گاندھی اس جوابی تحریک کا مہاتما بنا۔ گاندھی کے پرستاروں پر بھی شوق "شہادت" سوار ہوا اور بالآخر انگریزوں کو ہندوستان سے فرار ہونا پڑا۔

تحریکوں سے انسانی ذہنیت کس طرح متاثر ہوتی ہے اس کے لئے مؤرخ کو علم نفسیات جاننا ضروری ہے۔ لیکن جب سے میرے سر فلسفہ تھوپا گیا ہے تب سے میرے محرّروں کو قدم قدم پر دقّتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تحریکوں کی کامیابی کا راز معلوم کرنے کے لئے صرف علم النفس ہی کافی

نہیں ہے۔ بعض تحریکیں خانہ بدوش قوموں کے خروج کی شکل میں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے خروج کا باعث معاشی ضرورت ہوتا ہے۔ جب بنی اُمیّہ کے دور میں عربوں نے خروج کیا تو اس کا باعث یہ تھا کہ عربوں کی ضروریاتِ زندگی اُن کا ریگستانی علاقہ مہیا نہ کر سکتا تھا اسی طرح اور اسی معاشی ضرورت کے تحت یعنی "شکم علیہ السلام کے تقاضے پر" تُرک ترکستان سے اُٹھے اور ایک صدی کے اندر اندر ہندوستان سے لے کر بلادِ روم تک پھیل گئے۔ جب کسی قوم کے معاون شکم اور عقیدہ دونوں ہو جاتے ہیں تو ایک اور ایک گیارہ کا مضمون ہو جاتا ہے اور ایسی قوم کے سیلاب کو کوئی نہیں روک سکتا۔

ایسی تحریکِ خروج کو سمجھنے کے لئے مؤرخ کے لئے علم معاشیات جاننا بھی ضروری ہے۔ اب گویا اس فلسفے میں جو مجھ پر لادا گیا دیگر غیر فلسفیانہ علوم بھی شامل ہوئے۔ مؤرخ شاید فلسفی تو بن سکے لیکن وہ ہر علم کا ماہر کس طرح ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ مؤرخ کے لئے علمِ حیوانات بھی لازم ہے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز نے اپنی "خاکہ تاریخ" کو اس زمانے سے شروع کیا جب انسان کیڑے مکوڑوں کی صورت میں تھا۔ کیونکہ اس مصنّف کے نظریئے کے مطابق انسان کا قدرتی ماحول اس کے انسانیت اختیار کرنے سے پہلے ہی قائم ہو چکا تھا۔ اور اسی ماحول کے مطابق انسان نے روزی کے ذریعے تلاش کئے۔ چنانچہ ویلز نے اپنی کتاب کے تیسرے باب میں ان کیڑے مکوڑوں کا ذکر بھی کیا ہے جو حضرت انسان کے مورثِ اعلیٰ تھے۔ انسان کے روزی کے طریقوں نے تمام واقعات تاریخ کا بیج بویا۔ گویا اس مؤرخ نے میرے محرّروں کے لئے سائنس دانی

بھی لازم کر دی۔ علم معاشیات بھی سائنس میں شمار کیا جاتا ہے۔ (حوالہ نمبر۲۴)

ماہرینِ معاشیات کا دعویٰ ہے کہ اصل واقعہ گرشکم انسان ہے۔ اگر ہندوستان کے حملہ آوروں کو (آریا قوم سے لے کر انگریزوں تک) اپنے ملک میں پیٹ بھر روٹی مل جاتی تو ہندوستان آج تک گونڈ۔ بھیل اور دڑاوری اقوام کے ہاتھ میں رہتا۔ چونکہ انسان کے مورثِ اعلیٰ بقول ڈارون حیوان تھے اس لئے بقول ویلز حیوانات کا علم بھی مؤرخ کے لئے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی انسانوں میں چنگیز خان اور ہٹلر جیسے حیوان بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو اپنے اثرِ صحبت سے اپنے حامیوں کو دورِ حیوانیت میں واپس لے جاتے ہیں۔

یہ جملہ علومِ مورخ کے لئے اس لئے لازمی کئے گئے کہ تاریخ کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو کے لئے ان علوم کی ضرورت ہے۔ تاریخ میں جنگوں اور معرکوں کا بھی حال ہوتا ہے۔ اس لئے مؤرخ کو فوجی علوم سے بھی واقف ہونا چاہیئے۔ تاریخ کا سیاسی پہلو سمجھنے کے لئے علم تدبیر مملکت بھی مورخ کو جاننا چاہیئے۔ اسی طرح زبان اور فنون بھی جزوِ تاریخ ہیں۔ جو انسان کے ساتھ ساتھ ترقی کرتے ہیں۔

الغرض جوں جوں انسان کا ذہن وسیع ہوتا گیا اسی حساب سے میرا میدان بھی وسیع ہوا۔ لیکن میری گاڑی جہاں اٹکی وہ حضرت انسان کی ذہنیت تھی۔ انسان نے سمندروں میں غوطے مار کے ان کی گہرائیوں کا پتہ چلا لیا۔ لیکن اپنے دل کی گہرائیوں کا پتہ نہ چلا سکا۔ بقول شاعرؔ

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک قطرۂ خوں نکلا!

علمِ نفسیات کی خامیاں

چنانچہ انسان کا دل اس کے دماغ کے خلاف ہمیشہ بغاوت کرتا رہتا ہے۔
انسان کا دماغ جہاں عقل رہتی ہے انسان کو جنگ کے خطروں سے اور جنگ کی بربادی سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن انسان کا دل جہاں جذبات جاگزیں ہیں لڑائی کا شیدا ہے۔ اہلِ مغرب کا دعویٰ ہے کہ وہ عقل کے پیرو ہیں۔ لیکن یہی اہلِ مغرب اپنی بربادی کا سامان ہر وقت تیار کرتے رہتے ہیں۔ ایٹم بمب انہیں عقل کے پرستاروں نے بنایا۔ مشرقی اہلِ دل ہمیشہ عقل کی مذمت کرتے ہیں ہیں۔ بقول مولانا رُوم

عقل را بفروش حیرانی بخر
عقل تزویر است حیرانی نظر

(عقل کو فروخت کر کے اس کے بدلے دل کی حیرانی خرید۔ عقل دھوکہ دیتی ہے دل نظر پیدا کرتا ہے)۔

جذبات جو دل سے پیدا ہوتے ہیں وہ دو قسم کے ہیں جو نفسِ امّارہ سے پیدا ہوتے ہیں وہ جذبات انسان کو لڑائی میں ڈھکیلتے ہیں۔ جو نفسِ مطمئنّہ سے پیدا ہوتے ہیں وہ امن و امان کی تلقین کرتے ہیں۔ الغرض انسان اپنے نفس کا تابع ہے عقل کا نہیں۔ مؤرخ کی گاڑی اسی نفسیاتِ انسانی میں پھنس جاتی ہے۔ مؤرخ یہ تو جانتا ہے کہ ہٹلر اور چنگیز خان پیدا ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے علم نفسیات کی بنا پر یہ نہیں بتا سکتا کہ اگلا ہٹلر اور چنگیز خان کہاں سے اور کس صورت میں پیدا ہو گا؟

انسان کا علم اپنے نفس کے متعلق بیکار ہو جاتا ہے۔ جب اس علم میں آرزو اور تمنّا داخل ہو جاتی ہے۔ جرمن قوم آخر وقت تک اس مغالطے

میں رہی کہ فتح ہماری ہی ہوگی۔ گاندھی کی تمنائے آزادی نے ہندی مسلمانوں کے دل میں بھی تمنائے آزادی پیدا کی لیکن گاندھی اپنی تمنا میں اس بُری طرح غرق ہو گیا کہ اس کو مسلمانوں کی تمنا نظر نہ آئی۔ بے لوث نظر انسان کی قسمت ہی میں نہیں۔ بقول شاعر:-

نہ ہو شوق جس میں شامل وہ نظر کہاں سے لاؤں

یہ شوق علمِ نفسیات کو بیکار کر دیتا ہے۔ جب انسان زندوں کے واردات قلب معلوم کرنے سے معذور ہے تو وہ سکندر اور محمود غزنوی کے حالتِ قلب کا کس طرح اندازہ لگا سکتا ہے۔ مسلمان محمود غزنوی کو بہ نظر شوق دیکھتے ہیں۔ ہندو بہ نظرِ نفرت۔ محمود غزنوی خود معلوم نہ کر سکا کہ ہندو اپنی قدیم بُت پرستی کو محض دہشت انگیزی کی وجہ سے نہیں چھوڑ سکتے۔ چنانچہ جب محمود کے حملے ختم ہوئے تو سومنات پھر آباد کیا گیا۔

بیشک ہماری اس دنیا میں نئی نئی تحریکیں اٹھتی رہتی ہیں لیکن کوئی نئی تحریک پُرانے نقوش کو یکسر نہیں مٹا سکتی۔ جب گاندھی نے نئی تحریک آزادی چلائی تو اس مہاتما کو یہ خیال نہ آیا کہ ہندو دل و دماغ پر صدیوں سے پُرانے نقوش ذات پات موجود ہیں۔ مسلمانوں کے دلوں پر اپنے پانچسو سالہ حکومت کے اثرات قائم ہیں۔ وہ اپنے مفتوحوں کی حکومت کو کس طرح قبول کریں گے۔ چنانچہ جب انگریز فرار ہوئے اور ہندوستان آزاد ہوا تو یہ پُرانے نقوش پھر اُبھرے۔ بھارت ماتا کے ٹکڑے ہوئے۔ مرہٹوں کے دلوں پر شیواجی کے نقوش موجود تھے۔ سکھوں کے دلوں پر رنجیت سنگھ قابض تھا۔ چنانچہ مہاراشٹرا اور پنجابی صوبوں کا ظہور ہوا۔

اسی طرح علم نفسیات کی ایک اور خامی بھی ہے۔ انسان یہ معلوم نہیں کرسکتا کہ کل اس کی نیت کیا ہوگی۔ وہ آج کے دھندوں میں اس طرح منہمک ہوجاتا ہے کہ کل کی خبر نہیں رہتی۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جو لوگ آج آزادی کے حامی ہیں وہ آزادی حاصل کرنے کے بعد دوسروں کی آزادی علب کرتے ہیں۔ انقلاب فرانس واقع ۱۷۸۹ء کا نعرہ "برادری اور آزادی" تھا لیکن چند سالوں کے اندر ہی یہی فرانسیسی نپولین کی قیادت میں دوسرے ملکوں کی آزادی سلب کرنے لگے۔ نپولین کے خاتمے کے بعد اسی فرانس نے الجزائر اور مراکش کی آزادی پر ہاتھ مارا۔ اسی طرح ہندو "آزاد" ہوکر کشمیر پر ٹوٹ پڑے۔

الغرض انسان اپنے دل کی گہرائیوں کا پتہ نہیں چلاسکتا۔ اور مورخ علم النفس پر قادر ہونے کے بعد بھی ماضی کی گہرائیوں میں نہیں جاسکتا۔ وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ سکندر کی نیت درحقیقت کیا تھی۔ کیا وہ محض اپنی سلطنت کو وسیع کرنا چاہتا تھا یا یونانی تہذیب کا علمبردار تھا؟ زمانہ ماضی کا مشاہدہ بجز ہم عصر مورخ کوئی اور مورخ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ بعد العصر یا قریب العہد مورخوں کو پرانی تاریخوں کو معتبر ماننا پڑتا ہے لیکن کیا یہ "معتبر" مورخ آج کل کے مورخوں کی طرح علم النفس پر قادر تھے؟ کیا یہ فطرت انسانی کے مختلف پہلو جانتے تھے؟ اگر نہیں جانتے تھے تو کیا ان کی تاویلیں قابل اعتماد ہیں؟ اورنگ زیب کے زمانے کے مورخوں کی نوشتہ تاریخیں پڑھنے سے مسلمانوں کے جذبات تو معلوم ہوجاتے ہیں لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ہندو شیواجی کو علمبردار ہندو آزادی سمجھتے تھے یا محض لٹیرا۔

درحقیقت زمانۂ حال کے لوگ خواہ مورخ ہوں یا ادیب، زمانۂ ماضی

کو اس کے اپنے رنگ میں نہیں دیکھ سکتے۔ اگر دیکھ بھی سکیں تو یہ رنگ اُن کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہر زمانے کا اپنا رنگ ہوتا ہے گو پچھلا رنگ زمانۂ حال کے رنگ میں بھی شامل ہوتا ہے۔ بعض ماہرین علم النفس کا تو یہ دعویٰ ہے کہ جس کو ہم فطرتِ انسانی کہتے ہیں وہ بھی زمانے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

فطرتِ انسانی میں جو رحم و کرم کا مادّہ ہے وہ جنگ کے دَوران میں مفقود ہو جاتا ہے۔ جن قوموں کو حصولِ روزی کے لئے سخت محنت مشقّت کرنی پڑتی ہے وہ سنگ دل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان تبدیلیوں اور فرق کے باوجود فطرتِ انسانی میں چند چیزیں ایسی ہیں جو نہیں بدلتیں۔ مثلاً بھوک اور پیاس۔ تقاضۂ شہوت۔ تقاضۂ نام و نمو۔ اگر فطرتِ انسان یکسر بدل جائے تو تاریخ کا مطالعہ بالکل بیکار ہو جاتا ہے۔

لیکن بلا شبہ انسان کے معیار ضرور بدلتے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں اگر کوئی شخص ہر وقت مصروفِ عبادت رہتا تھا تو لوگ اس کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ قرونِ وسطیٰ کے مؤرخوں نے ان زاہد اور عابد لوگوں کو انسانیت کا معیار بنایا۔ لیکن زمانۂ حال میں زاہد و عابد کے بھوکے مرنے کا امکان ہے۔ اس لئے ہمارے زمانے میں زُہد و عبادت کی جگہ خدمتِ خلق نے لے لی ہے۔ اب ہم زاہد و عابد کی اتنی عزّت نہیں کرتے جتنی کہ ہم یتیم خانوں کے بانیوں کی کرتے ہیں۔ اس لئے ہم پرانی تاریخوں کے محترموں کو اس نظر سے نہیں دیکھتے جس نظر سے ان محترموں کو ان کے ہم عصر دیکھتے تھے۔ یعنی ہر زمانے میں عیب و صواب کا تصوّر رائج الوقت رواج کے مطابق ہوتا ہے۔

اب تک تو میں نے صرف یہ بتایا ہے کہ مجھ پر فلسفہ کس طرح لادا گیا۔ تاکہ اہلِ عقل مجھ کو علومِ عقلیہ میں شمار کریں۔ گویا ان اہلِ عقل نے مجھ کو سائنس کے سانچے میں ڈھالنے کی خاطر میرے میدان کو وسیع کیا۔ اہلِ دل کو مجھ میں حکمِ خداوندی نظر آیا۔ اور انہوں نے میرے پیدا کردہ واقعات کو حکمِ خداوندی سے منسوب کیا۔ اہلِ عقل نے میرے محرّروں کے لئے علمِ نفسیات لازم ٹھہرایا۔ تاکہ میرے محرّر ہر واقعہ کو فطرتِ انسانی کی کسوٹی پر پرکھ سکیں اور کوئی بات خلافِ عقل اپنے صحیفوں میں درج نہ کریں لیکن اہلِ دل کشف و کرامت کے قائل تھے۔

مجھ پر فلسفہ کیوں لادا گیا؟

جس معاملے میں اہلِ عقل اور اہلِ دل کا تصادم ہوا وہ قوموں کے عروج و زوال کا مسئلہ تھا۔ عاقل و دانا دعویٰ کرتے تھے کہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کو عقل سمجھ سکتی ہے۔ کیونکہ عروج و زوال کے اسباب "قانونِ فطرت" پر مبنی ہیں اور یہ قانون ہمیشہ کارگر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ قوانینِ فطرت انسانی عقل کے تراشیدہ ہیں۔ اس لئے اہلِ دل ان کو قبول نہیں کر سکتے تھے ان اہلِ دل کے نزدیک حکمِ خدا آگ کی فطرت کو بھی بدل سکتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کے نزدیک زوال گناہوں کی سزا ہے اور عروج نیک اعمال کی جزا ہے۔

جب مورخوں نے اسباب عروج و زوال کو بھی میرے حدود میں شامل کیا تو اہلِ عقل اور اہلِ دل کے درمیان تصادم اور بڑھا۔ اور اب مجھ پر فلسفۂ الٰہیات پوری طرح ٹھونسا گیا۔ اہلِ عقل کے بیان کردہ اسباب زوال و عروج سے اہلِ دل مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے درمیان کا اختلاف اقرار و انکار خدا پر مبنی تھا۔ عقیدہ خُدا کا قرار کرتا تھا۔ عقل خدا کی مُنکر تھی۔ لیکن ان دونوں کو عروج و زوال صاف نظر آتا تھا۔ اب میں پہلے اہلِ عقل کا

زاویۂ نگاہ پیش کرتی ہوں۔ بعد کو میں اہلِ دل کا نظریہ پیش کروں گی۔

یہ حقیقت ہے کہ کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ اسی طرح کوئی قوم زوال نہیں پسند کرتی۔ لیکن موت کی طرح زوال بھی آتا ہے۔ انگریزوں نے زوال کی روک تھام کے لئے پرانے سامراجوں کے اسباب و زوال کا بغور مطالعہ کیا۔ ان کے مشہور مؤرخ ایڈورڈ گبن نے اسباب زوال رومتہ الکبریٰ پر چھ جلدیں لکھ ماریں۔ جب ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ لگا تو انہوں نے سلطنتِ مغلیہ کے زوال پر بھی غور و خوض کیا۔ اور انگریز مؤرخ اردن نے اس سلطنت کے اسباب زوال معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن باوجود اس چھان بین کے انگریزی سامراج کا یکا یک خاتمہ ہوا اور اس طرح ہوا کہ اس کی مثال تاریخِ عالم نہیں پیش کر سکتی۔

عقلِ انسانی کی بیچارگی

سلطنت مغلیہ کے زوال کے معاملے میں انگریز اس نتیجے پر پہنچے کہ اس سلطنت کے زوال کا باعث یہ تھا کہ حکمران ہندوستان میں یعنی اپنے مفتوحوں کے درمیان بس گئے۔ اس لئے مفتوح کے اثر صحبت اور اثر آب و ہوا سے یہ حکمران بھی "ہندی" ہو گئے۔ یعنی انگریزوں کی اصطلاح کے بموجب وہ "نیٹو" ہو گئے۔ اس سببِ زوال سے انگریزوں نے یہ سبق سیکھا کہ ہندی بننے سے گریز لازم ہے۔ چنانچہ انگریزی حکومت اپنے انگریز افسروں کو مجبور کرتی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے وطن انگلستان جایا کریں۔

انگریز افسران حکومت یہاں تک محتاط تھے کہ اپنے رہنے کے لئے وہ شہر سے دور بنگلے بناتے تھے تاکہ مفتوحوں کے اثر صحبت سے بچ سکیں۔ دیسی لباس اور دیسی کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے اس خوف سے

کہ وہ کہیں دیسی نہ بن جائیں۔ برعکس اس کے مسلمان حکمران ہندوستان میں صرف بسے ہی نہیں بلکہ ہندی عورتوں کو اپنے گھر میں ڈالا اور اُن سے اولادیں ہوئیں۔ لیکن باوجود دیسی ہو جانے کے مسلمانوں کی غیر مغل اور مغل حکومت انگریزی حکومت سے کہیں زیادہ پائیدار ثابت ہوئی۔ اگر ان دونوں یعنی غیر مغل اور مغل اسلامی حکومت کے زمانۂ حکومت کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ باوجود دیسی ہو جانے کے بلاشبہ کم از کم پانچ سو سال یعنی شہاب الدین غوری کے زمانے سے اورنگ زیب تک مسلمان برسرِ اقتدار رہے۔ اس کے برعکس انگریز باوجود ان تمام احتیاطوں کے دو سو سال بھی حکومت نہ کر سکے۔

انگریز ہندوستان سے کیوں بھاگا؟ اس کا جواب انگریزوں کی طرف سے یہ ہو گا کہ ہم آزادی پسند تھے۔ اس لئے ہماری مرضی تھی کہ ہمارا "پیارا" ہندوستان بھی آزاد ہو جائے۔ لیکن کیا یہ جواب صحیح ہے یا محض انگریزی چالاکی کا نمونہ ہے؟ اگر یہ جواب صحیح نہیں ہے تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کی طاقت کے خوف سے بھاگے۔ لیکن چین نے ۱۹۶۲ء میں ہندوستان کی طاقت کی پول کھول دی۔ یہ سب جوابات عقل پر مبنی ہیں لیکن وہی عقلِ انسانی ان جوابات کو رد بھی کرتی ہے۔ اور اس لئے ان جوابات سے ہماری تسلی نہیں ہوتی اور ہم انگریزوں کے فرار کے "اصل" اسباب ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں لیکن کیا انسانی ذہن ان اصل اسباب کو معلوم کر سکتا ہے؟ انسانی عقل ان سوالوں کا یہ جواب بھی دے سکتی ہے۔ جیسا کہ اکثر مؤرخ جواب دیتے ہیں۔ کہ دو عالمگیر جنگوں نے انگلستان کی جڑ کھوکھلی کر دی اس لئے وہ اب اپنے

سامراج کا بار نہیں سنبھال سکتے تھے لیکن وہی عقلِ انسانی اس دلیل کو اس طرح رد کرتی ہے کہ باقی دیگر یوروپین سامراجی ایشیا اور افریقہ سے کیوں فرار ہوئے ؟ الغرض ان مباحث سے انسانی عقل کی بےچارگی صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔

انگریزوں کا فرار تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ انگریزوں سے پہلے متعدد سامراج نذرِ زوال ہوئے۔ چنانچہ مورخوں نے اسبابِ زوال کو تلاش کرنا اپنا شعار بنایا۔ اور اپنی عقل کے مطابق اسباب "ڈھونڈ ڈھونڈ کر" نکالے۔ زیبِ داستان کے لئے لفّاظی سے بھی کام لیا۔ گبن کی مشہور تصنیف "زوال رومتہ الکبریٰ" اس کی بہترین مثال ہے۔ گبن کے دلائل کا لب لباب یہ ہے کہ خروجِ عیسائیت نے اس سامراج کے پرخچے اڑا دیئے لیکن اس کے باوجود وارثان رومتہ الکبریٰ جو تاریخ میں بازنطیوں کے نام سے موسوم ہیں اور جو عیسائیت کے علمبردار تھے تقریباً ایک ہزار سال برسرِ حکومت رہے۔ اسی عیسائیت نے جس نے بقول گبن رومتہ الکبریٰ کا خاتمہ کیا تھا بازنطیوں کو بامِ عروج پر پہنچایا۔

الغرض عقلی دلائل ایک دوسرے کو رد کرتے ہیں اور "اصل" اسباب کے جویا بڑی الجھن میں پڑ جاتے ہیں۔ لیکن اس دنیا میں ہمیشہ مفکرین کا ایسا طبقہ بھی رہا ہے جو خدا کو مُسبّب الاسباب سمجھتا ہے۔ اس طبقے کا خیال ہے کہ حق کلّی انسان کی قسمت ہی میں نہیں۔ اس حق کلّی کو خدا نے اپنے لئے مخصوص کر کے رکھا ہے۔ مفکرین کا یہ طبقہ ہر ملک و ملّت میں پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اس مادّہ پرست دور میں بھی ایسے مفکرین موجود ہیں۔ مسلمان مفکرین تو سب اس نظریہ کو مانتے تھے۔ بجز ابن خلدون جس نے قوموں کے زوال کے عقلی اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔

اہلِ دِل کا نظریۂ زوال

ان قائلینِ خدا نے بجائے عقل کے عقیدے کا سہارا لیا۔ خدا کو اصل سبب ٹھہرایا یعنی خدا ہی قوموں کو بامِ عروج پر پہنچاتا ہے۔ اور وہی نیچا دکھاتا ہے لیکن اہلِ عقل نے اہلِ عقیدے سے بڑے ٹیڑھے سوال پوچھے مثلاً انھوں نے پوچھا :-

(۱) کس بنا پر خدا قوموں کو عروج عطا کرنے کے لئے منتخب کرتا ہے ؟

(۲) اس انتخاب میں خدا کسی اصول کو پیشِ نظر رکھتا ہے یا قوموں کو باری باری عروج دیتا ہے ؟

(۳) قوموں کا زوال بطور سزا ہوتا ہے۔ اسی طرح قوموں کا عروج بطور جزا ہوتا ہے۔ ؟

(۴) زوال کے بعد خدا کسی قوم کو دوسرا موقع بھی دیتا ہے ؟ یعنی قوموں کی توبہ بھی قبول کرتا ہے ؟

(۵) کیا خدا نے اس دنیا کو کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے ؟ اگر کوئی مقصد ہے تو وہ کیا ہے ؟

مندرجہ بالا چند سوالات محض بطور نمونہ پیش کئے گئے ہیں۔ اصل میں تو سوال بے شمار ہیں۔ ان میں پانچواں سوال وہ ہے جس کا جواب معلوم کرنے کے لئے انسان نے فلسفے کے سمندر میں غوطہ زنی شروع کی۔ اس گہرے سمندر سے اس نے کئی چیزیں برآمد کیں۔ لیکن اس کو وہی چیزیں ہاتھ لگیں جن کو اس کے حواس خمسہ پہچانتے تھے۔ ان چیزوں کو اس نے نکالا۔ ان چیزوں کو سمجھنا نسبتاً آسان تھا۔ کیونکہ وہ ان چیزوں کو دیکھ سکتا تھا چھو سکتا تھا۔ سونگھ سکتا تھا۔ چکھ سکتا تھا اور محسوس کر سکتا تھا۔ ان چیزوں

کا اس نے مطالعہ شروع کیا۔ اور اس طرح ان علوم کا آغاز ہوا۔ جو آج کل سائنس کہلاتے ہیں۔ جن چیزوں کو وہ حاصل نہ کر سکا اُن کا شمار فلسفے میں ہونے لگا۔ گویا فلسفے کے زُمرے میں وہ چیزیں ہیں۔ جو انسان کے حواس خمسہ سے ورے ہیں۔

تلاشِ سبب مندرجہ بالا باقی چار سوال تاریخ سے متعلق ہیں کیونکہ وہ انسانی تجربہ کے حدود میں آتے ہیں۔ اور تاریخ میں ان کا جواب موجود ہے۔ لیکن یہ جواب صرف واقعات کی صورت میں ہے لیکن انسان کی معمولی عقل بتاتی ہے کہ ہر واقعہ کا کوئی سبب بھی ہوتا۔ چنانچہ عقل کے حامی ہر واقعہ کا سبب بھی ڈھونڈتے ہیں۔ اسی تلاش سبب سے اس گورکھ دھندے کی بنیاد پڑی جو آج کل "فلسفہ تاریخ" کہلاتا ہے۔ لیکن اگر آپ بغور دیکھیں تو مندرجہ بالا چاروں سوال بھی جو بظاہر تاریخ سے متعلق ہیں۔ پانچویں سوال کے جواب کے محتاج ہیں۔ وہ پانچواں سال ہم قصداً دہراتے ہیں۔ "کیا خدا نے اس دنیا کو کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے؟ اگر کوئی مقصد ہے تو وہ کیا ہے"؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں پوری کائنات ارضی وسماوی کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ خدا کے دل کا راز بھی معلوم کرنا ضروری ہے۔ صرف موجودہ کائنات ہی کا تجزیہ ضروری نہیں بلکہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ارض وسما کب پیدا ہوئے۔ کس طرح پیدا ہوئے اور کس نے پیدا کئے؟ تمام مذہبی کتابیں اس کا جواب نہایت ہی مختصر دیتی ہیں یعنی "کن فیکون" (ہو جا اور ہو گیا)۔

تاریخ کا تقاضا ہے کہ اس کن فیکون کی تفصیل کی جائے اور یہ بھی

بتایا جائے کہ کُن فیکون سے خدا کا مقصد کیا تھا؟ لیکن خدا کا مقصد معلوم کرنا آسان نہیں۔ اہلِ عقل اس سے معذور ہیں۔ البتہ اہلِ دل دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کو یہ مقصد معلوم ہے۔ چنانچہ ہر پیغمبر نے اس مقصد کو بیان کیا ہے۔ یہودیوں کی توریت و زبور میں بھی یہ مقصد بیان کیا گیا ہے عیسائیوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰ نے بھی اس مقصد کو بیان کیا۔ گویا تلاشِ سبب کے ساتھ یہ بھی ضروری ہو گیا کہ خدا کا مقصد بھی معلوم کیا جائے کہ اس نے کیوں یہ کائنات پیدا کی۔

سب سے پہلے جس نے اس مقصد خدا کو بیان کر کے فلسفۂ تاریخ کی بنیاد ڈالی وہ سینٹ اگسٹائن (۳۵۴ء تا ۴۳۰ء) ہے جس نے اپنی مشہور کتاب "خدائی شہر" میں اپنا فلسفۂ تاریخ پیش کیا۔ بقول اس والئ کلیسا تخلیق کائنات سے خدا کا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی مخلوق پر برکت و رحمت نازل کرے۔ مسلمانوں کا نظریہ بھی یہی تھا۔ بقول مولانا روم خدا کہتا ہے کہ:-

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگان جودے کنم

(میں نے خلق کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ میں اس سے فائدہ حاصل کروں بلکہ میرا مقصد یہ تھا کہ میں اپنے بندوں پر جود و عطا نازل کروں)

مگر اس دنیا میں صرف خیر ہی نہیں بلکہ شر بھی ہے۔ کیا خدا کے مقصدِ تخلیق میں شر بھی داخل تھا؟ اس سوال کا جواب سینٹ اگسٹائن اس طرح دیتا ہے:- (حوالہ نمبر ۵)

کفار کو خدا کا پیدا کردہ خیر نہیں نظر آتا۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ "اس دُنیا میں کئی چیزیں مثلاً آگ۔ سردی۔ درندے وغیرہ

بھی ہیں جو بجائے فائدہ کے ہمارے نازک جسم کو ضرر پہنچاتے ہیں کیونکہ ہم زیرِ سزا ہیں۔ یہ کفار نہیں سمجھتے کہ (یہ ضرر رساں چیزیں بھی) اپنی جگہ قابلِ ستائش ہیں اور باقی مخلوق میں اُن کی بھی جگہ ہے ..... اور ہمارے لئے کار آمد ہیں۔"

مسئلہ خیر و شر کس طرح فلسفۂ تاریخ میں داخل ہوا

مسلمانوں کا نظریۂ شر بھی یہی تھا لیکن ایک بڑے فرق کے ساتھ۔ وہ فرق یہ تھا کہ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق انسان زیرِ سزا نہیں ہے۔ مگر خدا نے باوجود اس کے ابلیس کی صورت میں شر ضرور پیدا کیا۔ اس سلسلے میں مولانا رُوم نے اپنی مثنوی میں ایک بڑا عبرت آموز افسانہ لکھا ہے جس میں شیطان کہتا ہے کہ میرا کام صرف یہ ہے کہ کھوٹے اور کھرے کو علیحدہ کر دوں تاکہ اچھے لوگ بُرے لوگوں کے دھوکے میں نہ آئیں۔ ابلیس کہتا ہے کہ :-

امتحان شیر و کلبم کرد حق　　　امتحان نقد و قلبم کرد حق

(خدا کو شیر اور کتے میں فرق دکھانا مقصود تھا۔ اور کھرے کھوٹے میں خدا فرق دکھانا چاہتا تھا)

قلب را من کہ سیاہ رُو کردہ ام　　　صیرفیم قیمت او کردہ ام

(کھوٹے کو میں نے سیاہ نہیں کیا۔ میں تو صرف صرّاف ہوں اور ہر چیز کی قدر و قیمت بتانا میرا کام ہے۔)

نیکواں را پیشوا و دامنم　　　شاخہائے خشک را بر می کنم

(میں نیکوں کا پیشوا اور جائے امن ہوں۔ البتہ میں خشک شاخ کو کاٹ دیتا ہوں)۔

اس کے بعد شیطان کہتا ہے کہ بطور آزمائش میں لوگوں کے سامنے مختلف قسم کی غذائیں پیش کرتا ہوں۔ جب مجھے سگ زادہ دوغلا ہرن نظر آتا ہے تو میں ہڈی اور گھاس دونوں اس کے سامنے ڈالتا ہوں تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ اس دوغلے کی فطرت میں کُتّاپن غالب ہے یا ہرن کی فطرت غالب ہے۔

گر بسوئے استخواں آید سگ است — در گیاہ جوید یقین آہو رگ است

(اگر وہ ہڈی کی طرف بڑھے تو اس میں کتّے کی فطرت غالب ہے۔ اگر گھاس پسند کرے تو اس میں ہرن کی فطرت غالب ہے)

نیک راچوں بد کنم؟ یزداں نیم — داعی ام من خالق ایشاں نیم

(نیک کو بد میں کس طرح بنا سکتا ہوں؟ میں خدا نہیں ہوں۔ میں محض داعی ہوں۔ مخلوق کا خالق نہیں ہوں)۔

اس کے بعد مولانا روم خیر و شر کے معاملے میں یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ دونوں اس دنیا کے لئے ضروری ہیں۔

قہر و لطفے جفت شد باہم دگر — زاد ازیں ہر دو جہانے خیر و شر

(مہر اور لُطف دونوں گڈ مڈ ہو گئے اور اسی گڈ مڈ سے خیر و شر کی دُنیا پیدا ہوئی)۔

مؤرخوں کو بھی خیر و شر کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ تاریخ کے پہلے فلسفی سینٹ اگسٹائن نے شر کے تحت دُشمنانِ عیسٰی کا ذکر کیا۔ عیسٰیؑ کی دُشمن یہودی قوم تھی۔ چنانچہ اس پہلے فلسفۂ تاریخ کے بموجب خدا نے یہودیوں کو آزمائش میں ڈالا لیکن یہ قوم اس آزمائش میں پُوری نہ اُتری۔ اسی لئے خدا نے اس قوم کی سلطنت کو برباد کر دیا۔ اس فلسفی نے

رومتہ الکبریٰ کے زوال کو بھی خدا کے غضب سے منسوب کیا۔ اب اِن روحانی فلسفیان تاریخ نے ہر قوم کے زوال کو قہرِ خداوندی سے منسوب کرنا شروع کر دیا۔ جب چنگیزیوں نے عالمِ اسلام کو برباد کیا تو مسلمانوں نے بھی اپنی تباہی کو اسی قہرِ خداوندی سے منسوب کیا۔ چنگیز خاں نے خود اپنے آپ کو تازیانۂ الٰہی قرار دیا۔ عطا ملک جوینی نے اپنی "تاریخ جہاں کُشا" میں چنگیز خان کے ہاتھ سے شہرِ بخارا کی بربادی کا حال لکھتے ہوئے دو مسلمان عمائدینِ شہر کی گفتگو نقل کی ہے۔ یہ عمائدین امیر جلال الدین حسن زیدی اور امام رکن الدین تھے۔ دونوں اپنے زمانے کے جیّد عالم تھے اور امامِ وقت تھے۔ ان کی گفتگو اس زمانے کے مسلمانوں کے خیالات کا آئینہ ہے کیونکہ امیر جلال الدین سادات ماوراء النہر کا امام تھا۔ (حوالہ نمبر ۶)

امام امیر جلال الدین: یہ کیا حالت ہے؟ یہ جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ حالتِ بیداری میں ہے یا خواب میں۔

امام رکن الدین: خاموش رہو۔ یہ قادرِ مطلق کی بادِ قہر ہے اور ہم میں طاقتِ گفتار باقی نہیں۔

اس گفتگو کے بعد مؤرخ جوینی اس تقریر کا ذکر کرتا ہے جو چنگیز خان نے عمائدینِ شہر کے سامنے کی۔ یہ عمائدین پابہ زنجیر اس کے سامنے پیش کئے گئے ان کو مخاطب کرتے ہوئے چنگیز خان نے کہا:۔

"لوگو! تم کو معلوم ہو کہ تم نے بڑے بڑے گناہ کئے ہیں خاص کر عمائدین نے۔ اگر تم مجھ سے پوچھو کہ میرے پاس اس کا کیا ثبوت ہے تو میں یہی کہوں گا کہ میں خدا کا تازیانہ ہوں۔ اگر تم نے یہ بڑے گناہ نہ کئے ہوتے تو خدا مجھ جیسا تازیانہ تمہارے لئے

نہ بھیجتا"۔

ان فلسفیانِ تاریخ نے ہر قوم کی بربادی کو قہرِ الٰہی سے منسوب کیا۔اسی طرح قوموں کے عروج کو جزائے الٰہی ثابت کیا۔چنانچہ مسلمان مؤرخوں کا یہ دستور ہوگیا کہ وہ مسلمانوں کی فتح یابی کے اسباب نہیں بیان کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق مسلمانوں کی فتح یابی ان کے نیک اعمال کی جزا تھی اور پرستارِ توحید ہونے کا انعام تھا۔

اسی طرح ہندو بھی ہر سزا و جزا کو ایشور کی ناراضگی اور خوشنودی پر محمول کرتے تھے۔ وہ اس جزا و سزا کے اس حد تک قائل تھے کہ تاریخ نگاری کو بے سُود سمجھتے تھے۔اسی لئے ہندوؤں کی نوشتہ کتابیں اور مضامین پر تو ملتی ہیں لیکن تاریخ پر کوئی کتاب نہیں ملتی۔اس کا جواب دورِ حاضر کے قوم پرست ہندو یہ دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے ان کی نوشتہ تاریخیں برباد کر دیں۔لیکن مسلمانوں نے محمود غزنوی کے دَور سے ہندستان میں آنا شروع کیا۔مشہور محقق ابو ریحان البیرونی جب ہندوستان پہنچا تو اس نے ہندوؤں کی نوشتہ تاریخوں کی تلاش کی مگر اس کے ہاتھ کوئی تاریخ نہ لگی لیکن اس کو اور علوم پر بہت سی کتابیں دستیاب ہوئیں۔

سببِ تلاش اب تک ہم نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مؤرخوں نے واقعاتِ تاریخ کے اسباب تلاش کرنے کے لئے ان واقعات کا جائزہ لیا۔ واقعات کے اسباب معلوم کرنے کا دستور یونانی مؤرخ اور خصوصاً تھوسی ڈائیڈیس قائم کر گئے تھے۔مسلمان مورخوں میں البیرونی (سنہ ۹۷۳ء تا سنہ ۱۰۴۸ء) نے اور بعد کو ابن خلدون (سنہ ۱۳۳۲ء تا سنہ ۱۴۰۶ء) نے واقعات کے اسباب

معلوم کرنے کی کوشش کی۔ گو ابن خلدون کی تاریخ میں ہر واقعہ کا سبب درج نہیں ہے۔ لیکن اس نے اپنے "مقدمہ" تاریخ میں مورخوں کو تاکید کی کہ وہ ہر واقعہ کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کریں۔

جب ہر واقعہ کا سبب حکمِ خداوندی سمجھا جاتا تھا اور خدا کو مسبب الاسباب کہا جاتا تھا تو مورخوں نے اسبابِ واقعات معلوم کرنے کی کیوں کوشش کی؟ اس کا سبب یہ تھا کہ یونانی فلسفہ اور منطق مسلمانوں میں بھی عباسیوں کے زمانے سے رائج ہو چکا تھا۔ یورپ میں جب نشاۃِ ثانیہ کا دور شروع ہوا اور قرونِ وسطیٰ کا دورِ اعتقاد ختم ہوا تو یونانی منطق اور فلسفے نے پھر سر اُٹھایا اور تقاضہ کیا کہ انسانی عقل سے ہر واقعہ کا سبب معلوم کیا جائے۔ کیونکہ اس زمانے کے یوروپین اہلِ فکر خدا کو مسبب الاسباب ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے تھے۔

مسئلہ تقدیر و تدبیر

اس کے علاوہ ہر واقعہ کو حکم خداوندی سے منسوب کرنے کے معنی یہ تھے کہ انسان کو تقدیر کا غلام مان لیا جائے۔ گویا انسان کی تدبیر بیکار ہے۔ تقدیر و تدبیر کا تنازعہ قدیمی ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں جب مذہب نے زور پکڑا تو ہر طرف تقدیر کے حامی نظر آنے لگے۔ مسلمانوں میں بھی یہ تنازعہ نمودار ہوا۔ اور ایسا نمودار ہوا کہ مسلمانوں میں اس بنا پر علیحدہ فرقے قائم ہو گئے۔ تقدیر کے قائل "جبری" اور تدبیر کے حامی "اختیاری" کہلاتے تھے۔ مولانا روم (۱۲۰۶ء تا ۱۲۷۳ء) کے زمانے میں یہ تنازعہ اس قدر عام تھا کہ مولانا مذکور نے اس مسئلہ پر اپنی مثنوی میں سینکڑوں اشعار لکھے۔ مولانا تدبیر کے حامی تھے۔ اور جبریوں کی مذمت کرتے تھے۔

خدا کو مسبب الاسباب مان کر جبری یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ جب کاتبِ تقدیر صرف خدا ہے تو انسان کو ہاتھ پیر مارنے سے کیا حاصل؟ انسان کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ قوموں کو بھی افراد کی طرح سمجھتا رہا ہے۔ ہر فرد کو لڑکپن۔ شباب۔ ضعیفی اور موت کی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس لئے انسان نے یہی منزلیں قوموں کے لئے بھی قائم کیں۔ جس طرح ہر فرد اپنے نوشتۂ تقدیر کا تابع ہے۔ اس لئے ان کے نظرئے کے بموجب قوموں کا بھی نوشتۂ تقدیر ہوتا ہے۔ چنانچہ قوموں کا عروج و زوال اسی نوشتۂ تقدیر کے مطابق ہوتا ہے۔

مسئلہ خیر و شر کی طرح فلسفۂ تاریخ میں تقدیر کا مسئلہ بھی داخل ہوا۔ اب یہ فلسفۂ تاریخ فلسفۂ الٰہیات کا جزو بن گیا اور اسی فلسفۂ تاریخ کو بھی انھیں منزلوں سے گذرنا پڑا۔ جن سے فلسفۂ الٰہیات کو گذرنا پڑا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ الٰہیات کی تائید میں صرف قیاس سے کام لیا جاتا تھا۔ فلسفۂ تاریخ کی تائید واقعات سے کی جاتی تھی۔ لیکن کیا یہ واقعات کماحقہ صحیح ہیں؟ کیا مؤرخ اس زمانے میں موجود تھا جب یہ واقعات نمودار ہوئے؟ مؤرخ کا دار و مدار تو صرف نوشتۂ احوال پر ہے یا پرانے کتبوں پر ہے۔ لیکن نہ ان نوشتۂ حالات میں اور نہ ان کتبوں میں اس بات کا ذکر ہے کہ جب واقعات نمودار ہوئے تو اُس زمانے کے لوگوں کے دلوں پر کیا گذری اور یہ ہم عصر لوگ ان واقعات سے کس طرح متاثر ہوئے ایسے نوشتۂ واقعات کم ملتے ہیں۔ جن سے قلبِ انسانی کے تاثرات کا حال معلوم ہو سکے۔

<u>تاریخ قوانینِ فطرت پر مبنی ہے یا مرضیِ مولا پر</u> جب واقعاتِ تاریخ کو خدا سے

منسوب کیا گیا تو طرح طرح کے سوالات اُٹھے۔ ارسطو یہ طے کر چکا تھا کہ خدا نے بعد تخلیق کائنات گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اور اپنی مخلوق کو قوانینِ فطرت کے سپُرد کر دیا۔ یہ قوانینِ فطرت بیشک خدا کے اپنے نافذ کردہ تھے۔ لیکن وہ اپنے وضع کردہ قوانین کے خلاف کس طرح جاسکتا تھا؟ فلسفیانِ تاریخ کے درمیان اس مسئلہ میں بڑی پھوٹ پڑی۔ ایک طبقہ نے دعویٰ کیا کہ خدا بعد تخلیقِ کائنات گوشہ نشین نہیں ہوا اور وہ اپنی مخلوق کی شکایات فرداً فرداً سنتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی بھی نگہداشت کرتا ہے۔ ان کو حسب موقع سزا و جزا بھی دیتا ہے۔ دوسرے طبقے کے فلسفیانِ تاریخ نے اس کے برعکس یہ دعویٰ کیا کہ جب خدا نے افراد کی طرح قوموں کو بھی قوانینِ فطرت کے سپُرد کیا تو ہمارے فلسفۂ تاریخ کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ان قوانینِ فطرت کا مطالعہ کریں اور اپنے فلسفۂ تاریخ کو انہیں قوانینِ فطرت پر مبنی کریں۔ اگر کوئی فرد یا قوم دانستہ آگ میں کوُد پڑے تو آگ اپنی فطرت کے تقاضے کے بموجب اس کو ضرور جلائے گی۔ اور خدا اس میں کوئی دخل نہ دے گا۔ لیکن جو فلسفیانِ تاریخ اپنے فلسفہ کو مرضئ مولا پر مبنی کرتے تھے انہوں نے آتشِ نمرود کی مثال پیش کی اور بتایا کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے مواحد اور متقی لوگوں کے حق میں خدا اپنے قوانینِ فطرت کو بھی بدل سکتا ہے جیسا کہ اس نے کر کے دکھایا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کو آتشِ نمرود سے محفوظ رکھا۔

ترقی پسند فلسفیانِ تاریخ مرضئ مولا کے حامیوں نے واقعاتِ تاریخ کو بالکل مرضئ مولا پر چھوڑ دیا۔ لیکن ان

فلسفیانِ تاریخ میں جو طبقہ عقل کا پیرو تھا۔ اس نے اپنا فلسفہ علیحدہ قائم کیا۔ ان عقل کے پیروؤں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیں فرداً فرداً افراد کی طرح نذرِ زوال ہوتی ہیں لیکن دُنیا پھر بھی "ترقی" کرتی رہتی ہے۔ بقول شاعر:۔

نہیں معلوم دُنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی!
کہ لاکھوں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

ان "ترقی پسند" فلسفیانِ تاریخ کو "رونقِ محفل" میں ترقی نظر آئی۔ چنانچہ اس "ترقی پسند" طبقۂ فلسفیان نے ماضی کو حقارت سے دیکھا۔ تاریخِ عالم میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ عرب جب اسلام سے فیض یاب ہونے لگے تو بانیٔ اسلام نے خود زمانۂ قبل از اسلام کو "جاہلیہ" کا لقب دیا۔ حجۃ الوداع میں آپ نے فرمایا کہ آج کے دن ایامِ جہالت کے دستور میرے پیروں کے نیچے ہیں۔ چنانچہ جو دَور آنحضرتؐ نے بعد ہجرت شروع کیا وہ مسلمانوں کے نزدیک ترقّی سے منسوب ہے۔

تاریخ میں ترقّی ہے یا تنزّل؟ اس سوال کا جواب یورپ میں فلاسفۂ الٰہیات کے سُپرد ہوا۔ انہوں نے مذہب کو پسِ پُشت ڈال کر صرف واقعاتِ تاریخ کی بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ دُنیا رُوبہ ترقی ہے۔ ان فلسفیوں کے برعکس حامیانِ دین نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ ترقّی خدا کی عطا کردہ ہے۔ لیکن ترقّی کے معاملے میں یہ دونوں متفق الرائے تھے۔ مسلمانوں میں صوفیوں نے بھی ارتقا کا نعرہ بلند کیا۔ مولانا روم نے مسئلہ ارتقاء پر اپنی مثنوی میں متعدد شعر کہے۔ فلسفیانِ تاریخ کی

طرح مولانا روم بھی دُنیا کو اور انسان کو بحیثیت مجموعی دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی قوم کا زوال دُنیا کے زوال کے مترادف نہیں ہے۔ مولانا اپنی مثنوی میں فرماتے ہیں۔

آمدہ اوّل با اقلیمِ جماد ۔۔۔ وز جمادی در نباتی او فتاد

(انسان پہلے کنکر پتھّر کی صورت میں آیا۔ اس جمادیت سے اس نے نباتی صورت اختیار کی)۔

وز نباتی چوں بہ حیوانی فتاد ۔۔۔ نامدش حالِ نباتی، ہیچ یاد

(جب نباتی حالت سے اس کو حیوانی درجہ ملا تو نباتی دَور کے حالات وہ بھول گیا۔)

ہم چنیں اقلیم در اقلیم رفت ۔۔۔ تا شد اکنون عاقل و دانا و زفت

(اس طرح وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا رہا۔ حتّٰی کہ اب وہ عاقل و دانا بھی ہو گیا۔)

ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام ۔۔۔ ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام

(سبزے کی طرح میں کئی دفعہ اُگا اور میں نے سات سو ستر قالب دیکھے)

تُو از آں روزے کہ در ہست آمدی ۔۔۔ آتشے یا خاک یا بادے بُدی

(جس دن تُو پیدا ہوا اس دن سے تیری حالت بدلنے لگی کبھی تُو آگ بنا کبھی خاک کبھی ہوا)۔

گر بداں حالت ترا بُودے بقا ۔۔۔ کہ رسیدے مر ترا ایں ارتقا

(اگر تُو ایک ہی حالت میں رہتا تو تجھے یہ ترقّی کیسے نصیب ہوتی)

مردم از حیوانی و آدم شُدم ۔۔۔ پس چہ ترسم کہ ز مردن کم شوم

(میں حیوان مر کر انسان کی صورت میں نمایاں ہوا۔ اس لئے مجھے ڈر نہیں کہ مرنے سے نقصان پہنچتا ہے)۔

ترقی کے معاملے میں خدا کے قائل اور منکر مفکرین میں کوئی فرق نہ تھا۔ سوائے اس کے خدا کے ماننے والے قوموں کی ترقی کو خدا کی ذات سے منسوب کرتے تھے۔ منکرِ خدا مفکرین اس ترقی کو قوانینِ فطرت پر محمول کرتے تھے۔ ان مفکرین کا نظریہ یہ تھا کہ جو قوم قوانینِ فطرت پر کاربند ہوتی ہے وہ ترقی کرتی ہے جو قوم ان قوانین کے خلاف جاتی ہے وہ فنا ہو جاتی ہے۔ قرآن خود عاد اور ثمود قوموں کی مثال پیش کرتا ہے۔ جو خدا کے خلاف چل کر اپنے آپ کو فنا کر بیٹھیں۔ اسی طرح توریت و زبور میں بھی اور خصوصاً کتاب خروج میں فرعونِ مصر کی شکست اور موسیٰ کی جیت کا حال درج ہے۔

الغرض منکر اور قائلِ خدا دونوں نے قوموں کے زوال کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ زوال پیدا کرنے والی قوت کو قائلین خدا کہتے ہیں۔ منکرین اس قوت کو فطرت یعنی نیچر کہتے ہیں۔ ان مفکرین کی بدولت قوموں کے عروج و زوال کے اسباب معلوم کرنا بھی مؤرخ پر فرض ہو گیا۔ اس فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں تاریخ کو میدانِ فلسفہ میں بھی قدم رکھنا پڑا۔ فلسفہ بیشتر قیاس آرائیوں پر مبنی ہے اس لئے اب مورخ بھی قیاس آرائی کی الجھن میں پڑ گئے اور آج تک پڑے ہوئے ہیں۔ فلسفۂ تاریخ کے حامی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر قوموں کے اسبابِ عروج و زوال کو تاریخ سے نکال دیا جائے تو تاریخ کی عبرت آموزی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ان اسبابِ عروج و زوال کی وجہ سے تاریخ فلسفے کی لونڈی بن جاتی ہے۔ علاوہ بریں مؤرخ کے لئے فلسفے میں ماہر ہونا بھی لازم ہو جاتا ہے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلسفۂ تاریخ واقعات پر مبنی ہے اور خالص

فلسفے کا دارومدار خالص قیاس پر ہے۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ مؤرخ کو بھی تاویلوں کے جال میں پھنسنا پڑتا ہے۔ اگر تاریخ میں تاویل جائز قرار دی جائے تو اختلافات کا دروازہ کھل جاتا ہے اور جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ تاریخ میں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔ گبن جیسا ذی علم اپنے ذاتی تعصبات میں پھنس گیا۔ گبن عیسائیت سے سخت متنفر تھا اس لئے اس نے عیسائیت کو رومتہ الکبریٰ کے زوال کا باعث ٹھہرایا۔ ہر وہ مذہب جس نے عیسائیت کو نیچا دکھایا گبن کو پسند تھا۔ اس نے جو اسلام کی تعریف کی وہ حبِ علیؓ پر نہیں بلکہ بغضِ معاویہؓ پر مبنی ہے۔

فلسفے کی وجہ سے تاریخ کی متضاد تاویلیں

الغرض جب میں فلسفے میں گرفتار ہو گئی تو میں فلسفیوں کا آلۂ کار بن گئی۔ میرے پیدا کردہ ایک ہی قسم کے واقعات سے مختلف اور متضاد نتائج نکالے گئے۔ ان فلسفیوں نے واقعات کو جو میرا اصل جوہر اور میرا سرمایۂ ناز ہیں پسِ پشت ڈال دیا۔ کیونکہ یہ واقعات فلسفیوں کو غیر مسلسل نظر آتے تھے۔ اور بعض واقعات میں ان کو بعدُ المشرق و مغرب نظر آتا تھا۔ فلسفیوں کی تو عادت ہے کہ وہ محض قیاس کی بناء پر کُلیے قائم کر دیتے ہیں۔ جب ان کو ٹھوس واقعات ہاتھ آئے تو اب ان کو کُلیے قائم کرنے کا بہترین موقع ملا۔ چونکہ یہ فلسفی ہر چیز کو قدرت کے کسی نہ کسی منصوبے پر محمول کرنے کے عادی تھے اس لئے ان حضرات نے انسان کے پیدا کردہ واقعات کو بھی قدرت کے منصوبے سے منسوب کیا۔ ان فلسفیوں میں دو طبقے تھے۔ ایک کا خیال یہ تھا کہ حقیقت وہ ہے جو عقل میں آجائے یعنی جو چیز عقل کی سمجھ کے باہر ہو وہ حقیقت نہیں ہو سکتی۔ ان حضرات

نے گویا خدا کو بھی عقل کے تحت کر دیا۔ دوسرا طبقہ خدا کو حدودِ عقل سے ورے سمجھتا تھا لیکن تاریخ کا ہر واقعہ مطابقِ عقل نہیں ہوتا۔ بعض واقعات بالکل خلافِ عقل ہوتے ہیں۔ لیکن حامیانِ عقل کے لئے ضروری تھا کہ خلافِ عقل واقعات کو بھی عقل کے تحت لایا جائے اور ان خلافِ عقل واقعات کو بھی مطابقِ عقل ثابت کیا جائے۔

جب قائلینِ خدا نے خلافِ عقل واقعات کو خدا سے منسوب کرنا شروع کیا تو حامیانِ عقل نے "فلسفۂ تاریخ" ایجاد کیا تاکہ ان واقعات کو فلسفے کی رُو سے مطابقِ عقل ثابت کیا جا سکے اور ان غیر عقلی واقعات کو بھی قدرت کے کسی منصوبے سے منسوب کیا جا سکے اس معاملے میں قائلین اور منکرین دونوں تقریباً متفق الرائے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ حامیانِ عقل ہر چیز کو فطرت کی پیدا کردہ سمجھتے تھے۔ اور حامیانِ خدا اپنے خدا کو ہر چیز کا خالق سمجھتے تھے۔ درحقیقت یہ فرق محض نام کا تھا یعنی خدا کو خدا کہا جائے یا فطرت (نیچر) کہا جائے۔

دراصل یہ وہی اختلاف تھا جو افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو کے درمیان نمودار ہوا۔ افلاطون کہتا تھا کہ تخلیقِ کائنات کے بعد بھی خدا اپنی مخلوق کی خاطر اپنے بنائے ہوئے قوانینِ فطرت کو بدل سکتا ہے۔ خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو بچانے کے لئے آگ کی فطرت کم ازکم چند گھڑیوں کے لئے بدل دی۔ ارسطو کے مطابق خدا اپنے بنائے ہوئے قوانین میں گُم ہو گیا۔ لیکن افلاطون کے حساب سے خدا کی اپنی "ہستی" ہے جو ہر ہستی پر غالب ہے۔ قوانینِ فطرت خدا کے وضع کردہ ہیں۔ خدا قوانین کا وضع کردہ نہیں ہے۔ یعنی خدائی اپنی "ذاتِ پاک" ہے۔

میں تو ایک دیوی تھی لیکن اب فلسفیانِ تاریخ کے دونوں طبقوں نے مجھ پر فلسفہ ٹھوس کر مجھے تابع کر دیا۔ ارسطو کے حامیوں نے مجھے قوانینِ فطرت کا ماتحت بنا دیا۔ افلاطون کے پیرؤں نے مجھے خُدا کی ذاتِ پاک کا آلہ بنا دیا۔ ارسطو کے نزدیک دُنیا کی ہر شے قوانینِ فطرت کی تابع ہے۔ اس لئے فطرت خود حتیٰ کہ فنون اور مذہب اور سیاست بھی اپنا اپنا فلسفہ رکھتے ہیں۔ اور انہیں قوانینِ فطرت کے مطابق فنون۔ مذہب اور سیاست کا عروج و زوال ہوتا ہے۔ جس فلسفی کو انسان سے متعلق ہر چیز میں فلسفہ نظر آیا وہ ایک جرمن تھا جو ہیگل کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے اپنے زمانۂ زندگی میں (۱۷۷۰ء تا ۱۸۳۱ء) فلسفہ کو وسعت دی۔ اور ہر چیز کا فلسفہ قائم کیا۔ اس نے اپنے فلسفۂ تاریخ کے سلسلے میں ہر زمانے اور ہر قوم کا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے لیکچر موسومہ "فلسفۂ تاریخ" میں تاریخ کو تین حصّوں میں منقسم کیا۔ (حوالہ نمبر ۲)

(۱) اصل تاریخ جس میں صرف واقعات ہوتے ہیں اور اپنے زمانے سے متعلق ہوتے ہیں۔

(۲) "خیال آموز" تاریخ جس کو پڑھ کر انسان کو ان واقعات پر غور و خوض کرنا پڑتا ہے اور ان واقعات سے انسان کوئی نتیجہ نکالتا ہے۔

(۳) فلسفیانہ تاریخ جو یہ بتاتی ہے کہ کوئی واقعہ بغیر مقصد کے نہیں ہوتا۔ اور انسان کو سوچ بچار کر کے یہ مقصد معلوم کرنا پڑتا ہے۔ اسی مقصد کے ذریعہ انسان کی نظر الوہیت تک پہنچتی ہے کیونکہ یہ مقصد منشائے الٰہی کے مطابق ہوتا ہے اور خدا تاریخ گر نظر آتا ہے۔

فلسفۂ تاریخ کا سبق کہ مُصیبت راحت کا پیش خیمہ ہے

ہیگل سے بہت پہلے عیسائی اور مسلمان مؤرخ خدا کو تاریخ گر ثابت کر چکے تھے ان خُداشناس مورخوں کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا کو اپنے بندوں کی بہتری مقصود ہوتی ہے۔ اس لئے خدا کی فرستادہ آفات میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ گویا شر کو بھی خدا نے بندوں کی بہتری کے لئے پیدا کیا۔ سب سے پہلے جس نے تاریخ کی اس طرح تاویل کی وہ سینٹ اگسٹائن تھا جس کے "خدائی شہر" کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ ہیگل کا دیگر خداشناس مؤرخوں کی طرح نظریہ یہ تھا کہ خدا چاہتا ہے کہ اس کے بندے راہِ ترقی پر گامزن ہوں۔ گویا تاریخ بھی انسان کی طرح مصروفِ سفر ہے اور اس کا منزلِ مقصود "ترقی" ہے۔ سفر میں انسان کو مختلف منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح تاریخ کو بھی چند منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن تاریخ کی منزلیں انقلاب کہلاتی ہیں۔ ان انقلابوں میں انسان کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس حساب سے ۱۹۴۷ء کا انقلاب ہندوپاکستان بھی تاریخ کی ایک منزل تھی جس سے لاکھوں کو نقصان پہنچا لیکن کروڑوں کو فائدہ بھی حاصل ہوا۔ بقول مولانا روم تاریخ یہ بتاتی ہے کہ:۔

درپسِ ہر گریہ آخر خندہ ایست   مردِ آخر بین مبارک بندہ ایست

(ہر رونے کے بعد خوشی نصیب ہوتی ہے۔ جو عاقبت کو دیکھ سکتا ہے وہ بڑا مبارک انسان ہے)۔

ہر کجا آب رواں سبزہ بُود   ہر کجا اشکِ رواں رحمت شود

(جس طرح پانی کی روانی سے سبزہ پیدا ہوتا ہے اسی طرح آنسو بہانے سے

رحمت نازل ہوتی ہے)۔

گویا خدا مصیبت انسان کی آزمائش کے لئے بھیجتا ہے۔ جو قوم صبر و استقلال سے مصیبت جھیلتی ہے وہ بالآخر میٹھے پھل کھاتی ہے بقول شاعر:

صبر تلخ است ولیکن برِ شیریں دارد

اگر تاریخ کی صعوبتیں بے معنی اور بے مقصد ہیں تو ایسی تاریخ کو کون پڑھے گا۔ اس کے علاوہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ ہمیشہ بشارت کا منتظر رہتا ہے۔ جس انبیا نے بشارت دی وہ سب سے زیادہ مقبول ہوئے جنہوں نے صرف "پیغام" "ناامیدی" دیا ان کو کسی نے قبول نہ کیا۔

ہیگل کا پیش کردہ فلسفہ تاریخ

چونکہ ابن خلدون کے لئے میں نے ایک علیحدہ باب مخصوص کیا ہے اس لئے میں اب اس فلسفہ کا ذکر کرتی ہوں جو جرمن فلسفی ہیگل نے مجھ پر ٹھونسا گویہ جرمن فلسفی ابن خلدون کے ۲۵۰ سال بعد پیدا ہوا۔ ہیگل روح کا قائل ہے اور اس کے نزدیک یہ روح تاریخ گر بھی ہے۔ چونکہ روح از روئے فلسفہ الٰہیات ثابت ہے اس لئے رُوح کی تاریخ گری بھی مسلّم ہے۔ تاریخ جو راستہ اختیار کرتی ہے اور جو اس کا مقصد ہے وہ بذریعہ عقل معلوم کیا جاسکتا ہے۔

لیکن بقول ہیگل مؤرخ تاریخ کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ جب انسان کے جسم کے ٹکڑے کر دئے جاتے ہیں تو انسان کی روح پرواز کر جاتی ہے اور محض جسم اور اس کے ٹکڑے باقی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر تاریخ کو قوم وار یا ملک وار لکھا جائے تو تاریخ کی رُوح پرواز کر جاتی ہے۔ وہ روح کیا شے ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ ہیگل کے نزدیک یہ رُوح "رُوحِ خدا" ہے

اور اس کا مقصد "آزادی" ہے۔ روح کو مقید نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب مورخ قوم وار تاریخ لکھتے ہیں تو گویا یہ مورخ روح کو مقید کرنا چاہتے ہیں۔

اگر محض تاریخِ مشرق کا مطالعہ کیا جائے تو یہ روح مقید نظر آتی ہے کیونکہ مشرقی ممالک میں آزادی بادشاہ تک محدود تھی۔ لیکن جب یونانیوں اور رومیوں کا دَور شروع ہوا تو اس آزادی نے پَر نکالے۔ اگرچہ یونانیوں اور رومیوں کے زمانے میں غلامی کا رواج تھا لیکن اصل باشندے آزاد تھے۔ رومیوں کے بعد عیسائیت کا دور شروع ہوا۔ اور اس دَور میں آزادی نے اپنا قدم جمایا۔ ان دلائل سے ہیگل یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ آزادی یکلخت انسان کے ہاتھ نہیں آئی بلکہ آزادی حاصل کرنے کے لئے انسان کو "ترقی" کرنی پڑے گی۔ گویا آزادی اور ترقّی ہم مشرب ہیں۔ اس لئے ہم تاریخ کو ایسی حالت میں سمجھ سکتے ہیں جب ترقّی کا تصوّر ہمارے ذہن نشین ہو جائے۔

لیکن اس تصورِ ترقی کو ذہن نشین کرنے کے لئے ہم کو تاریخِ عالم پڑھنی چاہیئے۔ کیونکہ فرداً فرداً قومیں نذرِ زوال ہوتی رہتی ہیں۔ اور ترقّی ہمیں مسدود نظر آتی ہے۔ مگر ایک قوم کے زوال سے تصوّرِ ترقی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی جانشین قوم اس تصوّر کو اپنا لیتی ہے۔ گویا ترقی مشعل ہے جو ترقی پذیر قوم زوال پذیر قوم سے لے لیتی ہے۔ لیکن یہ جانشین قوم ترقی کو ابتدائی مراحل سے شروع نہیں کرتی بلکہ اس مقام سے اپنا سفر ترقی شروع کرتی ہے جہاں تک پچھلی قوم پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ہیگل نے ان منازل ترقی کو انسانی زندگی سے تشبیہہ دی۔ اور ترقی کو زمانۂ طفولیت۔ زمانۂ شباب اور زمانۂ ضعیفی میں منقسم کیا۔ مشرقی دور میں ترقّی بچہ تھی۔ یونانیوں اور رومیوں کے دَور میں اس کی جوانی شروع ہوئی۔ دورِ عیسائیت میں اس کے شباب

کی تکمیل ہوئی۔ تکمیلِ شباب کے وقت ترقی جرمن قوم کے ہاتھ آئی۔ گویا جرمن قوم "خاتم الترقی" ہے۔ کیونکہ شباب کے بعد ضعیفی لازمی ہے۔ چونکہ ترقی روح سے وابستہ ہے۔ اور رُوح خدا سے وابستہ ہے اس لئے شبابِ ترقی کے معنی یہ ہیں کہ خُدا جرمن قوم کے ہاتھوں جوان ہوا۔ اور آزادی کی بھی تکمیل جرمن قوم نے کی کیونکہ ترقی اور آزادی بقول ہیگل مترادف ہیں۔ اس سے ہیگل نے یہ بھی نتیجہ نکالا کہ

(۱) ہر قوم اپنی بساط کے مطابق ترقی اور آزادی میں اضافہ کرتی ہے۔

(۲) ہر قوم کو خدا خود ترقی اور آزادی کے لئے منتخب کرتا ہے۔

(۳) جب کسی قوم کی ترقی کی "باری" آتی ہے تو دوسری قوموں کو خاموشی سے اس قوم کی قیادت کو تسلیم کرنا چاہیئے کیونکہ جب خدا کسی قوم کو ترقی کے لئے منتخب کرتا ہے تو خدا خُود اس قوم کا مربی بن جاتا ہے۔

(۴) لیکن خُدا کسی قوم کو صرف ایک مرتبہ "باری" دیتا ہے۔ یعنی ہر قوم کو صرف ایک موقع ملتا ہے۔ یعنی قوم کی توبہ نہیں قبول کی جاتی اور اس کو دوسرا موقع نہیں دیا جاتا۔

ہیگل کے فلسفۂ تاریخ کے مطابق گویا تاریخ یعنی تاریخ عالم ایک ڈرامہ ہے۔ جس کے اداکار افراد نہیں بلکہ قومیں ہیں۔ ہر قوم اپنی باری سے اسٹیج پر آتی ہے۔ جب تک کوئی قوم اس اسٹیج پر رہے تب تک دوسری قوم کو اسٹیج پر آنے کا حق نہیں۔ جو قوم اسٹیج پر ہوتی ہے وہ اپنی بساط کے مطابق تماشہ دکھاتی ہے۔ اگر تاریخ عالم کو ایک ڈرامہ مان لیا جائے تو یہ قومیں اس ایک ڈرامہ کے مختلف منظر (سین) پیش کرتی ہیں۔ یہ ڈرامہ کیا ہے؟ مظہرِ رُوحِ خدا ہے۔ گویا قومیں محض کٹھ پتلی ہیں۔ جن کی رسی خدا کے ہاتھ میں ہے۔

یورپ والوں کے لئے یہ نیا تصور تھا لیکن عمر خیام (متوفی ۱۱۲۳ء) چھ سو سال پیشتر یہ تصور پیش کر چکا تھا۔ اس کی بیشتر رُباعیاں اسی موضوع پر ہیں۔ ایک مشہور رُباعی میں وہ کہتا ہے کہ :۔

مالعبت گانیم وفلک لعبت باز | از روئے حقیقیٔ نہ از روئے مجاز
بازیچہ ہمی کنیم بہ نطع وجود | رفتیم بہ صندوق عدم یک یک باز

(انسان کٹھ پتلی ہے اور فلک پتلی باز ہے۔ گو مجازاً یہ صحیح نہیں لیکن حقیقتاً یہ درست ہے۔ ہم اس دُنیا میں قلابازیاں کھاتے ہیں اور بالآخر باری باری ہم عدم کو روانہ ہوتے ہیں۔)

مسئلہ شر کے متعلق ہیگل کا نظریہ یہ تھا کہ وقتاً فوقتاً خدا شریروں کو پیدا کرتا رہتا ہے۔ سکندر بھی خدا کی مرضی کے مطابق اُٹھا اور اس نے دُنیا کو تہ وبالا کر کے وہ نتائج پیدا کئے جو اس کے گمان میں نہ تھے۔ خُدا کے منصوبے پورا کرنے کے لئے ایسے لوگ ضروری ہیں۔ چنانچہ ہیگل کہتا ہے کہ ان لوگوں کو بُرا نہ کہنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ بھی خدا کے فرستادہ ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ :۔

"ایسے لوگ دیگر مفاد بلکہ مقدس مفاد کو بھی پامال کرتے ہیں۔ یہ حرکت ہمارے تصورِ اخلاق کے خلاف ضرور ہے لیکن جب کوئی بھاری چیز حرکت کرتی ہے تو معصوم پھول اور دیگر چیزیں اس کے پیروں تلے آ کر برباد ہو جاتی ہیں۔"

اگر لاکھوں جانیں اس حرکت سے ضائع ہو جائیں تو کیا مضائقہ ہے؟ خدا افراد کی بہبودی کا لحاظ نہیں کرتا۔ وہ تو دنیا کی بھلائی دیکھتا ہے۔ بقول شاعر :۔

فرد کی کیا ہے حقیقت ہے وہ ملّت کے لئے
قطرہ دریا کے لئے ۔ دریا ہے موجوں کے لئے

ہیگل کی نظر میں ملّت سے مُراد پوری دُنیا ہے۔ خدا اس دُنیا پر بحیثیت مجموعی نظر رکھتا ہے نہ کہ قوم وار۔ مولانا رُوم نے بھی کہا ہے:۔

مردم از حیوانی و آدم شدم
پس چہ ترسم کہ زمُردن کم شوم

ہیگل کے اس نظریے کے مطابق سکندر جیسے انسان تمام قیود اخلاق سے بری ہیں۔ جرمن قوم کا ہمیشہ سے یہ نظریہ رہا ہے۔ نیطشہ بھی اس نظریہ کا قائل تھا۔ اس نے سکندر جیسے انسانوں کو مافوق الانسان یعنی "سُپرمین" قرار دیا۔ ایسے انسان کسی قانون کے پابند نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے لئے علیحدہ قانون تراشتے ہیں۔ نیطشہ کا نظریہ اس طرح منظوم کیا جاسکتا ہے۔

قانون کی ہتکڑیاں دستور کی زنجیریں
شاہیں کو پکڑنے کی بچّوں کی ہیں تدبیریں
شاہین کو کیا پروا وہ خوب سمجھتا ہے
پرواز مری اُونچی پنجے مری شمشیریں!

ڈاکٹر اقبال نے نیطشہ کے مافوق الانسان کو شاہین کا لقب دیا۔ ان کے کلام میں اس نظریہ پر متعدد اشعار ہیں۔ ہیگل کے فلسفۂ تاریخ کے مطابق افراد کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل چیز تو جماعت ہے جس میں وہ پرورش پاتا ہے۔ اس لئے جماعت کے مفاد کے سامنے افراد کے مفاد کی کوئی حقیقت نہیں۔ مولانا رُوم اور ہیگل کے نظریے میں تو بظاہر مشابہت ہے لیکن دراصل یہ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ مولانا رُوم کی مُراد لفظ مُردن سے موت ہے۔

قتل نہیں۔ لیکن ہیگل جماعت کے مفاد کے لئے قتل عوام کو جائز سمجھتا ہے۔ تاکہ ایک مخصوص جماعت کو قوت حاصل ہو نہ کہ کائنات کو ارتقا حاصل ہو۔ گویا افراد کے احساسات کوئی چیز نہیں۔ جماعت کا مفاد اصل چیز ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی جس کا ہیگل حامی ہے کس کام کی جب افراد طاقت کا آلہ بن جائیں۔ اس سوال کا جواب ہیگل یہ دیتا ہے کہ اصل آزادی جماعت کی آزادی ہے۔ جس کا قائم کرنا یا قائم رہنا ناممکن ہے۔ جب تک کہ جماعت طاقتور نہ ہو۔ اس لئے جس راستہ پر تاریخ چلتی ہے اس کا منزلِ مقصود جماعت کی آزادی ہے نہ کہ افراد کی۔ لہٰذا افراد کے لئے ہیگل کا فلسفۂ تاریخ پیغامِ موت ہے۔

اس کے علاوہ ہیگل کا فلسفۂ تاریخ بہ اعتبار خصوصیت چار ادوار میں تقسیم ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ گویا تاریخ کی شروعات مشرق سے ہوئی۔ یونانیوں اور رومیوں کے زمانے میں دوسرا دور یعنی آغازِ شباب آیا۔ تیسرے دور میں عیسائیت نے تاریخ کے شباب کی تکمیل کی جرمن قوم کے ہاتھ سے تاریخ کا چوتھا دور شروع ہوا جو آخری دور ہے۔ گویا سفرِ تاریخ ختم ہوا۔ اور علمِ تاریخ منزلِ مقصود کو پہنچ گیا۔ اب تاریخ کا راستہ بند ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب ترقی ختم ہے۔ اور دُنیا خاتمے کی منتظر ہے۔ یعنی جرمن قوم "خاتم الترقی" ہے۔ جرمن قوم کی ترقی کے بعد دُنیا ختم ہے۔

جتنے فلسفیانِ تاریخ جرمنی سے اُٹھے اتنے کسی ایک مُلک سے نہ پیدا ہوئے۔ چنانچہ دوسرا فلسفیِ تاریخ بھی جس کا فلسفہ آج دنیا کو تہ و بالا کر رہا ہے اسی مُلک سے نمودار ہوا۔ یہ کارل مارکس تھا جو نسلاً یہودی

تھا۔لیکن جرمنی میں اس کے آباؤ اجداد سکونت اختیار کر چکے تھے اور اس فلسفۂ تاریخ پر جرمن رنگ چڑھ چکا تھا۔

کارل مارکس کا فلسفۂ تاریخ

ہیگل نے مجھے موت کے گھاٹ اُتارا تو نہیں لیکن موت کے گھاٹ کے کنارے ضرور پہنچا دیا۔لیکن اسی اثنا میں ایک اور مفکر اسی جرمنی سے اُٹھا جس نے مجھے حیاتِ ثانی کی بشارت دی۔ اس مفکر نے بھی دُنیا کو تماشہ گاہ قرار دیا۔جہاں وقتاً فوقتاً "مداری" نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ ہیگل نے میری دُنیا خدا کے سُپرد کر دی تھی اور میں مظہرِ خدا بن گئی تھی۔یعنی خدا اپنی ہستی کا اظہار میرے ذریعہ کرتا تھا لیکن کارل مارکس کائنات کو حادث نہیں بلکہ قدیم مانتا تھا۔گویا کائنات پہلے ظہور میں آئی۔ خدا بعد کو نمودار ہوا۔

کارل مارکس (۱۸۱۸ء تا ۱۸۸۳ء) کا زمانہ وہ تھا جب سرمایہ داری زور پکڑ چکی تھی۔لیکن ساتھ ہی اس زمانے کے فلسفی محبت اور اُلفت کا گیت گا رہے تھے۔ مگر سرمایہ داروں کے کارخانوں میں ظلم اور خود غرضی کا راج تھا۔ اپنے مزدوروں سے یہ سرمایہ دار زیادہ سے زیادہ کام لیتے تھے۔ اور کم سے کم اُجرت دیتے تھے۔ ان سرمایہ داروں کا نظریہ یہ تھا کہ دُنیا کی تمام قدریں "شکم علیہ السلام" کے ماتحت ہیں۔ انسان کو اچھائی۔ بُرائی خوشی اور ملال اسی وقت نظر آتے ہیں جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے۔جب پیٹ بھرا تب دُور کی سُوجھی۔ علوم و فنون، ادب شاعری فلسفہ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔حتیٰ کہ انسان خدا کو بھی اس وقت یاد کرتا ہے جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے۔چنانچہ سرمایہ دار اپنے مزدوروں کے خالی پیٹ سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

کارل مارکس نے جب آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ باوجود اس ظلم و تعدی کے خدا کچھ نہیں بولتا بلکہ ظالم سرمایہ داروں کا ساتھ دیتا ہے۔ کارل مارکس فطرتاً شدّت پسند تھا۔ چنانچہ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ خدا کا تصوّر محض ایک ڈھونگ ہے۔ جس کی آڑ میں یہ سرمایہ دار دولت جمع کر رہے ہیں چنانچہ اس نے اس ڈھونگ کو ختم کرنے کی تدبیر سوچی۔ اسی تدبیر سے فلسفہ اشتراکیت نکلا۔ اپنے نظریہ کو مؤثر بنانے کے لئے کارل مارکس نے تاریخ پر نظر دوڑائی۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تاریخ کے تمام واقعات تقاضائے شکم سے نمودار ہوئے حکم ربّی سے نہیں۔ گویا تاریخ گری میں خدا کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ سب کچھ پیٹ کے تقاضے سے ہوا ہے اس طرح کارل مارکس نے خدا کو تاریخ سے نکال باہر کیا۔

کارل مارکس کے اس نظریے کے مطابق پیغمبروں کی تمام کاوشیں بھی تقاضائے شکم کے تحت تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے صلیب اس لئے قبول کی کہ ان کے حامیوں کا پیٹ اچھی طرح بھرے۔

تاریخ میں کارل مارکس کو خدا تو کہیں نظر نہ آیا البتہ اس کی آنکھوں نے تاریخ میں یہ ضرور دیکھا کہ انسان مختلف ادوار سے گزرا ہے۔ ہر دور کے علیحدہ علیحدہ مداری تھے جن کا تماشہ اپنے دور کے مذاق کے مطابق ہوتا تھا۔ چنانچہ کارل مارکس کو دورِ سرمایہ داری کے مداری نظر آئے۔ جو اپنا تماشہ دکھا رہے تھے لیکن ان مداریوں کے آگے کارل مارکس کو اور مداری نظر آئے جو دورِ سرمایہ داری کے مداریوں کے خاتمے کے منتظر تھے تا کہ وہ میدان میں آکر اپنا تماشہ شروع کریں۔ ڈاکٹر اقبال کی نظر بھی ان آنے والے مداریوں پر پڑی۔ چنانچہ ان کے منہ سے نکلا:۔

اُٹھو دورِ سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا!

لیکن ڈاکٹر اقبال کو یہ نظر آیا کہ ارتقائے انسانی کے لئے ہر دور لازمی ہے۔ مگر کارل مارکس کی نظر نے معلوم کر لیا تھا کہ ہر ملک کو کسی نہ کسی دن ان ادوار سے گذرنا لازم ہے۔ بغیر سرمایہ داری کے اشتراکیت نہیں آسکتی۔ اس کے فلسفہ کے مطابق ہر چیز سے اس کا تضاد پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہر طرف آگ ہوگی تو پانی کہیں نہ کہیں سے آجائے گا۔ اور آگ کے راج کو ختم کر کے اپنا راج قائم کریگا۔ لیکن ساتھ ہی آگ اور پانی ایسے متضاد ہیں کہ ان دونوں کا میل ناممکن ہے۔
کارل مارکس خدا کا قطعی منکر تھا۔ اس لئے اس کو تاریخ کے یہ ادوار بذریعہ الہام نہیں معلوم ہوئے۔ اس لئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ اپنے نظریے کی خاطر اس نے تاریخ کو توڑ مروڑ کر یہ نادیل نکالی۔ اس نے اپنی کتاب "افلاس فلسفہ" میں لکھا کہ :۔ (حوالہ نمبر ۸)

"ماہرینِ معاشیات کا خیال ہے کہ دورِ سرمایہ داری سے پہلے دَورِ جاگیرداری کا جو دستور تھا وہ محض عارضی اور مصنوعی تھا۔ لیکن دورِ سرمایہ داری کے دستور قدرت کے پیدا کردہ ہیں۔ اور اس لئے دائمی ہیں..... گویا دورِ سرمایہ داری پر پہنچ کر تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔"

لیکن کارل مارکس اس نتیجے پر پہنچا کہ دَورِ جاگیرداری مصنوعی اور عارضی تھا اس لئے اس دَورِ میں ایسے واقعات نمودار ہوئے جس سے یہ دَور ختم ہوا اور دورِ سرمایہ داری آیا۔ لیکن جس طرح واقعات تاریخ نے دورِ جاگیرداری ختم کیا اسی طرح اس دورِ سرمایہ داری میں بھی ایسے واقعات نمودار ہوں گے جن سے یہ دورِ

سرمایہ داری بھی ختم ہو گا۔ کارل مارکس کی پیشین گوئی کے مطابق سرمایہ داری کے بعد جو دور شروع ہو گا وہ دورِ اشتراکیت (کمیونزم) ہو گا۔

کارل مارکس کی یہ پیشین گوئی اس بات پر مبنی تھی کہ زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ نیز یہ تبدیلیاں بذریعہ الہام یا وحی نہیں ہوتیں بلکہ تقاضۂ شکم سے ہوتی ہیں۔ گویا بیں یعنی تاریخ بھی شکم کے تحت ہے۔ خدا کے تحت نہیں۔ لیکن بقول کارل مارکس معاشی نظام کو بھی قرار نہیں یعنی تقاضائے شکم بھی بدلتے رہتے ہیں اور ہر تبدیلی کے ساتھ انسانی تصورات اور خیالات بھی بدلتے ہیں اور اسی حساب سے قدریں بھی بدلتی ہیں۔ دورِ سرمایہ داری میں جو چیزیں قابلِ قدر ہیں وہ دورِ اشتراکیت میں مذموم ہو جائیں گی۔ دورِ سرمایہ داری کی خرابیوں سے وہ حالات پیدا ہوں گے جن سے سرمایہ داری کا تختہ اُلٹ جائے گا۔

الغرض بقول کارل مارکس ایک دور دوسرے دَور کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور انسانی ترقی برابر جاری رہتی ہے۔ ارتقاء کے معاملے میں کارل مارکس ڈارون کا مقلد تھا جس کے نظریے کے مطابق کیڑے مکوڑے ترقی کر کے انسان بن گئے۔ جس طریقے سے کیڑے مکوڑوں نے ترقی کی وہ یہ تھا کہ جو کیڑے نا اہل تھے وہ یا تو فنا ہو گئے یا کیڑوں کی صورت ہی میں رہ گئے جو کیڑے اہل تھے وہ ترقی کر کے اگلے مدارج پر پہنچ گئے۔ اس جدوجہدِ ترقی کا نام ڈارون نے "تنازعہ البقاء" رکھا۔ چنانچہ کارل مارکس بھی اسی نظریۂ تنازعہ البقاء کا قائل تھا۔ چنانچہ اسی "افلاسِ فلسفہ" میں کارل مارکس نے لکھا کہ:۔

"اعلیٰ قسم کے حیوان قحط اور موت کی منزلیں طے کر کے اپنے

اعلیٰ منزلِ مقصود تک پہنچے یعنی اعلیٰ قسم کے حیوان بنے"۔

لیکن کارل مارکس نے اپنے فلسفۂ اشتراکیت میں ایک فحش غلطی کی۔ اس نے اصولِ ارتقاء کو فراموش کر کے اشتراکیت کو آخری منزل قرار دیا۔ گویا اشتراکیت قائم ہونے کے بعد انسانی ارتقاء ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح مجھے دَورِ اشتراکیت تک پہنچا کر میرا خاتمہ کر دیا۔ لیکن میں تو انسان کے ساتھ وابستہ ہوں۔ جب تک انسان ہے تب تک میں بھی رہوں گی۔ ممکن ہے کہ اشتراکیت کے بعد قیامت آجائے۔ لیکن قیامت کی پیشین گوئی کوئی نئی چیز نہیں۔ ہر زمانے میں قیامت کی پیشین گوئی کی جاتی ہے لیکن اب تک تو قیامت کا کوئی نشان نظر نہیں آتا۔

اشتراکیت کے مخالفین اشتراکیت کے "آخر الزمان" ہونے سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اشتراکیت اتنی بُری چیز ہے کہ اس کو مٹانے کے لئے خدا انسان ہی کا خاتمہ کر دے گا۔ کاش کارل مارکس آج زندہ ہوتا اور اس معقول اعتراض کا جواب دیتا۔

اشتراکی فلسفے کے مطابق تو "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں" لیکن کارل مارکس کے مطابق اشتراکیت محض قیامت کا پیش خیمہ ہے۔ دُنیا کے خاتمے کا خیال کارل مارکس کے دل میں کس طرح پیدا ہوا؟ کیا اس پر وحی آئی؟ یہ شخص خدا کا شدّت سے منکر تھا۔ اس لئے وحی یا الہام کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نے اشتراکیت کو آخری دورِ ترقی اس لئے قرار دیا کہ اس کے نزدیک اشتراکیت سے بہتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ اس معاملے میں کارل مارکس نے انبیاء کی تقلید کی کیونکہ ہر نبی نے اپنے قائم کردہ مذہب کو بہترین قرار دیا ہے۔ لیکن تاریخِ مذاہب سے پتہ

چلتا ہے کہ نئے مذاہب برابر آتے رہے۔

فلسفۂ تاریخ کے مطابق کیا انسان ترقی پسند ہے؟

کارل مارکس نے دورِ اشتراکیت کے بعد ترقی کا دروازہ بند کر دیا لیکن بیشتر فلسفیان کو مجھ میں ترقی ہی ترقی نظر آتی ہے گویا میں ترقی کے لئے ہی پیدا ہوئی کیونکہ انسان جو ہمیشہ میرا موضوعِ بیان ہے ترقی کے لئے پیدا کیا گیا۔ ترقی کا یہ تصور اسی وقت پیدا ہو چکا تھا جب علیسائیت نے دعویٰ کیا کہ عیسیٰ کی بدولت دُنیا اپنے زمانۂ جاہلیت سے بہتر ہے۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں مغرب میں مذہب کی مخالفت شروع ہوئی اور اب صاحبِ فکر لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ اصل ترقی مذہب کے ذریعہ نہیں بلکہ بذریعہ عقل ہوتی ہے۔ مذہب کو جتنا پسِ پشت ڈالا جائے اتنا ہی عقل زور پکڑے گی کیونکہ عقیدہ اور عقل یکجا نہیں ہو سکتے۔ یہ نظریہ پہلے فرانس میں والٹیر نے پیش کیا کیونکہ اس ملک میں رائج الوقت سیاست کے خلاف تحریک شروع ہونے لگی تھی اور انقلاب کا تصور پیدا ہونے لگا تھا۔ تحریکِ انقلاب اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب انقلاب کو ذریعۂ ترقی ثابت کیا جائے۔ فرانس میں مون ٹیس کیو اور انگلستان میں گبن نے مذہب کے خلاف علم بلند کیا۔

ان دونوں کی دلیل یہ تھی کہ رومیوں نے ترقی اس لئے کی کہ وہ مذہب اور عقیدے کی جھکڑ بندیوں سے بری تھے۔ تاریخ طالب ترقی ہے اور مذہب مانعِ ترقی ہے۔ ترقی انسان کا انتظار کر رہی ہے تاکہ وہ جلد از جلد انسان کے قدم چومے۔ اسی زمانے میں امینول کانٹ (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء) جرمنی سے اُٹھا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ تاریخ بھی فطرت کی طرح

ترقی طلب کرتی ہے۔ اور آزادی کی جویا ہے۔ کیونکہ ترقی کے لئے آزادی ضروری ہے۔ لیکن اصل آزادی آزادیٔ ذہن ہے اور تاریخ بھی اسی آزادیٔ ذہن کا تقاضہ کرتی ہے۔

ایک اور جرمن فلسفی شلر (۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۵ء) نے جو دراصل شاعر تھا میرے متعلق دعویٰ کیا کہ میں ہمیشہ ترقی پسند رہی ہوں اور میری ترقی پسندی ہی کی بدولت انسان وحشی سے متمدن ہوا۔ اس لئے میں انسانی ترقی کی داستان ہوں تنزل کی نہیں گویا میرا صحیفہ تنزل سے بالکل ناآشنا ہے۔ اور انسان برابر ترقی کرتا رہا ہے۔ بالفاظ دیگر میں ایسے راستے پر چلتی ہوں جس کی ہر منزل ترقی کی منزل ہے۔ یہ میری راہ ترقیٔ پہلے سے معین ہے۔ راستے میں مجھے کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو مجھے اس راہِ ترقی سے بھٹکا دے۔

مگر دورِ حاضر کا مشہور انگریز مورخ ہربرٹ فشر (۱۸۶۵ء تا ۱۹۴۰ء) میرے متعلق کچھ اور ہی کہتا ہے۔ اس غریب کو میرا معین راستہ نظر نہ آیا اور نہ اس کو میری ہر منزل میں ترقی نظر آئی۔ وہ کہتا ہے :- (حوالہ نمبر ۹)

"مجھ سے زیادہ عاقلوں اور داناؤں کو تاریخ میں ایک معینہ منصوبے کے تحت متواتر ترقی نظر آتی ہے لیکن میری نظر اس سعادت سے محروم رہی۔ مجھے تو یہ نظر آیا کہ جس طرح ایک لہر کے بعد دوسری لہر اٹھتی ہے اسی طرح تاریخ بھی اسی مدوجزر کی کہانی ہے گویا تاریخ نشیب و فراز سے پُر ہے۔ اس لئے میں تو تاریخ سے صرف یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ انسان کی

قسمت میں نشیب و فراز ہی لکھا ہے جس کو وہ پہلے سے نہیں دیکھ سکتا..... بے شک تاریخ میں ترقی بھی صاف نظر آتی ہے لیکن ترقی قانونِ فطرت میں داخل نہیں۔ ایک پیڑھی کی حاصل کردہ عزت کو دوسری پیڑھی کھو بیٹھتی ہے۔ اکثر اوقات انسان راستے سے بھٹک کر بربادی اور بربریت کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔"

فلسفہ کی بدولت میں متضاد نظریئے کے جال میں پھنس گئی۔ کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ اس کو وہی نظر آتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کا زمانہ وہ تھا جب مغرب ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ کیونکہ مشرق اس وقت خوابِ غفلت میں تھا۔ اس لئے اس زمانے کے مفکروں کے دل جوشِ ترقی سے پُر تھے۔ ان کو مجھ میں ترقی ہی ترقی نظر آتی تھی لیکن پروفیسر فشر کے زمانے میں پہلی عالمگیر جنگ (سنہ ۱۹۱۴ تا سنہ ۱۹۱۸ء) نے اہلِ مغرب کا مغالطہ ترقی دُور کر دیا تھا۔ مشرق بیدار ہو کر اہلِ مغرب کو نکالنے کی فکر میں تھا۔ چنانچہ پروفیسر فشر کو فراز کے ساتھ نشیب بھی نظر آیا۔ ان کی نظر میں مَیں مد و جزر کی داستان ہوں۔

اسی لئے میں نے فلسفے کے متضاد نظریوں کو اپنے لئے بار سمجھا۔ ایک فلسفی کو میرے فلسفے میں ترقی نظر آتی تھی دوسرے کو تنزل دکھائی دیتا تھا۔ ایک کو مجھ میں خیر کا غلبہ نظر آتا تھا اور دوسرے کو شر کا۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے خیر و شر دونوں گھسیٹتے ہیں کیونکہ میں انسان سے وابستہ ہوں۔ اس لئے

میرے افعال کی بناپر کوئی قطعی کلیّہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ میں نے اپنے لئے ایک علیٰحدہ فلسفہ وضع کیا جس کا ذکر میں اگلے باب میں پیش کر رہی ہوں

چوتھا باب

میرا اپنا فلسفہ

گذشتہ باب میں جس فلسفے کا ذکر میں نے کیا ہے اس کو میں نے نہیں اپنایا۔ میں ایک ایسے فلسفی کی منتظر تھی جو تاریخ نگار ہو۔ چنانچہ ایسا تاریخ نگار بالآخر میرے ہاتھ لگا جس کا نام ویکو (۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء) تھا۔

باب بعنوان "میں کون ہوں۔ کیا ہوں اور کیا نہیں ہوں" کے تحت میں نے بتایا ہے کہ اہل عقیدہ مورخوں نے مجھ کو نہیں بلکہ خدا کو "واقعہ گر" قرار دیا۔ حتیٰ کہ انسان کو بھی حکمتِ الٰہی کا آلہ قرار دیا۔ جب یہ مسئلہ اُٹھا کہ واقعہ گر انسان ہے یا خدا تو فلسفیوں نے مجھ پر دست درازیاں شروع کیں اور مجھ پر فلسفہ کا بوجھ لادا گیا کس طرح اور کیوں مجھ پر فلسفہ لادا گیا اس کا حال متعلقہ باب میں میں بیان کر چکی ہوں۔ یہ بوجھ لادنے والے تقریباً سب پیشہ ور فلسفی تھے ان میں کوئی مورخ نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر کوئی مورخ ان میں تھا تو اس نے تاریخ نگاری محض فلسفے کی خاطر اختیار کی تھی۔

ویکو اور اس کا فلسفہ تاریخ

مجھ پر یہ بوجھ قرون وسطیٰ ہی سے لدنا شروع ہو گیا تھا۔ جب قرون وسطیٰ کے اختتام پر دورِ جدید کا آغاز "نشاۃ ثانیہ" کی صورت میں ہوا تو فلسفہ کا بار پوری طرح مجھ پر لد چکا تھا اس لئے ناچار مجھ کو فلسفہ اپنانا پڑا۔ میں پوری فلسفی بننے کی تیاری کر رہی تھی کہ مُلک اٹلی سے ایک مورخ نمودار ہوا

جس کا نام ویکو (۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء) تھا۔ اس نے میرے فلسفے کو سائنس قرار دیا۔ یعنی مجھے قیاس کی گہرائیوں سے نکال کر تیقّن کے تخت پر بٹھادیا۔ جس طرح سائنس بالیقین بتاتی ہے کہ دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں اسی طرح اس ویکو نے میرے قائم کردہ کلیوں کو کامل اور یقینی قرار دیا۔

لیکن باوجود ویکو کی کاوشوں کے میں سائنس ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی۔ کیونکہ میرے قائم کردہ کلیوں کی تصدیق ممکن نہیں۔ دو اور دو کے چار ہونے میں اگر کوئی شک کرتا ہے تو ماہرین ہندسہ اس کے ہاتھ پر دو دو روٹیاں رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان روٹیوں کو ملا کر گنو۔ اس طرح علم ہندسہ کے اس دعویٰ کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

لیکن میرے معلوم کردہ کلیوں کی تصدیق ناممکن ہے۔ علومِ سائنس کے کلیوں کی تصدیق تجربہ گاہوں میں ہو سکتی ہے لیکن میرے کلیوں کی تصدیق کے لئے تجربہ گاہ قائم کرنا ممکن نہیں مثلاً میرے واقعات کی بنا پر یہ کلیہ قائم کیا گیا ہے کہ جب لوگوں پر ظلم ہوتا ہے تو انقلاب رُونما ہوتا ہے۔ اس کلیے کی تصدیق کے لئے کسی مُلک کے لوگ مؤرخ کو اجازت نہ دیں گے کہ مؤرخ ان پر ظلم کرے۔ لیکن باوجود اس دقّت کے اس اطالوی مؤرخ ویکو نے دعویٰ کیا کہ تاریخ بھی ایک سائنس ہے۔ دیگر سائنسوں کے عنصر تو خدا کے پیدا کردہ ہوتے ہیں مثلاً علم کیمیا کے عناصر آگ پانی وغیرہ ہیں جو خدا کے پیدا کردہ ہیں لیکن تاریخ کے عناصر انسان کے پیدا کردہ ہیں مثلاً رواج۔ زبان۔ قانون وغیرہ انسان کے اپنے ساختہ ہیں۔ ان میں خدا یا فطرت کو کوئی دخل نہیں۔ لہٰذا اس اصول کے تحت کہ "تصنیف را مصنّف نیکو کند بیان" انسان اپنی ساختہ چیزوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔

چونکہ خدا نہیں بلکہ انسان واقعہ گر ہے اس لئے انسان ان واقعات کی نوعیت اور ان کے اسباب کو خوب سمجھتا ہے۔ چونکہ مورخ بھی انسان ہے اس لئے مؤرخ کو ان واقعات کے سمجھنے میں کوئی دقّت نہ ہونی چاہیئے۔

ویکو کا یہ دعویٰ قرونِ وسطیٰ کے مؤرخوں کے نظریے کے بالکل خلاف تھا کیونکہ ان عقیدت مند مؤرخوں کا عقیدہ تھا کہ واقعہ گر انسان نہیں بلکہ خدا ہے۔ جب انسان واقعہ گر ہے تو وہ ان واقعات کے اسباب بھی باآسانی معلوم کر سکتا ہے۔ ویکو نے اپنے دعوے کو ایک کتاب کی صورت میں پیش کیا جس کا نام اس نے "علم جدید" (نئی سائنس) رکھا کیونکہ اس کی نظر میں تاریخ بھی ایک سائنس تھی۔ اس کتاب کا پورا نام یہ تھا۔

"قوموں کی یکساں فطرت کے متعلق علم جدید"

اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ ویکو کے نظریے کے مطابق سب قومیں فطرتاً یکساں ہیں۔ لیکن ان قوموں کے متعلق جو علم ویکو پیش کرتا ہے وہ بالکل نیا ہے۔ ویکو کی کتاب کا مقصد مصنف کی اپنی زبانی سنئے:۔ (حوالہ نمبر ۱)

"یہ علم جدید ... قوموں کی یکساں فطرت کا نظارہ پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ دینی اور دُنیاوی دستور کس طرح متمدّن اقوام میں پیدا ہوئے ..."

اس تمہید کے بعد ویکو زمانے کو تین حصّوں میں اس طرح منقسم کرتا ہے:۔

(۱) دیوتاؤں کا زمانہ جس میں متمدّن لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ حکومتِ الٰہی کے تحت ہیں۔ اور دیوتا اپنے احکام فال کے ذریعہ جاری کرتے ہیں۔

(۲) جاں باز سورماؤں کا زمانہ جس میں یہ سورما برسرِ حکومت تھے۔

کیونکہ ان سورماؤں کا دعویٰ تھا کہ فطرتاً وہ عوام سے افضل ہیں۔

(۳) عوام کا زمانہ جس میں عوام کا دعویٰ تھا کہ سب انسان برابر ہیں۔ اسی زمانے میں پہلے جمہوریت قائم ہوئی اور بعد کو بادشاہ نمودار ہوئے

زمانے کو ادوار میں منقسم کرنے کے بعد ویکو فطرتِ انسانی کی کمزوریاں اس طرح بیان کرتا ہے :- (حوالہ نمبر ۲)

(۱) انسان اپنی نادانی کی وجہ سے سمجھتا ہے کہ کائنات اسی کے مفاد کے لئے پیدا ہوئی ہے اسی نادانی کی وجہ سے دُنیا میں رمز پیدا ہوئے۔ کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی اس سے وہ خائف ہو جاتا ہے۔

(۲) انسانی دماغ کی کمزوری یہ بھی ہے کہ زمانۂ ماضی کو وہ زمانۂ حال کی نظر سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ زمانۂ قدیم کے وحشی انسانوں کو بھی وہ اپنی طرح متمدّن سمجھتا ہے۔

(۳) انسان کی تیسری کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی قوم کو دیگر اقوام پر فضیلت دیتا ہے۔

(۴) چوتھی کمزوری یہ ہے کہ ہر قوم کے اہلِ علم اپنے علم کو قدیم اور راسخ سمجھتے ہیں۔

ویکو کے مقرّر کردہ تاریخ کے راستے

مورخ کو فطرتِ انسانی کی یہ کمزوریاں بتانے کے بعد ویکو نے یہ ثابت کیا کہ از روئے فلسفہ تاریخ بڑی کار آمد ہے۔ اور علم تاریخ میں ترقّی کی پوری اہلیت ہے اور اس علم کے ذریعہ بہت سے فلسفیانہ مسائل حل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ مؤرخ اپنے علم پر حاوی ہو اور مؤرخ جانتا ہو کہ تاریخ کے لئے بھی

چند راستے مقرر ہیں۔ جن پر تاریخ ہمیشہ چلتی ہے۔ ان راستوں کے ذریعہ مؤرخ ان قدیم زمانوں کے بھی حالات معلوم کر سکتا ہے۔ جو ابھی تک مخفی ہیں۔ بقول ویکو وہ راستے دو ہیں :۔

تاریخ کا پہلا راستہ:

تاریخ کے بعض عہد ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں خواہ علاقے مختلف ہوں۔ مثلاً یونان کا عہدِ ہومر یورپ کے عہد قرون وسطیٰ سے ملتا جلتا ہے۔ حالانکہ علاقے مختلف ہیں۔ ان دو عہدوں کو ہم عہدِ رزمیہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں عہدوں میں جنگجو امراء کا راج تھا۔ ذریعۂ معاش کاشتکاری تھی۔ شاعر رزمیہ نظمیں لکھتے تھے عزّت کا دارومدار ذاتی شجاعت پر تھا۔ اس لئے عہدِ ہومر کے واقعات اگر ہم کو پوری طرح معلوم نہیں تو ہم ان واقعات کا تصوّر قرونِ وسطیٰ کے واقعات کے ذریعہ کر سکتے ہیں۔

تاریخ کا دوسرا راستہ:

تاریخ کے عہد ایک دوسرے کے بعد ایک ہی طرح باری باری سے آتے ہیں۔ مثلاً رزمیہ عہد کے بعد بزمیہ عہد آتا ہے۔ جب اہلِ سیف کی جگہ اہلِ قلم لیتے ہیں۔ نظم کی جگہ نثر لے لیتی ہے۔ کاشتکاری کی جگہ صنعت و حرفت پیدا ہوتی ہے۔ جنگ کی بجائے لوگ صلح و امن کے طلبگار ہوتے ہیں لیکن اس امن و امان سے چند خرابیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہوتی ہیں۔ مسلسل امن اور دولت کی فراوانی سے لوگوں کے ذہن معطل ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے ذہن سے کوئی نئی چیز یا نیا خیال نہیں پیدا ہوتا۔

لیکن ویکو ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ یہ دونوں راستے ایک دوسرے سے متصل نہیں ہیں۔ اور نہ ہر راستے کی ایک ہی منزل مقصود ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی قوم پہلا راستہ طے کرنے کے بعد بھٹک کر کسی اور راستے پر پڑ جاتی ہے۔ جو دوسرے مقررہ راستے سے مختلف ہوتا ہے گویا تاریخ ہمیشہ ایک ہی قسم کے واقعات نہیں پیدا کرتی یعنی تاریخ اپنے آپ کو دہراتی نہیں اور نہ وہ ان راستوں کی پابند ہے۔ جب تاریخ پہلے راستے سے گذرتی ہے تو ضروری نہیں کہ اس کو اس راستے میں وہی واقعات ملیں جو پہلے اس راستے کے سفر میں ملے تھے۔ کیونکہ زمانہ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اور نئے نئے واقعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے ویکو مؤرخوں کو تنبیہہ کرتا ہے کہ پیشین گوئی کرنا مؤرخوں کا کام نہیں۔

مجھے ویکو کی یہ بات بہت پسند ہے۔ میں نے ہمیشہ اپنے محرّروں کو تاکید کی کہ فال گوئی پجاریوں اور منجموں کا کام ہے۔ اور مؤرخ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ لیکن میرے ناظرین اعتراض کرتے ہیں کہ جب میں انسان کو آئندہ سے مطلع نہیں کر سکتی تو میرے صحیفوں کے مطالعہ سے کیا فائدہ؟ یہ بڑی طویل بحث ہے۔ اس مسئلہ میں بعض محرّروں کو مجھ سے اختلاف ہے۔ جس کا ذکر میں مناسب جگہ کروں گی۔

اس تنبیہہ کے بعد ویکو مؤرخوں کو پانچ خطروں سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ یہ ہیں:۔

پہلا خطرہ:

افراد کی طرح قومیں بھی فخر و مباہات کا شکار ہوتی ہیں۔ ہر قوم دعویٰ کرتی ہے کہ اس کا ماضی بڑا شاندار ہے۔ جو قومیں باہم ترقی

پر پہنچ کر گر جاتی ہیں۔ وہ تو ہر وقت اپنے شاندار ماضی کے گانے گاتی ہیں۔ "پدرم سلطان بود" انسان کی قدیمی کمزوری ہے۔ گری ہوئی قوموں کے پاس اس کے سوا اور کوئی ذریعۂ تسلی نہیں۔ ہندو تو البیرونی (۹۷۳ء تا ۱۰۴۸ء) ہی کے زمانے میں اس ذہنیت کا شکار ہو چکے تھے۔

دوسرا خطرہ:

جب مؤرخ عہدِ قدیم کے متعلق چھان بین کرتا ہے تو وہ اس عہد میں اس حد تک غرق ہو جاتا ہے کہ وہ اس کا شیدا ہو جاتا ہے۔ جب کتا یا بلی انسان پالتا ہے تو اس کو اس جانور سے بھی انس پیدا ہو جاتا ہے اور اس کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب مؤرخ عہدِ قدیم کا دیر تک مطالعہ کرتا ہے تو اس کو اس عہد سے بھی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور اس زمانے کی تعریف میں وہ مبالغہ کرنے لگتا ہے۔

تیسرا خطرہ:

مؤرخ عام طور سے اہلِ دماغ ہوتے ہیں اور اپنی اس اہلیت پر نازاں ہوتے ہیں۔ اس لئے جب وہ زمانۂ ماضی کا مطالعہ کرتے ہیں دوبارہ تو اس زمانے کے لوگوں کو بھی اپنی طرح اہلِ دماغ قرار دیتے ہیں لیکن بقول ویکو جن لوگوں سے زمانۂ سابق متاثر ہوا ہے وہ اہلِ دماغ نہیں بلکہ اہل عمل یا اہل سیف تھے۔ علم اور عمل کا یکجا ہونا مشکل ہے اس لئے تاریخ کی عظیم الشّان ہستیاں صاحبِ عمل تھیں صاحب علم نہ تھیں۔

چوتھا خطرہ:

جب مؤرخ کو دو قومیں ہم خیال نظر آتی ہیں تو وہ اس سے فوڑا یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ ان میں ایک قوم دوسری قوم کی معلّم ہے۔ وہ یہ

بھول جاتا ہے کہ بیک وقت ایک ہی خیال دو انسانوں کے دماغ میں آسکتا ہے کیونکہ جدّت کسی خاص قوم کے لئے مخصوص نہیں۔ جدّت کا دروازہ ہر قوم کے لئے کھلا ہوا ہے۔ بیشک ایک قوم دوسری قوم کو سکھاتی ہے۔ یونانیوں نے رومیوں کو درس دیا۔ چین نے جاپان کو انسان بنایا۔ لیکن شاگرد جو کچھ استاد سے سیکھتا ہے وہ بقدر استعداد شاگرد ہوتا ہے۔ نا اہل شاگرد اُستاد سے کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ بقول مولانا روم :-

چار پا را قدر طاقت بار نہ ۔۔۔ بر ضعیفاں قدر قوت کار نہ

دانۂ ہر مُرغ اندازۂ وے است ۔۔۔ طعمۂ ہر مرغ انجیرے کہ است

(چوپایوں پر ان کی طاقت کے مطابق بوجھ لادو۔ ضعیفوں پر ان کی ضعیفی کے مطابق بوجھ لادو۔ ہر پرند کی غذا سے اس پرند کی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر پرند کو انجیر ہضم نہیں ہوتا۔)

پانچواں خطرہ :-

یہ ایک عام خیال ہے۔ کہ ماضی کے قریب العہد لوگ زمانۂ ماضی کو بہتر جانتے تھے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ عہد اورنگ زیب کے مؤرخ بابر کے متعلق ہم سے بہتر جانتے تھے۔ بقول ویکو تاریخ دانی کے معاملے میں متقدمین اور متاخرین میں کوئی بڑا فرق نہیں۔ بعض اوقات متاخرین کے نوشتہ واقعات متقدمین کے نوشتوں سے زیادہ صحیح ہوتے ہیں۔

تحقیق تاریخ کے طریقے

ان خطروں سے آگاہ کرنے کے بعد ویکو مورخین کی ہدایت کے لئے تحقیق کے چند طریقے پیش کرتا ہے :-

پہلا طریقہ : زمانہ ماضی کے حالات معلوم کرنے میں پُرانی قوموں کے

ذخیرۂ الفاظ سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اگر کسی پرانی قوم کی لغت میں فلسفیانہ اصطلاحیں نہیں ہیں تو ہم یہ کہہ سکتے کہ یہ قوم علم فلسفہ سے ناآشنا تھی۔ ذخیرۂ الفاظ سے قوموں کی ذہنیت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب عہد اسلام میں کوئی شخص دوسرے کی مزاج پرسی کرتا تھا تو جواب میں یہ دوسرا شخص "الحمد للہ" کہتا تھا۔ گویا اچھی صحت اللہ کی طرف سے ہے۔ آج کل ہم "شکریہ" کہتے ہیں۔ گویا پرسش کنندہ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ عربی لغت میں لفظ "شکر" صرف خدا کے لئے مخصوص ہے۔ تاریخ نگاری میں قوموں کی ذہنی ترقی بھی شامل ہے اس لئے مؤرخ کو قوموں کی زبانوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کسی قوم کے ذخیرۂ الفاظ سے اس کی ذہن کی رسائی کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ہمارے زمانے میں اردو زبان میں انگریزی الفاظ اور محاورے بکثرت داخل ہو رہے ہیں جس سے زبان اُردو کے افلاس اور انگریزی زبان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس راقم الحروف نے بڑی کوشش کی کہ اس سرگذشت تاریخ میں وہ غیر مانوس بدیشی محاوروں اور الفاظ سے گریز کرے لیکن پھر بھی اس کو صرف الفاظ ہی نہیں بلکہ محاورے بھی استعمال کرنے پڑے۔ ہمارے اُردو اخباروں کے "اداریئے" پڑھیئے۔ آپ یہ محسوس کریں گے کہ ایڈیٹر صاحب نے پہلے یہ اداریہ انگریزی میں لکھا تھا۔ بعد کو اس کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ لفظ "اداریہ" خود انگریزی لفظ "ایڈی ٹوریل" کا بھونڈا ترجمہ ہے۔ انگریزی الفاظ کا اُردو میں داخل ہونا اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ہم جدید خیالات سے متاثر ہو رہے ہیں اور ہماری ثقافت میں

انگریزیت کس سرعت سے داخل ہو رہی ہے۔ رومیوں کو بھی یونانی زبان کے الفاظ اور محاورے لینے پڑے۔

دوسرا طریقہ :۔

زمانۂ قدیم کے قوموں کے تمدن کا جائزہ لینے میں ان قوموں کی راگ مالا یا دیو مالا کا مطالعہ ضروری ہے۔ بُت پرست قوموں میں اخلاقی تعلیم انہیں "مالاؤں" کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ ان مالاؤں سے پتہ چلتا ہے کہ ان قدیم قوموں میں کون کون باتیں معیوب تھیں اور کون کون باتیں اچھی سمجھی جاتی تھیں۔ مالا گڑھنے میں یونانی اور ہندو مشہور تھے۔ لیکن یونانی دیو مالا بڑی معنی خیز ہے۔ مثلاً تاریخ کو مجھ جیسی دیوی سے منسوب کیا اور میرا نام کلائو رکھا لیکن سب سے زیادہ معنی خیز بات یہ ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک کورا کاغذ دیا۔ اس کورے کاغذ کے کیا معنی ہیں؟ اس سوال کا جواب مَیں کئی بار اس سرگذشت کے پہلے باب میں دے چکی ہوں۔ اس قسم کی دیو مالا سے پتہ چلتا ہے کہ یونانی ذہن کیسی اعلیٰ منزل تک پہنچ چکا تھا۔ بالآخر اسی یونانی ذہن سے فلسفہ نمودار ہوا۔ اور سقراط اور افلاطون اور ارسطو جیسے فلسفی پیدا ہوئے۔ گویا یونانیوں کی دیو مالا فلسفے کی پیش خیمہ تھی۔

تیسرا طریقہ :۔

دیو مالا کی طرح دیکو کی نظر میں پُرانی روایات کی بھی بڑی اہمیت تھی۔ یہ صحیح ہے کہ یہ روایات مثل افسانہ ہیں۔ اور صحت کے لحاظ سے یہ محض من گڑھنت ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ان روایات کا پس منظر حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ ناولوں میں جو

واقعات ہوتے ہیں وہ بلاشبہ من گھڑت ہوتے ہیں۔ لیکن اچھے قسم کے ناولوں میں جو سماجی منظر پیش کیا جاتا ہے وہ بالکل صحیح ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ کا یقین بھی اس وقت کیا جاتا ہے جب جھوٹ سچ کے مطابق ہوتا ہے۔ جو جھوٹ حدِ امکان سے ورے ہوتا ہے اس کا کوئی یقین نہیں کرتا۔ اس لئے اس قسم کا جھوٹ نہ کوئی بولتا ہے نہ کوئی لکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جھوٹ کو بھی سچ کی نقل کرنی پڑتی ہے۔

البتہ روحانی معاملات میں مافوق العادت باتوں کا ذکر آتا ہے۔ لیکن مؤرخ کے لئے یہ آسمانی باتیں بھی بیکار نہیں۔ ان باتوں سے رائج الوقت عقائد اور قدروں کا پتہ چلتا ہے اور اسی کو تاریخ کا پس منظر کہتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال انجیل ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزوں کا ذکر ہے کہ کس طرح یہ نبی ہاتھ لگا کر کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے تھے۔ رائج الوقت عقل ان معجزوں کو تسلیم نہیں کرتی لیکن ساتھ ہی ان روایات سے پتہ چلتا ہے کہ

(۱) اس زمانے کی عقل ان معجزوں کو تسلیم کرتی تھی۔

(۲) معجزہ گر قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا۔

(۳) اس زمانے میں کوڑھ کا مرض لاعلاج سمجھا جاتا تھا اس لئے جو شخص کوڑھی کو اچھا کر دیتا تھا وہ خدا رسیدہ سمجھا جاتا تھا۔

(۴) کوڑھ کو ذلیل ترین مرض سمجھا جاتا تھا۔ اور اُس زمانے کے شرفار کوڑھی سے بات کرنا بھی ذلت سمجھتے

سمجھتے تھے۔ گویا غرور جزو شرافت تھا۔

یہ سب باتیں حضرت عیسیٰؑ کے زمانے کے سماج کا پس منظر ہیں۔ اس لئے مؤرخ کو اس قسم کی روایات کا بھی جائزہ لینا پڑتا ہے۔ اسی لئے انجیل بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ انجیل کے ذریعہ سماج کے متعلق وہ حالات معلوم ہوتے ہیں جو اس زمانے کی عام تاریخوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس زمانے کی تاریخیں صرف امورِ سیاست تک محدود تھیں اور سماج کا نقشہ پیش کرنا حدودِ تاریخ سے باہر تھا۔

چوتھا طریقہ :۔

مندرجہ بالا قسم کی روایات اُس زمانے میں پیدا ہوئیں جب انسان عقلی اعتبار سے بچہ تھا اور اس قسم کی روایات کو بے چون وچرا مان لیتا تھا۔ بقول ویکو وحشی لوگوں کی عقل اب بھی اسی عہدِ طفولیت میں ہے۔ اس لئے قدیم زمانے کے وحشیوں کی ذہنیت ہم اپنے زمانے کے وحشیوں کی ذہنیت کے ذریعہ معلوم کرسکتے ہیں۔

یہ چار طریقے بتانے سے ویکو کا مقصد یہ تھا کہ مورخ کو پُرانی تاریخیں پڑھنے کی ضرورت نہ رہے۔ کیونکہ اس دنیا میں ایسے دَور بھی گذرے ہیں جب تاریخ نگاری کا نشان بھی نہ تھا۔ اگر تاریخ تھی بھی تو وہ اس قسم کی روایات سے پُر تھی۔ جن کو عقل تسلیم نہیں کرتی۔ لہٰذا یہ طریقے اختیار کرنے سے مؤرخ پرانی افسانہ نما تاریخوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور جن عہدوں کی تاریخ دستیاب نہیں ہے ان عہدوں کے سماج کا اندازہ مندرجہ بالا طریقوں سے لگا سکتا ہے اس طرح ویکو نے تاریخ میں تنقید بھی رائج کردی کیونکہ مؤرخ کو تاریخ کے خلا پُر کرنے کے لئے کانٹ چھانٹ کرنا

ضروری ہوگیا۔ اسی کانٹ چھانٹ کو تنقید کہتے ہیں۔ مثلاً بعض قدیم عہدوں کی تاریخیں تو موجود ہیں لیکن ان تاریخوں میں خلافِ عقل واقعات درج ہیں جن کو حذف کرنا ضروری ہے۔

ویکو نے جو فلسفہ میرے لئے تراشا اور مجھ کو سونپا اس کو میں نے دل و جان سے قبول کیا۔ گو میرے اس پرستار نے میرے حدود بہت بڑھا دیئے کہ خلا پُر کرنے کا کام بھی میرے سپرد کر دیا لیکن ساتھ ہی میرے اس پرستار نے مجھ کو تمام علوم پر حاوی کر دیا۔ پہلے مجھ پر فلسفہ لادا گیا تھا اور میں فلسفیوں کی دستِ نگر ہو گئی تھی۔ لیکن اب فلسفی میرے دستِ نگر ہو گئے۔

کروچی کا نظریۂ تاریخ

فلسفیوں سے آزادی مجھے جس کی بدولت نصیب ہوئی وہ بھی ویکو کی طرح ایک اطالوی تھا۔ جس کا ذکر میں کر چکی ہوں۔ اس کا نام کروچی تھا۔ اس نے مجھے صرف فلسفہ ہی پر نہیں بلکہ سائنس پر بھی فوقیت دی۔ اور اس طرح اس نے ویکو کے کام کی تکمیل کی۔ کروچی سے پہلے فلسفہ تمام علوم کا بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔ اور میں اس بادشاہ کی بوجھ اٹھانے والی لونڈی تھی چنانچہ میں بار بار بتا چکی ہوں کہ مجھ پر "فلسفہ لادا گیا"۔

فلسفے کا دارومدار محض قیاس اور مفروضوں پر تھا۔ فلسفہ حقیقت کی تلاش کرتا تھا لیکن وہ اسی تلاش میں قیاس کے راستوں پر چلتا تھا۔ اور اس لئے فلسفی ان قیاس کے راستوں میں گُم ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر اقبال بھی حقیقت کے منتظر رہے۔

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

موسیٰ ؑ اس حقیقت کی تلاش میں طور تک پہنچے مگر ہوش گم کر کے ناکام واپس آئے اور حقیقت لباسِ مجاز میں نہ آسکی۔ خدا بھلا کرے اس کرۂ چی کا جس نے مجھے حقیقت کا لباسِ مجاز پہنایا۔ اس نے دعویٰ کیا کہ صرف وہی چیز حقیقی ہے جو میرے صحیفے میں درج ہے۔ گویا میں خدا کا مظہر ہوں کیونکہ میں خدا کے پیدا کردہ اشرف المخلوقات کا تذکرہ کرتی ہوں لیکن کرۂ چی آخر انسان ہی تھا اس کے ہاتھ بھی حقِ کلّی نہ آسکا۔ اس لئے اس کو بھی حقِ جزوی پر قناعت کرنی پڑی۔ چنانچہ میرے صحیفے میں جو حقائق درج ہیں وہ حقائق جزوی ہیں کلّی نہیں۔ جو حقائق انبیائے بذریعہ وحی معلوم کئے ہیں ان کا عقلی ثبوت پیش کرتی ہوں تاکہ منکر بھی ان حقائق کو مان لیں۔

موسیٰ ؑ نے بذریعہ وحی معلوم کر لیا تھا کہ ان کی قوم بالآخر فرعون کے پنجوں سے رہائی پائے گی اور اپنی علیٰحدہ حکومت قائم کرے گی۔ اس حکومت کا ذکر کر کے میں نے موسیٰ کی صداقتِ وحی کا ثبوت مہیا کیا۔ میرے اکثر واقعات آسمانی صحیفوں میں بھی درج ہیں۔ توریت اور زبور میرے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ مسلمانوں کے قرآن میں بھی عاد اور ثمود کا تذکرہ ہے۔ جس طرح یہ آسمانی صحیفے عبرت آموزی کرتے ہیں اسی طرح میں بھی انسان کی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی ہوں۔

میں انبیاء کو اپنے صحیفے میں اعلیٰ ترین مقام دیتی ہوں لیکن محض عقیدے کی بنا پر نہیں بلکہ عقلی ثبوت پیش کر کے۔ مثلاً میں دکھاتی ہوں کہ کسریٰ اور سکندر کی حکومتیں ختم ہوگئیں لیکن ان انبیاء کی حکومت آج بھی باقی ہے۔ اور یہ حکومت اس لئے باقی ہے کہ وہ انسان کے قلب پر ثبت ہے۔

میں انبیاء کو کیوں اعلیٰ مقام دیتی ہوں اس لئے کہ انھوں نے اس ہمت اور جرأت سے کام لیا جو بڑے بڑے فاتح بھی نہ دکھا سکے۔ فاتحین نے صرف فوجوں پر فتح پائی۔ لیکن انبیاء نے رائج الوقت عقیدوں پر فتح پائی۔ بادشاہ کو معزول کرنا اور اس سے تخت چھین لینا آسان ہے لیکن رائج الوقت عقیدوں کا راج ختم کرنا مشکل ترین کام ہے۔ لیکن انبیاء نے یہ کام کر دکھایا اور اس سلسلے میں اپنی جانیں بھی دے دیں۔ زکریاؑ کے سر پر آری چلائی گئی۔ عیسیٰؑ کو صلیب پر لٹکایا گیا۔ بانیٔ اسلامؐ کو جلاوطن کیا گیا لیکن بالآخر ان انبیاء کے نظریات رائج ہو کر رہے۔ مخالفوں کو نیچا دیکھنا پڑا۔ یہودی جنہوں نے عیسیٰؑ کو صلیب پر ٹانگا بالآخر ایسے منتشر ہوئے کہ پھر جمع نہ ہو سکے۔ پوری دنیا میں یہودی ملعون ہوئے۔ ہٹلر نے چند گھنٹوں میں ساٹھ لاکھ یہودیوں کا بڑی اذیت سے بذریعہ گیس خاتمہ کیا۔

ابوجہل بمعہ اپنے عقائد فنا ہو گیا اور وہی نئے عقائد رائج ہوئے جن کی وہ مخالفت کرتا تھا۔ میں ان واقعات کو صرف پیش ہی نہیں کرتی بلکہ ان کے اسباب بھی بتاتی ہوں جن کو اہلِ عقل بھی تسلیم کر لیتے ہیں۔ ابوجہلیت کیوں ہاری اور اسلام کیوں جیتا؟ اس کا جواب میں اس طرح دیتی ہوں کہ یہودی اور ابوجہل پرانے گیت گا رہے تھے اور یہ نہ جانتے تھے کہ بقول شاعر:

ہر نفس نو می شود دنیا و ما
بے خبر از نو شدن اندر بقا (مولانا روم)

(ہر لمحہ دنیا کی تجدید ہوتی رہتی ہے ہم اپنے خیال کو بقا کا درجہ دیتے ہیں اور اس لئے اس تجدید سے بے خبر رہتے ہیں)

دنیا کی آئے دن تجدید کا ذکر کرنا میرا خاص فریضہ ہے بلکہ میرا تو دعویٰ ہے کہ میں تذکرۂ انقلاب کے لئے ہی پیدا کی گئی۔ اگر انقلاب کے تذکرے کو میرے صحیفے سے خارج کر دیا جائے تو میرا صحیفہ روکھا اور پھیکا ہو جائے۔ جب میں انقلاب کے اسباب بیان کرتی ہوں تو میں فلسفیوں کو بھی مات کر دیتی ہوں۔ فلسفی تو صرف قیاس سے کام لیتا ہے۔ لیکن میں اپنے بیانِ اسباب کے ساتھ ٹھوس واقعات پیش کرتی ہوں۔ فلسفی تو خیالی پلاؤ پکاتا ہے میرا پلاؤ ٹھوس ہوتا ہے جس کو آپ چکھ سکتے ہیں۔

میں یہ بھی بتاتی ہوں کہ نئے اور پرانے کا جھگڑا دائمی ہے۔ ہر زمانے میں لوگوں نے نئی باتوں کی مخالفت کی ہے اور ہر نئی بات اور نئی چیز کو "بدعت" قرار دیا ہے۔ لیکن بالآخر یہ بدعتیں جزوِ ایمان بن جاتی ہیں۔ یہودیوں نے عیسیٰؑ کی اور ابوجہل نے بانیٔ اسلام کی مخالفت کیوں کی؟ اس لئے کہ ان دونوں نے بھی سابق انبیاء کی طرح نئے خیالات پیش کئے جو یہودیوں اور ابوجہل کے لئے "بدعت" تھے۔ جب امام غزالیؒ نے تصوف کو جزوِ اسلام قرار دیا تو ان کی کتابیں اندلس میں سرِ بازار جلائی گئیں۔ بدعت کے مخالفین نے مولانا رومؒ کو کافر ٹھہرایا کیونکہ مولانا روم کی محفلوں میں عیسائی بھی آتے تھے اور مولانا ان کو تبدیلِ مذہب پر مجبور نہ کرتے تھے۔ مولانا کی محفلوں میں سماع کا بھی رواج تھا۔ جو علمائے وقت کی نظر میں سخت بدعت تھی۔

اسی طرح جب شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا ترجمہ فارسی میں کیا تو بدعت کے دشمن ان پر ڈنڈا لے کر دوڑے اور شاہ صاحب کو

اپنا وطن دہلی ترک کرنا پڑا۔ گویا ترجمہ کرنا بھی بدعت تھی۔ جب سرسیّد نے مسلمانوں میں انگریزی زبان رائج کرنا چاہی تو ان پر کفر کے فتوے دئیے گئے لیکن تصوّف اور قرآن کے ترجمے اور انگریزی مدارس ہر طرف نظر آتے ہیں۔ جو چیز کل بدعت تھی وہ آج رائج ہے۔ یہ تمام واقعات میرے صحیفے میں درج ہیں۔ جن کو لوگ پڑھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی لوگ "بدعت" سے خائف رہتے ہیں اور یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہر حقیقت شروع میں بدعت کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔

میں واقعات کی بنا پر یہ بھی بتاتی ہوں کہ انسان نے بدعت کی سزا میں عیسیٰؑ جیسی ہستی کا خون بہایا۔ بانیٔ اسلامؐ جیسی ہستی کو شہر بدر کیا لیکن آج بھی حقیقت ویسی ہی تلخ ہے۔ جیسی کہ ان زمانوں میں تھی۔ ان ٹھوس واقعات کی بنا پر میں یہ نتیجہ نکال سکتی ہوں کہ حق گوئی کبھی عوام میں مقبول نہیں ہو سکتی لیکن یہ ایک قسم کی پیش گوئی ہے جو میرے شعار کے خلاف ہے لیکن اگر کوئی پیشین گوئی سبق آموزی کی خاطر کی جائے تو وہ میرے نزدیک جائز ہے کیونکہ میرے واقعات سے جو کلیئے اخذ کئے جاتے ہیں وہ بھی ایک قسم کی پیشین گوئی ہوتے ہیں۔

سبق آموزی کے معاملے میں مذاہب کی مؤید اور معاون ہوں مخالف نہیں۔ کسی مذہب نے عقائد کے معاملے میں زبردستی روا نہیں رکھی۔ محمود غزنوی نے بزور شمشیر ہندو عقائد کو باطل ثابت کرنا چاہا لیکن وہ ناکام رہا اور محمود کے بعد سومنات پھر قائم ہوا۔ میں محمود کو دادِ شجاعت دیتی ہوں لیکن اس کی زبردستی کو نہیں سراہتی۔ میرا کام یہ نہیں کہ میں تصویر کا ایک رُخ پیش کردوں جیسا کہ میں بار بار بتا چکی ہوں۔ میرا کام یہ نہیں کہ

کسی مذہب کے برحق یا باطل ہونے کا فیصلہ کردں۔ یہ فیصلہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

بدعت اور راسخ الاعتقادی کا چکر

میں یہ بھی بتاتی ہوں کہ جب کوئی بدعت مقبول ہو جاتی ہے تو وہ راسخ کہلاتی ہے یعنی راسخ الوقت عقیدے کا جزو بن جاتی ہے۔ لیکن فطرت انسانی کا ایک عجیب و غریب پہلو یہ ہے کہ بدعت اور راسخ الاعتقادی کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے۔ جو بات کل بدعت تھی وہ آج راسخ ہے۔ جب بدعت راسخ بن کر جزو عقیدہ بن جاتی ہے تو ابوجہلیت پھر نمودار ہوتی اور نئی "بدعت" کی پھر مخالفت ہوتی ہے۔ اقبال نے بدعت اور راسخ الاعتقادی کے دائمی تنازعہ کو اپنے ایک مشہور شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا بہ ابد
چراغ مصطفوی ؐ سے شرار بولہبی

میں یہ بھی بتاتی ہوں کہ جب کسی نئی تحریک یا نئے مذہب کی مخالفت ہوتی ہے۔ تو اس مخالفت سے نئی تحریک کو بجائے نقصان کے فائدہ پہنچتا ہے۔ جس شدت سے مخالفت ہوتی ہے اسی حساب سے نئی تحریک مستفید ہوتی ہے اس طرح مخالف نئی تحریک کی اشاعت کرتے ہیں اس کا ثبوت میرے صحیفے میں موجود ہے۔ ابوجہل آزاد تھا اور بڑی آزادی سے ہر گلی کوچے میں اسلام کی مذمت کرتا تھا۔ لیکن اس طرح وہ اسلام کا نام سب کے کانوں تک پہنچاتا تھا۔ اسلام کی اس طرح مذمت سن کر اکثر کفار کے دل میں جستجو پیدا ہوتی تھی کہ آخر اسلام میں کیا نقص ہے کہ ابوجہل اس زور شور سے اس کی مذمت کر رہا ہے۔ یہ جستجو اہالیانِ مکہ کو کھینچ کر مسلمانوں

کے پاس لے جاتی تھی۔ جب وہ ان "مذموم" مسلمانوں کا نیک رویہ دیکھتے تھے تو فوراً اسلام قبول کر لیتے تھے۔ ان کے شکوک فوراً یقین کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ لیکن یقینِ محکم سے انسان میں ایک سوز پیدا ہوتا ہے جس کو میں "سوزِ یقین" کہتی ہوں اسلام کی ترقی کا راز یہی سوز تھا۔

تاریخ میں شخصیت کی اہمیت

میں یہ بھی بتاتی ہوں کہ یہ سوز اصولوں سے نہیں بلکہ شخصیت سے پیدا ہوتا ہے۔ مثنوی مولانا روم میں ایک بڑی سبق آموز حکایت حضرت عیسیٰ کے متعلق اس طرح ہے کہ ایک شخص نے دیکھا کہ حضرت عیسیٰؑ نے کچھ پڑھ کر ایک جانور کی ہڈی پر پھونکا جس سے وہ مُردہ زندہ ہو کر اُٹھ گیا۔ چنانچہ اس شخص نے حضرت عیسیٰ سے پوچھا کہ آپ نے کیا پڑھ کر دم کیا کہ اس مُردے میں جان آ گئی۔ حضرت عیسیٰؑ نے چند کلمے بتائے۔ جن کو پڑھ کر اس شخص نے ایک اور مردہ جانور پر دم کیا لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ اس پر اس شخص نے پوچھا کہ میرے دم کرنے سے مُردے میں جان کیوں پیدا نہ ہوئی۔

حضرت عیسیٰؑ کا جواب قابلِ نقل ہے:۔

عمرہا بالیست تا دم پاک شد   تا امین مخزن افلاک شد

(دم کو پُر اثر بنانے کے لئے عمر بھر کی ریاضت درکار ہے۔ جب تک انسان ریاضت نہ کرے تب تک اس کو مخزنِ افلاک حاصل نہیں ہو سکتا)

اس قصے کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کی شخصیت سے دوسرے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ ریاضت سے انسان میں سوزِ یقین پیدا ہوتا ہے اور پر سوزِ یقین کی صحبت میں جو کوئی بیٹھتا ہے وہ بھی پُر سوز ہو جاتا ہے۔ اسی سوز سے دُنیا کا رُخ بدلتا ہے۔ گویا واقعہ گر انسان ہے۔ اگر ایک واقعہ

سے دوسرا واقعہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ یہ نہیں کہ پہلا واقعہ دوسرے واقعہ کا سبب ہے۔ اصل مسبّب انسان ہے واقعہ نہیں۔ اسی طرح بُرے انسان بُرے واقعات پیدا کرتے ہیں :۔

گر گلے گیرد بکف خارے شود　　　ور سوئے یارے رود مارے شود

(بُرے آدمی کی مُٹھی میں مٹّی کانٹا بن جاتی ہے۔ اگر بُرا آدمی دوست کے پاس جاتا ہے تو دوست بھی سانپ بن جاتا ہے۔)

بظاہر اچھے اور بُرے آدمی دونوں ہم شکل نظر آتے ہیں اور انسان معلوم ہوتے ہیں لیکن

گر بصورت آدمی انساں بُدے　　　احمدؐ و بوجہل ہم یکساں بُدے

(اگر صرف صورت انسانیت کی دلیل ہے تو احمدؐ اور ابوجہل کو یکساں ہونا چاہیئے)

لیکن بانیٔ اسلام کی تحریک کامیاب ہوئی۔ ابوجہل کی تمام کاوشیں خاک میں ملیں۔ چنانچہ جو فلسفہ میں نے اپنایا اس میں انسان واقعہ گر ہے آب و گل نہیں۔ لیکن میرے بعض محرّر آب و گل کو واقعہ گر قرار دیتے ہیں۔ اس لئے میں نے ایسے فلسفے کو رد کیا۔ کارل مارکس کا دعویٰ ہے کہ ایک دَور سے دوسرا دَور خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ نام نہاد فلسفی خود اپنے فلسفے کو رد کرتا ہے۔ دورِ اشتراکیت کی بانی سرمایہ داری نہیں بلکہ خود کارل مارکس ہے۔ تمام واقعات خیال سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور خیال انسان کے دل میں آتا ہے۔ آب و گل کے دل میں یُں نہیں آسکتا۔

ویکو کا فلسفہ اصل فلسفہ تاریخ ہے

میں نے دیگر فلسفیوں کو رد کیا۔ اور صرف ویکو کے فلسفے کو اپنایا۔ میں نے ویکو کے فلسفے کو جن وجوہ سے پسند کیا وہ وجوہ ویکو کی اپنی زبان

سے سنئے جو اس نے خود اپنی کتاب "علم جدید" میں بیان کئے ہیں۔

(۱) اپنی کتاب کے "خاص پہلو" کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہ پہلو علم دین سے متعلق ہے۔ جس میں حکمتِ الٰہی مضمر ہے اور جس کو میں نے عقلی جامہ میں پیش کیا ہے۔"

(۲) میری کتاب "انسانی خیالات کی تاریخ ہے۔"

(۳) میری کتاب کا یہ خاص پہلو "فلسفۂ حکومت" بیان کرتا ہے کیونکہ ابتدائی حکمرانوں نے قوانین اور دستور جاری کئے اور یہ قوانین وغیرہ اسی فلسفۂ حکومت پر مبنی ہیں۔

(۴) میری کتاب میں قدیم مذہبی روایات پر "فلسفیانہ تنقید" بھی ہے۔

(۵) میری یہ کتاب "بہترین دائمی تاریخ ہے جس میں ہر قوم کی تاریخ زمانہ وار شامل ہے۔

(۶) میری اس کتاب میں "اقوام کے قوانینِ فطرت کا بیان ہے۔"

(۷) میں نے اس کتاب "دنیاوی تاریخِ عالم کے اصولوں" کو پیش کیا ہے۔ جو اب تک مخفی تھے۔ اور پرانے افسانوں کے مطالب بھی بیان کئے ہیں۔

گویا ویکو کی کتاب "علم جدید" دراصل علم دین سے متعلق ہے۔ لیکن یہ علم دین ویکو نے عقلی جامہ پہنا کر پیش کیا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ بظاہر انسان واقعہ گر نظر آتا ہے۔ لیکن انسان واقعہ گری خدا کے اشارے سے کرتا ہے۔ اس معاملے میں ویکو نے افلاطون کی تقلید کی۔ کیونکہ افلاطون کا قول تھا کہ ہر چیز کی فطرت خدا کی پیدا کردہ ہے اور اس طرح ہر چیز جس میں قومیں بھی شامل ہیں خدا کے مقرر کردہ راستے پر چلتی ہے۔ افلاطون کے برعکس اس کے

شاگرد ارسطو کا دعویٰ یہ تھا کہ بعد تخلیقِ کائنات خدا نے چند قوانینِ فطرت وضع کیئے۔ اور اپنی کل کائنات کو ان قوانینِ فطرت کے سپرد کر دیا اور خود گوشہ نشین ہو گیا۔

لیکن ویکو کے نزدیک خدا گوشہ نشین نہیں ہوا۔ اور وہ آج بھی کائنات اور انسان کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتا ہے۔ البتہ واقعہ گری کے معاملے میں خدا انسان کو وسیلہ بناتا ہے۔ اور اس طرح انسان بھی ایک طرح واقعہ گر ہے۔ اسی لئے ویکو نے یہ دعویٰ کیا کہ دنیا کے واقعات کو انسان اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کیونکہ یہ واقعات انسان کے وسیلے سے رُونما ہوتے ہیں۔

ویکو کے علاوہ دیگر فلسفیانِ تاریخ نے ارسطو کا نظریہ اختیار کیا۔ اور قوانینِ فطرت کو واقعہ گر قرار دیا۔ اسی لئے میں نے اس قسم کے فلسفے کو نہیں قبول کیا ویکو نے عقل اور خدا کو متضاد نہیں ٹھہرایا۔ بلکہ عقل اور حکمِ خداوندی میں تطابق قائم کیا۔ مثلاً اس نے یہ مانا کہ از روئے عقل دُنیا بدلتی رہتی ہے لیکن یہ تبدیلی بھی خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔ انسان کے حکم سے نہیں۔ البتہ ان تبدیلیوں میں انسان وسیلہ ضرور ہے۔ اس طرح ویکو نے تقدیر اور تدبیر دونوں کو شریکِ کار قرار دیا۔ (حوالہ نمبر ۳) بقول ویکو "انسان خود اپنا راستہ چلتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں خدائی چرخہ بھی ہوتا ہے اور راستے بھر وہ یہ چرخہ چلاتا رہتا ہے۔"

ویکو کے فلسفۂ تاریخ کی بدولت میں اہلِ عقل اور اہلِ عقیدہ دونوں میں مقبول ہو گئی اور آج تک مقبول ہوں۔ اہلِ عقیدہ مجھے

اس لئے پڑھتے ہیں کہ میں مظہرِ خدا ہوں۔ اہلِ عقل مجھے اس لئے پسند کرتے ہیں کہ میں ان کو زمانۂ ماضی کے حالات بتاتی ہوں جن سے وہ عبرت حاصل کرتے ہیں۔

لیکن درحقیقت ویکو اس فلسفے کا موجد یا خالق نہ تھا یہ فلسفہ تو پہلے سے مجھ میں مضمر تھا بقول شاعر:

بادہ از ما مست شد نے ما ازو

قالب از ما ہست شد نے ما ازو (مولانا روم)

(نشے کا مادّہ شراب میں نہیں بلکہ پینے والے میں ہوتا ہے جس طرح انسان کا قالب اس کی روح کے تقاضے سے پیدا ہوا گویا قالب روح میں پہلے سے موجود تھا۔)

البتّہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی اور فلسفی نے مجھ کو اس نظر سے نہ دیکھا جس سے ویکو نے مجھے دیکھا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان باوجود لمبے چوڑے دعوؤں کے اپنی نظر کا محتاج ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے ایک پرانا لطیفہ یاد آیا۔ اتفاق سے ایک بیل گاڑی میں چار پیشے کے لوگ ہم سفر ہو گئے۔ ایک مولوی صاحب تھے دوسرے پنڈت جی تیسرا قصائی اور چوتھا بنیا تھا۔ جب صبح ہوئی تو کالے تیتر کی آواز سنائی دی۔ اس پر یہ گفتگو ہوئی۔

مولوی صاحب: واہ واہ یہ تیتر کیا صاف کہہ رہا "سُبحان تیری قدرت"

پنڈت جی: مولوی صاحب! آپ کو مغالطہ ہوا۔ وہ تو کہہ رہا ہے "سری رام دسرت"

قصائی : آپ دونوں غلط! وہ تو کہہ رہا ہے "ہری پائے ڈھک رکھ"!

بنیا : آپ تینوں غلط۔ وہ تو صاف کہہ رہا ہے "نون تیل ادرک"!

تیتر صرف ایک تھا۔ آواز بھی صرف ایک تھی لیکن ان چاروں نے اس ایک آواز کے چار معنی نکالے۔ اور ہر معنی مختلف تھا۔ جس طرح ان چاروں کے پیشے مختلف تھے۔ گویا نظر کا ماخذ انسان کا ماحول ہے وہ چیز نہیں جس کو وہ دیکھ رہا ہے۔ شراب میں نشہ نہیں بلکہ پینے والوں میں نشے کا مادہ ہے۔ اسی لئے میرے واقعات کی مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں لیکن مجھے اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ مختلف تاویلوں سے ہر قسم کا حاجت مند مجھ سے مستفید ہوتا ہے۔ اہلِ عقیدہ مجھ میں خدا کو دیکھتے ہیں۔ اہلِ عقل کو مجھ میں عقل نظر آتی ہے۔ اس طرح میں ہر ایک کے لئے کار آمد ہو جاتی ہوں۔ لیکن یہ بڑی طویل بحث ہے جس کے لئے ایک علیحدہ باب درکار ہے۔

جو لوگ مجھے اپنی اپنی مختلف نظروں سے دیکھتے ہیں ان کو میں مختلف صورتوں میں نظر آتی ہوں اور اس طرح میرے تمام مختلف پہلو دیکھنے والوں کی نظر میں آجاتے ہیں جس سے دیکھنے والوں کو میری وسعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ میرا ہر پہلو ایک معنی رکھتا ہے۔ میرا ہر پہلو حقیقت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جس کو اہلِ دل "حق جزوی" کہتے ہیں۔ جب ان ٹکڑوں کو جوڑ دیا جائے تو میں "حق کلی" بن جاتی ہوں لیکن مجھے جو دیکھتے ہیں وہ نابینا ہوتے ہیں۔ میں اس ہاتھی کی طرح ہوں جس کو

دیکھنے کے لئے چند نابینا آئے ایک کے ہاتھ پیر آگیا جس کو ٹٹول کر وہ پکار اُٹھا کہ ہاتھی ایک درخت کا تنا ہے۔ دوسرے کے ہاتھ ہاتھی کی دُم آگئی جس کو ٹٹول کر اس نے ہاتھی کو سانپ قرار دیا۔ تیسرے کے ہاتھ کان آگئے جن کو اس نے ہاتھی کا چھاج سمجھا۔ اس اختلاف پر ان اندھوں میں سخت ہنگامہ برپا ہوا۔ کیونکہ ہر ایک اپنے کو برحق سمجھتا تھا۔ اسی طرح مجھے بھی اندھے پڑھتے ہیں اور مجھ کو عجیب عجیب لقب دیتے ہیں۔ ان متضاد القاب کا ذکر میں نے باب بعنوان "میرے متعلق اغیار کا فیصلہ" کے تحت کیا ہے۔

ان اندھوں کی کہانی سے بعض لوگ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر ان میں سے ہر اندھے کا بیان کردہ ہاتھی کا حلیہ یکجا کر دیا جائے تو ہاتھی کی پوری تصویر بن جائے گی۔ یہ غلط ہے۔ ہر اندھے نے ہاتھی کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بیان کیا۔ اور وہ بھی تشبیہوں کی صورت میں۔ ان میں سے ہر ایک کی تشبیہ اپنی اپنی بساط کے مطابق تھی۔ جس کو ان میں سے کسی نے نہ دیکھا تھا اور نہ ان میں دیکھنے کی اہلیت تھی۔ اس لئے ان کا بیان کردہ حلیہ محض ان کے قیاس پر مبنی تھا حقیقت پر نہیں لیکن قیاس صرف تجربے پر مبنی ہوتا ہے۔ اور تجربہ بساط پر۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ:۔

فکر ہر کس بقدر ہمّت اوست

اسی لئے حقیقت بھی بذریعہ تشبیہ بیان کی جاتی ہے۔ لیکن تشبیہ انسانوں کو گمراہ کرتی ہے۔ بُت پرستی تشبیہ کی وجہ سے رائج ہوئی۔ انسان نے اپنے تجربے کے مطابق خدا کو آنکھ۔ ناک۔ کان سب کچھ دے دئے۔ میں بھی تشبیہ نگاری کا شکار رہی ہوں کیونکہ تاریخ نگاری تشبیہ نگاری پر مبنی ہے۔ حقیقت صرف خدا جانتا ہے۔ جب زندہ ہاتھی کو بیان کرنے سے

انسان قاصر ہے تو وہ مُردوں کو کس طرح بیان کر سکتا ہے؟ میرے بہترین فلسفی دیکو کو بھی قیاس پر اعتماد کرنا پڑا۔ الغرض میرے فلسفے کی کہانی دراصل قیاس اور تشبیہہ کی کہانی ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ میں فلسفی کی اپنی شخصیت اور ماحول کا عنصر بھی ہوتا ہے۔ حقیقت ایک ہی ہے۔ لیکن ہر فلسفی اس ایک حقیقت کو اپنا رنگ دے دیتا ہے۔ اور اس طرح حقیقت کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح انسان کے جسم کے ٹکڑے کرنے سے ماہرین علم الابدان ان ٹکڑوں کو تو بیان کر سکتے ہیں لیکن روح کو بیان نہیں کر سکتے۔ اسی طرح تاریخ کی بھی روح ہے۔ جس تک کوئی مؤرخ نہ پہنچ سکا۔ اس لئے لاچار ہو کر میں اپنے فلسفے کے اجزاء کو بیان کرتی ہوں۔

فلسفۂ تاریخ کے مختلف اجزاء

جس طرح مختلف فلسفی میری مختلف تاویلیں کرتے ہیں اسی طرح میرے پڑھنے والے اپنی اپنی نیت کے تحت مجھے پڑھتے ہیں۔ فلسفیوں کی نیت یہ ہوتی ہے کہ میرے نئے واقعات کی بنا پر نئے نظریے ایجاد کریں۔ سرمایہ داری اپنے زمانے کے لئے ایک نئی چیز تھی جس کا ظہور مشینوں کی ایجاد کے بعد ہوا۔ اس لئے کارل مارکس نے یہ نظریہ پیدا کیا کہ آگ سے پانی اور پانی سے آگ ظہور میں آتی ہے۔ شیطان منش لوگ مجھ میں شیطانی کا جواز ڈھونڈتے ہیں۔ انگریزی عالمگیر سامراج کو دیکھ کر ہٹلر نے یہ نتیجہ نکالا کہ اب جرمن سامراج کی باری ہے۔ اہل دل کے لئے میں الفت کی کہانی ہوں جس کا نشان تاج محل ہے۔ بقول چراغ دہلوی:-

در فلسفہ در منطق جز عشق نمی بینم ۔۔۔ چنداں کہ نظر کردم شبہا بہ کتاب اندر

طالبانِ شہرت کو مجھ میں طلبِ شہرت کا جواز نظر آتا ہے۔ چنانچہ لاکھوں کی تعداد میں یہ طالبانِ شہرت روزانہ میرا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ میرے حریم میں سینکڑوں شہرت طلب دل پیش ہوتے ہیں لیکن میں شہرت کے لئے صرف شکستہ دلوں کو منتخب کرتی ہوں جو راہِ خدا میں یا خدمتِ خلق کی خاطر پاش پاش ہوئے۔ چنانچہ اپنی شہرت کی فہرست میں میں نے انبیاء کو سب سے اعلیٰ مقام دیا۔ جو محض شہرت کی تلاش میں میرے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ ان کو میں اخباروں کے سپرد کرتی ہوں جو ان سے روپیہ وصول کر کے ان کی تصویریں بھی چھاپ دیتے ہیں۔ بادشاہوں نے اسی شہرت طلبی کے تحت میرے ناخلف محرّروں کو نوکر رکھا اور انہوں نے اپنے ممدوح کو آسمان پر پہنچا دیا لیکن بالآخر یہ شہرت طلب بادشاہ اور ان کے متعلق "تاریخیں" قعرِ گمنامی میں پڑ گئیں جن کو اب کوئی نہیں پڑھتا۔

سکندر کو شہرتِ دوام میں نے اس کی خون ریزی کی بنا پر نہیں بخشی۔ بلکہ اس وجہ سے اس کو یہ شہرت حاصل ہوئی کہ اس نے مشرق و مغرب کی مغائرت کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کی اس کاوش کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ اس کے مفتوحوں نے اس کے حق میں افسانے گڑھے جو ابھی تک مشرق میں پڑھے جاتے ہیں جن میں نظامی کا "سکندر نامہ" ممتاز ہے قناعت پسند لوگوں نے سکندر اور دیوجانس کلبی کا قصہ گڑھا۔ قرونِ وسطیٰ میں ایک کتاب سکندر کے متعلق لکھی گئی جس میں سکندر کو ارسطو کا شاگردِ رشید ثابت کیا گیا۔ اس کتاب کا ترجمہ عربی میں "سر الاسرار" کے نام سے ہوا۔ (حوالہ نمبر ۲)

اسی طرح "سدِّ سکندری" کا قصہ گڑھا گیا۔ یہ ایک دیوار تھی جو

سکندر نے یاجوج ماجوج کی یورشوں کو روکنے کے لئے بنوائی تاکہ مہذب دنیا ان وحشیوں کی یورشوں سے محفوظ رہے۔ اس قصّہ کا مقصد یہ تھا کہ سکندر انسانیت کا علم بردار تھا۔ وحشت کا نہیں۔ (حوالہ نمبر ۵)

سکندر کے متعلق جو کتاب "سِرّ الاسرار" کے نام سے لکھی گئی اس میں وہ نصیحتیں تھیں جو سکندر کا استاد ارسطو اپنے شاگردوں کو کیا کرتا تھا یہ کتاب خود ارسطو سے منسوب کی گئی اور اس کتاب کی نصیحتیں اخلاق کا نمونہ سمجھی گئیں۔ گویا سکندر اخلاق کا نمونہ تھا کیونکہ وہ اپنے استاد کی نصیحتوں پر عمل کرتا تھا۔

سینٹ اگسٹائن نے بھی سکندر کو اخلاق اور سخاوت کا نمونہ قرار دیا۔ اور اس طرح عیسائی علماء دین بھی سکندر کے معتقد ہو گئے۔ الغرض سکندر کی شہرت اس کے نیک اعمال پر مبنی تھی فتوحات پر نہیں چنگیز خاں کی فتوحات سکندر سے کہیں زیادہ وسیع تھیں لیکن اس خونخوار انسان کا ذکر صرف اس کی خونخواری کی بنا پر آتا ہے۔ اس لئے میں کہہ سکتی ہوں کہ میرا فلسفہ جس کو شہرت دوام بخشتا ہے اس میں نیک اعمال کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ یعنی میرے فلسفے میں اخلاق کا عنصر فیصلہ کُن ہے۔ چنانچہ بعض لوگ فلسفۂ تاریخ میں شہرت کو بھی شامل کر لیتے ہیں اس بنا پر کہ تاریخ صرف اہلِ شہرت کی خاطر پیدا کی گئی۔ میرے فلسفے کا دعویٰ ہے کہ اہلِ شہرت تاریخ کی خاطر پیدا کئے گئے کیونکہ اکثر لوگ بجز انبیاء اسی لئے ہاتھ پیر مارتے ہیں کہ مشہور ہو کر ان کا نام تاریخ میں آجائے۔

مگر میرے فلسفے میں جھوٹی اور سچّی شہرت کے معاملے میں زمانہ جو

فیصلہ کرتا ہے وہ درست سمجھا جاتا ہے۔ لوگ دھوکے میں آسکتے ہیں لیکن زمانے کی آنکھ میں خاک ڈالنا ممکن نہیں۔ زمانہ ڈھول کی پول کھول دیتا ہے۔ اور دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کر کے دکھا دیتا ہے۔ جو شہرت کے مستحق ہوتے ہیں وہ شہرت کو ٹھکراتے ہیں لیکن شہرت ان کے قدم چومتی ہے۔ زماں کے علاوہ مکاں بھی میرے فلسفے میں شہرت کا فیصلہ کرتا ہے۔ سکندر جیسی ہستیاں تمام عالم میں مشہور ہو جاتی ہیں۔ معمولی لوگ ایک محدود خطے میں شہرت حاصل کرتے ہیں اور وہ بھی عارضی ہوتی ہے۔ کیونکہ زمانہ ان کی شہرت کو مٹا دیتا ہے۔ انبیائؑ نے جو شہرت حاصل کی وہ بلحاظ زماں و مکاں دوامی اور عالمگیر تھی۔ ان کی شہرت انسان کے قلب میں جگہ حاصل کرتی ہے۔ کسی نبی کی سوانح عمری اس کے حیات میں نہیں لکھی گئی۔ بانیٔ اسلامؐ کی سوانح عمری باوجود اس کے کہ وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب تحریری تاریخ کا رواج عام ہو چکا تھا، ہجرت کے ڈیڑھ سو سال بعد یعنی ۷۶۷ء میں کسی صحابی نے نہیں بلکہ ابن اسحاق نے لکھی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے اقوال صدیوں بعد ضبطِ تحریر میں آئے۔

ان باتوں کے پیشِ نظر فلسفۂ تاریخ بقول مولانا روم یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ

آں چہ بامعنی ست خود پیدا شود ‌ ‌ ‌ وآں چہ بے معنی ست خود رسوا شود

(جو معنی خیز ہوتا ہے وہ خود بخود نمودار ہو جاتا ہے جو لغو ہوتا ہے وہ خود بخود رسوا ہو جاتا ہے)

جان بے معنی دریں تن بے خلاف ‌ ‌ ‌ ہست ہم چوں تیغ چوبیں در غلاف

(جو زندگی بے فیض ہے وہ جسم میں ایسی ہے جیسی کہ لکڑی کی تلوار غلاف

میں ہوتی ہے)۔

تا غلاف اندر بود با قیمت است   چوں بروں شد سوختن را آلت است

(لکڑی کی تلوار جب تک غلاف میں رہتی ہے تب تک وہ قیمتی سمجھی جاتی ہے لیکن جب باہر نکال لی جاتی ہے تو صرف جلانے کے کام میں آتی ہے)

میرا بھی کام ہے کہ جھوٹی تلواروں کو جلاؤں یعنی جھوٹی شہرت کی پول کھول دوں۔ اس لئے تاریخ کا فیصلہ صرف قطعی ہی نہیں بلکہ صادق بھی ہوتا ہے۔ اس لئے جھوٹے دعویداران شہرت کا نام تاریخ میں نہیں آتا۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ میرا فلسفہ صرف شہرت کی بنا پر اپنا فیصلہ دیتا ہے۔ شہرت تو ہٹلر اور چنگیز خان نے بھی حاصل کی لیکن ان دونوں کی شہرت شیطان کی سی ہے۔ یعنی یہ حضرات محض شر کے بانی ہیں خیر کے نہیں۔

الغرض اخلاق میرے فلسفے کا جزوِ اعظم ہے جس پر میں ناز کرتی ہوں۔ چنانچہ جو فلسفہ مجھ پر دوبارہ لادا گیا اس کو میں نے کبھی نہیں اپنایا۔

کیا نوشتۂ تقدیر بھی فلسفۂ تاریخ کا جزو ہے

بعض فلسفیوں کا دعویٰ ہے کہ میرے فلسفہ کی بنا مسئلہ تقدیر ہی پر ہے۔ اگر تقدیر نہ ہوتی تو مجھ پر فلسفہ نہ لادا جاتا۔ تمام فطرت تقدیر پر ہی مبنی ہے۔ آگ کی قسمت میں جلانا لکھ دیا گیا ہے۔ فطرت اور اس کے قوانین جب خدا نے وضع کئے تو ہر جزو فطرت کے لئے چند قوانین مقرر کر دئے اور انسان کو خدا نے بقول ارسطو ان قوانین فطرت کے حوالے کر دیا۔ اس لئے انسان تقدیر فطرت کے تحت ہو گیا۔ لیکن یہ قوانین قاہر اور جبار ہیں رحمان و رحیم نہیں۔ جب تم اپنی انگلی کو آگ میں دو گے تو یہ آگ اپنی فطرت کا تقاضہ پورا کرے گی اور

تمہاری انگلی کو جلادے گی۔ گویا انگلی کو آگ میں ڈالنا سبب ہوا اور جلنا نتیجہ ہوا۔

لیکن ارسطو کا یہ استاد یہ بتا چکا تھا کہ خدا بعد تخلیق کائنات گوشہ نشین نہیں ہوا اور وہ اپنی مخلوق کی فرداً فرداً نگہبانی کرتا ہے۔ اس نگہبانی کا ثبوت افلاطون نے یہ پیش کیا۔ کہ خدا نے اپنی مخلوق اور خصوصاً انسان کو صاحب اختیار بھی بنا دیا۔ بیشک آگ کی قسمت میں جلانا لکھا ہے لیکن انسان کو اختیار ہے کہ وہ اپنی انگلی آگ میں نہ ڈالے۔

اس طرح انسان صاحب تدبیر ہے۔ بندۂ تقدیر نہیں۔ آگ کو اختیار نہیں کہ وہ جلانے سے انکار کرے۔ لیکن انسان کو اختیار ہے کہ اپنی تدبیر سے وہ آگ اس طرح جلائے کہ اس کی انگلی نہ جلے۔ ویکو کا نظریہ بھی یہی تھا کہ انسان صاحب تدبیر ہے بندۂ تقدیر نہیں۔ لیکن ساتھ ہی ویکو یہ بھی مانتا تھا کہ انسان حکم خدا کے تحت ہے۔ مثلاً اگر کوئی آتش فشاں پہاڑ یکایک پھوٹ پڑے اور کسی شہر کو غارت کردے تو یہ حکم ربی ہے۔ اور ایسی حالت میں انسان لاچار ہے اس طرح ویکو نے انسان کو صاحب تدبیر قرار دیا۔ لیکن آخری فیصلہ خدا کے ہاتھ میں چھوڑ دیا۔ انسان کے صاحب اختیار ہونے کی اور مثالیں بھی ویکو نے پیش کیں۔ مثلاً انسان پر جب غصہ سوار ہوتا ہے تو وہ بڑی بے ہودہ حرکتیں کرتا ہے لیکن خدا نے انسان کو ضبط کا مادہ بھی دیا ہے۔ جس سے وہ اپنے غصے پر قابو پا سکتا ہے۔ انسان نے اسی قوتِ ضبط کی بنا پر ترقی کی اور وحشی سے انسان بنا۔ اسی طرح انسان نے اپنے نفس پر قابو پاکر عدل وانصاف سیکھا اور ذاتی مفاد اور قومی

مفاد میں اس نے فرق معلوم کیا۔ یہ تمیز انسان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ بال بچہ دار ہو جاتا ہے اور بیوی بچوں کی خاطر وہ اپنے نفس پر قابو حاصل کرنا سیکھتا ہے۔ اور اس طرح قبیلوں اور قوموں کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ گویا قوموں کی ابتدا بھی اختیار پر ہے جبر پر نہیں۔

قوموں کی ابتدا تو اختیار پر ہے۔ لیکن قوموں کا خاتمہ بھی کیا اختیار پر ہے؟ موت پر تو انسان قابو نہیں رکھتا لیکن وہ بیماری میں تدبیریں ضرور کرتا ہے۔ اگر کسی کا ہاتھ سڑ جاتا ہے تو باقی جسم کو بچانے کے لئے وہ سڑے ہاتھ کو کٹوا دیتا ہے۔ انگریزوں نے اپنے ملک کو بچانے کے لئے اپنے سامراج سے کنارہ کشی اختیار کی۔

یونانیوں نے انسان کو خاص بندۂ تقدیر قرار دیا تھا۔ لیکن ویکو نے تقدیر کے حدود مقرر کئے۔ مثلاً حوادثِ آسمانی کے معاملے میں انسان بے شک بندۂ تقدیر ہے۔ لیکن حوادث روز نہیں آتے۔ روزمرہ کے معاملے میں انسان صاحبِ تدبیر ہے۔ لیکن انسان میں جو تدبیر کی قابلیت ہے وہ خدا کی عطا کردہ ہے۔ چنانچہ انسان کی تدبیریں خدا کے مقرر کردہ حدود ہی میں چلتی ہیں۔ جب تک انسان کی تدبیریں ان حدود کے اندر رہتی ہیں تب تک انسان خوش رہتا ہے۔ لیکن جب انسانی تدبیر ان حدود کے باہر قدم رکھتی ہے تو انسان مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس طرح نوشتۂ تقدیر فلسفۂ تاریخ کا جزو ہے۔ لیکن تقدیر خود خدا کی پیدا کردہ ہے۔

کیا فلسفۂ تاریخ تقدیر سے مبرّا ہے؟

دوسرے اطالوی فلسفی کروچی نے قسمت کے دعوے کو بالکل خارج کر دیا۔ اس فلسفی کے نزدیک انسان اپنی تقدیر خود ہی پیدا کرتا ہے

گویا انسان اپنی دُنیا کا خدا ہے۔ کروچی کے نزدیک تاریخ انسانی تدبیر و اختیار کی کہانی ہے۔ تقدیر کی نہیں۔ انسان کو جو تدبیر کی قابلیت حاصل ہوئی وہ عقل کی عطا کردہ ہے۔ ہر واقعہ کا سبب انسانی تدبیر میں پایا جاتا ہے نوشتۂ تقدیر میں نہیں اور اس طرح ہر سوال کا جواب تاریخ دے سکتی ہے۔ لیکن ویکو کے نزدیک ہر سوال کا جواب تاریخ نہیں دے سکتی۔ سوال سے سوال پیدا ہوتے ہیں۔ آخری سوال کا جواب صرف خدا دے سکتا ہے۔ یعنی اس آخری سوال کا جواب تقدیر دیتی ہے جو خدا کی مقرر کردہ ہے۔ گویا تاریخ کے دو پہلو ہیں یعنی خدائی اور انسانی۔ تاریخ تخلیقِ آدم سے شروع ہوئی۔ لیکن آدم کو خدا نے پیدا کیا۔ اور اسی خدا نے انسان میں نیک و بد کی تمیز پیدا کی۔ جس کی وجہ سے یہ دُنیا اور انسان قائم ہے۔ اگر انسان میں عدل و انصاف کا مادّہ خدا نہ پیدا کرتا تو یہی انسان ایک دوسرے کو مار کر نسلِ انسانی کو ختم کر دیتا۔ اسی عدل و انصاف کی بنا پر انسان نے ترقی کی۔ لیکن ویکو نے انسانی جنون ترقی کو خدا کا درجہ نہیں دیا۔ کیونکہ ویکو وحی اور الہام کا قائل تھا۔ بیشک انسان عقل کے ذریعہ ترقی کرتا ہے۔ لیکن اس ترقی کا رہبر خُدا ہے۔

کروچی نے ویکو کے نظریہ کو بالکل رد تو نہیں کیا۔ لیکن اس نظرئے کی تاویل اپنے عقیدۂ تدبیر کے مطابق کی۔ کیونکہ کروچی کا عقیدہ تھا کہ انسان صاحبِ تدبیر ہے۔ بندۂ تقدیر نہیں۔ اس سلسلے میں کروچی نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ بحیثیت افسانہ آزادی" لکھی۔ (حوالہ نمبر ۶) اس کتاب میں کروچی خود تسلیم کرتا ہے کہ ہر مورخ ماضی کو بھی اپنی نظرئے یعنی نظرِ حال سے دیکھتا ہے۔ اگر مؤرخ کے زمانے میں جمہوریت کا

راج ہے تو اس کو زمانۂ ماضی میں بھی جمہوریت نظر آئے گی۔ تاج محل کو دیکھ کر یہ مؤرخ اس عمارت کا موازنہ اپنے زمانے کی عمارتوں سے کرتے ہیں اور اس کی خوبصورتی یا بدصورتی کا فیصلہ اسی طریقے سے کرتے ہیں۔

کروچی دورِ حاضر کی پیداوار ہے جس میں تدبیر کا راج ہے۔ اس لئے کروچی کو ماضی میں بھی تدبیر کا راج نظر آتا ہے۔ کروچی کا زمانہ دورِ آزادی ہے۔ اس لئے اس کو زمانۂ ماضی میں بھی آزادی نظر آتی ہے۔ چنانچہ کروچی اپنے زمانے کے ان مورخوں کی مذمت کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ آزادی انسان کے ہاتھ سے جا رہی ہے۔ لیکن کروچی کے نزدیک آزادی ایک ایسا درخت ہے جس کو سدا بہار حاصل ہے۔ یعنی آزادی انسان کی سرشت میں داخل ہے۔ چنانچہ وہ آزادی کے نوحہ گروں کے متعلق لکھتا ہے کہ :- (حوالہ نمبر ۷)

"یہ کہنا کہ آزادی مرگئی بالکل ایسا ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ زندگی ختم ہوگئی کیونکہ آزادی کا مخرج زندگی ہے۔"

کروچی کے نزدیک آزادی اسی قدر اُبھرتی ہے جتنا کہ اس کو دبایا جاتا ہے بقول شاعر "اُبھرے گی یہ اتنا ہی جتنا کہ دبا دیں گے"۔ اس دعوے کی تائید میں کروچی نیپولین کی مثال پیش کرتا ہے جس نے متعدد یوروپین اقوام کی آزادی کو پامال کیا لیکن بالآخر یہ آزادی بڑے زور شور سے زندہ ہوئی۔ اس بنا پر کروچی نے تقدیر کو نہیں بلکہ تدبیر کو فلسفۂ تاریخ کا جزو ٹھہرایا کیونکہ واقعاتِ تاریخ تدبیر ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔

فلسفۂ تاریخ کا ایک اور جزو یعنی تاریخ کی عہدبندی و تقسیم

ہر زمانے میں ایک خاص قسم کے واقعات رُونما

ہوتے ہیں۔ جن کو عام لوگ "زمانے کی ہوا" کہتے ہیں۔ اور اس ہوا کے تحت ایک "فیشن" قائم ہو جاتا ہے۔ یہ ہوا کسی مکاں کی محتاج نہیں ہوتی زماں بھی مکاں کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ زمانہ قدیم میں رسل و رسائل کے ذرائع نہایت محدود تھے لیکن پھر بھی یہ فیشن تقریباً عالمگیر ہو جاتا تھا۔ جب بُت پرستی کا رواج تھا تو تقریباً تمام دُنیا بُت پرستی میں گرفتار تھی۔ جب تصوّرِ توحید پیدا ہوا تو یہ تصوّر بھی ہر جگہ نمایاں ہوا۔ جو تصوّر خدا کا سُقراط۔ افلاطون اور ارسطو کے دماغ میں آیا وہی تصوّر حضرت عیسیٰؑ نے پیش کیا حالانکہ بلحاظ زمان و مکاں سقراط (۴۷۰ء تا ۳۹۹ قبل مسیح) اور حضرت عیسیٰ (۴ قبل مسیح تا ۲۹ء) کے درمیان چند صدیوں کا فاصلہ ہے۔ بلحاظ مکاں بھی ان کے ملک متصل نہ تھے۔ اسی طرح قرونِ وسطیٰ میں مذہب کا فیشن تھا۔ اور مشرق و مغرب دونوں مذہب کے پیرو تھے۔

عمل خیال سے پیدا ہوتا ہے اس لئے ان ادوار میں خیال و عمل مشرق و مغرب میں یکساں تھے۔ چنانچہ خیال و عمل کی مماثلت کی بنا پر بعض مورخوں نے مجھ کو ادوار میں منقسم کیا۔ اور میرے ہر عہد کا بہ لحاظ فیشن علیحدہ علیحدہ نام رکھا۔ یہ دستور ابھی تک رائج ہے۔ جس طرح زمانہ قبل از مسیح اور زمانۂ قبل از اسلام کو عیسائی اور مسلمان مورخین زمانۂ جاہلیت کہتے تھے اسی طرح کارل مارکس نے قدیم زمانے کا نام "غلامی معیشت" رکھا کیونکہ قدیم زمانوں میں غلامی کا رواج تھا۔ اس طرح کارل مارکس نے اپنے زمانے کو "معیشت سرمایہ داری کا لقب دیا۔ آئندہ زمانے کے متعلق کارل مارکس کو یقین تھا۔ کہ اشتراکیت رائج ہو کر رہے گی۔ اس لئے

اس آئندہ زمانے کو اس نے "دورِ اشتراکیت" کا نام دیا۔

حالانکہ یہ تقسیم ادوار سراسر مصنوعی اور جعلی تھی لیکن دورِ حاضر کے مورخین اسی تقسیم کے مرض میں مبتلا ہیں۔ ہر عہد کا عنوان اس عہد کے فیشن کے مطابق کام کرتے ہیں۔ دورِ یونان کو کلاسیکی کہا جاتا ہے کیونکہ جو خیالات یونانی دور میں رائج تھے وہ دورِ حاضر میں مستند سمجھے جاتے تھے۔ اس دور میں فلسفے کا زور تھا۔ اور یونانی فلسفی رائج الوقت عقائد کے خلاف آزاد خیالی کی تلقین کرتے تھے۔ اور یہی آزاد خیالی کا فیشن دورِ حاضر میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی لئے یونانی عہد کے خیالات اس زمانے میں مستند سمجھے جاتے ہیں۔

اسی طرح قرونِ وسطیٰ کو "دورِ اعتقاد" کا نام دیا گیا کیونکہ قرونِ وسطیٰ میں مذہب کی وجہ سے آزاد خیالی مفقود ہو گئی تھی۔ ارسطو اور سقراط کا نام لینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے بعد جو دورِ مغرب میں آیا وہ "عہد نشاۃ ثانیہ" کہا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں یونان کی آزاد خیالی پھر زندہ ہوئی اور انسانی خیال نے عقیدے کی بیڑیاں توڑنا شروع کیں اور آزاد خیالی کا پھر چرچا ہونے لگا۔

آزاد خیالی کی تکمیل جس دور میں ہوئی وہ "عہدِ جدید" کہلاتا ہے۔ اس وقت دنیا اسی دور سے گزر رہی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ عہدِ جدید سے پہلے کا دور یعنی عہد نشاۃ ثانیہ مغرب تک محدود رہا۔ مشرق اس دور سے محروم رہا۔ جہاں اہلِ مغرب کی آمد کے وقت تک عقیدے کا راج تھا۔ جب یورپین ایشیا میں پہنچے تو مغرب میں دورِ جدید رائج ہو چکا تھا اس لئے یہ یوروپین اپنے ساتھ دورِ نشاۃ ثانیہ

نہیں لائے بلکہ دورِ جدید لائے۔ اس طرح اہلِ مشرق پہلی سیڑھی سے محروم رہے اور یکایک ان کو دوسری سیڑھی کا سامنا کرنا پڑا۔

ادوار کی تقسیم قرونِ وسطیٰ تک تو مشرق و مغرب دونوں کے حسب حال ہے۔ اس لئے قرونِ وسطیٰ تک کے ادوار کا اطلاق تمام مہذب دُنیا پر ہو سکتا ہے۔ لیکن جب یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہوا تو مشرق و مغرب کے درمیان ایک قسم کی حدِ فاصل قائم ہوگئی اور مشرق بقول اہلِ مغرب "پیچھے" رہ گیا۔

یہ تقسیم ادوار بھی فلسفۂ تاریخ کا جزو سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اگر فلسفۂ تاریخ پوری تاریخ پر حاوی ہے جیسا کہ فلسفے کو ہونا چاہیئے تو ادوار کے عنوانات مشرق کے معاملے میں صحیح نہیں ثابت ہوتے۔ اس لئے جس فلسفہ تاریخ کی رُو سے یہ تقسیمِ ادوار جائز اور درست ہے وہ فلسفہ، فلسفے کا نام کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان ادوار میں مشرق شامل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرق ابھی دورِ نشاۃ ثانیہ سے گذر رہا ہے۔ فلسفی وہی کہلایا جا سکتا ہے جو کم از کم مکاں کی قید سے مستثنیٰ ہو۔ وہ فلسفہ کیا جس کا اطلاق صرف چند علاقوں تک محدود ہو۔

دورِ جدید کے معاملے میں اس مصنوعی فلسفۂ ادوار کا اطلاق مشرق پر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے تقسیم ادوار کسی طرح فلسفہ تاریخ کا جزو نہیں بن سکتا۔ لیکن جنہوں نے ادوار میں میرے ٹکڑے کئے ان کا دعویٰ ہے کہ ہر دور کی ایک "روح" ہوتی ہے جس سے اس دور میں جان پیدا ہو جاتی ہے اور انسان کی طرح ہر عہد کی اپنی "شخصیت" قائم ہو جاتی ہے۔ مثلاً کلاسیکی

یعنی یونانی عہد کی اپنی علیٰحدہ شخصیت اس صورت میں تھی کہ اس عہد میں ہر شخص کو ذاتی آزادی حاصل تھی۔ رومی عہد کی شخصیت حکومت کی صورت میں تھی۔ اسی طرح دَورِ حاضر کے ممالک کی شخصیت سرمایہ داری کی صورت میں ہے۔ بقول کارل مارکس آئندہ دَور کی شخصیت اشتراکیت کی صورت میں ظاہر ہوگی۔

فلسفہ تاریخ کا انسانی جزو

گو میرے ٹکڑے کر کے مجھ کو عہدوں میں منقسم کر دیا اور ٹکڑے ہونے سے بظاہر میری روح پرواز کر گئی لیکن انسان جس سے میں متعلق ہوں باقی رہا۔ میں انسان کے کارناموں اور اس کی ناکامیوں کی داستان ہوں اس لئے جب تک انسان باقی ہے تب تک میری روح بھی باقی رہے گی۔ گو انسان کا قالب اس کائنات تک محدود ہے لیکن اس کی روح کی رسائی آسمان تک ہے۔ انسانی قالب اور روح دونوں کو اس دنیا میں خیر کے ساتھ شر سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے لیکن کائنات خیر و شر کے جھگڑے سے بری ہے۔

انسان کے سامنے ایک طرف خیر ہے جو پکار پکار کر اس کی عقل و ہمت اور قوتِ ارادی کو اپنی طرف بُلاتا ہے۔ لیکن خیر و شر کے راستے میں اس کو شر نظر آتا ہے۔ جو روڑے اٹکاتا ہے۔ لیکن یہ شر کیا چیز ہے جو اس کے راستے میں روڑے اٹکا رہا ہے؟ اہلِ عقیدہ نے شر کو شیطان سے منسوب کیا ہے۔ مذہب زرتشت اسی خیر و شر کے تنازعہ پر مبنی ہے۔ لیکن زرتشت نے شر کو خدائی جامہ پہنا کر اہرمن یعنی خدائے شر کا لقب دیا اور خدائے خیر کو اہورمزدا (یزدان) کا نام دیا۔ یہ دونوں خدا ہمیشہ برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ چنانچہ میرے صحیفے میں انبیاء کی داستان کے ساتھ ساتھ چنگیز خان

اور ہٹلر کی خوں ریزیوں کا حال بھی ہے۔ بقول اہلِ عقیدہ انبیاء خیر کی پیداوار ہیں۔ چنگیز خاں اور ہٹلر شر کی۔

میرے صحیفے میں جو خیر کے کارنامے درج ہیں ان کارناموں کے اسباب بھی میں بتاتی ہوں۔ مثلاً مجھے معلوم ہے کہ خلفائے راشدہ کی کامیابی کی وجہ ان کی نیک نیتی تھی کیونکہ وہ خیر کے پیرو تھے۔ اس لئے ان کے ہر عمل سے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ لیکن ساتھ ہی حادثے بھی پیش آتے ہیں اور بعض اوقات ایک معمولی حادثے سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ بڑے دور رس ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت عثمانؓ کے قتل سے بڑے دُور رس نتائج برآمد ہوئے۔ بظاہر تو یہ واقعہ صرف ایک فرد کی موت کی صورت میں تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے مسلمان سُنّی اور شیعہ فرقوں میں ہمیشہ کے لئے منقسم ہو گئے۔ اس لئے جو شخص یا جن چند لوگوں نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا انہوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ گویا ایک فردِ واحد یا چند اشخاص کی حرکت سے پورا ملک یا پوری قوم متاثر ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک فردِ واحد کی حرکت سے پورا مُلک یا پوری قوم کیوں اس طرح متاثر ہوتی ہے؟ کیا کسی قوم یا کسی مُلک کی قسمت کا فیصلہ صرف ایک ہی ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر ہے تو ہماری یہ دُنیا نہایت ناپائیدار ہے۔ لیکن یہ خلافِ عقل ہے کہ ایک فردِ واحد پوری قوم کا تختہ اُلٹ دے اور خدا مُنہ دیکھتا رہ جائے اگر یہ خیال درست ہے کہ ہر واقعہ کسی سبب سے پیدا ہوتا ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک فردِ واحد پوری قوم کی بربادی کا سبب ہو سکتا ہے۔

گویا خدا نے اپنی مخلوق کو ایک فردِ واحد کے حوالہ کر دیا۔ کہ وہ جو چاہے کرے۔ کیا یہ ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب جو دیا گیا اس سے مؤرخوں میں تقسیم پیدا ہو گئی بعض نے کہا کہ حضرت عثمانؓ کا قتل خدا کے اشارے سے ہوا اور اسی طرح حضرت علیؓ بھی مارے گئے۔ حضرت علیؓ کا قاتل ابن ملجم تھا۔ یعنی ایک فرد واحد تھا۔ کیا ابن ملجم نے یہ حرکت خود اپنی طرف سے کی یا خدا کے اشارے سے کی؟ اگر تاریخ صرف اسباب اور نتائج کا نام ہے تو اس طرح دُنیا کا بگاڑنا یا بنانا صرف ایک فردِ واحد کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ اور خدا معطل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ صرف خلافِ عقیدہ ہی نہیں بلکہ خلافِ عقل بھی ہے۔ کیونکہ اس طرح تاریخ کے کارساز اور بگاڑنے والے فرد واحد ہو جاتے ہیں۔ گویا انسان خدا کی جگہ لے لیتا ہے اور اس طرح فرعون اور ان کی فرعونیت دُنیا کی مالک ہو جاتی ہے۔

مگر ساتھ ساتھ میں یہ بھی بتاتی ہوں کہ فرعونیت کے مقابلے میں موسیٰؑ اُٹھے۔ ہٹلر کو روسیوں اور امریکہ والوں نے نیچا دکھایا۔ گویا انسان کو انسان ہی بڑھاتا ہے اور انسان ہی گھٹاتا ہے۔ ہٹلر کو جرمنوں نے بڑھایا امریکن نے گھٹایا۔ لیکن اس طرح صرف انسان واقعہ گر ثابت ہوتا ہے۔ خدا نہیں۔ لیکن اہلِ عقیدہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ جرمنوں کا اور امریکن کا پیدا کرنے والا خدا ہے۔ اس لئے واقعہ گر انسان نہیں صرف خُدا ہے۔ اس اعتراض کا جواب دینے کے لئے مؤرخوں نے یہ طے کیا کہ میں خُدا اور انسان دونوں کے اشارے پر چلتی ہوں۔ بعض نے کہا کہ انسان بندۂ تقدیر ہے۔ لیکن تقدیر یہ مقرر کرنے والا کون ہے؟ اگر یہ مان لیا

جائے کہ یہ خدا اور انسان دونوں کے اشارے پر چلتی ہوں تو ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کا اشارہ زیادہ کارگر ہے۔ بعض اوقات انسان شر سے مغلوب ہو کر ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اور دنیا مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس مصیبت سے دنیا کو چھٹکارا خدا کے حکم سے ملتا ہے لیکن کیا خدا اس چھٹکارے کا سامان آسمان سے ٹپکاتا ہے؟ روسی اور امریکن جنہوں نے ہٹلر کو ختم کیا پہلے سے دنیا میں موجود تھے۔

ہٹلر سے رہائی پانے کے بعد دنیا اشتراکیت میں گرفتار ہو گئی اور اب اشتراکیت پسند روسی اور چینی امریکہ سے برسرپیکار ہیں اور اس طرح تیسری عالمگیر جنگ کی تیاری ہو رہی ہے۔ گویا شر آج بھی اپنی شرارتوں میں محفوظ ہے۔ یعنی انسان نے ہی ہٹلر کی شرارتوں کا خاتمہ کیا لیکن یہی انسان اب دوسری شرارت کی تیاری کر رہا ہے۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا نہیں بلکہ انسان واقعہ گر ہے۔ انسان ہی کے ذریعہ خیر و شر دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ خیر اور شر دونوں انسان کے دل و دماغ میں رہتے ہیں۔ جب دل انسان پر غالب ہو جاتا ہے تو شر نمودار ہوتا ہے۔ جب دماغ غالب ہوتا ہے تو خیر اٹھتا ہے اور شر کو مغلوب کرتا ہے۔ (۲۶ نمبر ۸)

اس طرح بظاہر فلسفہ تاریخ کا اصل جزو انسان نظر آتا ہے۔ گویا ایک واقعہ دوسرے واقعہ کا سبب نہیں ہوتا بلکہ اصل سبب انسان ہے۔ اس لئے مؤرخوں کی تلاش اسباب واقعات کی صورت میں بے معنی اور بیکار ہے۔ اصل سبب انسان خود ہے۔ بقول شاعر انسان "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" ہے۔ یہ فیصلہ اطالوی مؤرخ کر چکی

کا ہے۔ لیکن ویکو اس سے متفق نہیں۔ ویکو کے نزدیک کوزے کی مٹّی خدا نے پیدا کی۔ کوزہ بے شک انسان بناتا ہے لیکن کوزہ بنانے میں انسان محض وسیلہ ہے۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ واقعہ گری میں انسان اور خدا کا حصّہ برابر برابر ہے۔ جو لوگ صرف خدا کو مسبب الاسباب مانتے ہیں وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ خدا بھی واقعہ بذریعہ اسباب پیدا کرتا ہے براہ راست نہیں پیدا کرتا۔ ہٹلر کا خاتمہ کسی زلزلے سے نہیں ہوا بلکہ انسان کے ذریعہ سے ہوا۔ گویا واقعہ گری میں بلاشبہ انسان وسیلہ ہے۔ جو لوگ خدا کے منکر ہیں وہ صرف انسان کو واقعہ گر مانتے ہیں۔ الغرض منکرین اور قائلین دونوں کے مطابق انسان فلسفۂ تاریخ کا جزو اعظم ہے۔ خواہ وسیلے کی صورت میں ہو خواہ اپنی خود مختار صورت میں۔ البتہ یہ دعوٰی غلط ہے کہ ایک فردِ واحد پوری دنیا کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک فردِ واحد چنگیز خان نے اپنے زمانے کی دُنیا کا تختہ اُلٹ دیا۔ لیکن اس وحشی انسان نے بھی جیسا کہ میں گذشتہ باب میں بتا چکی ہوں اپنی تقریر میں تسلیم کیا کہ میں "تازیانہ الٰہی" بن کر اُٹھا ہوں اس لئے یہ کہنا کہ ایک فرد واحد دُنیا کو تہ و بالا کر سکتا ہے درست نہیں۔ چنگیز خان کی پشت پر اس کی پوری قوم تھی۔ خواہ فرد واحد کی صورت میں ہو یا قوم کی صورت میں یہ بات مسلّم ہے کہ انسان فلسفۂ تاریخ کا اہم جزو ہے۔ خدا کے احکام بھی انسان کے وسیلے سے پورے ہوتے ہیں۔

مجھے یہ باب "میرا اپنا فلسفہ" کے نام سے اس لئے لکھنا پڑا کہ

گذشتہ باب میں جو موضوع ہیں وہ دراصل فلسفہ نہیں ہیں۔ مثلاً میری ابتدا کا معاملہ۔ میرا مقصد۔ مورخ کی دقتیں۔ تاریخ سائنس ہے یا فلسفہ۔ وغیرہ وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کا جواب دیگر علوم کے ذریعہ دیا جا سکتا ہے۔ فلسفہ درکار نہیں۔ اصل مسئلہ جو دراصل خالص فلسفۂ تاریخ سے متعلق ہے۔ وہ یہ ہے کہ واقعہ گر انسان ہے یا خدا؟ کیونکہ اس سوال کا جواب دینے کے لئے پہلے یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ خدا ہے بھی یا نہیں۔ اگر خدا ہے تو وہ بذاتِ خود انسان کے معاملات کا فیصلہ کرتا ہے یا اس کے وضع کردہ قوانینِ فطرت انسان اور قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں؟ یعنی خدا واقعہ گر ہے یا انسان؟ پیشہ ور فلسفی اس سوال کا جواب دینے میں اختلاف کا شکار ہو گئے کیونکہ ان کا ذریعۂ علم محض قیاس تھا واقعات نہ تھے۔ واقعات تو میرے تحت میں تھے۔ اس لئے اس مسئلہ کو صرف وہی حل کر سکتا تھا جو فلسفے کے علاوہ تاریخ کا بھی ماہر ہو۔ ایسا عالم سب سے پہلے مسلمانوں میں ابن خلدون کے نام سے ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوا لیکن اس کی مشہور تصنیف "مقدمہ" ایک عرصے تک عالمِ اسلام تک ہی محدود رہا۔ اور مغرب اس کے فلسفے سے فیض یاب نہ ہو سکا۔ اس مشہور مفکر کا ذکر میں ایک مخصوص باب کے تحت کروں گی۔

جس فلسفی تاریخ یعنی ویکو سے مغرب متاثر ہوا وہ دو سو سال بعد پیدا ہوا اس لئے اہلِ مغرب ویکو ہی کو اصل فلسفۂ تاریخ کا بانی سمجھتے ہیں۔ میرے نزدیک بھی اگر کسی مفکر نے میرے فلسفے کو مغرب

ہیں سمجھا تو وہ بھی ویکو تھا۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ واقعہ گر خدا اور انسان دونوں ہیں۔ لیکن انسان محض وسیلہ خدا ہے۔ بذات خود انسان واقعہ گر نہیں۔ لیکن چونکہ انسان عقل کا بھی پابند ہے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ خدا کی واقعہ گری کو از روئے عقل ثابت کیا جائے۔ چنانچہ ویکو نے خدا کو واقعہ گر از روئے عقل بھی ثابت کیا۔ اسی لئے میں نے ویکو کے فلسفے کو اپنایا اور اس کے فلسفے پر میں نے اپنی مہر لگا دی اور اسی لئے مجھے یہ علیحدہ باب لکھنا پڑا تاکہ اہلِ عقل بھی اس سے مُستفید ہوں۔ گو بعض اہلِ عقل خدا کے منکر ہیں لیکن یہ لوگ فطرت اور اس کے قوانین کو ضرور مانتے ہیں اور ان قوانین کو واقعات کا سبب بتاتے ہیں۔ گویا فطرت واقعات تاریخ پیدا کرتی ہے۔ لیکن یہ محض نام کا فرق ہے۔ خدا خدا ہی رہتا ہے۔ خواہ اس کو کسی نام سے پکارا جائے۔

پانچواں باب

عالمِ اسلام میں میری آمد اور قیام

میں ہمیشہ سے انسان سے وابستہ ہوں۔ جہاں وہ پہنچتا ہے وہاں میں بھی پہنچ جاتی ہوں اور اس کی حرکات و سکنات کا تماشہ دیکھتی ہوں۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو میں اس وقت ایران اور "وارثانِ روم" بازنطیوں کے علاقے میں تھی۔ یہ دونوں بڑے قدیم دشمن تھے اور ایک دوسرے سے برابر لڑتے رہتے تھے۔ اور میں اس لڑائی کی داستان لکھتی رہتی تھی۔ ابھی میں اس جنگ کی نامہ نگاری کر رہی تھی کہ یکایک صحرائے عرب سے ایک آواز اٹھی جس نے ایران اور بازنطین دونوں کو خائف کر دیا۔ شروع میں تو یہ آواز کسی قدر دھیمی تھی لیکن چند سالوں کے اندر ہی یہ آواز قیصر و کسریٰ کے محلوں میں گونجنے لگی۔

مَیں بھی اس آواز سے جاگی اور اس صحرا کا رُخ کیا جہاں سے یہ آواز آ رہی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں بتا چکی ہوں اس وقت میرے دو بھیس تھے کیونکہ مجھ کو "جیسا دیس ویسا بھیس" کے اصول پر چلنا پڑتا ہے۔ وارثانِ رُوم کے علاقے میں میرا بھیس محض برائے نام رومی تھا۔ کیونکہ ظہورِ اسلام کے وقت یہ وارثانِ روم مشرقی رنگ میں رنگ چکے تھے۔ اور ان کی سلطنت کا جھنڈا مذہبی بن چکا تھا۔ ایران میں میرا لباس ایرانی قومیت کے رنگ کا تھا۔ کیونکہ ایرانی مذہب سے زیادہ قومیت کے شیدا تھے۔ میں نے

مختلف زمانوں میں مختلف قسم کے بھیس کیوں اختیار کئے؟ اس لئے کہ ہر زمانے میں میرے متعلق تخیل مختلف ہوتا تھا۔ قبیلہ بندی کے دور میں میرا کام نسب نامہ لکھنا تھا۔ اس لئے اس زمانے میں تاریخ صرف اس کو کہا جاتا تھا جو نسب نامے بیان کرے لہٰذا اس زمانے میں میرا بھیس نسب نامہ نما تھا۔ جب بادشاہوں کا دور شروع ہوا تو مجھے درباری بھیس اختیار کرنا پڑا۔ قرون وسطیٰ میں مذہب عیسوی آیا تو مجھے پادریوں کی ٹوپی پہننی پڑی۔ اس ٹوپی کو پہن کر مجھے پھر کشف و کرامات اور معجزے بیان کرنے پڑے۔ جن کو میں رومیوں کے زمانے میں ترک کر چکی تھی۔ اس لئے دورِ عیسوی میرے لئے ترقی نہیں بلکہ تنزل تھا۔

یہ تنزل اس وقت نظر آتا ہے جب میں پرانا لباس ترک کر کے نئے لباس میں نظر آتی ہوں۔ چنانچہ دورِ عیسوی کے بعد جب یورپ میں دورِ نشاۃ ثانیہ شروع ہوا تو اس دور کے اہلِ قلم نے میرے عیسوی دور کے لباس کو نشاۃ ثانیہ کی نظر سے دیکھا اور میرے دورِ عیسوی کے صحیفوں کو پڑھ کر کہا:- (حوالہ نمبر ۱)

"اس دورِ عیسوی کی تاریخوں میں فکر و نظر ایسی گری ہوئی نظر آتی ہے کہ ہمیں تاریخ مفقود معلوم ہوتی ہے...... گویا تاریخ دینیات کی لونڈی بن گئی ہے۔ اور روح تاریخ کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔"

دورِ عیسوی میں میرا کام تثلیث کی تلقین کرنا تھا۔ جب عیسائیت کو یہودیوں نے اس علاقے سے خارج کیا جہاں عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔ اور جہاں توحید نمودار ہوئی تھی تو اس مذہب کو یونان میں پناہ لینی پڑی۔

جہاں دیوتاؤں کا راج تھا۔ ان دیوتاؤں میں تین معبود بڑے سمجھے جاتے تھے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی تثلیث کا عقیدہ تھا اور تمام دیوتاؤں کے سرغنہ برہما، شیو اور وشنو سمجھے جاتے تھے۔ الغرض جب مذہب عیسوی پر تثلیث غالب ہو گئی تو ہمیں اسی عیسوی تثلیث کی تلقین کرنے لگی۔ اس لئے قرونِ وسطیٰ میں میرا جو لباس یورپ میں تھا اس پر تثلیث کندہ تھی۔

دورِ عیسوی میں عیسائی اولیاء بھی نمودار ہوئے جو عیسوی مذہب کے حامیوں کی مدد کرتے تھے اور مخالفوں کو زک دیتے تھے۔ ان اولیاء نے پرانے دیوتاؤں کی جگہ لی اور مجھے ان اولیاء کے کشف وکرامات کو بھی اپنے صحیفے میں داخل کرنا پڑا۔ فرق صرف یہ تھا کہ دورِ عیسوی کے قصص کشف وکرامت کو دیوتاؤں سے نہیں بلکہ ذات عیسیٰؑ سے منسوب کیا جاتا تھا۔ کیونکہ عیسیٰ کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا گیا تھا۔ اور اب ان قصص کا شمار توہمات میں نہیں بلکہ دینِ برحق میں ہوتا تھا۔ البتہ اس دورِ عیسوی میں روحانیت کا تصور ضرور پیدا ہوا۔

روحانیت کے معاملے میں قرونِ وسطیٰ کی تاریخ نگاری قدیم تاریخ نگاری سے اعلیٰ وارفع ہے۔ کیونکہ دورِ عیسوی کی تاریخوں میں ایمان اور کفر کا ذکر بھی پایا جاتا ہے گویا اس دورِ عیسوی میں انسان کے دماغ میں ایمان اور مومن کا تخیل بھی پیدا ہوا۔ ان تاریخوں میں ان لڑائیوں کا بھی ذکر ہے جو عیسائی مومنوں اور کافروں کے درمیان ہوئیں۔ اس طرح حق و باطل کا تصور بھی انسان کے ذہن میں پیدا ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ حق کی صورت تثلیث کی وجہ سے مسخ ہو گئی تھی لیکن حق کا تصور انسان کے ذہن میں دورِ عیسوی میں ضرور پیدا ہوا۔ از روئے روحانیت یہ ایک قسم کی

ترقی تھی۔

لیکن عیسائیت سے بہت پہلے یہودی اس روحانیت تک پہنچ چکے تھے۔ لیکن مغرب کے یہودی روحانیت سے ناآشنا تھے۔ کیونکہ جو یہودی منتشر ہونے کے بعد مغرب میں پہنچے تھے وہ اپنے ساتھ توحید ابراہیمی نہیں لائے تھے۔ بلکہ جو ایمان ان یہودیوں کے پاس تھا وہ یہودیوں کے پجاریوں کا ساختہ تھا جو ربی کہلاتے تھے۔ انہوں نے برہمنوں کی طرح اصل توحید ابراہیمی میں پوجا کا تصور بھی شامل کر دیا تھا۔ یعنی اس زمانے کے یہودی خدا پرست نہ تھے بلکہ مذہب پرست تھے۔ اس مذہب پرستی کا مفصل حال متی۔ لوقا۔ مرقس اور یوحنا کی انجیلوں میں پایا جاتا ہے۔

عرب کی حالت قبل از اسلام

عین اس زمانے میں جب میں تثلیث کی تبلیغ و تلقین کر رہی تھی میرے کان میں ایک عجیب قسم کی صدا آئی جو عرب کے صحراسے اٹھی۔ جو چیز مجھے عرب کے لق و دق صحرا میں کھینچ کر لے گئی وہ یہی صدا تھی جس کو اس کے حامی "صدائے توحید" کہتے تھے۔ لیکن جب پہلی بار میرے کانوں میں یہ صدا پہنچی تو میں نے محسوس کیا کہ اس صدا سے تو میرے کان آشنا ہیں۔ کیونکہ یہ صدا میرے کانوں تک عہد ابراہیمی میں پہنچ چکی تھی۔ لیکن میرے ذہن میں اس صدا کا تصوّر موہوم ہو چکا تھا۔ کیونکہ بعد کو یہودیوں نے خود توحید کو موہوم کر دیا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ ایسی صدا ایسے بنجر علاقے سے اٹھی جہاں

نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی فقط آب باراں پہ تھی زندگانی

زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں　　　　لُوؤں کی لپٹ بادِ صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیاباں　　　　کھجوروں کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں

نہ کھیتوں میں غلّہ نہ جنگل میں کھیتی!
عرب اور کُل کائنات اس کی یہ تھی

گو صدائے توحید بڑی دلکش تھی لیکن میں نے سوچا کہ ایسے سنگلاخ ملک میں جانے سے کیا فائدہ جہاں صرف رجز کا رواج تھا۔ جس کو لوگ ازبر کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں بجز لوٹ مار کے اور کوئی واقعہ نہ تھا۔ جس کو میں اپنے صحیفے میں لکھتی۔ میرے کورے کاغذ کی طرح ان بادیہ نشین عربوں کا افسانہ بھی کورا تھا۔ اس کے علاوہ میں ان بادیہ نشین ناخواندہ لوگوں میں محرر کس طرح مقرر کرتی۔ اس لئے میں نے یہ طے کیا کہ میں فی الحال وارثانِ روم کے علاقوں میں مقیم رہوں۔

بوقت ظہورِ اسلام اگر دنیا میں کوئی منظم حکومتیں اور قومیں تھیں تو وہ مشرق میں چین۔ ہندوستان اور ایران تک محدود تھیں۔ مغرب میں صرف بازنطینیوں کی حکومت تاریخ نگاری کی خواہاں تھی۔ کیونکہ ان کا دعویٰ تھا کہ بحیثیت وارثانِ روم وہ مورخوں کی حمد و ثنا کے مستحق ہیں۔

کسرایانِ ایران اپنے نام میرے صحیفوں میں درج کرانے کے بجائے اپنے نام اور اپنے کارنامے پتھروں پر کندہ کراتے تھے۔ جن میں سے بعض ابھی تک موجود ہیں۔ لیکن ساسانی کسراؤں نے میرے محرروں سے تاریخیں بھی لکھوائیں۔ جو اب بیشتر مفقود ہیں۔ صرف ان کے نام باقی ہیں جو میں خدائے نامک" مشہور ہے۔ میرے مسلمان محرروں کی بدولت اس کتاب کا ایک حصہ عربی زبان میں منتقل ہوا۔ ایک اور تاریخ پہلوی

زبان میں موسومہ "شاہ نامہ گشتاسپ" بھی دستیاب ہے۔ انہیں پُرانی تاریخوں سے فردوسی نے اپنا شاہنامہ مرتب کیا۔ لیکن فردوسی کے شاہنامے کو میں اپنا صحیفہ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ اس میں ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جن کا وجود ثابت کرنا مشکل ہے۔ ہوشنگ۔ کیمرث۔ جمشید۔ ضحاک۔ فریدون کا پتہ نہیں چل سکتا۔ الغرض میرے ایرانی محرروں کے صحیفے اب مفقود ہیں۔ بلکہ میں یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ ان مفقود کتابوں کو تاریخ کا نام دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

البتہ بلاد روم میں میرے محرر ایسی کتابیں لکھ رہے تھے جن کو میں اپنا کہتی ہوں۔ گو بازنطینی اپنے آپ کو وارثانِ روم کہتے تھے۔ لیکن انہوں نے لوی یا طاقی توس جیسا کوئی مؤرخ نہیں پیدا کیا۔ بازنطیوں نے دو قسم کی تاریخیں لکھیں:۔

(۱) اصل تاریخ جو یونانی نہج پر لکھی جاتی تھی جس کو تعلیم یافتہ لوگ پڑھتے تھے۔

(۲) عامیانہ تاریخ جو عوام پڑھتے تھے ان کے مصنف نیم خواندہ راہب ہوتے تھے۔ اس لئے ان میں مذہبی رنگ ہوتا تھا۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو میں ضبطِ تحریر میں آچکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود مجھے مسلمانوں نے ایک عرصے تک طلب نہیں کیا۔ کیونکہ بانیٔ اسلام ذوقِ نام و نمو سے بری تھا۔ اس دور کے مسلمان بھی شہرت سے بے نیاز تھے۔ ان کے نزدیک اصل سُرخ رُوئی وہ تھی جو خدا کے حضور میں نصیب ہو۔ بقول شاعر ان مسلمانوں کا مقصد صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا تھا:۔

پیش خلقاں خوار و زار و ریش خند
پیشِ حق محبوب و مطلوب و پسند (مولانا روم)

(ہم لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ہیں لیکن خدا کی نظر میں ہم محبوب و مطلوب ہیں۔)

اس دور کے مسلمانوں کی شہرت کی طرف سے بے نیازی اس حد تک تھی کہ انہوں نے اپنے اس محترم مربیّ کی سوانح عمری تک نہ لکھی۔ اس محسن انسانیت نے سنہ ۶۳۲ء میں وفات پائی لیکن ان کی سوانحعمری ایک صدی کے بعد ابن اسحٰق (متوفی سنہ ۷۶۷ء) نے قلم بند کی اور وہ بھی تلف ہو گئی۔ اب صرف اس کا خلاصہ باقی ہے۔ جو ابنِ ہشام (متوفی سنہ ۸۳۴ء) نے تیار کیا۔

نبیؐ اسلام کی وفات کے بعد چار خلفاء نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی۔ اُن کو بھی نام و نمود سے کوئی رغبت نہ تھی اس لئے انہوں نے بھی پیشہ ور خوشامدی مؤرخوں کو پاس نہ آنے دیا۔ ظہورِ اسلام سے پہلے میں صرف قبائلی نسب ناموں کی صورت میں سرزمینِ عرب کا کبھی کبھی نظارہ کرتی تھی۔ لیکن بانیٔ اسلام کی بدولت میرا حوالہ مسلمانوں کے قرآن میں بھی ملتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس بانی کے دماغ میں تاریخ کو بھی جگہ حاصل تھی۔ اس نبیؐ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ ایک "نیا" مذہب قائم کر رہا ہے۔ بموجب قرآن اسلام ایک لمبے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ اس لئے اسلام کو سمجھنے کے لئے تاریخ جاننا ضروری ہے اس لئے ایسے نبیؐ کو باوجود اس کے اُمّی ہونے کے میں اپنا محسن قرار دے سکتی ہوں۔ جو قدر میری مسلمانوں نے کی اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ چونکہ ان کے قرآن میں متعدد میرے واقعات کے ذکر تھے اس لئے اس

کتاب سے میرے محرّروں کو بڑی مدد ملی۔

بانیٔ اسلامؐ کی متعدد صفات میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ فخر و مباہات پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سے مجھے بہت فیض پہنچا اور مجھے بیانِ نسب سے چھٹکارا ملا اور میرے حدود بڑے ہوتے گئے۔ مسلمانوں کے قرآن میں بار بار "اساطر الاولین" کی اصطلاح ملتی ہے۔ مفسرین کے نزدیک اس اصطلاح سے مراد اولین زمانے کی تحریریں ہیں یعنی تاریخ سے متعلق دستاویزات۔ اس لئے مجھے فخر ہے کہ میرا ذکر مسلمانوں کے قرآن میں ہے اس بنا پر مسلمانوں نے میرا بڑا احترام کیا۔ احادیث میں بھی میرا حوالہ ملتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:۔

"تاریخ سے کنارہ کش نہ ہو کیونکہ اس کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ کون سی بات باعتبارِ تاریخ صحیح ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ واقعہ حال کا ہے یا کسی قدیم عہد کا ہے۔"

مسلمانوں کے قرآن میں میرا ذکر اس طرح ہے:۔

(ترجمہ از سورۃ ھود: مترجم نذیر احمد)

"دوسرے پیغمبروں کے جتنے قصّے ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان کے ذریعہ سے ہم تمہارے دل کی ڈھارس بندھاتے ہیں۔ اور (ان قصوں کے ضمن میں) ایک تو جو حق بات تھی وہ تمہارے پاس پہنچی۔ اور (اس کے علاوہ ان میں) مسلمانوں کے لئے نصیحت اور یاد دہانی (بھی) ہے۔"

اسلام کی تاریخی اہمیت سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ظہورِ اسلام بذاتِ خود ایک ایسا اہم اور فیصلہ کن واقعہ ہے جس نے میرا رُخ ہی بدل

دیا۔ بعض قوموں کے حق میں تو اسلام نسخۂ کیمیا بن گیا۔ وہ ایرانی جن کا اسی اسلام نے بمقام نہاوند ۶۴۲ء میں خاتمہ کیا اسلام کے سایے میں آکر پھر زندہ ہوئے اور عہد عباسی میں عالمِ اسلام کے مالک بن گئے۔ ترک جو جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے مسلمان ہوکر مشرق و مغرب پر مسلّط ہو گئے۔ الغرض اسلام نے جتنی واقعہ گری کی ہے وہ لاثانی ہے۔ اسلام کی کہانی بذاتِ خود ایک مسلّم تاریخ ہے۔

یہ واقعہ گری بانیٔ اسلام کی وفات (۶۳۲ء) کے بعد اور بڑھی کیونکہ بعد وفات دنیا کی قسمت کا فیصلہ "اجماعِ امت" کے ہاتھ میں آگیا۔ اس فیصلے کے لئے میرا مطالعہ لازم ہوگیا۔ اب علاوہ قرآن کے احادیث بھی جزوِ اسلام بن گئیں۔ محدثین کا طبقہ اُٹھا جس نے چھان بین کی وہ ہی راہیں اختیار کیں جو میرے واقعات کو معلوم کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ الغرض میں مسلمانوں کی گھٹی بن گئی۔ علاوہ احادیث کے اصحابِ رسول کے اقوال کی جستجو بھی شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں مسلمان مؤرخوں کو سیرتِ اصحاب پر بھی کتابیں لکھنی پڑیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے میرے فن میں ایک ایسی ایجاد کی جس کی تقلید آج پوری دنیا کر رہی ہے۔ وہ ایجاد مجموعاتِ سوانح کی صورت میں تھی۔ جو مغربی اصطلاح میں آج "ڈکشنری سوانح" کہلاتی ہے۔ شروع میں اس ایجاد کا نام "اسماء الرجال" تھا۔

الغرض قرآن اور حدیث دونوں کے مطابق میں قابلِ احترام سمجھی گئی۔ اس کے علاوہ اس نبی کی اُمت نے ایسی پھرتی سے اور ایسے پیمانے پر واقعات پیدا کئے کہ میرے صحیفے کے صفحات ملبب ہو گئے۔ یہ اُمت چند سالوں کے اندر مراکش اور اندلس سے لیکر ہندوستان تک

پھیل گئی۔ اب میرے صحیفے میں قیصر و کسریٰ کی جگہ مسلمانوں کا نام آنے لگا۔ بُت پرستی کے افسانے ختم ہوئے اور توحید کی کہانی کا آغاز ہوا۔ اس امت کی داستان میں صرف مادی فتوحات ہی نہ تھیں بلکہ ذہنی انقلاب بھی شامل تھا۔ اس انقلاب کا ذہنی پہلو ایک معمہ ہے جس کو میں بھی حل نہیں کر سکتی یہ جاہل مطلق قوم ذہنی اعتبار سے جہالت کی تحت الثریٰ میں تھی لیکن اس قوم نے صدائے لاالٰہ الااللہ محمد الرسول اللہ سن کر اس تحت الثریٰ سے ایسی چھلانگ لگائی کہ عرش پر پہنچ گئی۔ صدیوں پرانی ذہنی بیڑیاں یکایک ٹوٹ کر گر پڑیں۔ جس راستے پر عرب صدیوں سے چل رہے تھے۔ اُس کو چھوڑ کر یکایک نیا راستہ اختیار کر لیا۔

عروجِ اسلام کے اسباب عقل نہیں بتا سکتی

میری عقل اور انسان کی عقل جس پر وہ نازاں ہے اس کی اصل وجہ معلوم کرنے سے قاصر ہے۔ اگر اس کا کوئی جواب دے سکتا ہے تو وہ عقیدہ ہے۔ بقول شاعر:

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت — بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت — چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ اور نویدِ مسیحاؑ

فتوحات کے اسباب بتانا تو میرے لئے کچھ مشکل نہیں۔ بعد میں چنگیز خان اور نیپولین نے بھی چند سالوں کے اندر بڑی سلطنت قائم کر لی لیکن ان دونوں کی قائم کردہ سلطنتوں کی پُشت پر صرف تلوار تھی۔ کوئی تصور یا عقیدہ نہ تھا اس لئے یہ دونوں سلطنتیں بہت جلد ختم

ہوگئیں۔ چنگیز خان جس نے عالم اسلام کو تباہ کیا تھا۔ اسی کے خاندان کی ایک شاخ مسلمان ہوگئی اور اس تصور نے تخریب کرنے والوں کو تعمیر پر لگا دیا۔

میرا لاکھوں برس کا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ جو کام ایک "خیال" کر سکتا ہے وہ شمشیر و سناں نہیں کر سکتیں۔ قوانین فطرت میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی مثال پیش کر کے میں خیال کی قوت کا اندازہ لگا سکوں۔ فطرت میں سورج ہے جو روشنی دیتا ہے لیکن رات کو سورج اور اس کی روشنی غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن خیال رات کو بھی نہیں سوتا۔ حامیان خیال رات بھر اپنے خیال کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ اگر رات کو سو بھی جاتے ہیں تو ان کو خواب میں بھی وہ وظیفہ نظر آتا ہے۔

خیال سے ایک جنون پیدا ہوتا ہے جو عقل کی بندشیں توڑ کر وہ کام کرتا ہے جس کو عقل بیان نہیں کر سکتی۔ بقول شاعر:-

جنون آرزو بہتر ہے عقل مصلحت بیں سے

جنوں کو شاعروں نے "عشق" کا نام دیا ہے لیکن اس عشق تک عقل کی رسائی ممکن نہیں۔ انسان کو جو عشق اپنے معشوق یا اپنی اولاد سے ہوتا ہے اس کا سبب تو عقل بتا سکتی ہے کیونکہ وہ سبب شہوت کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن جو عشق انسان کو ایک موہوم خیال سے پیدا ہوتا ہے اس کا سبب معلوم کرنے سے عقل معذور ہے۔ بعض ماہرین نفسیات نے اس عشق خیالی کا سبب یہ بتایا ہے کہ انسان خود پرست ہے اس لئے وہ اپنے خیال سے بھی محبت کرتا ہے۔ لیکن یہ جواب اہل عقل کو بھی قائل نہیں کر سکتا۔ خیال سے عشق کوئی انسان خود نہیں پیدا کرتا۔ بلکہ

ایک فردِ واحد کے دل میں یہ عشقِ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس فردِ واحد کو میں نے اپنے صحیفے میں "نبی" کا نام دیا ہے۔

اگر عشقِ خیال نبی کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو یہ خیال اور اس کا عشق نبی کی موت کے ساتھ ختم ہو جانا چاہیئے۔ لیکن میں نے تو بچشم خود یہ دیکھا ہے کہ بانیٔ خیال کی موت کے بعد یہ خیال عشق اور زور پکڑتا ہے اور لاکھوں کے دلوں میں جاگزیں ہوتا ہے۔ عمرؓ اور خالدؓ جیسے لوگوں کی تخریبی طبیعت کو تعمیر پر لگا دیتا ہے۔ شدید مخالفوں کو شدید حامی بنا دیتا ہے۔ سینٹ پال جیسا شدید مخالف عیسیٰؑ مذہب عیسوی کا شدید حامی بن جاتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اس سوال کا جواب اہلِ عقل نہیں بلکہ اہلِ عقیدہ اس طرح دیتے ہیں :-

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شُد — او ز حرص و عیب کلّی پاک شد

(جو کوئی اپنا کپڑا عشق سے چاک کر دیتا ہے وہ حرص اور دیگر عیوب سے پاک ہو جاتا ہے)۔

شاد باد اے عشقِ خوش سودائے ما — اے طبیبِ جُملہ علّت ہائے ما

(اے میرے خوش سودا عشق تو سلامت رہے۔ کیونکہ تو میری جُملہ بیماریوں کی دوا ہے)۔

اے دوائے نخوت و ناموسِ ما — اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

(اے عشق تو میرے غرور اور ناموس کی دوا ہے تو میرے لئے افلاطون اور جالینوس ہے)

جسمِ خاک از عشق بر افلاک شُد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد

(عشق کی بدولت عیسیٰؑ کا جسمِ خاکی آسمان کو پہنچ گیا۔ موسیٰؑ کی بدولت

پہاڑ متحرک ہوا اور ناچنے لگا۔

عشق جان طور آمد عاشقا | طور مست و خر موسیٰ صعقا

(عشق سے طور میں جان پیدا ہو گئی طور مست ہو گیا اور موسیٰ بے ہوش ہو گئے)

سر پنہاں است اندر زیر و بم | فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

(سبب عشق ایک مخفی بھید ہے اگر میں اس بھید کو بیان کر دوں تو دنیا تہ و بالا ہو جائے)

گویا سبب عشق اہل عقیدہ بھی بتانے سے ڈرتے ہیں یہ ان رازوں میں سے ہے۔ جو انسان کو نہیں بتائے جا سکتے۔ کیونکہ فکر و نظر محدود ہے۔ اگر اس راز کو بتایا جائے تو انسانی عقل اس کو تسلیم نہیں کرے گی۔

بانیٔ اسلام کے زمانے میں ان کے معتقد اپنے اس بانی کو سبب عشق سمجھتے تھے۔ اسی لئے تلاش سبب کے لئے مجھے طلب نہیں کیا گیا۔ کیونکہ سبب ان کی آنکھوں کے سامنے زندہ موجود تھا۔ جب مسلمانوں کی فتوحات کا آغاز ہوا اور واقعات بڑی سرعت سے رونما ہونے لگے تب بھی میرے مسلمان محرروں نے ان واقعات کے اسباب معلوم کرنے کی پرواہ نہ کی کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ جو کامیابیاں ان کو حاصل ہوئی ہیں ان کا سبب وہی ہستی ہے جس نے ان کے نبی کو بھیجا تھا مسلمان موزخوں کے نزدیک مسلمانوں کی کامیابیاں اور ناکامیاں سب خدائی منصوبے کے تحت تھیں۔

اہل مغرب کو عیسائی مورخ اس خدائی منصوبے سے آگاہ کر چکے تھے۔ لیکن جب دور نشاۃ ثانیہ میں عقل نے زور پکڑا تو خدائی

منصوبے کا نظریہ پس پُشت ڈال دیا گیا کیونکہ یہ نظریہ عقل کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جا سکتا تھا۔

اس دورِ نشاۃ ثانیہ میں ویکو سب سے پہلا مورخ تھا جس نے خدائی منصوبے کے نظرئے کو پھر زندہ کیا۔ جس کا ذکر باب بعنوان "میرا اپنا فلسفہ" کے تحت میں کر چکی ہوں۔ اسی لئے میں نے ویکو کے فلسفۂ تاریخ کو اپنایا مسلمانوں نے جو کارنامے دکھائے اُن سے اس فلسفے کی مزید تصدیق ہو گئی۔

خدائی منصوبے سے متعلق جو نظریہ عیسائی مورخوں نے پیش کیا تھا وہ صرف مذہب تک محدود تھا۔ کیونکہ عیسائیت قسطنطین اعظم (۳۰۶ء تا ۳۳۷ء) کے زمانے تک حکومت سے محروم رہی۔ اور مذہب عیسوی کو رومیوں کی چیرہ دستی جھیلنی پڑی۔ جب عیسائیت کو تین سو سال بعد حکومت نصیب ہوئی تو وہ بھی فتوحات کی بنا پر نہیں بلکہ قسطنطین کے عیسائی ہونے کی وجہ سے حکومت حاصل ہوئی اسی لئے مذہب عیسوی میں رومی خیالات اور تصورات داخل ہو گئے۔ برعکس اس کے اسلام کی ابتدا ہی حکومت سے ہوئی۔ اس لئے اسلام سے متعلق ہر چیز بالکل نئی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی ہر چیز کو خدا سے براہ راست منسوب کیا۔ قبل از اسلام زمانے کو "جاہلیہ" قرار دیا۔ اس جاہلیہ دور میں "رجز" کی صورت میں میں موجود تھی۔ لیکن جب خدائی منصوبے کے تحت مسلمانوں کو فتوحات حاصل ہونا شروع ہوئیں تب بھی ان کو تلاش سبب کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ کیونکہ ان کے خیال کے بموجب یہ اسباب الہام اور وحی کی صورت میں ان کے پاس موجود تھے۔ اپنی ہر فتح کو وہ "نصرت الہٰی" سمجھتے تھے "نصر من اللہ فتح قریب" ان کا نعرہ تھا۔ ان حالات میں ان کے پاس میرا

جانا بیکار تھا۔

خلفائے راشدینؓ کے بعد بنی اُمیہ نے حکومت قائم کی تو مَیں طلب کی گئی۔ بنی اُمیہ نے عہدِ جاہلیہ سے پھر ناتا جوڑا۔ اور اب میرا کام آسان ہو گیا۔ کیونکہ اب واقعات میں تسلسل قائم ہو گیا۔ میں نے رجز کی داستانیں اب لکھنا شروع کیں لیکن عرب ناخواندہ تھے۔ مسلمان عربوں میں جو چند لوگ تھوڑے بہت خواندہ تھے وہ فتوحات میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے اس دَور میں میرے محرّر عیسائی تھے۔ امیر معاویہؓ کے عہدِ حکومت میں میرا محرّر اخطل نامی ایک عیسائی تھا۔ دوسرے عیسائی محرّر نضر بن حارث نے ان رجزوں میں ایرانی عنصر داخل کر دیا۔

جب بنی اُمیہ کا خاتمہ ۷۴۹ء میں ہوا تو عباسیوں نے مجھے طلب کیا۔ عباسیوں نے بنی اُمیہ سے اسلام کے نام پر حکومت چھینی تھی۔ اس لئے انہوں نے بنی اُمیہ کی قوم پرستی کا خاتمہ کیا اور اسلامی دَور شروع ہوا۔ انہوں نے ان تمام صحیفوں کا بھی خاتمہ کیا جو دورِ بنی اُمیّہ میں لکھے گئے تھے۔ کیونکہ ان میں عربوں کا بحیثیت ایک علیحدہ قوم کے تذکرہ تھا۔ گو عبّاسیوں کے عہد میں بڑے بڑے نامور مورخ پیدا ہوئے لیکن میرے علم کو کوئی علیحدہ ہستی نہیں دی گئی۔ عباسی عہد میں متعدد فلسفی بھی پیدا ہوئے جنہوں نے علوم کی فہرست مرتب کی لیکن اس فہرست میں مجھے کوئی جگہ نہ دی۔ الکندی (ولادت تقریباً ۸۵۰ء) اور فارابی (وفات ۹۵۰ء) نے جو کتابیں اقسامِ علوم پر لکھیں ان میں میرا ذکر تک نہیں پایا جاتا۔ نہ بوعلی سینا نے مجھے علوم میں شمار کیا۔ مشہور اندلسی عالم عبدالبر (۹۷۸ء تا ۱۰۷۰ء) نے اپنی کتاب "جامع بیان العلم"

میں علم و فضل کو بڑا سراہا لیکن میرا ذکر نہیں کیا۔ (حوالہ نمبر ۲)

مسلمانوں کے عہد میں تاریخ کی پہلی صورت

جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں سب سے پہلے مسلمانوں کے زمانے میں میں "خبر" کی صورت میں نمودار ہوئی۔ چنانچہ اس ابتدائی عہد میں میرا نام "علم الاخبار" تھا۔ قبل از اسلام مجھ کو عرب "رجز" کہتے تھے۔ کیونکہ میں قبیلوں کی جنگ بیان کرتی تھی۔ اسلام کی آمد سے عربوں کی زبان میں اضافہ ہوا اور اب مجھے خبر کا نام دیا گیا لیکن یہ فرق صرف نام کا تھا کام کا نہ تھا کیونکہ خبر کی صورت میں بھی میں وہی کام کرتی رہی جو میں رجز کی صورت میں کیا کرتی تھی۔ یعنی کسی ایک خاص لڑائی یا کسی ایک واقعہ کو بیان کرنا۔ کبھی کبھی خبر کی جگہ "ذکر" یا "امر" یا "حدیث" کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔ ہر "خبر" کے متعلق علیحدہ مختصر رسالہ لکھا جاتا تھا۔ اور ہر خبر کے ساتھ اسناد بھی پیش کی جاتی تھیں ان خبریہ تاریخوں کی تین خصوصیات تھیں:۔

خبریہ تاریخ کی پہلی خصوصیت:۔

اگر ایک کتاب میں ایک سے زیادہ خبر ہوتی تھی تو ہر خبر بذاتِ خود مکمل ہوتی تھی اور دوسری خبر سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ اور نہ کسی اور خبر کا حوالہ ہوتا تھا اور نہ ان مختلف خبروں میں آپس میں اسباب و علل کا کوئی تعلق ہوتا تھا۔ بلحاظ مکاں و زماں بھی ان خبروں میں کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ اگر ایک خبر علاقہ یمن سے متعلق ہے تو دوسری خبر علاقہ حجاز سے متعلق ہوتی تھی۔ باعتبار زمانہ بھی ان خبروں میں فاصلہ ہوتا تھا۔ البتہ یہ لحاظ رکھا جاتا تھا کہ پہلے زمانے کی خبر

پہلے درج کی جائے۔ اور بعد کی خبر بعد کو۔ لیکن اکثر اوقات ان خبروں کے زمانوں میں کافی فاصلہ ہوتا تھا بعض اوقات اتنے طویل ہوتے تھے کہ ان کو کئی صفحوں میں لکھا جاتا تھا۔

خبریہ تاریخ کی دوسری خصوصیت :-

ہر خبر میں جان ڈالنے کی کوشش کی جاتی تھی اس لئے زیب داستاں کے لئے رنگینی پیدا کی جاتی تھی۔ بعض اوقات لڑائی سے متعلق خبروں کو مکالمے کی صورت میں پیش کیا جاتا۔ اور ہر سورما اپنی شجاعت خود بیان کرتا تھا۔ معرکوں کا حال بڑی تفصیل سے بیان کیا جاتا۔ لیکن اس حال میں واقعات کم اور زیب و زینت زیادہ ہوتی تھی۔ آگے چل کر تاریخ نگاری میں جو عبارت آرائی داخل ہوئی وہ ان خبریہ تاریخوں سے لی گئی۔ اسی عبارت آرائی نے تاریخ کو خاص و عام میں مقبول بنایا۔ جب عربوں میں تعلیم کا چرچا ہوا تو یہ خبریہ تاریخیں ادیبوں کے لئے نمونہ بن گئیں۔

خبریہ تاریخ کی تیسری خصوصیت :-

ان خبریہ تاریخوں میں اشعار بھی درج کئے جاتے تھے۔ ان اشعار کا واقعات سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ یہ اشعار اکثر اوقات مورخ کے کہے ہوئے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شاعری عام تھی۔ اور بعض اشعار بڑے معنی خیز ہوتے تھے۔ اور کبھی کبھی حسب موقع بھی ہوتے تھے۔ یہ دستور مسلمانوں کے ادب میں اب بھی قائم ہے۔ سعدی کی گلستان اشعار سے بھری پڑی ہے۔ اردو ادب میں بھی یہ دستور قائم ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اشعار چند لفظوں میں وہ مطالب ادا کر دیتے ہیں جن کو ادا کرنے کے لئے نثر میں کئی سطریں لکھنی پڑتی ہیں۔ اکثر اشعار انسانی

فطرت کا آئینہ ہوتے ہیں۔

لیکن یہ خبریہ تاریخیں بیشتر تلف ہو گئیں۔ کیونکہ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں پیشہ ور کاتبوں کی کمی تھی۔ دورِ بنی اُمیہ میں عبدالملک (۶۸۵ء تا ۷۰۵ء) کے زمانے سے پہلے سرکاری دفتروں میں عربی کا رواج نہ تھا۔ جب عبدالملک نے عربی رائج کی تب بھی عربوں میں ادیب نہ پیدا ہو سکے کیونکہ ہر عرب اس زمانے میں فتوحات پہ لگا ہوا تھا۔ فتوحات کی وجہ سے واقعات کی کمی نہ تھی لیکن کاتب کمیاب تھے اس لئے میرے واقعات کے لئے صرف ان فاتحین کے حافظے میں جگہ تھی۔ اس دور میں صرف چند لوگوں نے میرے واقعات کو قلمبند کیا۔ عبدالملک کے زمانے میں بانئ اسلام کی سوانحعمری بھی لکھی گئی۔ جس کا ذکر مؤرخ طبری نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ (حوالہ نمبر ۲)

جب عباسیوں کے ہاتھ حکومت آئی تو انہوں نے بنی امیہ کے زمانے کی کتابوں سے دانستہ غفلت برتی کیونکہ وہ بنی اُمیہ کے دشمن تھے۔ چنانچہ جو معدودے چند کتابیں دورِ بنی اُمیہ سے متعلق تھیں وہ تلف ہو گئیں۔ چنانچہ اب ان خبریہ تاریخوں کا صرف ذکر ملتا ہے۔ طبری نے اپنی تاریخ میں ان خبریہ تاریخوں سے استفادہ کیا لیکن اب بنی اُمیہ کے دور کی خبریہ تاریخیں مفقود ہیں۔

عباسیوں کے دور میں تاریخ نگاری زور شور سے شروع ہوئی۔ خبریہ تاریخیں کسی ایک مخصوص واقعہ یا معرکہ سے متعلق ہوتی تھیں۔ اس قسم کے واقعات کثرت سے دورِ عباسی میں پیدا ہوئے اس لئے اس دور میں بھی خبریہ قسم کی تاریخیں لکھی گئیں۔ جب تاریخ نگاری

عام ہو جاتی ہے تو مخصوص واقعات کے متعلق تاریخیں بھی درکار ہوتی ہیں۔ اس قسم کی تاریخ نگاری کو دورِ عباسیہ میں علی بن محمد مدائنی نے پروان چڑھایا جس کا زمانۂ زندگی ۷۵۳ء اور ۸۳۱ء کے درمیان تھا۔ اس نے کئی معرکوں پر کتابیں لکھیں اور کئی مشہور لوگوں کے تذکرے بھی لکھے۔ الندیم کی مشہور "فہرست" میں اس کی متعدد کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔

عباسیوں کے دور میں سوانح نگاری عروج پہ پہنچی لیکن اکثر یہ سوانح عمریاں مدحیہ ہوتی تھیں۔ جن میں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھلایا جاتا تھا۔ لیکن جب واقعات کثرت سے پیدا ہونے لگے تو ہر واقعہ پر علیحدہ کتاب لکھنا محال ہو گیا۔ اس لئے جب تاریخ نگاری نے زور پکڑا تو ضخیم تاریخیں لکھی جانے لگیں اور خبریہ قسم کی تاریخوں کی ضرورت باقی نہ رہی۔ یہ ضخیم تاریخیں روزنامچہ کی صورت میں ہوتی تھیں۔

تاریخ کی دُوسری صُورت روزنامچہ کی شکل میں

روزنامچہ نما تاریخوں کا رواج عباسیوں کے زمانے سے شروع ہوا۔ واقعات کو سال بہ سال تقسیم کیا جاتا تھا۔ ہر سال کے واقعات کو اس تمہید سے پیش کیا جاتا تھا "تو پھر فلاں سال آیا"۔ اور اس کے ذیل میں اس سال کے واقعات درج کئے جاتے تھے اگر کوئی ایک واقعہ دوسرے واقعہ کا سبب ہوتا تھا تو ان دو واقعوں کے درمیان لفظ "وفیہا" لکھ دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی واقعہ کئی سال تک چلتا رہتا تھا تو ایسے واقعہ کا مکمل بیان اس سال کے ضمن میں کر دیا جاتا تھا۔ جس سال میں اس واقعہ کا آغاز ہوا۔ روزنامچہ نما تاریخ کو "تاریخ علی السنین"

کہا جاتا تھا۔

روزنامچہ نما تاریخ کی ابتدا کب ہوئی۔ اس کا پتہ چلنا مشکل ہے۔ کیونکہ اس قسم کی بہت سی تاریخیں تلف ہو گئیں۔ صرف ان کا ذکر دوسری کتابوں میں ملتا ہے۔ ابن جوزی نے اپنی تاریخ میں ایک روزنامچہ نما تاریخ کا ذکر کیا ہے جو عمارہ بن دطیمہ نے نویں صدی عیسوی میں لکھی۔ الندیم کی "فہرست" میں اس قسم کی بے شمار تاریخوں کا ذکر ہے۔ ایک ماہر سائنس محمد بن موسیٰ خوارزمی نے بھی روزنامچہ نما تاریخ لکھی۔

عہدِ عباسی کا مشہور ترین مؤرخ طبری

اس قسم کی تاریخ جو مکمل صورت میں آج بھی دستیاب ہے وہ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری نے اوائل دسویں صدی میں لکھنی شروع کی اور ۹۱۵ء تک کے واقعات سن وار درج کیے۔ مغربی مؤرخین عرصے سے اس کوشش میں ہیں کہ مسلمانوں کی سن وار تاریخ نگاری کا ماخذ معلوم کریں۔ آیا یہ مسلمانوں کی ایجاد ہے یا اغیار کی تقلید ہے۔ اغلب خیال یہ ہے کہ اس معاملے میں مسلمان موجد ہیں مقلد نہیں۔ جب سے سن ہجری مسلمانوں میں رائج ہوا تھا تب ہی سے لوگ واقعات کو سن ہجری سے منسوب کرتے تھے۔ سن ہجری گویا ان کی اپنی رائج کردہ جنتری تھی۔ جس پر ان کو فخر تھا۔ ان کے خیال میں روز ہجری ایک ایسا نشان تھا جس سے وہ اپنی منزلیں گنا کرتے تھے۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ سن وار تاریخ مسلمانوں نے ایجاد کی۔ عربوں کے ہمسائے ایرانی روزنامچہ نما تاریخ سے قطعاً ناآشنا تھے۔ البتہ عربوں نے ایرانیوں کی خاندان وار تاریخ کی ضرور نقل کی کیونکہ ایرانیوں کا

دستور تھا کہ وہ ہر حکمران خاندان کی تاریخ علیحدہ علیحدہ لکھتے تھے۔
اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ عربوں نے سن وار تاریخ لکھنا ہرگز یونانیوں اور رومیوں سے نہیں سیکھا۔ مسلمانوں نے یونانیوں سے فلسفہ تو ضرور سیکھا لیکن ان کی تاریخوں سے ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ قدیم یونانی تاریخیں بتوں سے منسوب تھیں اور بازنطینی تاریخوں میں عیسائیت اور تثلیث کا ذکر تھا۔

مسلمانوں کی ان روزنامچہ نما تاریخوں میں صرف خالص واقعات ہوتے تھے۔ ایک مؤرخ اپنے زمانے تک کے واقعات لکھتا تھا۔ دوسرا مؤرخ اپنی تاریخ اس سال سے شروع کرتا تھا جہاں پہلے مؤرخ نے اپنی تاریخ کا اختتام کیا تھا۔ مؤرخ قفطی نے اپنی تاریخ سنہ ۱۲۱۹ء میں مکمل کی۔ چنانچہ اس نے اپنی اس تاریخ کے متعلق لکھا: (مدخوذ از ...)

"اگر تم مسلسل اور منظم صورت میں واقعات کے خواہاں ہو تو تم کو ابو جعفر طبری کی تاریخ پڑھنی چاہیئے جس نے ابتدائے عالم سے لے کر سنہ ۳۰۹ ہجری تک کے واقعات درج کیے۔ اگر تم چاہو تو طبری کے ساتھ احمد بن ابی طاہر اور اس کے فرزند عبیداللہ کی تاریخیں بھی پڑھ سکتے ہو کیونکہ ان دونوں نے خاندان عباسیہ کے مفصل حالات لکھے ہیں اور چند مزید تفصیلات بھی دی ہیں جو طبری کی تاریخ میں نہیں پائی جاتیں"۔

اس کے بعد قفطی ان دیگر تاریخوں کا حوالہ دیتا ہے جن میں یہ تسلسل قفطی کے اپنے زمانے تک پایا جاتا ہے۔ لہٰذا قفطی کے اس بیان سے ثابت ہے کہ طبری کے جانشین مؤرخوں نے بھی سن وار تاریخ لکھنے کا

دستور جاری رکھا۔ ہر جانشین مؤرخ اپنے زمانے کے واقعات بڑی تفصیل سے لکھتا تھا اور بعض مؤرخ تو سال کے ٹکڑے کر کے روزانہ یا ہفتہ وار کے حساب سے واقعات درج کرتے تھے۔

لیکن جو مؤرخ تفصیل کی خاطر اپنے بیان کو طول دیتا تھا اس کی مذمت کی جاتی تھی اور اس پر مجازفہ (مبالغہ) کا الزام لگایا جاتا تھا۔ کیونکہ مبالغہ کرنے والے مؤرخ اسناد اور ماخذ حذف کر دیتے تھے۔ ایسے مؤرخوں کے متعلق ایک شاعر نے لکھا :-

"تم لوگ دعویٰ کرتے ہو کہ مکمل تاریخیں موجود ہیں تم جیسے لوگوں کا شمار اونٹوں میں ہے جن کو پتہ نہیں ہوتا کہ ان پر کیا لدا ہوا ہے"۔

روزنامچہ نما تاریخ نگاری کے فوائد

باوجود ان تفصیلوں کے مسلمانوں کی تاریخ روزنامچہ کی صورت ہی میں رہی۔ اگرچہ اس قسم کی تاریخ بہت دلچسپ نہ ہوتی تھی لیکن اس میں ایک خوبی بھی تھی وہ یہ کہ تاویل بازوں کو تاویل کا موقع نہ ملتا تھا۔ جب سے تاویل بازی میرے صحیفوں میں داخل ہوئی تب سے میری صورت مسخ ہو گئی اور مورخوں کو اپنے عقائد اور تعصبات کو مجھ میں ٹھونسنے کا موقع مل گیا۔

اب آپ کے سامنے چند اقتباسات "تاریخ طبری" سے پیش کئے جاتے ہیں۔ بطور تمہید طبری لکھتا ہے :- (حوالہ نمبر ۵)

"اب ہم اس سال سے جو ہجرت کا پہلا سال ہے بقیہ واقعات بیان کرتے ہیں"۔

اس تمہید کے بعد طبری اس پہلے سن ہجری کے واقعات (اردو ترجمے کے) دس صفحوں میں لکھتا ہے۔

جب کسی سال کے تحت طبری کوئی واقعہ بیان کرتا ہے تو وہ اس واقعہ کی ابتدا بھی بیان کرتا ہے خواہ وہ ابتدا برسوں پہلے ہوئی ہو مثلاً "فتنۂ قرامطہ" کے تذکرہ کے سلسلے میں جو ۲۷۸ھ ہجری (مطابق ۸۹۱ء) میں نمودار ہوا۔ طبری قرامطہ تحریک کی ابتدا بھی بیان کرتا ہے حالانکہ اس فرقے کا ظہور ۸۶۸ء میں ہو چکا تھا۔ اس فتنۂ قرامطہ کا تذکرہ طبری اس طرح شروع کرتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۶)

"اسی سال (یعنی ۲۷۸ھ ہجری مطابق ۸۹۱ء) ایک قوم کی حرکت کی خبریں آئیں جو کوفہ کے دیہات میں القرامطہ کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کی ابتدا یہ ہوئی کہ ایک شخص خوزستان سے کوفے کے دیہات میں آیا...."

(یہ شخص بہ حالتِ بیماری ایک سُرخ آنکھوں والے کے گھر میں مقیم ہوا۔ اس شخص کو سُرخ آنکھوں کی وجہ سے لوگ کرمتیہ کہتے تھے اور یہ کرمتیہ باربرداری کا کام کرتا تھا۔ اور اس کے گھر میں بیل رہتے تھے۔)

"اس بیل والے شخص کے نام پر جس کے گھر میں وہ رہتا تھا اس کا نام کرمتیہ رکھ دیا۔ بعد کو اس لفظ میں تخفیف کر لی گئی۔ لوگ اس کو قرمط کہنے لگے۔ اس قصے کو ہمارے ایک ساتھی نے اس شخص سے نقل کیا جس نے اس سے بیان کیا تھا...."

اس ابتدا کو بیان کرنے کے بعد طبری "قرمطی شریعت" اور "قرمطی قرآن"

کے چند اقتباسات پیش کرتا ہے اور اس طرح فتنہ قرامطہ کے ذکر کو ایک مسلسل قصہ بنا دیتا ہے۔ یہ تسلسل پیدا کرنے کے بعد آگے چل کر واقعات ۲۹۰ھ ہجری (مطابق ۹۰۲ء) کے تحت طبری پھر قرامطیوں کے خروج کا ذکر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں طبری اُس خط وکتابت کی نقل بھی دیتا ہے جو ایک قرمطی اور ایک عامل کے درمیان ہوئی۔

اگرچہ طبری نے قرامطہ فرقے کا ذکر مختلف سالوں کے تحت ٹکڑے کر کے کیا ہے۔ لیکن اگر ان ٹکڑوں کو یکجا کر دیا جائے تو ایک مکمّل قصہ بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں جو واقعات طبری نے درج کئے ہیں ان میں تقریباً ہر واقعہ کا سبب بھی بیان کیا ہے۔ صرف ان واقعات کے بیان میں تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ جن کا سلسلہ ایک مدّت تک چلتا ہے۔

جو لوگ ناول کے شیدا ہیں وہ ان روزنامچہ نما تاریخوں کی مذمت کرتے ہیں کیونکہ اس قسم کی تاریخوں میں ناول نہیں ہوتی۔ ان کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ایسی تاریخیں چٹ پٹی نہیں ہوتیں کیونکہ ان میں شاعروں کی سی عبارت آرائی نہیں پائی جاتی۔ یہ دونوں اعتراض بالکل بے معنیٰ اور لغو ہیں۔ ایسے معترض میرا مقصد ہی نہیں جانتے۔ میرا کام صرف واقعات پیش کرنا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان واقعات میں اسباب وعلل کا رشتہ قائم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ رشتہ قائم کرنا خالی از علّت نہیں اگر ایک واقعہ پہلے ہوا ہے اور دوسرا بعد کو تو ضروری نہیں کہ پہلا واقعہ دوسرے واقعہ کا سبب ہو اس معاملے میں بڑے بڑے عاقلوں نے دھوکا کھایا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو واقعہ آج پیش آرہا ہے اس کا سبب کوئی ایسا واقعہ ہو جو پچاس سال پیشتر گذر چکا ہے۔

اب رہا عبارت آرائی کا سوال۔ ایرانی مؤرخوں نے زیب داستان میں کمال پیدا کیا۔ لیکن اس کمال سے حقیقت غائب ہو گئی۔ عطا ملک جوینی کی مشہور تاریخ موسومہ "تاریخ جہان کشا" اس کا ثبوت ہے جس میں صفحے کے صفحے زیب داستاں اور لفاظی سے رنگے ہوئے ہیں۔ اگر اس لفاظی کو دُور کر کے دیکھئے تو اصل واقعات صرف معدودے چند رہ جاتے ہیں اسی طرح گبن کی مشہور تاریخ "زوال دولت رومتہ الکبریٰ" ادبی لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے۔ لیکن گبن نے واقعات کو قربان کر کے اور تاویل بازی سے اپنی اس کتاب کو دلچسپ بنایا ہے۔ گبن مذہب عیسوی کا سخت دشمن تھا۔ چنانچہ اس نے زوال رومتہ الکبریٰ کا باعث عیسائی مذہب کو ٹھہرایا۔

اسی لئے میں عبارت آرائی اور تاویل بازی سے سخت متنفر ہوں اور میں اپنے محرّروں کو ان خطرات سے برابر آگاہ کرتی رہی لیکن آخرکار یہ دونوں بلائیں میرے صحیفوں میں داخل ہو کر رہیں۔ اسی لئے میں طبری جیسے مؤرخ کی مدّاح ہوں جس نے حقیقت نگاری کی خاطر لفاظی اور تاویل سے گریز کیا اور اپنے متاخرین کے لئے حقیقت نگاری کا نمونہ قائم کر گیا۔ طبری کی ایک اور خصوصیت قابل ستائش ہے۔ ہر واقعہ کے ساتھ وہ حوالے اور اسناد پیش کرتا ہے۔ بانئ اسلام کے حالات ابن ابن اسحٰق کی "سیرت رسول اللہ" سے لئے۔ اگر کسی واقعہ کو مختلف مورخوں نے مختلف شکلوں میں بیان کیا ہے تو وہ یہ سب شکلیں پیش کر دیتا ہے اور فیصلہ اپنے ناظرین پہ چھوڑ دیتا ہے۔ اس کا مقولہ تھا کہ "جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ ہم دوسروں تک پہنچاتے ہیں"۔

مُسلم تاریخ نگاری کی تیسری صورت

روزنامچہ نما تاریخوں کے بعد مسلمانوں میں تاریخ نگاری نے ایک اور صورت اختیار کی۔ یعنی سوانح نگاری کا رواج شروع ہوا اور ساتھ ہی ہر حکمران خاندان کی علیحدہ علیحدہ تاریخیں لکھی جانے لگیں۔ سوانح نگاری کا رواج واقدی (۷۴۷ء تا ۸۲۳ء) کا کاتب محمد ابن سعد (متوفی ۸۴۵ء) قائم کر گیا تھا۔ اس نے "طبقات کبیر" کے نام سے آٹھ جلدوں میں حضرت آدمؑ سے لے کر اصحاب رسول اللہؐ تک کی سوانح عمریاں لکھیں جن کا ترجمہ اردو میں بھی موجود ہے۔ (حوالہ نمبر)

ابن سعد نے اسناد اور حوالے دینے کا رواج بھی قائم کیا اور یہ رواج روزنامچہ نما تاریخوں میں بھی قائم رہا۔ آثار پیغمبری کے ضمن میں جو روایت ابن سعد نے بیان کی ہے وہ عبداللہ بن محمد بن عقیل کے حوالے سے ہے۔ اس روایت میں حضرت ابو طالب کے سفرِ شام کا ذکر ہے جس میں آنحضرتؐ بھی شریک تھے۔ راستے میں ابو طالب ایک عیسائی راہب کے ہاں ٹھہرے۔ اس راہب نے آنحضرتؐ کا چہرہ دیکھ کر کہا:۔

(حوالہ نمبر ۸)

"..... اس کا منہ پیغمبر کا منہ ہے۔ اس کی آنکھ پیغمبر کی آنکھ ہے۔"

سوانح عمری سے متعلق واقعات روزنامچہ نما تاریخوں میں بھی درج کیے جاتے تھے۔ جس سال کوئی خلیفہ حکومت حاصل کرتا تھا اس سال کے تحت اس نئے خلیفہ کی زندگی کا تذکرہ بھی لکھا جاتا تھا۔ جب تک مسلمانوں کی مرکزی حکومت باقی رہی تب تک سوانح عمریوں کا پایا

حکمرانوں کی خاندان وار تاریخوں کا رواج قائم نہ ہوا اور نہ اُس کی ضرورت تھی۔ لیکن جب خاندان عباسیہ برباد ہوا تو چاروں طرف طوائف الملوکی نمودار ہوئی تو سوانح عمریوں اور خاندان وار تاریخ نگاری نے زور پکڑا۔ اس زمانے کی تاریخیں سن وار نہیں بلکہ حکمران وار ہوتی تھیں یعقوبی نے ۸۹۱ء میں جو تاریخ لکھی اس میں ہر حکمران کی گدی نشینی کے وقت سعد و نحس کا بھی ذکر ہے۔ اسی طرح البلاذری (متوفی ۸۹۲ء) کی تاریخ موسومہ "انساب الاشراف" میں بھی امرا کی سوانح عمریاں ہیں۔ حکمران وار تاریخ نگاری کے معاملے میں مسلمان مورخوں نے ایرانیوں کی تقلید کی۔

مسلمان مورخ حکمران خاندانوں کے لئے لفظ "دولت" استعمال کرتے تھے۔ اس لفظ کے لغوی معنی "گشت لگانا" یا "باری" کے ہیں چونکہ ایک خاندان کے بعد دوسرے خاندان کی باری آتی تھی اس لئے یہ حکمران خاندان دولت کہلاتے تھے۔ حکمران وار تاریخ نگاری کے سلسلے میں مسلمان مورخین نے ایک ایجاد کی جو "طبقات" کے نام سے رائج ہوئی لفظ "طبقہ" کے لغوی معنی "تہ" یعنی لپیٹنا ہیں۔ بعض لغت میں ایک طبقہ کا طول بیس سال ہے۔ بعض میں چالیس۔ اس لئے لفظ طبقہ کے معنی ایک پیڑھی کے بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ محدثین نے بھی احادیث کی اسناد کو تین طبقوں میں منقسم کیا۔ اول اصحاب رسولؐ دوئم تابعین سوئم تبع تابعین۔

مسلم تاریخ نگاری کی ان تین صورتوں میں جس کو بقا حاصل ہوئی وہ روزنامچہ نما صورت تھی۔ جس کو طبری نے پروان چڑھایا۔ ہندوستان کے مسلم مورخوں نے بھی یہی روزنامچہ والا طریقہ اختیار کیا۔

مسلم تاریخ نگاری کا موضوع اور مقصد!

ہر علم کا موضوع اور اس کے حدود اس علم کے مقصد کے مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً علم الابدان کا موضوع انسان کا جسم ہے۔ لیکن انسان کا جسم دیگر حیوانوں سے بھی ملتا جلتا ہے۔ اس لئے علم الابدان میں جانوروں کی چیر پھاڑ بھی بطور ضمیمہ داخل ہے مسلمانوں کی نظر میں تاریخ نگاری کا موضوع اور اس کے حدود کیا تھے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے آپ کو یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں کے دماغ میں تاریخ کا مفہوم کیا تھا۔

ہمارے زمانے میں تاریخ کے مفہوم کے سلسلے میں بے شمار کتابیں پائی جاتی ہیں لیکن یہ سب کتابیں دورِ جدید میں لکھی گئیں۔ اس سے پہلے مغرب میں فنِ تاریخ نگاری پر کسی نے مخصوص کتاب نہیں لکھی۔ اس لئے میں مسلمان تاریخ نگاروں کی از حد ممنون ہوں کہ انہوں نے صرف میرے صحیفے ہی نہیں لکھے بلکہ میری اپنی ذات پر بھی متعدد کتابیں لکھیں جن میں میرے مقاصدِ حیات معین کئے۔ مسلمانوں کی تاریخ نگاری کا موضوع بیان کرنے سے پہلے میں ان مقاصد کا ذکر کرتی ہوں جو انہوں نے میرے لئے معین کئے۔ ان مقاصد معین کرنے والوں میں ابن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) سب کا بادشاہ ہے۔ لیکن اس بادشاہ سے چھ سو سال پیشتر ہی میرے مقاصد پر رائے زنی شروع ہو گئی تھی۔ ذیل میں چیدہ رائیں درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) امام شافعی بانیٔ مذہب شافعی (۷۶۷ء تا ۸۲۰ء)۔

"علم تاریخ ذہنِ انسانی کو جلا دیتا ہے"

(۲) یعقوبی جس نے نویں صدی عیسوی کے آخر میں وفات پائی۔ اپنی تاریخ کا نام رکھنے میں اپنے تمام ہم عصروں پر سبقت لے گیا۔ اس کی تاریخ کا نام تھا:-

"مشاقت الناس لزماہنم"

یعنی انسان نے اپنے آپ کو زمانے کے سانچے میں کس طرح ڈھالا؟ تاریخ دراصل یہی بتاتی ہے کہ زمانہ کس طرح بدلتا رہا اور انسان کس طرح زمانے کے ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کرتا رہا۔ جو لوگ تقاضائے زمانہ کے مطابق اپنے آپ کو نہ بدل سکے ان کو زمانے نے مٹا دیا۔

(۳) ابو بکر شبلی (متوفی ۹۴۶ء) کا قول تھا: "عام لوگ کہانی سن کر اپنا دل بہلاتے ہیں۔ اس کے برعکس خواص ان کہانیوں سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔"

(۴) ابوالحسن علی المسعودی (متوفی ۹۵۶ء) نے اپنی مشہور تاریخ "تنبیہہ الاشراف" اور "مروج الذہب" تیس جلدوں میں لکھی۔ اپنی اس کتاب کے دیباچہ میں اس نے لکھا:- (حوالہ نمبر ۹)

"تاریخ علم کی وہ شاخ ہے جس سے فضلاء اور جہلاء دونوں حظ حاصل کرتے ہیں اور نادان اور ذہین دونوں اس کے شیدا ہیں۔ تاریخ کے ذریعہ ہمیں ہر کارآمد چیز کا علم حاصل ہوتا ہے۔ ہر عجوبہ چیز کو تاریخ بیان کرتی ہے شرافت اور نیک سیرت کا سبق ہمیں اس سے ملتا ہے۔ بادشاہوں اور دیگر لوگوں کی تعلیم سیاست اس پر مبنی ہوتی ہے۔ تاریخ ہر بات کا اول و آخر بتاتی ہے۔"

(۵) ابو الفرج اصفہانی (متوفی ۹۶۷ء) نے میرے موضوع اور مقصد کو ایسا وسیع کر دیا کہ میں انسانی تہذیب اور ثقافت کا آئینہ بن گئی اس نے اپنی "کتاب الاغانی" کے دیباچہ میں لکھا:۔ (حوالہ نمبر۱)

"اس کتاب کا پڑھنے والا جب اس کتاب کے تصورات پر غور کرے گا تو اس کو ہر جملہ دوسرے سے زیادہ سبق آموز نظر آئے گا۔ اس کتاب میں اُس کو مزاحیہ کے ساتھ غور طلب باتیں اور واقعات نظر آئیں گے۔ حالاتِ زندگی مشہور معرکوں پر اشعار.... قبل از اسلام بادشاہوں کا اور خلفائے اسلام کے تذکرے بھی اس کتاب میں ہیں"۔

(۶) ابن جوزی (۱۲۹۲ء تا ۱۳۵۰ء) کے نزدیک "تاریخ اور سوانح حیات دل و دماغ کے لئے مفرح اور روحانی غذا ہیں"۔

میرے ان مسلمان محرّروں نے صرف اس ثنا و صفت پر ہی قناعت نہ کی۔ بلکہ میرے فن پر مخصوص کتابیں بھی لکھیں ان کتابوں کے مصنّفین میں بھی ابنِ خلدون بادشاہ ہے لیکن چونکہ میں نے ایک علیحدہ باب اپنے اس خلف الرشید کے لئے مخصوص کیا ہے اس لئے میں اس باب میں صرف دو چیدہ مصنفوں کے بیان کردہ مقاصد تاریخ پیش کرتی ہوں جن کے نام یہ ہیں:۔

(۱) کفیجی (۱۳۸۷ء تا ۱۴۷۴ء) نسلاً ترک تھا اور اناطولیہ کا باشندہ تھا۔ اس نے فتح قسطنطنیہ کا تماشہ دیکھا تھا۔ اس نے "المختصر فی علم التواریخ" لکھی۔

(۲) سخاوی (۱۴۲۷ء تا ۱۴۹۷ء) مشہور فاضل وقت ابن حجر کا شاگرد تھا اور ابن حجر ابن خلدون کا۔

یہاں ان دونوں کے بیان کردہ میرے مقاصد اور میرے فوائد پہلو بہ پہلو پیش نظر ہیں۔

تعریف تاریخ

سخاوی	کیفنجی
القصہ لفظ تاریخ کے معنی ایک شاخ علم کے ہیں جس کا تعلق واقعات کے زمانے معلوم کرنے سے ہے تاکہ ان واقعات کی اصلیت اور زمانے کا تعین کیا جا سکے۔ درحقیقت اس علم کا تعلق ہر شے سے ہے جو دُنیا میں ہوتی رہا ہے۔	تاریخ نگاری علم کی ایک شاخ ہے۔ جو زمانے کے حصّوں کے متعلق تحقیقات کرتی ہے کہ ہر حصّے میں کیا حالات تھے۔ اور ان حالات کے ذریعہ پتہ چلاتی ہے کہ کون سا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا۔

مقصد اور موضوع تاریخ

سخاوی	کیفنجی
تاریخ انسان اور زمانے پر حاوی ہے جن مسائل سے تاریخ کا تعلّق ہے وہ انسان اور زمانے سے متعلق ہیں کہ کس طرح زمانہ حوادث	اس کا مقصد ہے کہ ہر دلچسپ واقعہ کے حالات معلوم کرے یعنی ایسے واقعات جن سے نیک عمل کی توفیق پیدا ہو اور بد اعمالی سے تنبیہ ہو

کفنیجی

تاکہ نیک عمل کی قوت پیدا ہو اور بداعمالی میں رکاوٹ پیدا ہو اور انسان نصیحت حاصل کرے کہ یہ نصائح دل میں اس طرح حاصل کرے کہ یہ نصائح دل میں جاگزین ہو جائیں۔

سخاوی

سے متاثر ہوتا ہے اور انسان بھی ان حوادث کا شکار ہوتا ہے۔

فوائد تاریخ

کفنیجی

ہر شخص کو عالم اجسام سے عالم ارواح میں جانا ہے۔ لیکن اس کے دُنیاوی اعمال کے نشان باقی رہتے ہیں اور اس کی یادگار تاریخ اور قصّوں میں باقی رہ جاتی ہے اس کے علاوہ تاریخ کے نیک سخی۔ باایمان اور شجاع لوگوں کے متعلق معلومات بڑی کارآمد ہوتی ہیں۔ جب اعلیٰ دماغ کے لوگ ان قصوں کو پڑھتے ہیں تو ان کی طبیعت ان سے متاثر ہوتی ہے اور وہ بھی ان نیک اعمال لوگوں کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سخاوی

تاریخ کے ذریعہ جعلی دستاویزات کا جعل کھُل جاتا ہے۔

اگر تاریخ کے ذریعہ یہ معلوم ہو جائے کہ زمانے کو کبھی قرار نہیں اور صرف اس بے قراری کو قرار ہے تو صرف یہ علم بذاتِ خود تاریخ کے فوائد کا زندہ ثبوت ہے۔

مؤرّخ بننے کے شرائط

کیفنجی

مورخ کو بھی وہی شرائط پوری کرنی پڑتی ہیں جو محدثین کے لئے لازم ہیں۔ یعنی مورخ کے لئے بھی ذہین۔ حق پسند اور صاحبِ ایمان ہونا لازم ہے۔

سخاوی

مورخ کو دیگر علوم سے بھی واقف ہونا چاہیئے .... دوسری شرط یہ ہے کہ مورخ میں ورع یعنی پرہیز گاری اور پارسائی ہو اور خوفِ خدا ہو...... ورنہ خطرہ ہے کہ وہ قیاس کا شکار ہوگا جس کے متعلق حدیثِ نبوی ہے کہ " قیاس آرائی سے خبردار رہو کیونکہ قیاس سب سے بڑا جھوٹ ہے "

وسعتِ تاریخ مسلمانوں کے عہد میں

سب سے پہلے مسلمان مؤرخوں نے ہی میرے حدود کی توسیع کی اور میرے محیط میں انسان سے متعلق ہر چیز کو شامل کر دیا۔ مسلمانوں سے پہلے میں

صرف بادشاہوں کے کارنامے اور فتوحات بیان کرتی تھی اور عوام کو بیں نظرانداز کرتی تھی لیکن مسلمان مورخوں کا نظریہ یہ تھا کہ مجھے انسانی زندگی کا مکمل نقشہ پیش کرنا چاہیئے اور فطرتِ انسانی کا ہر پہلو دکھانا چاہیئے۔

آج کل بھی میرے متعلق یہی نظریہ ہے۔ لیکن اس دورِ جدید کے مورخوں نے یہ وسیع نظریہ مسلمان مؤرخوں سے حاصل کیا۔ مسلمان مورخوں کے احسانات کو آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب آپ کو دورِ جدید کا نظریہ معلوم ہو۔ اس لئے مسلمانوں کا قائم کردہ وسیع نظریہ تاریخ بتانے سے پہلے میں دورِ جدید کا نظریہ پیش کرتی ہوں تاکہ آپ ان دونوں نظریوں کا موازنہ کر سکیں۔

دورِ جدید کا نظریۂ تاریخ

میرے نظریوں میں تبدیلی لابدی ہے کیونکہ ہر زمانے کا اپنا مذاق ہوتا ہے اگرچہ مؤرخ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ میرے صحیفے آئندہ نسلوں کے لئے لکھ رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر مؤرخ اپنی تاریخ اپنے ہم عصروں کے لئے لکھتا ہے۔ یورپ میں جب قوم پرستی کا زور تھا تو ہر تاریخ میں قومیت ہی نظر آتی تھی۔ اب رسل و رسائل کی ترقی سے ملکوں کے درمیان فاصلے معدوم ہو گئے ہیں۔ اور پوری دُنیا مثل ایک مُلک کے نظر آتی ہے اس لئے آج کل تاریخ کا موضوع بجائے قوم کے انسان ہے اب بجائے ملک وار تاریخوں کے تاریخِ عالم کا فیشن ہے۔ تاریخ عالم کے موجد بھی مسلمان تھے۔ تقریباً ہر مُسلمان مؤرخ نے تاریخِ عالم لکھی۔ ان بیں بعض تاریخِ عالم آج بھی دستیاب ہیں جن کی فہرست آگے چل کر

پیش کی جائے گی۔ یہاں فی الحال مغربی رائج الوقت نظریہ تاریخ پیش کیا جاتا ہے۔

انگریز جیسی قدامت پسند قوم نے بھی اپنی ضخیم "کیمبرج ماڈرن ہسٹری" کو منسوخ کر کے "نئی کیمبرج ماڈرن ہسٹری" لکھنی شروع کر دی کیونکہ پچھلی کیمبرج ماڈرن ہسٹری صرف سیاسی اُمور سے متعلق تھی اور تمدن کا ذکر برائے نام تھا۔ اس نئی کیمبرج ہسٹری میں عامیانہ خیالات اور عامیانہ زندگی پر زور ہے۔ تاریخ کی آئندہ وسعت کا اندازہ بیوری کی دُوربین نظر نے پہلے سے کر لیا تھا۔ پروفیسر بیوری نے اس صدی کے شروع ہی میں لکھا کہ :- (حوالہ نمبر ۹)

"مطالعہ تاریخ میں جو نئی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں سے ایک اہم تبدیلی یہ ہے کہ اب تاریخ کے حدود بڑے وسیع ہو گئے ہیں .... پہلے تاریخ صرف سیاسی اُمور پر مشتمل سمجھی جاتی تھی .... لیکن اب تاریخ کی تعریف اور حدود میں ہر وہ مواد شامل ہے جس کا تعلق انسان کی مادی یا روحانی ترقی سے ہے .... گویا اس طرح انسان کا پورا سماج بھی احاطۂ تاریخ میں آجاتا ہے"۔

مغربی مؤرخوں نے تو میرے حدود کی توسیع اس صدی کے شروع میں کی لیکن جیسا کہ آپ اُوپر دیکھ چکے ہیں۔ کفیجی اور سخاوی جیسے لوگ پندرھویں صدی عیسوی ہی میں میرے حدود کی توسیع کر چکے تھے اور تاریخ کے حدود اور فوائد پر علیحدہ کتابیں بھی لکھ چکے تھے۔ مسلمان مؤرخوں نے میرے اس توسیع حدود پر صرف لبیک ہی نہ کہا بلکہ اسی وسعت کے مطابق انہوں نے اپنی تاریخیں بھی لکھیں جن کو مندرجہ ذیل زمروں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) تاریخ عالم جس کی ابتدا تخلیق آدم سے ہوتی تھی اور تمام انبیاء اور ان کی اُمتوں کا حال ہوتا تھا۔ بیشتر تاریخ عالم اسی نہج پر لکھی گئیں۔
(۲) عمومی تاریخیں جن میں سے بعض میں کسی خاص عہد پر زور ہوتا تھا۔
(۳) مقامی تاریخیں مثلاً تاریخ دمشق۔ تاریخ بغداد وغیرہ وغیرہ۔
(۴) مؤرخ کے اپنے زمانے کی تاریخ جس کی بہترین مثال "تاریخ بیہقی ہے"۔
(۵) سوانح حیات اور خود نوشتہ سرگذشت۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں عصامہ ابن منقذ (۱۰۹۵ء تا ۱۱۸۸ء) نے اپنی سرگذست لکھی۔ اسی طرح تیمور لنگ (۱۳۳۶ء تا ۱۴۰۵ء) اور بابر (۱۴۸۳ء تا ۱۵۳۰ء) نے "تزک تیموری" اور "بابر نامہ" کے نام سے اپنی سرگذشت لکھوائیں۔
(۶) اولیاء کے سوانح حیات۔ فریدالدین عطار (۱۱۱۹ء تا ۱۲۲۹ء) کا "تذکرۃ الاولیا" اس کا بہترین نمونہ ہے۔
(۷) شعرا کے متعلق تذکرے۔ دولت شاہ سمرقندی (ولادت ۱۴۳۷ء) کا "تذکرۃ الشعرا" آج بھی دستیاب ہے۔
(۸) تاریخی افسانے۔ "فتوح الشام" اور "فتوح المصر" دراصل ناول ہیں۔ تاریخ نہیں۔
(۹) تاریخ مذاہب۔ اس قسم کی تاریخوں میں جملہ مذاہب کا تقابلی مطالعہ بھی ہوتا ہے۔ ابن حزم (۹۹۴ء تا ۱۰۶۴ء) کی کتاب "الملل والنحل" آج تک زندہ ہے۔

ان میں سے بعض تاریخیں تو لاثانی ہیں۔ مثلاً ابن حزم کی تصنیف دُنیا کی پہلی کتاب ہے جس میں مختلف مذاہب کا موازنہ کیا گیا ہے۔ ابن حزم نے جو اقتباسات انجیل سے لئے ہیں وہ من وعن صحیح ہیں

مندرجہ بالا اقسام تاریخ میں سے چند کا ذکر آگے کیا جائے گا لیکن اس ذکر سے پہلے ضروری ہے کہ آپ اس وسعت سے شناسا ہو جائیں جو مسلمان مؤرخوں نے اس علم تاریخ کو دی۔ اس وسعت سے انسان کا مکمل تمدن میرے حدود میں آگیا۔

مُسلمان مؤرخوں کی تاریخوں میں اپنے زمانے کے تمدن کی تصویر

مسلمان مورخوں نے میرے حدود کی کس طرح توسیع کی اس کا اندازہ سخاوی کی تاریخ "الاعلان بالتوبیخ" سے ہو سکتا ہے جس میں اس نے ایک مؤرخ الذہبی نامی کا ذکر کیا ہے جس نے اپنی تاریخ میں مندرجہ ذیل لوگوں کے حالات لکھے:-

(۱) رسول اللہؐ اور ان کی سیرت۔
(۲) قصص الانبیاء یعنی حضرت آدمؑ سے لیکر نبی آخر الزماںؐ تک۔
(۳) اصحاب رسولؐ اللہ۔
(۴) خلفائے راشدین۔ خلفائے بنی اُمیہ۔ خلفائے عباسیہ حکمرانان خاندان مروان اُندلسی۔ حکمرانان عبیدیہ المغرب و مصر۔
(۵) بادشاہانِ ایران و بازنطین۔ حکمرانان خاندان بویہ و سلجوق وغیرہ۔
(۶) وزرا حضرت ہارون سے لے کر حضرت عمرؓ تک۔
(۷) اُمرا۔ عاملین صوبجات۔ رئیس الکتاب۔
(۸) فُقہا۔ بانیان مذاہب اسلامیہ۔ ماہرین قانون وراثت وغیرہ۔
(۹) قاریانِ قرآن جو ساتوں قرأت کے ماہر تھے۔
(۱۰) ماہرینِ حدیث جو احادیث ازبر کر لیتے تھے اور حفاظ

(۱۱) مؤرخین جو تاریخ نگاری کرتے تھے۔

(۱۲) ماہرینِ صرف و نحو۔ ادیب۔ ماہرینِ سجع وغیرہ

(۱۳) اولیاء۔ تارکینِ دُنیا۔ صوفیا وغیرہ۔

(۱۴) قضاۃ۔ عاملین۔ شاہدینِ عدالت وغیرہ۔

(۱۵) مدرسین۔ کتب فروش۔ کاتب۔ قصہ گو۔

(۱۶) واعظین۔ مصائب۔ ماہرین موسیقی۔

(۱۷) ذہین۔ حاضر جواب۔ اہلِ حکمت لوگ۔

(۱۸) اطبا۔ فلسفیان۔ ملحدین۔ ماہرینِ اقلیدس وغیرہ

(۱۹) متکلمین۔ جہمیہ۔ معتزلہ۔ عشری عقیدے والے۔ کرّمیہ اور وہ جو خدا کو انسان سمجھتے ہیں۔

(۲۰) شیعوں کے مختلف فرقے بمعہ غلاۃ و روافض

(۲۱) خوارج۔ دُشمنانِ علیؓ۔ اہلِ بدعت۔

(۲۲) راسخ الاعتقاد علمائے دین۔ محدثین وغیرہ

(۲۳) اہلِ بُخل۔ پرستارانِ شکم۔ عیّار۔

(۲۴) نابینا۔ اپاہج۔ گونگے۔ بہرے وغیرہ۔

(۲۵) منجّم۔ کیمیاگر۔ دفینوں کے متلاشی۔

(۲۶) بدّو۔ ماہرینِ انساب۔ اخباری۔

(۲۷) اہلِ ہمّت۔ بہادر۔ ایلچی

(۲۸) تجّار۔ ماہرینِ بحر۔

(۲۹) مشہور کاریگر۔ اہلِ حرفہ۔ موجدین۔

(۳۰) گوشہ نشین۔ شعبدہ باز صوفی۔

(۳۱) امام مسجد۔ موذن اور معبّر۔

(۳۲) رہزن۔ فدادیہ۔ شطرنج کے ماہرین۔

(۳۳) معشوق۔ عاشق۔ بازارو عورتیں۔ نائکا۔ زنخے۔

(۳۴) بھکاری۔ دھوکے باز۔ اغلامی۔ اہلِ دولت۔

(۳۵) مجذوب۔ پاگل۔ گنڈے۔

(۳۶) شہدائے قرآن۔ اہلِ سماع۔

(۳۷) زمانۂ جاہلیہ کے فال گو۔

(۳۸) پیشہ ور قاتل۔

(۳۹) نیزے باز۔

(۴۰) پیشہ ور دھوکے باز۔

ذہبی آخر میں لکھتا ہے "ایسی تاریخ جس میں ان چالیس قسموں کے لوگوں کا تذکرہ ہو وہ بڑی طویل ہوگی اور بارشتر کی طرح ہوگی۔ لیکن علیحدہ علیحدہ ان لوگوں پر بڑے قابل لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں ....."

مُسلمان مؤرخوں کی چند غیر معمولی عمومی تاریخیں

اگر تلف شُدہ تاریخوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو مُسلمان مؤرخوں کی تاریخوں کا شمار کرنا ناممکن ہے۔ ابن خلکان کی "وفیات الاعیان" اور الندیم کی "فہرست" ہیں ان میں سے صرف چند کا ذکر ہے۔ اگر ان تاریخوں کی مکمل فہرست تیار کی جائے تو وہ فہرست بذاتِ خود ایک کتاب بن جائے۔ تاریخِ عالم اور عمومی تاریخوں میں سے صرف چھ کا ذکر بطورِ نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) طبری کی "تاریخ الرسل والملوک" حضرت آدم سے شروع ہوتی ہے

اور ۹۱۵ء کے حالات پر ختم ہوتی ہے۔ اس کی دو بڑی خصوصیات ہیں۔
(۱) طبری احادیث کی طرح اپنے نوشتہ واقعات کے بھی اسناد پیش کرتا ہے۔ دوئم۔ اگر کسی واقعہ کو قدیم مؤرخوں نے متضاد صورتوں میں بیان کیا ہے تو طبری دونوں صورتیں پیش کرتا ہے۔ اس غیر جانب داری کا یہ نتیجہ ہوا کہ شیعہ اس کو سخت متعصب سُنّی کہتے تھے اور سُنّی اس کو رافضی سمجھتے تھے۔ جب وہ مرا تو اس کا جنازہ نہ نکالا جا سکا اور اس کی لاش کو اپنے حجرے ہی میں دفن کر دیا۔ تاریخ طبری کا مفصّل تذکرہ ایک مخصوص باب موسومہ "میرے چند مشہور صحیفے" کے تحت کیا گیا ہے جو آگے آئے گا۔

(۲) المسعودی (متوفی ۹۵۶ء) کی "تنبیہ الاشراف" اور "مروج الذہب" تیس جلدوں میں تھی لیکن اب صرف اس کا خلاصہ دو جلدوں میں دستیاب ہے۔ المسعودی سیّاح بھی تھا اور ہندوستان۔ لنکا۔ آرمینیا۔ زنجبار اور چین تک کا سفر کر چکا تھا۔ چنانچہ اس کی تاریخ معلومات کا خزانہ ہے۔ جس کو قاموس کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اپنے زمانے کے تمدّن کا مکمل نقشہ پیش کیا ہے۔

(۳) ابن مسکویہ (متوفی ۱۰۳۰ء) کی تاریخ "تجارب الامم" میں ۹۸۰ء تک کے واقعات درج ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ اس مصنّف کا مقصدِ تصنیف یہ تھا کہ زمانۂ ماضی کی قوموں کی بربادی کے اسباب بتائے جائیں تاکہ ہم عصر لوگ عبرت حاصل کر سکیں۔ اس نے اپنی اس تاریخ میں انبیاء کے معجزوں کا ذکر دانستہ حذف کیا۔ اور اس بنا پر کیا کہ "ہمارے زمانے کے لوگوں کو جن مسائل کا آئندہ سامنا

کرنا ہے ان مسائل کے حل کے لئے صرف ایسے تجربوں کی ضرورت ہے جو فطرت کے مطابق ہوں۔ اور جن میں کشف و کرامت کا شائبہ نہ ہو۔"

(۴) ابن الاثیر (سنہ ۱۱۶۰ئہ تا سنہ ۱۲۳۴ء) کی "کتاب الکامل فی التاریخ" جس میں سنہ ۱۲۳۱ء تک کے حالات درج ہیں۔ یہ تاریخ بھی حضرت آدمؑ سے شروع ہوتی ہے۔ گو ابن الاثیر نے طبری سے استفادہ کیا لیکن اس میں صلیبی جنگوں کا بھی ذکر ہے۔ اس قسم کا ذکر دیگر تاریخوں میں نہیں ملتا۔

(۵) یعقوبی (متوفی اواخر نویں صدی عیسوی) کی "تاریخ" بھی حضرت آدم سے شروع ہوتی ہے لیکن اس تاریخ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جغرافیائی معلومات بھی ہیں کیونکہ یہ مؤرخ جغرافیہ کا بھی ماہر تھا۔ مذہباً یہ شیعہ تھا۔ چنانچہ اس کی تاریخ میں حضرت علیؓ کے صحیح اقوال پائے جاتے ہیں۔

(۶) البلاذری (متوفی سنہ ۸۹۲ء) کی "فتوح البلدان" جو عباسی خلیفہ المتوکل باللہ (سنہ ۸۴۷ء تا سنہ ۸۶۱ء) کے عہد میں لکھی گئی۔ یہ تاریخ خلیفۂ وقت کی قصیدہ گوئی سے پاک ہے۔ اس کا مفصل تذکرہ ایک علیحدہ باب بعنوان "میرے چند مشہور صحیفے" کے تحت کیا گیا ہے۔

چند مقامی تاریخیں جو مکمل نقشۂ تمدن مقامی تاریخوں میں ملتا ہے وہ عمومی تاریخوں میں نہیں پایا جاتا۔ یہ تاریخیں تمدنی معلومات کا خزانہ ہیں۔ اس قسم کی تاریخوں میں مقامی اہلِ قلم۔ مفکرینِ وقت۔ علمائے دین۔ ادبا اور عمالِ حکومت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مقامی مدارس کا ذکر تو خاص طور سے کیا جاتا ہے۔ عالمِ اسلام کے جملہ مشہور شہروں کے متعلق اس قسم کی مقامی تاریخیں لکھی گئیں۔ مثلاً بغداد

بخارا۔ قرطبہ۔ دمشق۔ موصل۔ حلب۔ بیروت۔ ہمدان۔ اصفہان۔ کوفہ۔ مکّہ۔ مدینہ۔ بلخ۔ مرو وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے صرف دو تاریخوں کا ذکر بطور نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) ابن الخطیب بغدادی (۱۰۰۲ء تا ۱۰۷۱ء) کی "تاریخ بغداد" میں صرف مرد عمائدین ہی کا ذکر نہیں بلکہ اس زمانے کی مشہور خواتین کا بھی تذکرہ ہے۔ بغداد کے محلّوں اور اس شہر کے ماضی کا بھی مفصّل ذکر ہے۔ اس شہر کے رائج الوقت رسم و رواج کے متعلق معلومات کا تو یہ تاریخ خزانہ ہے۔

(۲) ابن عساکر (متوفی ۱۱۷۶ء) کی "تاریخ دمشق" نے طوالت کے معاملے میں سب مقامی تاریخوں کو مات کیا۔ اس تاریخ کی اسّی جلدوں میں صرف دمشقی اہلِ قلم کا ذکر تھا۔

مقامی تاریخیں کس نیّت سے لکھی جاتی تھیں؟ اس سوال کا جواب ابن الخطیب کی زبان سے سنئے۔ یہ ابن الخطیب بغدادی نہیں بلکہ ابن الخطیب غرناطی ہے جس نے اپنی تاریخ "الاحاطہ فی الاخبار غرناطہ" کے نام سے اپنے دورانِ زندگی (۱۳۱۳ء تا ۱۳۷۴ء) میں لکھی:۔ (حوالہ الجبلی)

"صرف میں ہی اپنے وطن کا شیدا نہیں ہوں اور نہ میں
پہلا شخص ہوں جس نے اپنی حُب الوطنی کا ثبوت دیا ہے
حُب الوطنی ہر اہلِ شہر کے خمیر میں ہے جس کی نظر اپنے وطن
پر برابر لگی رہتی ہے۔"

لوگ اپنے وطن سے کیوں محبّت کرتے ہیں۔ ابن الخطیب اس سوال کا جواب بھی ان الفاظ میں دیتا ہے:۔

"لوگ اپنے وطن سے اس لئے محبّت کرتے ہیں کیونکہ وطن میں ان کی جوانی کی تمنّائیں پوری ہوتی ہیں۔ اپنے وطن کی یاد اس لئے آتی ہے کہ انسان کا بچپن وطن میں گذرتا ہے"۔

مؤرخ کے اپنے زمانے کی تاریخ مورخین اپنے زمانے کی تاریخیں بالعموم اپنے حکمرانوں کی فرمائش پر لکھتے تھے ان کے دو بہترین نمونے درج ذیل ہیں:-

(۱) ابوالفضل بیہقی (۹۹۵ء تا ۱۰۷۷ء) کی "جامع التواریخ" جس کا بیشتر حصّہ تلف ہوگیا۔ یہ تاریخ محمود غزنوی کے جانشین مسعود اوّل (۱۰۳۱ء تا ۱۰۴۱ء) کے عہد میں لکھی گئی۔ یہ "تاریخ سُبکتگین" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ بیہقی نے اپنی تاریخ کی تمہید فنِ تاریخ نگاری کے ذکر سے کی۔ اس تمہید کے باقی ماندہ حصّوں سے ظاہر ہے کہ یہ اپنے زمانے کا آئینہ ہے۔ سلطان مسعود اور اس کے درباریوں کا مفصّل تذکرہ ہے اور اس زمانے کی گپ شپ تک درج ہے۔ اس تاریخ کا باقی ماندہ فارسی متن بڑی چھان بین کے بعد پروفیسر سعید نفیسی نے طہران سے دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ اس تاریخ کا بھی مفصّل تذکرہ باب بعنوان "میرے چند مشہور صحیفے" کے تحت آپ پڑھیں گے۔

(۲) شمس الدین ابن خلکان (۱۲۱۱ء تا ۱۲۸۲ء) کی عجیب وغریب کتاب جو "وفیات الاعیان" کے نام سے مشہور ہوئی اس میں ان اہلِ قلم کا تذکرہ ہے جو مصنّف کے زمانے میں یا پہلے فوت ہوئے۔ ان اشخاص کی تعداد ۸۶۵ ہے۔ یہ عربی زبان میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے گو اس قسم کی سوانح نگاری کی بنیاد ابن سعد قائم کرچکا تھا لیکن چار سو

سال بعد یہ فن پروان چڑھا۔ ابن خلکان کی تقلید میں الندیم نے بعد کو اپنی فہرست لکھی۔ ابن خلکان نے اس فن کو کیوں عروج دیا؟ اس کا جواب اس کی اپنی زبان سے سنیئے :۔ (حوالہ نمبر ۱۲)

"میں نے اپنی اس تصنیف میں کسی خاص طبقے کے لوگوں یعنی بادشاہوں۔ وزیروں۔ امیروں۔ شاعروں اور عالموں تک محدود نہیں کیا بلکہ میں نے ان تمام لوگوں کو شامل کیا جن کے نام سے لوگ آشنا ہیں اور جن کے متعلق سوال پوچھے جاتے ہیں"۔

سوانح حیات کی کثرت اوپر چند سوانح عمریوں کا ذکر کیا جا چکا ہے صرف بادشاہ ہی اپنی سوانح حیات نہیں لکھتے تھے۔ بلکہ اہل قلم بھی اپنی سرگذشت قلم بند کرتے تھے۔ امام غزالی (۱۰۵۶ء تا ۱۱۱۱ء) نے اپنی آپ بیتی کہانی "منقد فی الضلال" کے نام سے لکھی۔ جہانگیر (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) نے "تزک جہانگیری" میں اپنے حالات لکھے۔ اہل تشیع نے حضرت علی کی زندگی پر بے شمار کتابیں لکھیں۔

اسی طرح اولیاء کے متعلق متعدد تذکرے لکھے گئے۔ عبدالوہاب الشعرانی (متوفی ۱۵۶۵ء) نے "الطبقات الکبریٰ" کے نام سے ۴۲۸ صوفیوں کے تذکرے لکھے۔ جن میں ۱۶ عورتیں بھی شامل ہیں۔ اس کا ترجمہ بھی اردو میں ہو گیا ہے جس کو نفیس اکیڈمی نے حال ہی میں دوبارہ شائع کیا۔

تاریخ مذاہب تو گیارھویں عیسوی میں ایسی مقبول ہوئی کہ سینکڑوں کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں۔ ابن حزم نے اپنے دیباچہ میں اس قسم کی متعدد کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ بعد کو شہرستانی نے ۱۱۲۷ء میں اسی موضوع پر اور اسی عنوان کے ساتھ اپنی کتاب لکھی۔ تاریخ

مذاہب ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی مقبول رہی۔ اس ملک میں محسن فانی (متوفی سنہ ۱۶۷۰ء) نے اس موضوع پر اپنی تاریخ - دلبستان مذاہب" کے نام سے لکھی جس میں سکھوں کے مذہب کا بھی ذکر ہے۔ محسن فانی کی نظر فلسفیانہ تھی۔ اپنی کتاب کے آخر میں مصنف نے" مذہب فلسفیان" کا ذکر کیا ہے جو خود اس کو پسند تھا۔ متعدد مذاہب کے سلسلے میں وہ انسان کی مشکلات کو اس طرح بیان کرتا ہے۔ (حوالہ نمبر ۱)

ہ (مذہب کی) ایک خامی یہ ہے کہ جب ایک نبی کا مذہب مقبول ہو جاتا ہے اور اس مذہب کا علم خدا کی بابت اور عبادت کے معاملے میں قائم ہو جاتا ہے تو کچھ مدت کے بعد دوسرا نبی آتا ہے۔ اور دوسرے مذہب کی تلقین کرتا ہے۔ اس سے لوگ دقت میں پڑ جاتے ہیں۔ اور طے نہیں کر سکتے کہ سابق نبی صادق تھا یا کاذب۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان کو زمانے کے ساتھ شریعت کو بھی بدلنا چاہیئے.....

محسن فانی نے جن مذاہب اور مسلمانوں کے فرقوں کا ذکر کیا ہے ان کی فہرست یہ ہے :-

(۱) زرتشتی مذہب جو مصنّف کے زمانے میں متعدد فرقوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ ان فرقوں کے نام یہ تھے۔ سپاسی۔ مہابادی۔ جمشیدی۔ سمرادی اور صدذیری۔ ان صدذیریوں کا عقیدہ تھا کہ فردوس کے سو دروازے ہیں اور ہر دروازے میں داخل ہونے کے لئے علیٰحدہ علیٰحدہ قاعدے مقرر ہیں۔

(۲) ہندو مذہب کے فرقوں کا حال بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔
جن ہندو فرقوں کا حال مصنف نے لکھا ہے ان کے نام یہ ہیں۔
ویدانتی۔ سنکھیا۔ ولشنوی۔ بیراگی۔ بدھ مت کو بھی ہندو مذہب
کے ساتھ شامل کر دیا ہے۔

(۳) سکھ مذہب بھی دو فرقوں میں منقسم ہو چکا ہے۔ ایک فرقہ جانکی
کہلاتا تھا دوسرا ثابیتی۔

(۴) یہودی مذہب جس کے متعلق معلومات مصنّف کو بذریعہ
سرمد حاصل ہوئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرمد محسن فانی کا دوست
تھا اور یہودی مذہب کو چھوڑ کر سرمد اسلام قبول کر چکا تھا۔ محسن نے
یہ بھی لکھا ہے کہ جب سرمد شہر ٹھٹھہ (سندھ) پہنچا تو وہ ایک
ہندو لڑکے ابھے چند نامی پر عاشق ہو گیا۔ سرمد نے محسن کی خاطر
یہودیوں کی "کتاب پیدائش" کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

۵۔ عیسائی مذہب جس کے متعلق معلومات محسن نے ایک پرتگالی
پادری فرانسائی نامی سے حاصل کیں۔ حالانکہ محسن کے زمانے
میں مذہب عیسوی پراٹسٹینٹ اور کیتھولک فرقوں میں منقسم
ہو چکا تھا لیکن مصنّف نے ان فرقوں کا ذکر تک نہیں کیا۔

(۶) اسلام کے صرف تین فرقوں یعنی سنّی۔ شیعہ اور اسماعیلی کا
ذکر اس کتاب میں ہے۔

(۷) محسن فانی نے اہل طریقت کے عقیدوں کو اسلام کے زمرے
میں شمار نہیں کیا۔ عمر خیام اور اس کی طریقت "واحدیہ" پر
ایک علیحدہ باب لکھا۔

(۸) اسی طرح فرقہ "روشنیا" کے لئے ایک علیحدہ باب قائم کیا۔
(۹) صوفی فرقہ "حلولیہ" کو بھی اسلام میں شامل نہیں کیا۔
(۱۰) چنگیز خانی مذہب کو بھی علیحدہ طور سے بیان کیا۔
آخر میں محسن فانی نے "مذہب فلسفیان" کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

مسلم ایران میں تاریخ نگاری

اب تک میں نے صرف عربوں کی تاریخ نگاری کا ذکر کیا ہے کیونکہ اسلام کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا۔ جس کی بدولت یہ صدیوں کے وحشی یکایک انسان بن گئے۔ ان کے لئے میرے صحیفے میں جو اوراق تھے وہ کورے پڑے تھے۔ لیکن میں اپنے لاکھوں برس کے تجربے کی بنا پر جانتی تھی کہ وحشیوں کی بھی باری آتی ہے۔ جب مغرب کے وحشی اٹھے اور دولتِ روما کو تہ وبالا کر دیا تو میں نے سوچا کہ جب تقاضۂ شکم کی بنا پر دنیا میں انقلاب ہو سکتا ہے تو "تقاضۂ خیال" کس طرح بے اثر رہ سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تقاضائے شکم بھی ہمیشہ انسانوں میں کارگر رہا ہے۔ لیکن دل کا مقام شکم سے اونچا ہے۔ شکم سے صرف دماغ متاثر ہوتا ہے لیکن خیال کے تقاضے دل سے پیدا ہوتے ہیں اور خدا کا مقام دل ہی ہے۔ جب تک دل متاثر نہیں ہوتا تب تک دماغ بھی معطّل رہتا ہے۔ . . . . دماغ صرف عقل کا مقام ہے لیکن دل جنون کا گھر ہے۔ اہلِ جنون جو کام کر گئے وہ اہلِ دماغ نہ کر سکے۔

حامیانِ اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ حکایتِ ہستی کا آغاز شکم سے

ہوا۔ گو شکم انسان کے ساتھ پیدا ہوا اور اس شکم کے تقاضے لاکھوں برس سے انسان کے ساتھ ہیں لیکن اس کے باوجود اشتراکیت زور نہ پکڑ سکی لیکن جب کارل مارکس جیسا اہل جنوں پیدا ہوا تب کہیں اشتراکیت نے زور پکڑا۔ اشتراکیت بھی کارل مارکس کے دماغ سے نہیں بلکہ دل سے نکلی۔ بقول شاعر:

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے (اقبالؒ)

جس صدا نے عربوں کو جگایا وہ صدا بانیٔ اسلام کے دل سے نکلی تھی اس لئے یہ صدا کارگر ہوئی لیکن یہ صدا ایران تک بانیٔ اسلام کے زمانے میں نہ پہنچی۔ جب یہ صدا ایران پہنچی تو کسی قدر وہ پرانی ہو چکی تھی۔ اس لئے ایرانیوں کے دل پر جو پرانے نقوش تھے وہ پوری طرح مٹ نہ سکے۔ جس طرح عربوں نے اپنے صدیوں پرانے دستور ایک آواز پر ختم کر دیئے۔ اس طرح ایرانی اپنے پرانے دستوروں کو نہ مٹا سکے۔ ایرانیوں کی تہذیب اتنی پرانی تھی کہ اب اس پر تصنع نے قابو پا لیا تھا۔ ان کے خیالات کی طرح ان کی زبان بھی پراگندہ ہو گئی تھی۔ اس پر یہ طرّہ ہوا کہ ایرانی عربوں کے زیرِ نگین ہو گئے۔

جب کوئی پرانی قوم کسی نوآموز قوم کی زیرِ نگیں ہو جاتی ہے تو مفتوح قوم کے دماغ پر احساس بکتری چھا جاتا ہے۔ نئی قوم سے سیکھنے کی بجائے مفتوح اپنے فاتح کی مذمت کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے ماضی کے زعم میں مست رہتا ہے۔ چنانچہ فردوسی نے (۹۴۰ء تا ۱۰۲۰ء) ایرانیوں کی عظمتِ رفتہ کے گیت گانا شروع کئے اور عربوں کی مذمت کی:۔

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاج کیان را کند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

(ان اونٹ کا دودھ پینے والوں اور گو کا گوشت کھانے والوں کا دماغ ایسا خراب ہوگیا ہے کہ وہ اب "تاج کیان کی آرزو کرتے ہیں۔ اے چرخ گرداں تجھ پر ہزار لعنت۔)

اسی فردوسی نے اپنی دانست میں ایرانیوں کو جگانے کے لئے ایک تاریخ لکھی جو مفتوح ایرانیوں کا "قرآن" بن گیا۔ دراصل فردوسی کا شاہنامہ نہ تاریخ تھی نہ قرآن تھا۔ بلکہ محض ایک افسانہ تھا۔ اس افسانے میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان میں سے بعض کا تو وجود ہی نہ تھا۔ فردوسی نے محض اپنی لفاظی سے ان مفروضہ ہستیوں کا وجود قائم کیا۔ ایرانی اپنے قومیت کے نشے میں ایسے مست تھے کہ ان کے مورخوں نے شاہ نامہ کی عبارت آرائی اور لفاظی کو اپنی تاریخوں کے لئے نمونہ قرار دیا۔ فارسی میں بھی سینکڑوں تاریخیں لکھی گئیں لیکن یہ تاریخیں قدیم عربی تاریخوں کے مقابلے میں کمتر ہیں۔ حالانکہ ان عربی تاریخوں کے مصنف بھی ایرانی نژاد تھے۔ یہ ایرانی عرصے تک عربی میں تاریخ نگاری کرتے رہے کیونکہ ان کے زمانے میں فارسی زبان مفتوحوں کی زبان سمجھی جاتی تھی۔ جس طرح ایک عرصے تک اردو "بیرے اور خانساماؤں" کی زبان سمجھی جاتی تھی۔

فارسی زبان میں بھی بڑی ضخیم تاریخیں لکھی گئیں لیکن یہ سب عبارت آرائی اور لفاظی سے پُر ہیں۔ محض چند واقعات کو بیان کرنے میں صفحے کے صفحے رنگے جاتے تھے۔ "تاریخ وصاف" اس کا زندہ ثبوت ہے۔ اس عبارت آرائی کے علاوہ فارسی تاریخیں دراصل تاریخیں نہیں بلکہ قصیدے

ہیں کیونکہ ایرانی مورخ بیشتر اپنے مربی حکمرانوں کے تنخواہ دار ملازم ہوتے تھے حتیٰ کہ چنگیزیوں نے بھی ان ایرانی مورخوں سے اپنی تاریخیں لکھوائیں عطا ملک جوینی کی "تاریخ جہان کشا" اس کا نمونہ ہے۔

فارسی میں شعرائے تذکرے

البتہ فارسی مورخوں نے سوانح نگاری میں کمال پیدا کیا۔ انہوں نے فارسی شعراء کی سوانح عمریاں بکثرت لکھیں۔ عرب مورخ اس قسم کی سوانح نگاری کی ابتداء کر چکے تھے۔ ابن قتیبہ (متوفی ۸۸۹ء) کی "کتاب الشعر والشعراء" عربی زبان میں اسی موضوع پر تھی۔ اسی طرح ابو الفرج اصفہانی کی "کتاب الاغانی" میں بھی عربی شاعروں کی سوانح حیات تھیں۔ لیکن فارسی مورخوں نے شعراء کی سوانح نگاری میں جدت پیدا کی۔ اور اس کو ایک مستقل اور باضابطہ فن بنا دیا۔

ایرانی ہمیشہ سے شعروشاعری کے دلدادہ رہے ہیں۔ جب عربی زبان کا ایران میں بھی زور تھا تو ایرانی شاعروں نے عربی میں شعر کہنا شروع کئے اور ایرانی نژاد عربی شاعروں کی سوانح عمریاں بھی لکھیں۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب ایران پر عربی نثر اور عربی نظم دونوں چھائی ہوئی تھیں جب سامانیوں کے عہد میں فارسی زبان پھر زندہ ہونی شروع ہوئی اور ایرانی اپنی مادری زبان میں شعرگوئی کرنے لگے تو اب ان فارسی شاعروں کی سوانح عمریاں بھی فارسی نثر میں لکھی جانے لگیں۔ ان ابتدائی شعرائے ایران کے تذکروں میں مندرجہ ذیل تذکرے مشہور ہوئے۔

(۱) "لغات الفرس" جو اسدی طوسی نے ۱۰۶۰ء میں لکھی۔

(۲) "چہار مقالہ" نظامی عروضی سمرقندی نے ۱۱۵۵ء میں لکھا۔

(۳) "لباب الالباب" مصنفہ محمد عوفی اوائل تیرہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی۔

(۴) "مناقب الشعرا" مصنفہ ابوطاہر خاتونی عہد سلجوقی کی یادگار ہے۔

لیکن دولت شاہ سمرقندی نے ۱۴۸۷ء میں "تذکرۃ الشعرا" لکھ کر ان تمام پرانے تذکروں کو مات کردیا۔ گو اس تذکرہ میں غیر مصدقہ روایات درج ہیں۔ اس تذکرہ کی شہرت کا باعث یہ ہے کہ دولت شاہ نے اس کو ایک خاص نہج پر لکھا اور شعرا کو طبقوں میں منقسم کیا۔

اولیاء کے تذکرے

گو خالص تاریخ نگاری کے معاملے میں ایرانی عربی تاریخوں کا مقابلہ نہ کر سکے لیکن تذکرہ نویسی میں انہوں نے عربوں کو مات کردیا۔ شاعروں کے تذکروں کے علاوہ ایرانیوں نے اولیاء کے تذکرے بھی لکھے کیونکہ اولیاء خاص ایران کی پیداوار تھے تصوف ایران ہی سے شروع ہوا۔ خراسان صوفیوں کا مرکز تھا۔ جہاں صرف ایک شہر نیشاپور میں سینکڑوں صوفی جمع تھے۔ علی ہجویری (داتا گنج بخش) نے اپنی مشہور کتاب "کشف الظنون" میں لکھا ہے کہ

"خراسان کے تمام مشائخ کا شمار کرنا محال ہے تنہا اس صوبے میں میری ملاقات تین سو ایسے صوفیوں سے ہوئی جن کی روحانیت اس درجہ کی تھی کہ ان میں ہر ایک پوری دنیا کے لئے کافی تھا"

(۱) اولیاء کے تذکروں میں سب سے اعلیٰ مقام فریدالدین عطار کے "تذکرۃ الاولیاء" کو حاصل ہے۔ یہ بزرگ ان دو اشخاص میں سے ہیں جن کا لوہا مولانا روم بھی مانتے ہیں۔ عطار نے بڑی عمر پائی۔ سن ولادت ۱۱۱۹ء اور سن وفات ۱۲۲۸ء ہے۔ بعد کے تذکرہ نگاران اولیاء نے

اس سے برابر استفادہ کیا۔ اس تذکرے میں چھیانوے اولیاء کا ذکر ہے۔ اس کا ترجمہ انگریزی میں حال ہی میں پروفیسر آربری نے کیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بہت قدیم ہے۔

(۲) دوسرا تذکرہ قابلِ ذکر ملّا جامی (سنہ ۱۴۱۴ تا سنہ ۱۴۹۲) کا "نفحات الانس" کے نام سے مشہور و معروف ہے۔

(۳) تیسرا مشہور تذکرہ "مجالس العشاق" ہے جس کو ایک صوفی سلطان حسین نامی نے سنہ ۱۵۸۳ء میں لکھا۔

(۴) چوتھا مشہور تذکرہ "مجالس المومنین" عہدِ جہانگیری (سنہ ۱۶۰۵ تا سنہ ۱۶۲۷) میں قاضی نوراللہ شستری نے لکھا۔ اس میں شیعہ علماء اور صوفیوں کا ذکر ہے۔

(۵) پانچواں فارسی تذکرہ "رشحاتِ عین الحیات" ہے جو علی کاشفی نے سنہ ۱۵۰۴ میں لکھا۔ علی کاشفی ملا حسین واعظ کاشفی مصنف "انوارِ سہیلی" کے فرزند تھے۔

فارسی تاریخ نگاروں کی خامیاں

فارسی تاریخ نگاری کی سب سے نمایاں خامیاں دو ہیں جن کی وجہ سے یہ عربی تاریخ نگاری کا مقابلہ نہ کرسکی:۔

(۱) فارسی تاریخیں عبارت آرائی اور لفّاظی کا شکار ہیں۔ لفّاظی کی یہ بلا عثمانی ترکوں کے عہد تک پہنچی اور عثمانی تاریخ نگاری کو بھی خراب کیا۔

(۲) فارسی مورخ اپنے مربّی بادشاہوں کی فرمائش پر تاریخیں لکھتے تھے۔ بادشاہوں کی قصیدہ گوئی سیدھی سادی عبارت میں نہیں کی جاسکتی۔

فارسی تاریخ نگاری نے چنگیزیوں کے عہد میں زور پکڑا جب عربی تاریخ نگاری کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ چنگیزی حکمران جاہل مطلق ہوتے تھے۔ اس لئے عبارت آرائی اور لفاظی سے بڑے متاثر ہوتے تھے "روضۃ الصفا" کے مصنف میر خوند نے فن تاریخ نگاری پر بھی تبصرہ کیا ہے جس میں اس نے مورخین کو چند ہدایات دی ہیں ان ہدایات میں سے ایک یہ ہے کہ اگر اہل حکومت مورخ کی حق گوئی پسند نہ کریں تو مورخ کو صحیح واقعات محض اشارۃً درج کرنا چاہئیں تاکہ اہل عقل اصل مطلب سمجھ جائیں۔

ہندوستان میں فارسی تاریخ نگاری

ہندوستان میں مسلمانوں نے جو طرز تاریخ نگاری اختیار کیا وہ بھی ایرانی قسم کا تھا۔ عہد مغلیہ سے پہلے متعدد تاریخیں فارسی میں ہندوستان میں لکھی گئیں جن میں بعض مورخوں نے اپنے زمانے کے حالات قلم بند کئے۔ اس سلسلے میں ابوالفضل کی "آئین اکبری" خاص طور سے قابل ذکر ہے کیونکہ اس کتاب میں عہد اکبری کی مکمل تصویر ہے۔ حتیٰ کہ اقتصادی اور معاشرتی معلومات بھی بکثرت ہیں۔ لیکن حسب دستور ابوالفضل جیسا باعلم اور ذہین انسان کو بھی اپنے ممدوح اکبر بادشاہ میں ایک عیب بھی نظر نہ آسکا" لیکن اکبر کے زمانے میں ایک اور مورخ ملا عبدالقادر بدایونی بھی تھا۔ جس کو اکبر میں کوئی خوبی نظر نہ آئی۔

صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے اور تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنے کے لئے آج ہم کو کئی تاریخیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ لیکن عبدالقادر بدایونی جیسے نکتہ چین مؤرخ ہر زمانے میں نہ تھے۔ اس لئے ان فارسی تاریخوں سے ہمیں صرف ایک رُخ ہی نظر آتا ہے۔ البتہ ان فارسی تاریخوں میں

سولہویں صدی عیسوی سے ایک نہایت کارآمد رواج شروع ہوا وہ رواج یہ تھا کہ کتاب کے خاتمے پر وہ ایک ضمیمہ شامل کر دیتے تھے۔ جس میں اس زمانے کے شعراء کا تذکرہ ہوتا تھا اور ہر شاعر کے چیدہ اشعار بھی بطور نمونہ درج کئے جاتے تھے۔ عہدِ مغلیہ کی تاریخوں میں یہ ضمیمے پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ان عمومی تاریخوں میں ہم عصر صوفیوں کے نام بمعہ مختصر حالات بھی لکھے جاتے تھے۔ سلاطینِ دہلی کے زمانے کی تاریخوں میں صوفیوں کا ذکر ضرور ہوتا تھا لیکن عہدِ اکبر (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) کے بعد سے یہ دستور کم ہونا شروع ہو گیا۔ کیونکہ مغلوں کے عہد میں صوفیوں کا وہ زور نہ رہا جو سلاطینِ دہلی کے زمانے میں تھا۔

ہندوستان میں بھی اولیاء کی سوانح عمریاں لکھنے کا دستور قائم ہوا لیکن اولیاء کی بہترین سوانح عمریاں بھی سلاطینِ دہلی کے زمانے میں لکھی گئیں۔ ان سوانح حیات میں صوفیوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اولیاء کا ہر تذکرہ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے حالات سے شروع ہوتا تھا۔ یہ بزرگ اتنے محترم و مشہور تھے کہ ان کو بجائے نام کے "خواجہ بزرگ" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ ہندوستان میں اولیاء کے جو تذکرے لکھے گئے ان میں امیر خورد کی نوشتہ "سیر الاولیا" بہت مقبول ہوئی جو عہدِ تغلق (۱۳۲۰ء تا ۱۳۹۶ء) میں لکھی گئی۔ دوسرا تذکرہ اولیاء کے متعلق "سیر العارفین" نوشتہ مولانا فضل اللہ حامد جمالی تھا جو شروع عہدِ ہمایوں میں لکھا گیا (۱۵۳۰ء تا ۱۵۴۰ء)۔ تیسری مشہور کتاب اولیاء سے متعلق "کتاب الانوار" تھی جس کا مصنف

شیخ عین الدین جنیدی بیجاپوری تھا۔ اس میں سلسلہ سہروردی کا تذکرہ تھا۔ علیحدہ صوفیوں کا تذکرہ لکھنے کا دستور عہد اورنگ زیب (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) تک قائم رہا۔ عبدالحق محدث دہلوی کا تذکرہ موسومہ "اخبار الاخیار" بہت مقبول ہوا۔

فارسی زبان میں خودنوشتہ سرگذشت

خودنوشتہ سرگذشت کے معاملے میں ایرانی عربوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔ ایران میں اس قسم کی سرگذشت کا رواج اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں شروع ہوا۔ اس کی شروعات شیخ محمد علی حزیں نے کی۔ جو چند سرگذشت فارسی میں لکھی گئیں ان میں سے مندرجہ ذیل دستیاب ہیں۔

(۱) "تاریخ احوال بہ تذکرات حال خود" نوشتہ علی حزیں۔ جو شاعر بھی تھا اور اصفہان کا باشندہ تھا۔ بعد کو ہندوستان پہنچا اور بنارس میں دفن ہوا۔ علی حزیں نے اپنی سرگذشت ہندوستان میں ۱۷۴۲ء میں لکھی۔ لیکن باوجود اس کے کہ ہندوستان اس کو پناہ ملی وہ ہندوستان سے متنفر ہی رہا۔

(۲) "روزنامہ" نوشتہ مرزا محمد جو ۱۷۸۵ء میں لکھا گیا۔

(۳) "تجربات الاحرار" نوشتہ عبدالرزاق بیگ مفتون (متوفی ۱۸۲۷ء)

(۴) شاہ طہماسپ (۱۸۲۴ء تا ۱۸۷۶ء) نے بھی اپنی سرگذشت لکھی۔ لیکن یہ سرگذشت بابرنامہ کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔

مسلم تاریخ نگاری کی خوبیاں

مسلمانوں کی تاریخ نگاری کے اس مختصر بیان کے بعد ضروری ہے کہ

میں ان احسانات کا ذکر کروں جو ان مسلمان مورخین نے مجھ پر کیے ۔ لیکن میرا دستور ہے کہ میں ہر تصویر کے دونوں رُخ پیش کرتی ہوں۔ چنانچہ میں پہلے مسلم تاریخ نگاری کی خوبیاں بیان کروں گی اور اس کے بعد خامیاں۔

خوبیوں کا ذکر مندرجہ ذیل زمروں کے تحت کرنا مناسب ہے :۔

(۱) مسلمانوں نے میرا محیط وسیع کیا۔ ان کے زمانے سے پہلے میں صرف بادشاہوں کے کارنامے اور ان کی فتوحات بیان کرتی تھی۔ لیکن چودھویں صدی کے آخر میں سخاوی اور کفیجی جیسے مفکر پیدا ہوئے جنہوں نے انسان کے مکمل تمدن کا بیان میرے سپرد کیا۔ اور اب مجھے بادشاہوں کے ساتھ ساتھ انبیا اور اولیاء کا ذکر بھی کرنا پڑا۔

راہبوں کے ساتھ دولت مندوں کا تذکرہ بھی سپرد ہوا۔ زاہدوں کے دوش بدوش میں نے بادہ خواروں اور رقاصوں کا ذکر پیش کیا۔

(۲) اس وسعت کی بنا پر میں ہر طبقے میں مقبول ہو گئی۔ چور اور بدمعاش بھی مجھے ذوق وشوق سے پڑھنے لگے۔ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کے زمانے میں چھاپہ خانوں کا رواج نہ تھا۔ میری مانگ بڑھتی گئی۔ ہر گھر میں میرے چرچے ہونے لگے۔ ہر تعلیم یافتہ خاندان میں مؤرخ پیدا ہوئے۔ مسلمانوں کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے جو وسعت مجھ میں پیدا کی وہ ان کی اپنی ایجاد تھی۔ قدیم ایرانیوں سے جو تاریخیں ان کے ہاتھ لگی تھیں وہ بادشاہوں کے کارناموں تک محدود تھیں۔ یونانی اور رومی تاریخیں کسی حد تک وسیع ہوتی تھیں لیکن مسلمانوں نے ان بُت پرستوں کی تاریخوں سے ہاتھ نہ لگایا۔ اس لیے جو وسعت انہوں نے مجھ میں پیدا کی وہ بلاشبہ ان کی اپنی ایجاد تھی۔ بیشک سکندر کا ذکر

ان کی تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن سکندر کے متعلق جو واقعات ان تک پہنچے ان کا ماخذ محض افسانے تھے۔

(۳) سب سے بڑا احسان مسلمانوں نے مجھ پر یہ کیا کہ میرے فن پر علیحدہ اور مخصوص کتابیں لکھیں جن کی بدولت میں ایک علیحدہ اور مخصوص علم قرار دی گئی اور میرے نام کے ساتھ لفظ "علم" بھی لگایا گیا جس کے معنی عربی زبان میں سائنس ہیں۔ یعنی "علم تاریخ" اب "سائنس تاریخ" کے مترادف ہو گیا۔ کیفجی اور سخاوی کی نوشتہ کتابیں میری اپنی علیحدہ شخصیت کا بیّن ثبوت ہیں ابن خلدون نے جس کا ذکر میں نے ایک مخصوص باب میں کیا ہے میری خاطر اپنا "مقدمہ" لکھا جس میں اس نے میرے لئے ایک مخصوص فلسفہ پیدا کیا۔ اس سلسلے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے بعد میرے فن پر کوئی کتاب نہ لکھی گئی۔ اس دورِ جدید میں جو کتابیں مغرب میں میرے فن پر لکھی گئیں وہ سب حال ہی کی پیداوار ہیں۔ گویا میرے فن پر پانچسو سال تک کسی اہلِ مغرب نے قلم نہ اُٹھایا اور میرا فن قعرِ گمنامی میں پڑا رہا۔

(۴) مسلمان مورخین نے میرے ہر پہلو پر کتابیں لکھیں لیکن میرے یہ پہلو یونانی اور رومی مؤرخ دیکھ چکے تھے۔ مسلمان مورخین نے جو اپنی طرف سے ایجاد کی وہ سوانح عمریوں کا مجموعہ تھا جو قاموس کی شکل میں لکھا جاتا تھا۔ یعنی حروفِ تہجّی کے اعتبار سے لغت کی طرح۔ ان قاموسوں میں صرف وزیروں اور حکّام ہی کے نام نہ ہوتے تھے بلکہ اہلِ قلم کے بھی تذکرے ہوتے تھے ان قاموس نما سوانح عمریوں کا دستور ابن سعد ہی نے آٹھویں صدی عیسوی میں قائم کر دیا تھا۔ لیکن جب حدیث کے سلسلے میں اسماء الرجال کا طریقہ نکلا تو اس فن نے زور پکڑا۔ تیرھویں

صدی عیسوی میں ابنِ خلکان نے " وفیات الاعیان" لکھ کر دورِ حاضر کے لئے اس قسم کی قاموس کا نمونہ قائم کر دیا۔ چنانچہ مغرب میں اس قسم کے قاموس برابر شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن اس کے موجد مسلمان ہی ہیں۔

مسلمان مؤرخوں کی خامیاں

(۱) چند مورخوں کے علاوہ عام مورخوں نے صرف ایک ہی رخ پیش کیا۔ جو مورخین اس الزام سے بری ہیں ان میں ابن مسکویہ (متوفی ۱۰۲۹ء) ہے جس نے واقعات پر تنقیدی نظر ڈال کر خرافات کو واقعات سے علیحدہ کیا۔ وہ اس خرافات کے متعلق لکھتا ہے :- (حوالہ نمبر ۱۴۴)

" میں اپنی تاریخ ان تاریخی معلومات سے شروع کر رہا ہوں جو طوفانِ نوح کے بعد کی ہیں کیونکہ اس سے پہلے کے واقعات قابلِ استناد نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ اس قسم کی معلومات کا اس کتاب کے مقصد سے کوئی تعلق نہیں (کیونکہ اس کتاب کا مقصد تجربات بیان کرنا ہیں) اسی وجہ سے ہم نے انبیاء کے معجزوں اور ان کے کارناموں کا ذکر بھی نہیں کیا ہے کیونکہ ہمارے زمانے کے لوگوں کو جو مسائل پیش آئیں گے ان کے حل کرنے کے لئے معجزوں کا ذکر کارآمد نہ ہوگا۔"

(۲) دوسرا نقص مسلمانوں کی تاریخوں میں یہ ہے کہ انہوں نے واقعات کو روزنامچہ کی صورت میں سن وار درج کیا۔ اس لئے ان سن وار واقعات میں علت اور معلول کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ کسی واقعہ کا سبب کیا تھا۔

(۳) تیسرا نقص یہ ہے کہ واقعات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ ایک

مؤرخ ایک واقعہ کو جس طرح لکھتا ہے اس کی تردید دوسرے مورخ کے بیان سے ہوتی ہے۔ طبری نے اکثر واقعات کے ساتھ وہ واقعات بھی لکھے جن سے ان کی تردید ہوتی ہے۔ اور واقعات کی صحت کا فیصلہ اپنے ناظرین پر چھوڑ دیا۔

(۴) چوتھا نقص یہ ہے کہ بیشتر مورخ اپنے مربی بادشاہوں کی جا اور بے جا تعریف کرتے ہیں اور ان کے ہر فعل کو صحیح اور درست قرار دیتے ہیں۔ اپنے مربیوں کے ظلم و تشدد کا ذکر ہی نہیں کرتے۔

(۵) پانچواں نقص یہ ہے کہ ہر مورخ اس مفروضے پر چلتا ہے کہ امداد الٰہی ہمیشہ مسلمانوں کے شامل حال رہتی تھی۔ ان کا ایمان تھا کہ مسلمانوں کو فتح اسی امداد الٰہی سے حاصل ہوتی تھی چنانچہ وہ مسلمانوں کی فتح کے دنیاوی اسباب بیان ہی نہ کرتے تھے۔ اور نہ دشمن کی کمزوریوں کا ذکر کرتے تھے بلکہ امداد الٰہی کو ثابت کرنے کے لئے دشمن کی فوج کی تعداد بتانے میں مبالغہ کرتے تھے۔ اگر آپ آج کسی فتح کے متعلق سوال کریں کہ یہ فتح کیوں اور کس طرح حاصل ہوئی تو اس کا جواب ان تاریخوں میں نہیں ملے گا۔ ان کا ایمان تھا کہ مسلمانوں کو قیصر و کسریٰ کی فوجوں پر فتح اس لئے حاصل ہوئی کہ اللہ ان کافروں سے ناراض تھا اور مسلمانوں کے ساتھ تھا۔

(۶) چھٹا نقص یہ ہے کہ مسلمان مؤرخ ایک خاص مقصد کے پیش نظر اپنی تاریخیں لکھتے تھے۔ وہ مقصد یہ تھا کہ ان تاریخوں کو پڑھ کر مسلمانوں کا ایمان تازہ ہو جائے اور ان کی روح تڑپ جائے۔ اور ان کے قلب میں گرمی پیدا ہو لہٰذا وہ مسلمانوں کی فتح کے معاملے میں بڑا مبالغہ کرتے تھے۔ لیکن یہ چھٹا نقص ایسا ہے کہ ہمارے زمانے کی تاریخیں بھی اس نقص سے

بری نہیں ہیں۔ بقول مؤرخ ای۔ایچ۔کار " وہ تاریخ ہی کیا جو روح کو تازہ نہ کرے" یعنی مؤرخ واقعات کی اس طرح تاویل کرے کہ وہ روح افزا ہو جائیں۔ پروفیسر کولنگ وُڈ نے اور پروفیسر اوک شوٹ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ " تاریخ دراصل مورخ کے اپنے تجربے کے مطابق ہوتی ہے" (حوالہ نمبر ۱)

مندرجہ بالا نقائص مسلمانوں کی تاریخوں میں کیوں پیدا ہوئے؟ پہلا نقص یعنی مسلمانوں کی تاریخوں میں معجزوں کا ذکر اس لئے پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے زمانے میں جو فضا تھی وہ عقیدے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُن کے دماغوں پر مذہب مسلط تھا۔ ان کو ہر طرف خدا اور اس کی امداد نظر آتی تھی۔ اسی امدادِ غیبی کے مفروضے پر انہوں نے اپنی تاریخیں لکھیں۔

دوسرا نقص یعنی روزنامچہ نما تاریخیں لکھنا اس لئے پیدا ہوا کہ وہ واقعات کے اسباب کے جویا نہ تھے۔ ان کو یقین کامل تھا کہ ہر چیز اور ہر واقعہ کا اصل سبب اللہ ہے جس کو وہ مسبب الاسباب مانتے تھے۔ لہٰذا وہ تلاش اسباب کو بیکار دردسری سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمان مورخوں کا نظریۂ تاریخ یہ تھا کہ مؤرخ کو صرف واقعہ نگاری کرنا چاہیئے اور واقعات کی تاویل کرنے سے گریز کرنا چاہیئے۔ البتہ ان کا یہ مفروضہ ضرور تھا کہ امدادِ الٰہی ان کے ساتھ ہے۔ اس مفروضے کے علاوہ واقعات میں علت و معلول کا تعلق معلوم کرنا ان کے نزدیک تاویل تھی۔ جرمن مؤرخ رین کی (۱۷۹۵ء تا ۱۸۹۶ء) نے بھی اپنے زمانے میں صرف واقعہ نگاری پر اکتفا کیا اور تاویل بازی کو گناہ ٹھہرایا۔ تاویل کے ذریعہ مؤرخ کو اپنے تعصبات اور عقائد شامل کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

تیسرا نقص یعنی واقعات میں تضاد اس لئے پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے زمانے میں چھاپہ خانے نہ تھے۔ کتابیں قلمی ہونے کی وجہ سے کمیاب ہوتی تھیں۔ مؤرخ کو اپنے اور دوسروں کے حافظے پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ آج کل کی انگریزی کتابوں کی طرح ان کتابوں میں اشاریہ یعنی انڈکس نہ ہوتا تھا۔ ایک واقعہ معلوم کرنے کے لئے پوری کتاب پڑھنی پڑتی تھی۔ کتابوں کی کمیابی کا یہ حال تھا کہ جب ایک جویائے علم ابوبکر اخشی کو ایک کتاب کی ضرورت ہوئی تو حج کے موقع پر اس کو مکہ جانا پڑا۔ اور وہاں اس نے مطلوبہ کتاب حاصل کرنے کے لئے اعلان کرایا لیکن تب بھی وہ کتاب نہ مل سکی۔ اگر کتابیں ملتی بھی تھیں تو ان میں کتابت کی متعدد غلطیاں ہوتی تھیں۔

چوتھا نقص یعنی اپنے مربی حکمرانوں کی بیجا تعریف اس لئے پیدا ہوا کہ یہ مسلمان مؤرخ ایسے زمانے میں تھے جب حکومت شخصی ہوتی تھی۔ اور مؤرخ بادشاہوں کے ملازم ہوتے تھے۔ فارسی تاریخ نگاری کا تو ظہور ہی بادشاہوں کے زمانے میں ہوا۔ تمام مشہور فارسی تاریخیں چنگیزی حکمرانوں کے دور میں لکھی گئیں۔ ایسے حکمران مورخ کی صاف گوئی کس طرح برداشت کر سکتے۔ ابتدائی دور کی عربی تاریخیں اس نقص قصیدہ گوئی سے نسبتاً بری ہیں۔

پانچواں نقص یعنی امدادِ الٰہی کی بابت مفروضہ اور اسلام کی مسلسل کامیابیوں کا ذکر اس لئے پیدا ہوا کہ مسلمان مؤرخوں کا ایمان تھا کہ اسلام دنیا کی اصلاح کے لئے آیا ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے اس مقصد کو پورا کرے اور اپنے جان و مال کو قربان کرنے

کے لئے ہر وقت آمادہ رہے۔ گویا مسلمانوں کی تاریخ رُوح افزا ہونی چاہیئے۔ تاکہ مسلمانوں کا عقیدہ اللہ پر پختہ اور کامل رہے۔ آج کل کی تاریخیں تو اس نقص سے بھری پڑی ہیں۔ انگریز مورخوں کا یہ مفروضہ تھا کہ دولتِ انگلشیہ اس لئے قائم ہوئی کہ پسماندہ کالی قوموں کی اصلاح کا بوجھ اپنے کندھوں پر لے۔ اور ان کالی قوموں کی اصلاح کرے۔ چنانچہ انگریزی زبان میں ایک نیا محاورہ " وہائٹ مینس برڈن" (گوروں کا بوجھ) رائج ہوا۔

چھٹا نقص یعنی مسلمانوں کے ایمان کو تازہ کرنے کا مقصد اس سے پیدا ہوا کہ مسلمانوں کو شکست کا سامنا نہ کرنا پڑے اور دشمن کی زیادہ سے زیادہ فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ رہیں۔ گویا یہ چھٹا نقص بھی پانچویں نقص کی طرح اس مفروضہ کی وجہ سے پیدا ہوا کہ اللہ ہمیشہ مسلمانوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اور دیتا رہے گا۔ اگر شکست ہو تب بھی اللہ کی امداد سے نا اُمید نہ ہوں اور گرمیٔ قلب باقی رہے۔

ان نقائص سے ظاہر ہے کہ ہر مؤرخ اپنے ماحول کا بندہ ہوتا ہے اور اپنے زمانے کی ہر چیز کو اسی نظر سے دیکھتا ہے جو ماحول اس میں پیدا کر دیتا ہے۔ اپنے ماحول سے ورے دیکھنے کی اہلیت تو صرف انبیاء میں ہوتی تھی لیکن انبیاء کا تاریخ نگاری سے کبھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ تو تاریخ گر تھے تاریخ نگار نہ تھے۔

چھٹا باب

میرا خلف الرشید ابن خلدون

اب میں اپنے خلف الرشید ولی الدین عبدالرحمٰن ابن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) کا ذکر شروع کرتی ہوں۔ لیکن میں ہمیشہ اپنے شیدائوں کو تاکید کرتی رہتی ہوں کہ ہر مورخ کی تاریخ پڑھنے سے پہلے اس مؤرخ کے حالات زندگی معلوم کر لو۔ اور خصوصاً اس کے ماحول کو جس میں اس نے اپنی زندگی گزاری۔ یہ دُنیا کا پہلا مورخ ہے جس کو مجھ میں فلسفہ نظر آیا۔ لیکن ابن خلدون کی فلسفہ سے مُراد عبرت و حکمت تھی وہ قیاس آرائیاں نہیں جس پر فلسفہ مبنی ہے۔

چونکہ اس نے عبرت اور حکمت آموزی کو اپنا شیوہ بنایا اس لئے اس کے اپنے ماحول کا ذکر اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ مؤرخ کی طرح ہر فلسفی کے نظرئیے بھی اس کے ماحول کے مطابق ہوتے ہیں۔ جب مؤرخ یا فلسفی کا ماحول پُر آشوب ہوتا ہے اس پہ قنوطیت سوار ہو جاتی ہے اور اس کو ہر چیز میں آشوب ہی نظر آتا ہے۔ علاوہ زمانے کے ابن خلدون کی اپنی زندگی بھی پُر آشوب ہی رہی۔

پہلا فلسفی تاریخ میں نے اوپر کہا ہے کہ ابن خلدون پہلا مؤرخ ہے جس کو مجھ میں فلسفہ نظر آیا۔ اس سے ایک ہزار سال پہلے اسی سرزمین مغرب الاقصیٰ میں ایک اور شخص

سینٹ اگسٹائن (۳۵۴ء تا ۴۳۰ء) نامی نے میرے واقعات کی تاویل کی لیکن یہ شخص پادری تھا۔ اس لئے اس کی تاویل مذہب پر مبنی تھی۔ اور عقل سے کوئی مناسبت نہ رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ اس پادری نے مجھے فلسفی کا لقب نہ دیا۔ لیکن ابن خلدون کو تو مجھ میں مکمل فلسفہ نظر آیا۔ ساتھ ہی ان دونوں کے ماحول تقریباً یکساں تھے۔ سینٹ اگسٹائن کے زمانے میں وحشی اقوام نے الارک (۳۷۰ء تا ۴۱۰ء) کی قیادت میں روم کا خاتمہ کیا۔ اور ہزار سالہ رومۃ الکبریٰ کی کہانی ختم ہوئی۔

اسی طرح ابن خلدون کو عالم اسلام کی بربادی دیکھنی پڑی۔ تمام مغرب طاعون کا شکار ہوا۔ یہ وہی مغرب تھا جو بقول ابن خلدون "ایک زمانے میں بحیرۂ روم سے لے کر ملک حبشہ تک آباد اور شاداب تھا لیکن اب وہاں سوائے چٹیل میدان۔ بنجر اور ریگستان کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ الغرض ابن خلدون کو ہر طرف بربادی ہی نظر آتی تھی۔

اس کے علاوہ اس کے خاندان کو اور اس کو خود بربادیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے خاندان کو اپنا وطن اندلس چھوڑنا پڑا۔ جہاں آخری اسلامی حکومت غرناطہ دم توڑ رہی تھی اس کا خاندان اشبیلیہ میں بڑا معزز سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کے تمام اقربا عالم و فاضل تھے۔ خود ابن خلدون حافظ قرآن ہونے کے علاوہ فاضل حدیث و فقہ بھی تھا۔ یہ سب حالات اس نے اپنی خود نوشتہ سرگذشت میں لکھے جو آج تک دستیاب ہے۔ جب وہ جوان ہوا تو طاعون کی وبا پھیلی اور اس کے والدین بھی اس وبا کا شکار ہوئے اور بقول اس کے "عمائدین۔ قائدین اور علماء کا خاتمہ ہوا"۔ مجبور ہو کر ابن خلدون کو

مراکش میں پناہ لینی پڑی جہاں حکمران تونس نے اس کو صاحب مہر مقرر کیا۔

ابن خلدون کا پُرآشوب زمانہ

اس زمانے میں تمام مغرب طوائف الملوکی کا شکار تھا جہاں آئے دن انقلاب ہوتے رہتے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر ابن خلدون نے مراکش واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن مراکش بھی نذرِ انقلاب ہوا۔ اور ابن خلدون کی آمد سے پہلے سلطان ابو اعینان کے ہاتھ حکومت آگئی جس نے ابن خلدون کو اپنی مجلس علماء کا رکن مقرر کیا۔ اور اس کے بعد اسکو اپنا میر منشی مقرر کیا۔ لیکن ابن خلدون نے اس عہدے کو اپنے شایانِ شان نہ سمجھا۔ لیکن وقت گزارنے کی خاطر اس عہدے کو قبول کر لیا۔ اور ساتھ ہی مطالعۂ کتب بھی شروع کر دیا۔ لیکن اب اس نے وہ سازشیں بھی شروع کیں جن کی وجہ سے اس کو دربدر ہونا پڑا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ چھوٹی چھوٹی حکومتیں آپس میں برسرپیکار رہیں تا کہ اس کو ترقی کا موقع ملے۔

مراکش میں بھی ابن خلدون چین سے نہ بیٹھا۔ اس وقت مراکش کے پایۂ تخت فاس میں ایک مغربی چھوٹی ریاست کا حکمران ہوا۔ ابو عبداللہ محمد والئی بجایہ مقید تھا۔ ابنِ خلدون نے اس قیدی سے سازش شروع کی اس شرط پر کہ اگر ابو عبداللہ قید سے بھاگ نکلے اور اپنی سلطنت پر پھر قابض ہو جائے تو وہ ابنِ خلدون کو اپنا وزیر مقرر کرے گا لیکن ابنِ خلدون کے آقا کو اس سازش کا بروقت پتہ چل گیا اور اس نے ابنِ خلدون کو مقید کر دیا۔ گو بعد میں ابو عبداللہ رہا ہو کر اپنی سلطنت میں واپس آگیا لیکن ابن خلدون قیدی رہا۔ یہ واقعہ ۱۳۵۷ء میں پیش آیا۔

جب ابن خلدون کی عمر پچیس سال تھی۔

ابن خلدون کی سرگردانی

ابن خلدون نے دو سال قید میں گزارے سلطان مراکش کی وفات کے بعد اس کو رہائی ملی اور اپنے پُرانے عہدے پر بحال ہوا۔ لیکن بعد وفات سُلطان متوفی سلطان کا وزیر حسن ابن عمر نامی نے حکومت پر قبضہ جمایا۔ لیکن متوفی سلطان کے بھائی ابو سلیم نے سلطنت مراکش پر قبضہ کرنا چاہا۔ وزیر بمعہ اپنے کٹھ پُتلی سلطان فرار ہوا اور سلطنت بجائے ابو سلیم کے منصور کے ہاتھ آئی۔ ابن خلدون ابو سلیم سے مِل گیا اور بربر سرداروں کو اُکسا کر منصور کے خلاف بغاوت کرا دی۔ ابو سلیم کے ہاتھ پھر سلطنت آگئی جس نے ابن خلدون کو پھر میر مُنشی مقرر کیا۔

دو سال بعد ابن خلدون قاضی القضاۃ مقرر ہوا جس پر دیگر عمائدین حکومت میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ جس سے سلطان ابن سلیم ابن خلدون سے بدظن ہوگیا۔ اسی عرصے میں اس سلطان کے خلاف امرا نے بغاوت شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سُلطان مذکور مارا گیا اور اب حکومت پھر وزیر ابن عمر کے ہاتھ آگئی۔ اس بغاوت کے دوران میں ابن خلدون تاڑ گیا تھا کہ ابن عمر کامیاب ہوگا اور اس لئے ابن خلدون نے اس باغی وزیر کا ساتھ دیا۔ وزیر نے حُسن خدمت کے صلے میں ابن خلدون کی تنخواہ بڑھا دی لیکن یہ شخص تو بڑے اونچے خواب دیکھ رہا تھا اور اس کو امید تھی کہ اس کا دوست اب اُسے کم از کم وزارت کا عہدہ دے گا۔ ناراض ہو کر ابن خلدون مستعفی ہوگیا اور بمشکل تمام ابن عمر سے اجازت حاصل کر کے غرناطہ واپس آگیا جہاں اس وقت محمد ابن یوسف برسرِ حکومت

تھا۔ لیکن مراکش کا معزول شدہ سلطان ابوعینان بھی یہاں موجود تھا۔
غرناطہ میں اس وقت وزارت مشہور مورخ اور شاعر ابن الخطیب مصنف "الاحاطہ فی الاخبار غرناطہ" کے ہاتھ میں تھی لیکن ۱۳۶۰ء میں غرناطہ میں بھی انقلاب نمودار ہوا۔ اور اس انقلاب کے نتیجہ میں ابن الخطیب مارا گیا۔ قتل سے پہلے ابن خلدون اور ابن الخطیب کے درمیان دوستی قائم ہو گئی تھی۔ لیکن یہ دونوں دوست ہوس حکومت میں بُری طرح گرفتار تھے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔
ابن خلدون کو یقین تھا کہ غرناطہ میں اس کو وزارت کا عہدہ ملے گا لیکن ابن خلدون کی یہ اُمید پوری نہ ہوئی۔ البتہ سلطان محمد والئ غرناطہ نے ابن خلدون کو عیسائی حکمران قسطیلیہ کے دربار میں بطور ایلچی بھیجا۔ جہاں ابن خلدون کی بڑی آؤ بھگت ہوئی بلکہ اس عیسائی حکمران نے اس کو مُلازمت بھی پیش کی لیکن ابن خلدون نے انکار کر دیا۔
ابن الخطیب کے قتل سے پہلے ہی سے والئ غرناطہ ابن خلدون سے بدظن ہو گیا تھا۔ غرناطہ کے انقلاب سے پہلے ہی ابن خلدون تاڑ گیا تھا کہ بہت جلد غرناطہ میں فساد برپا ہو گا۔ اسی زمانے میں والئ بجایہ کی طرف سے ابن خلدون کے پاس دعوت نامہ پہنچا جس کو ابن خلدون نے فوراً قبول کیا۔ اور غرناطہ چھوڑ کر بجایہ واپس آ گیا۔ جہاں سلطان ابوعبداللہ نے اس کو اپنا حاجب (وزیر) مقرر کیا۔
یہ واقعہ ۱۳۶۴ء کا ہے لیکن ایک سال بعد ہی امیر قسطنطین ابوالعباس نامی نے بجایہ پر چڑھائی کی۔ اور سلطان ابوعبداللہ مارا گیا۔ ابن خلدون فوراً ابوالعباس سے مل گیا اور شہر اس کے حوالے کر دیا۔ کچھ دنوں

ابن خلدون بجایہ میں رہا اور ابوالعباس نے اس کی وزارت کو قائم رکھا لیکن جب ابن خلدون نے اپنے نئے آقا کے تیور بدلتے دیکھے تو ابن خلدون فرار ہوکر بیسکرہ پہنچا جہاں اس کو امیر ابو حمو حکمران تلمسان کا دعوت نامہ ملا کیونکہ یہ حکمران تلمسان بجایہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا اور اس کو معلوم تھا کہ بجایہ میں ابن خلدون با اثر تھا۔ لیکن ابن خلدون نے آنے سے انکار کردیا۔ البتہ اس نے بجایہ میں اپنی طرف سے کچھ لوگوں کو بھیجا تاکہ وہ حکمران تلمسان کے حق میں کوشش کریں لیکن چند دنوں بعد حکمران تلمسان سے بھی ناراض ہوگیا اور اس حکمران کے خلاف بھی اس نے سازشیں شروع کردیں لیکن اس زمانے میں وہ بیسکرہ ہی میں مقیم رہا۔

جب سلطان عبدالعزیز نے تلمسان پر ۱۳۷۰ء میں قبضہ جمایا تو ابن خلدون اب اس سلطان عبدالعزیز کے حق میں ہوگیا اور اس کے لشکر میں شریک ہوکر سابق حکمران تلمسان ابو حمو کا پیچھا کیا۔ لیکن ابن خلدون کی اس سلطان عبدالعزیز سے بھی نہ بنی اور بالآخر ابن خلدون پھر غرناطہ واپس پہنچا۔ کیونکہ اب تمام حکمران مغرب ابن خلدون کے خلاف ہوگئے تھے اور اس کو اوّل درجے کا سازشی سمجھتے تھے۔ اس وقت والئ غرناطہ ابو احمر نامی تھا جس کے دربار میں ابن خلدون نے پناہ لی۔ لیکن سلطان ابو حمو حکمران مراکش نے ابو احمر کو لکھا کہ وہ فوراً ابن خلدون کو مراکش واپس بھیجے۔ ابو احمر بھی اب ابن خلدون سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔

تصنیف "مقدمہ" ابن خلدون بالآخر ۱۳۷۴ء میں تلمسان واپس آیا۔ لیکن ایک سردار قبیلہ کی سفارش پر ابو حمو نے ابن خلدون کا

قصور معاف کر دیا اور ابن خلدون نے تنگ آکر فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنا سارا وقت کتب بینی پر صرف کرے گا۔ گو ابو حمو ابن خلدون سے بدظن تھا لیکن پھر بھی ابو حمو نے اس کو قلعہ سلامہ میں رہنے کی اجازت دے دی۔ یہاں ابن خلدون نے چار سال گزارے اور یہیں اس نے اپنا مشہور عالم "مقدمہ" لکھا اور ساتھ ہی اس نے اپنی مشہور تاریخ لکھنا شروع کی۔ لیکن تاریخ نگاری کے لئے اس کو کتابوں کی ضرورت محسوس ہوئی جو صرف اس کے وطن شہر تونس میں پوری ہو سکتی تھی۔ جہاں اس وقت متعدد کتب خانے تھے۔ ۱۳۷۷ء میں وہ اپنے "مقدمہ" کی تکمیل کر چکا تھا اور اپنی "تاریخ" کی ابتدا کر چکا تھا۔ اس تاریخ کی تکمیل کی خاطر اس نے قلعہ سلامہ کی رہائش ترک کی اور ۱۳۷۸ء میں تونس پہنچا۔

اس وقت شہر تونس سلطان ابوالعباس کے قبضے میں تھا جو ایک زمانے سے ابن خلدون سے ناراض تھا۔ اس لئے ابن خلدون نے اس سلطان سے معافی چاہی۔ سلطان نے بھی اس کا قصور فوراً معاف کر دیا۔ کیونکہ اب ابن خلدون اپنے علم و فضل کے لئے مشہور ہو چکا تھا۔ سلطان ابوالعباس نے اس کا صرف قصور ہی معاف نہ کیا بلکہ اس کے آرام و رہائش کے لئے جملہ سامان بھی مہیا کیا اور ترغیب دی کہ وہ اپنی تاریخ کی تکمیل کرے۔ جب ابوالعباس اپنی مہم سے واپس آیا تو اس نے ابن خلدون کو اپنا مصاحب بھی مقرر کیا۔ جس پر اس کے رقیب اس سے حسد کرنے لگے۔

ان رقیبوں میں مفتی اعظم ابن عرفہ پیش پیش تھا جو بقول ابن خلدون اس سے اس لئے جلتا تھا کہ علم و فضل میں وہ ابن خلدون کی برابری

نہ کر سکتا تھا۔

ایک عرصے تک تو ابن خلدون ان سازشوں کے اثر سے محفوظ رہا اور اس عرصے میں اس نے اپنی تاریخ مکمل کر کے سلطان ابوالعباس کی خدمت میں ۱۳۸۲ء میں پیش کی اور ساتھ ہی سلطان مذکور کی شان میں ایک قصیدہ بھی پیش کیا۔ ابن خلدون قصیدہ گوئی میں بھی ماہر تھا۔ اس قصیدے کے ایک اقتباس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

صرف آپ ہی کا گھر غریب الوطنوں کی پناہ گاہ ہے

صرف آپ ہی آرزومندوں کے مربیّ ہیں

اسی قصیدے میں ابن خلدون نے اپنی تصنیف کے متعلق کہا:۔

اس تاریخ میں اقوام اور زمانے کا ذکر اس طرح ہے کہ صاحبِ عدل اس سے سبق حاصل کریں۔

اس (تاریخ) میں قدیم کتابوں کا خلاصہ ہے اور میں نے اس میں قدیم مصنفوں کی کمی کو پورا کیا ہے۔

میرا طرزِ بیان صاف اور چکنا ہے۔ گویا مجھے اس بیان پر قابو ہے۔ میں اس تاریخ کو آپ کی شان اور آپ کی دولت سے منسوب کرتا ہوں۔ واللہ میں نے اس تاریخ میں قطعاً مبالغہ نہیں کیا۔ میں مبالغہ سے نفرت کرتا ہوں۔ (حوالہ نمبر ۱)

ابن خلدون کے دشمن اس کے اپنے بیان کے مطابق اس کے پیچھے پڑے رہے۔ ابوالعباس ابن خلدون کو ایک مہم میں اپنے ساتھ لے گیا اور اس کو لاچار جانا پڑا۔ جب دوسری مرتبہ سلطان نے اس کو ساتھ چلنے کا حکم دیا تو ابنِ خلدون نے تنگ آ کر حج کے بہانے سے استعفیٰ دیدیا۔

عمائدین اور طلبا نے اس کا رخصتی جلوس نکالا اور ۱۳۸۲ء میں وہ مصر پہنچا۔ اس کے بعد ابن خلدون کو وطن واپس آنا نصیب نہ ہوا۔

مصر میں قیام ۱۳۸۲ء تا ۱۴۰۶ء

جب ابن خلدون مصر پہنچا تو اس کی عمر ۵۲ سال کو پہنچ چکی تھی۔ اتنی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ اب وہ اپنا وقت درس و تدریس میں گذارے لیکن ہوسِ حکومت نے اس کا یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اس کی آمد سے پہلے اس کی شہرت مصر میں پہنچ چکی تھی۔ اس وقت یہ ملک اپنے علوم و فنون کے لئے مشہور تھا اور قاہرہ جملہ علوم کا مرکز تھا۔ مصر پہنچ کر ابن خلدون نے اپنے بال بچوں کو بلایا مگر راستے میں جہاز غرق ہو گیا۔

شہر قاہرہ کو دیکھ کر ابن خلدون ہکا بکا رہ گیا۔ اس شہر کو اس نے دارالحکومت عالم قرار دیا۔ اس نے لکھا:۔

"میں نے اس مرکزِ عالم کو دیکھا۔ یہ فردوس کائنات ہے... جہاں مختلف قوموں کے لوگ آباد ہیں... یہ مرکزِ اسلام ہے..."

اس وقت مصر کا حکمران ملک الظاہر تھا جو ابن خلدون کی آمد سے دس دن پہلے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس سلطان نے بھی ابن خلدون کی آؤ بھگت کی۔ چند دنوں بعد ہی اس علامۂ وقت نے جامع الازہر میں سلسلۂ درس شروع کیا۔ طلبا ٹوٹ پڑے اور چند مہینوں کے اندر اس کی شہرت مصر کے ہر شہر میں پہنچ گئی۔ اب ابن خلدون نے مصر میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

مصر میں ابن خلدون کے درس کا وہی موضوع تھا جو اس کے

"مقدمہ" کا موضوع ہے۔ اس کے طلبار میں تقی الدین مقریزی اور حافظ ابن حجر بھی شامل تھے۔ جنہوں نے بعد کو بڑی شہرت پیدا کی۔ سلطان ملک الظاہر نے ابن خلدون کو قیمحیہ میں مدرس (پروفیسر) مقرر کیا جہاں مالکی فقہ کا درس دیا جاتا تھا۔ ۱۳۸۴ء میں سلطان نے ابن خلدون کو فرقہ مالکیہ کا قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ لیکن ابن خلدون پردیسی تھا اس لئے مقامی علمار اس کے خلاف ہو گئے۔ ابن خلدون نے جو وجہ مخالفت بیان کی ہے وہ یہ تھی کہ میں نے اس معزز عہدے کو سنبھالنے کے بعد بغیر کسی قسم کی طرفداری کے اللہ کے قوانین بلا خوف و خطر نافذ کئے اور طرفین مقدمہ کے ساتھ مساوی سلوک کیا۔ کمزوروں کی حمایت کی۔ طرفین کی طرف سے سفارشوں کی پرواہ نہ کی۔۔۔۔۔"

ہم عصروں اور قریب العہد سوانح نگاران ابن خلدون نے بھی اس کے عدل و انصاف کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً ابوالمحاسن لکھتا ہے کہ ابن خلدون "بڑی قابلیت اور شان سے انصاف کرتا تھا۔ وہ عمائدین اور اعلیٰ افسروں کی سفارشوں کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ اس لئے ان لوگوں نے ان کے خلاف مہم شروع کی۔"

الغرض چند مہینوں کے اندر ہی ابن خلدون کے خلاف سازشوں نے ایسا زور پکڑا کہ اس کے بقول "عمائدین دولت اور اس کے درمیان فضا تاریک ہو گئی" اور اس کو اس عہدۂ قاضی القضاۃ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ لیکن سلطان اس سے ناراض نہیں ہوا اور وہ برابر مدرسہ قیمحیہ میں درس دیتا رہا۔ اس کے بعد سلطان نے اپنے نام پہ ظاہریہ برقوقیہ قائم کیا اور ابن خلدون کو اس مدرسے کا بھی مدرس مقرر کیا۔ ۱۳۸۷ء

میں ابنِ خلدون نے حرمین کی زیارت کی۔ واپسی پر سلطان نے اس کو مدرسہ ضرغتمش میں مدرس حدیث مقرر کیا۔

ابن خلدون کی خود نوشتہ سرگذشت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ نو آمد مدرس جب پہلا سبق دیتا تھا تو اس موقعے پر علاوہ طلبار کے علمار بھی موجود ہوتے تھے اور اس طرح پہلے ہی دن مدرس کی قابلیت کے متعلق رائے قائم کرلی جاتی تھی۔ ابنِ خلدون کے اپنے بیان کے مطابق ہر ایسے موقع پر اس نے علمائے وقت کو متاثر کیا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی مخالفت ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ ابن خلدون پردیسی تھا یا علمار وقت کا حسد تھا۔ جس کے لئے علمار ہمیشہ بدنام رہے ہیں۔ مدرسہ ضرغتمش میں ابن خلدون نے امام مالک کی کتاب "موطّا" پڑھانی شروع کی۔

لیکن ابن خلدون اس مدرسہ سے بھی علیحدہ ہوا۔ اب اس کو بیبرس کی خانقاہ کا شیخ مقرر کیا گیا اور اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا۔ لیکن پھر بھی اس کو امن چین نصیب نہ ہوا جہاں ابن خلدون کے قدم جاتے تھے۔ وہاں انقلاب ضرور ہوتا تھا۔ اب مصر میں بھی سلطان ملک الظاہر کے خلاف بغاوت شروع ہوئی اور سابق سلطان صالح کو تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن ملک الظاہر نے پھر تخت حاصل کرلیا اور ابن خلدون پھر اپنی مشیخت خانقاہ پر بحال ہوا۔ لیکن کچھ دنوں بعد سلطان ملک الظاہر نے ابنِ خلدون کو پھر قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ ملک الظاہر کی وفات کے بعد سنہ ۸۰۱ھ میں وہ اس عہدہ قضا سے پھر برخاست کیا گیا اور

اب وہ بیت المقدس بغرض زیارت و سیاحت پہنچا۔

ابن خلدون اور تیمور کی ملاقات

بیت المقدس سے واپسی کے بعد خبر آئی کہ تیمور لنگ نے شام پر قبضہ کر لیا۔ یہ واقعہ ۸۰۱ھ کا ہے جب ابن خلدون بے روزگار ہو چکا تھا سلطان فرج نے مقابلے کی تیاریاں کیں کیونکہ شام اس زمانے میں مصر کا جزو تھا۔ سلطان ابن خلدون کو اپنے ساتھ لے کر بمعہ لشکر دمشق پہنچا۔ ابن خلدون کے علاوہ دیگر علماء اور فقہا بھی سلطان کے ہمراہ تھے لڑائی شروع ہی ہوئی تھی کہ سلطان فرج کے پاس خبر آئی کہ مصر میں خود بغاوت شروع ہونے والی ہے۔ چنانچہ سلطان شام کو چھوڑ کر مصر واپس چلا گیا۔ اب دمشق میں صرف یہ علماء بمعہ ابن خلدون رہ گئے۔ تیمور نے دمشق کا محاصرہ کیا اور حالت نازک ہو گئی ابن خلدون کو اپنی جان خطرے میں نظر آئی۔ جب تیمور کا لشکر شہر میں داخل ہو گیا تو اس پر ابن خلدون نے تیمور کے پاس جانے کا فیصلہ کیا اور اس کو شہر کی دیوار سے نیچے اُتارا گیا جہاں اس کی ملاقات تیمور کے فرزند شاہ ملک سے ہوئی۔ ابن خلدون نے تیمور سے ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ تیمور کو خبر بھیجی گئی کہ ایک مغربی قاضی مالکیہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

تیمور لنگ کے ساتھ ایک بڑا کٹر حنفی فقیہہ عبدالجبار ابن نعمان نامی رہتا تھا۔ جب تیمور کے سامنے مسلمان علما قید کر کے لائے جاتے تھے تو یہ عبدالجبار ان علماء کے عقیدوں کا امتحان لیتا تھا اور ذرا سے اختلاف کی بنا پر بھی ان کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح یہ شخص

سینکڑوں علماء کو قتل کرا چکا تھا۔ جب ابن خلدون تیمور کے سامنے پیش کیا گیا تو یہی عبدالجبار ترجمان مقرّر ہوا کیونکہ تیمور عربی داں نہ تھا۔ ابن خلدون اور تیمور کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا اقتباس ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ پوری گفتگو ابن خلدون کی اپنی بیان کردہ ہے۔ (حوالہ نمبر ۳)

تیمور:۔ تم مغرب کے کس علاقے سے آئے اور کیوں آئے؟

ابن خلدون: میں نے حج کی خاطر وطن چھوڑا اور بحری راستے سے مصر پہنچا.....

تیمور: ملک الظاہر نے تمہارے لئے کیا کیا؟

ابن خلدون: اس نے بڑی قدر سے میری حیثیت کا اعتراف کیا۔ میری خاطر مدارات کی اور میرے حج کے لئے سامان مہیّا کیا.... میری واپسی پر میرا وظیفہ مقرّر کیا....

تیمور: اس نے تمہیں قاضی کس طرح مقرّر کیا؟

ابن خلدون: مالکی فرقے کا قاضی وفات پا چکا تھا۔ سلطان کو مطلوبہ قابلیت مجھ میں نظر آئی.... لیکن جب ملک الظاہر مرا تو اہل حکومت نے مجھے علیحدہ کر دیا کیونکہ وہ مجھ سے ناراض تھے

(اس گفتگو کے بعد تیمور نے ابن خلدون سے اس کے وطن کے حالات پوچھے اور حکم دیا کہ مغرب الاقصار کے حالات لکھ کر ہمارے سامنے پیش کرو۔ اسی سرگذشت میں ابن خلدون یہ بھی لکھتا ہے کہ مصر آنے سے پہلے مغرب کے منجموں نے مجھے بتایا تھا کہ ۷۸۴ھ ہجری (مطابق ۱۳۸۲ء) میں ایک طاقتور ہستی خیمہ نشینوں میں نمودار ہوگی جو حکومتوں

کا تختہ اُلٹ کر آباد دنیا پر قبضہ کرلے گی۔ اس لئے میں اس ہستی کا منتظر تھا۔ اس لئے میں نے طے کیا کہ میں اس پیشین گوئی کا ذکر تیمور کو سناؤں گا تاکہ وہ مجھ سے خوش ہو۔ جب ابن خلدون تیمور کے سامنے دوبارہ پیش کیا گیا تو اس نے بطور تمہید اس پیشین گوئی کا ذکر کیا جس پر ترجمان عبدالجبار نے ابن خلدون سے بڑے ٹیڑھے ٹیڑھے سوال کئے جن کے جوابات کے لئے ابن خلدون پہلے سے تیار تھا۔ اب یہ سوال و جواب بھی ابن خلدون کی زبانی سنیئے)۔

ابن خلدون: میں آج سے تیس چالیس سال پیشتر ہی سے حضور کا منتظر تھا۔

ترجمان: اس کی وجہ بیان کرو۔

ابن خلدون (مخاطب بہ تیمور) اس کے دو وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ حضور سلطان کائنات اور حکمران عالم ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ حضور جیسا حکمران انسانوں میں آدمؑ سے لے کر آج تک کوئی نہیں پیدا ہوا۔ یہ بات میں محض قیاساً نہیں کہہ رہا کیونکہ میں عالم ہوں اور جانتا ہوں کہ حکومت کی بنیاد عصبیت پر ہی ہوتی ہے۔ جتنی بڑی جماعت ہوتی ہے۔ اسی حساب سے اس جماعت کو حکومت حاصل ہوتی ہے۔ تمام علماء از اوّل تا آخر اس بات پر متفق ہیں کہ دُنیا کے بیشتر لوگ دو جماعتوں یعنی عربوں اور ترکوں میں منقسم ہیں۔ حضور جانتے ہیں کہ عربوں نے پیغمبر کے زیر قیادت متحد ہو کر کس طرح حکومت حاصل کی۔ اب رہا ترکوں کا معاملہ۔ سو انہوں نے بھی شاہان ایران سے

مقابلہ کیا۔ اور افراسیاب نے خراسان پر قبضہ کیا۔ جس سے یہ بات ثابت ہے کہ ترک بھی شاہانہ نسل سے ہیں۔ عصبیت کے معاملے میں دُنیا کا کوئی بادشاہ ترکوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا نہ خسرو نہ قیصر نہ سکندر نہ بنو قدنزار ان کے سامنے ٹھہر سکتا ہے۔ ایرانیوں کے بادشاہ خسرو تھے لیکن کہاں ایرانی اور کہاں تُرک!!! قیصر اور سکندر رومیوں (یعنی یونانیوں) کے بادشاہ تھے۔ لیکن کہاں رومی اور کہاں تُرک!!! اب رہا بنو قدنزار کا معاملہ سو وہ بابلیوں اور بناطیوں کا بادشاہ تھا۔ لیکن کہاں یہ لوگ اور کہاں تُرک!!! اس لئے اس بادشاہ تیمور کے لئے جو میں کہتا ہوں وہ بالکل مُسلّم ہے۔ حضور کے انتظار کی میری دوسری وجہ یہ تھی کہ فال گو اور اولیائے مغرب بھی حضور کی آمد کی بشارت دیا کرتے تھے۔

(اس گفتگو کے بعد ابن خلدون نے تیمور کے سوالوں کا ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیمور قدیم زمانے کی تاریخ کا ماہر تھا)۔

ابن خلدون کی آخری ملاقات جو تیمور سے ہوئی اور جو گفتگو ہوئی وہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس گفتگو کا اقتباس درج ذیل ہے۔

اس مرتبہ ابن خلدون قرآن کا ایک قلمی مرصع نسخہ۔ ایک خوبصورت مصلیٰ اور نعت نبیؐ کا ایک نسخہ اپنے ساتھ لایا۔ بوقت باریابی ابن خلدون نے قرآن کھولا۔ تیمور فوراً اٹھا اور قرآن کو اپنے سر پر رکھا۔ اس پر ابن خلدون نے مٹھائی کے ڈبے بھی پیش کیے۔ تیمور نے اس مٹھائی کو

چکھا اور حاضرین میں اس مٹھائی کو تقسیم کرایا۔ اب گفتگو شروع ہوئی

ابن خلدون : اللہ حضور کی امداد کرے۔ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں

تیمور : کہو

ابن خلدون : میں اس مُلک میں دو لحاظ سے غریب الدیار ہوں اوّل میں اپنے وطن مغرب سے دُور ہوں۔ دوم میں قاہرہ سے غیر حاضر ہوں۔ جہاں میرے لوگ منتظر ہیں۔ میں حضور کے زیر سایہ ہوں اور مجھے امید ہے کہ حضورؐ مجھے بتائیں گے کہ میں کس طرح اس غُربت میں بسر کروں

تیمور : جو کچھ تمہیں مانگنا ہو مانگ لو۔ میں پُورا کروں گا۔

ابن خلدون : میری جلاوطنی نے میری خواہشوں کو بھی مٹا دیا۔ اب حضور ہی میری خواہش کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

تیمور : تم میرے خیمے میں پہنچ کر میرا انتظار کرو۔ انشاء اللہ میں تمہاری بڑی سے بڑی خواہش کو پورا کروں گا۔

ابن خلدون : میری ایک اور بھی التجا ہے۔ وہ یہ کہ اس شہر کے تمام قاری، مُنشی۔ ملازمین محکمہ اور حکام جو سلطان مصر یہاں چھوڑ گیا اب حضور کے زیر سایہ ہیں۔ حضور ان کی طرف سے غافل نہ ہوں....

تیمور : تم ان لوگوں کے لئے کیا مانگتے ہو؟

ابن خلدون : میں ان کے لئے امان نامہ کا طلبگار ہوں۔

(ابن خلدون نے یہ امان نامہ ضرور حاصل کیا کیونکہ وہ اور اس کے ساتھی کئی علماء اسی امان نامہ کی بناء پر قاہرہ واپس پہنچ سکے۔

بمشکل تمام ابن خلدون نے تیمور سے جان چھڑائی اور وہ بھی اس بہانے سے کہ مصر واپس ہو کر وہ اپنی تاریخ کو مکمل کرے گا اور اس تاریخ کو تیمور کے نام سے منسوب کرے گا۔ مصر واپس پہنچ کر ابن خلدون پر پھر ہوسِ حکومت سوار ہوئی اور تیسری بار پھر وہ قاضی القضاۃ مقرر ہوا۔ ایک سال پھر وہ برخاست ہوا اور اس پر چند الزامات بھی لگائے گئے لیکن پھر بھی وہ چوتھی دفعہ اس عہدے پر مقرر ہوا۔ اسی طرح دو مرتبہ اور اس نے یہ عہدہ حاصل کیا۔ آخری مرتبہ وہ صرف چند ہفتے اس عہدہ پر رہا اور ۱۴۰۶ء میں فوت ہوا۔

ابن خلدون کی سیرت

یہ بالکل صحیح ہے کہ ابن خلدون جہاں جاتا تھا۔ وہاں انقلاب رُونما ہوتا تھا جس کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر نہیں لیکن اس نے اپنے زمانے کی سازشوں سے پرہیز کرنے کے بجائے ان سازشوں میں بدل وجان شرکت کی۔ وفاشعاری اس کی فطرت ہی میں نہ تھی۔ حکومت اور مراتب حاصل کرنے کے لئے وہ بُرے کام کو جائز سمجھتا تھا۔ آج جس حکمران کی شان میں وہ قصیدے لکھ رہا ہے کل اسی کے خلاف سازش کرتا ہے۔ حتّٰی کہ تیمور جیسے سفّاک اور ظالم انسان کی مدح سرائی کرتا ہے اور اپنا کام نکالتا ہے۔ الغرض ابن خلدون اپنے انحطاط پذیر زمانے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے بجائے سازشوں میں شریک ہوا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اہل عمل اور اہل قلم کی استعداد میں بڑا فرق ہوتا ہے اور اہل قلم کے لئے چالاکیاں مناسب نہیں۔ اس کے باوجود جو مقام بحیثیت مفکر ابن خلدون نے عالم اسلام

میں حاصل کیا وہ لاثانی ہے۔ دورِ جدید کے مغربی مؤرخ تو اس کو آسمان پر چڑھاتے ہیں۔ پروفیسر ٹوئن بی اپنی کتاب " اسٹیڈی آف ہسٹری" میں لکھتے ہیں :- (حوالہ نمبر ۳)

" جہاں تک علم کا تعلق ہے عربی ادب ایک ہی آدمی کے نام سے روشن ہے اور وہ آدمی ہے ابنِ خلدون۔ عیسائی دُنیا اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی حتیٰ کہ افلاطون، ارسطو اور سینٹ آگسٹائن بھی اس کے ہم پایہ نہ تھے"

ابنِ خلدون ہمارے سامنے تین حیثیتوں سے پیش ہے :-

اوّل بحیثیتِ مؤرخ۔

دوم۔ بحیثیتِ بانیٔ فلسفۂ تاریخ۔

سوم۔ بحیثیتِ بانی اور پیشوائے علمِ عمرانیات۔

اس کی اصل شہرت اس کے "مقدمہ" پر مبنی ہے۔ تاریخ پر نہیں۔ اسی "مقدمہ" میں اس نے عمرانیات کی بُنیاد ڈالی۔

ابن خلدون کے فلسفۂ تاریخ کا آغاز اس کے نظریہ تاریخ سے ہوتا ہے۔ اس کے زمانے میں تاریخ نگاری کا جو طریقہ تھا اس سے وہ بد دل ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ :- (حوالہ نمبر ۴)

" جب میں نے ایسی تاریخوں کا مطالعہ کیا اور ان کو اُصول پر پرکھا اور جانچا تو یک بیک میں خوابِ غفلت سے جاگا اور خود ایک کتاب لکھنے کا عزم کیا..... اور قوموں کے حالاتِ پوشیدہ کو بے نقاب کیا۔ اخبار و اعتبار کے ماتحت اس کو مختلف ابواب پر ترتیب دیا اور ان میں حکومتوں کی

ابتدا اور ان کے آغاز کے اسباب و علل کو کھولا۔ میں نے اس کتاب کی بنا ایسی قوموں کے حالات پر رکھی جو دورِ حاضر میں مغرب میں آباد ہیں۔۔۔۔۔"

اس کا ارادہ تو بڑا بلند تھا لیکن جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے اس کی نظر بلادِ مغرب تک ہی محدود رہی۔ یہاں بلادِ مغرب سے ابنِ خلدون کی مراد ان حکومتوں سے ہے جو شمالی افریقہ میں رُونما ہوتی رہتی تھیں اور چند سالوں ہی میں ختم بھی ہو جاتی تھیں۔ رومیوں کی تاریخ کا مطالعہ ابنِ خلدون نے نہیں کیا اس لئے جو نتائج ابن خلدون نے اخذ کئے ان میں خامی رہ گئی۔ مثلاً اس نے بلادِ مغرب کی حکومتوں کو دیکھا کہ کتنی جلد وہ نذرِ زوال ہو جاتی تھیں۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ جس طرح خاندان فرداً فرداً چار پیڑھیوں کے بعد ختم ہو جاتے ہیں اسی طرح حکومتیں بھی ختم ہوتی ہیں۔ اس کا یہ کلیہ خاندان کے متعلق تو سہی ہے لیکن قومیں اتنی جلد ختم نہیں ہوتیں۔ اگر ابن خلدون دولت رومۃ الکبریٰ کی تاریخ سے واقف ہوتا تو وہ چار پیڑھیوں والا کلیہ حکومتوں اور قوموں کے متعلق نہ قائم کرتا۔

ابنِ خلدون کا نظریۂ تاریخ

لیکن ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ اس کا نظریۂ تاریخ باوجود اس خامی کے بڑا وسیع تھا۔ ابن خلدون تاریخ تاریخ کے ساتھ تاریخ کے فوائد بھی بیان کرتا ہے اور علم تاریخ کی مقبولیت کے اسباب بھی بتاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ :- (حوالہ نمبر ۵)

"تاریخ کا شمار ان فنون میں ہے جن کو تمام قومیں عام طور

پر پڑھتی پڑھاتی ہیں اور سفر تک کی تکالیف اس کی خاطر برداشت کرتی ہیں۔ عوام اور جہلا بھی اس کی راہِ معرفت میں پیش قدمی دکھاتے ہیں اور ملوک و اکابر بھی اس میں انتہائی رغبت و دل بستگی کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ تاریخ اگر ایک طرف ظاہر میں محض گذشتہ ایام اور سابق دولتوں کے حالات ہمارے سامنے لاتی ہے ... اور طرح طرح کے اقوال و امثال سے وہ بھرپور ہے اور ہماری بھری مجلسوں کا ایک دلچسپ موضوعِ گفتگو وہ بنتی ہے اور ہم کو یہ بھی بتاتی ہے کہ بدلتے ہوئے حالاتِ زمانہ نے مخلوقاتِ عالم کو کس طرح پیہم انقلاب و ردّ و بدل میں رکھا۔ اور کس طرح حکومتیں گھٹیں اور بڑھیں ..... تو دوسری طرف تاریخ اپنے باطن کے اندر ایک تحقیقی نظریہ بھی رکھتی ہے۔ یعنی کائنات کے علل اور ان کے دقیق مبادی کو سامنے لاتی ہے۔ واقعات کے اسلوب کا علم بخشتی ہے اور ان کے گہرے اسباب کو آشکارا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ فنونِ حکمت میں وہ بھی اپنا ایک مرتبہ رکھتی اور سزاوار ہے کہ علومِ حکمیہ میں اس کا شمار ہو۔ لیکن کیا کیا جائے کہ نااہلوں نے من گھڑت خرافات اور بے بنیاد باتیں اس میں شامل کر دیں اور لغو۔ کمزور بنیاد باتوں کو اِدھر اُدھر سے لے کر یا خود ساختہ باتوں کو اس میں شامل کر دیا۔ پھر بہت سے متاخرین لکیر کے فقیر ہو کر انھیں کے

قدم بہ قدم چلے اور اپنی سُنی سُنائی باتوں کو ہم تک پہنچایا۔ نہ انہوں نے واقعات کے اسباب پر نظر رکھی۔۔۔"

تلاش اسباب پر زور

اس بیان سے ظاہر ہے کہ ابن خلدون کی نظر میں وہ تاریخ ہی نہیں جس میں واقعات کے اسباب نہ بیان کئے جائیں گویا ابن خلدون کی نظر میں تلاش اسباب فلسفہ تاریخ کی جان ہے۔ جو واقعات آج گذر رہے ہیں ان کا سبب ممکن ہے کہ سو سال پہلے قائم ہو چکا ہو۔ اسی طرح آج کے واقعات کے سو سال بعد نتائج برآمد ہوں۔ جب میکولے کے اصرار پر ہندوستان کے مدارس میں انگریزی زبان رائج کی گئی تو اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ انگریزی پڑھ کر اہلِ ہند انگریزوں ہی کی مخالفت کریں گے۔ اسی لئے ابن خلدون روزنامچہ نما تاریخ نگاری کا مخالف تھا۔ اور واقعات کے اسباب بیان کرنے پر مُصر تھا۔ اس کا قول تھا کہ "ماضی مستقبل سے اس طرح مشابہ ہے جیسے پانی کا ایک قطرہ دوسرے سے" کیونکہ ہر واقعہ کی جڑ ماضی میں قائم ہوتی ہے اس لئے آج کے واقعہ کا سبب ہمیں زمانہ ماضی میں تلاش کرنا پڑتا ہے۔

ہر واقعہ کا سبب صرف واقعہ کی صورت ہی میں رُونما نہیں ہوتا۔ بلکہ وقتاً فوقتاً شخصیتیں بھی رُونما ہوتی ہیں جو اپنی قوم کا مستقبل بدل دیتی ہیں۔ بانیٔ اسلام کی آمد سے پہلے عرب میں جو واقعات رونما ہو رہے تھے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ عرب ہمیشہ بادیہ نشین ہی رہیں گے۔ اور برابر قبائلی جنگوں میں لگے رہیں گے۔ لیکن ایک ہستی کی آمد سے یہ اندازہ بالکل غلط ہو گیا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

"قومیں مختلف سیاسی کروٹوں کے ذریعہ بدلتی رہتی ہیں۔ اور ہمیشہ ایک ہی حالت پر نہیں رہتیں۔ ان کے مزاج۔ عوائد اور رسوم ان تبدیلیوں سے ایسے متاثر ہوتے کہ گویا ایک بالکل نئی قوم معرضِ وجود میں آگئی۔" (حوالہ نمبر ۶)

الغرض ابنِ خلدون تلاشِ اسباب کو لازم قرار دیتا ہے۔ اسی نظریے کی خاطر اس نے ہر قوم کے وطن کے جغرافیہ پر زور دیا۔ ابن خلدون سے پہلے کسی مؤرخ نے جغرافیائی عنصر اور اس کے اثرات کا ذکر نہیں کیا۔ ملک سوڈان کے باشندوں کے متعلق ابنِ خلدون نے لکھا کہ:۔

"چونکہ سوڈانی گرم اقلیم کے باشندے ہیں اور گرمی شروع ہی سے ان کے مزاجوں پر غالب رہی ہے اس لئے اُن کی روح میں گرمی کا اثر ان کے بدن اور اقلیم کی نسبت سے ہے۔ ان کی روح بہ نسبت چوتھی اقلیم کے باشندوں کے گرم تر ہے اور اسی بنا پر ان کی روح میں تخلخل کی زیادتی ہے۔ بہت جلد خوشی اور مسرت سے پھٹ پڑتے ہیں۔"

ابنِ خلدون کا نظریہ "قانونِ تغیر"

تلاشِ اسباب کے بعد ابن خلدون نے اپنے فلسفۂ تاریخ میں جس چیز پر زور دیا وہ کائنات کا قانونِ تغیر ہے۔ اس قانون کے متعلق وہ لکھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۷)

"ایک اور پوشیدہ غلطی جو تاریخ میں سرزد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ اور مرورِ ایّام سے قوموں اور قبائل کے جو حالات ردوبدل کا شکار ہوتے ہیں ان سے

غفلت اور بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ یہ تبدیلی چونکہ عرصہ دراز کے بعد وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ گویا ایسی چھپی بیماری ہے جس کو شاذو نادر ہی لوگ جانتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اہل عالم اور قوموں کے حالات و عادات و مذاہب ایک نہج و وطیرہ پر نہیں چلتے رہتے ہیں۔ جس طرح لوگ اور آبادیاں ایک حالت پر برقرار نہیں رہتیں۔ اسی طرح سطح زمین۔ زمانہ اور سلطنتوں کو بھی ثبات و قرار نہیں۔ اللہ کی یہی عادت اس کے بندوں میں بھی جاری ہے۔"

سبب تغیر اس تغیر کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ابن خلدون جو نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس کی حقیقت آج زندہ صورت میں ہمارے اور تمام اہل مشرق کے سامنے موجود ہے آج تمام مشرق اپنے سابق مغربی حکمرانوں کی کھلم کھلا نقل کر رہا ہے۔ اس کی وجہ ابن خلدون اس طرح بیان کرتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۸)

"ان حالات و عادات کے بدلنے کا ایک عام اور بڑا سبب یہ ہے کہ ہر قوم و ملت اپنے بادشاہ کی عادتوں کی پیروی کرتی ہے۔ چنانچہ اس حکیمانہ قول سے کہ "الناس علیٰ دین ملوکھم" (لوگ اپنے بادشاہ کے دین پر ہوتے ہیں) اسی راز کی طرف اشارہ ہے۔ جب ایک سلطنت دوسری حکومت و سلطنت پر اقتدار حاصل کرتے ہیں تو لامحالہ یہ (فاتح) اپنے اگلوں کی عادات کی طرف میلان کرتے ہیں اور (مفتوحوں) میں سے بہت سوں کو متاثر کرتے ہیں اور اس طرح فاتحین

اور مفتوحوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے۔ فاتح قوم مفتوحوں کی چند عادتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اور مفتوح قوم اپنے فاتحین کے رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ (مفتوح) قوم اپنے اطوار و عادات میں اپنے اگلوں سے بالکل مختلف اور جُدا ہو جاتی ہے......"

ابن خلدون کا پیش کردہ نظریہ احساس کمتری

ابن خلدون کا یہ کلیہ ایرانیوں کے مفتوح ہونے اور ایرانیوں کی تقلید عرب پر مبنی تھا۔ اس لئے ابتدائی دورِ اسلام کی تاریخ پڑھی تھی کہ کس طرح عربوں نے ایرانیوں کو فتح کیا اور کس طرح ایرانی ایک عرصہ دراز تک اپنے قدیم تمدن پر قائم رہے۔ اور عربوں کو بہ نظرِ حقارت دیکھتے رہے۔ اور بقول فردوسی عرب قوم کو ایرانی "اونٹ کا دودھ پینے والی اور گو کا گوشت کھانے والی" سمجھتے رہے۔ لیکن ساتھ ہی عربوں کی نقل بھی کرتے رہے۔ بالکل یہی حالت آج اہلِ مشرق کی ہے۔ جو ہر بات میں آج اہلِ مشرق کی ہے ....
.... اور ساتھ ہی مغرب کی مذمت بھی کرتے ہیں۔ گویا اہلِ مشرق کے قول اور فعل میں سراسر تضاد ہے۔ اس تضاد کی وجہ کیا ہے۔ دورِ حاضر کے ماہرینِ نفسیات اس تضاد کو "احساسِ کمتری" پر محمول کرتے ہیں۔ جب کوئی قوم اپنے فرسودہ تمدن پر ناز کرتی ہے لیکن ساتھ ہی کسی نو آموز قوم کے ہاتھوں مفتوح ہو جاتی ہے تو از روئے عقل مفتوح کو اپنے فاتح کی برتری فوراً تسلیم کر لینی چاہیئے۔

لیکن ایسا نہیں ہوتا کیونکہ مفتوح قوم کا تکبر اس کو مجبور کرتا ہے کہ ابوجہل کی طرح وہ بھی اپنی فرسودہ تہذیب کے گانے گاتی رہے۔ اور اس طرح اپنے دل کو جھوٹی تسلی دیتی رہے۔

یہ احساس کمتری آج کل کی دریافت سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ابن خلدون نے یہ راز کمتری اپنی ذہانت کے ذریعہ آج سے پانچسو سال پہلے ہی معلوم کر لیا تھا۔ اسی لئے اہل مغرب ابن خلدون کو اپنے دور کی پیداوار سمجھتے ہیں۔ اس کے "مقدمہ" کا ترجمہ متعدد مغربی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اور مشرق سے زیادہ اس کا احترام مغرب میں ہوتا ہے۔

بعض متعصب مغربی اہل قلم کا دعویٰ ہے کہ ابن خلدون نے یہ حکمت مغرب سے سیکھی۔ کیونکہ ان متعصب لوگوں کے خیال کے بموجب تمام عقل و حکمت صرف مغرب کے لئے ہی مخصوص رہی ہے۔ لیکن یہ حضرات ابن خلدون کے ماخذ معلوم کرنے سے قاصر ہیں صرف قیاس کی بنا پر اس کو مغرب کا نقال سمجھتے ہیں۔ اور یہاں تک کہتے ہیں کہ مغرب کے دور نشاۃ ثانیہ سے ابن خلدون متاثر ہوا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے زمانے میں تحریک نشاۃ ثانیہ بمشکل شروع ہوئی تھی۔ اغلب خیال یہ ہے کہ ابن خلدون نے جو کلیئے حکومت کے متعلق پیش کئے ہیں وہ اس نے مسعودی کی "تنبیہ الاشراف" سے حاصل کئے ہوں۔ لیکن "مقدمہ" میں علاوہ حکومت کے دیگر موضوعات کا بھی ذکر ہے اور اس کے قائم کردہ کلیئے ایسے مستحکم ہیں کہ ان کا اطلاق آج کل کے حالات پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً احساس کمتری اس کا ایسا نظریہ ہے جس کا مظاہرہ ہمیں زندہ صورت میں آج بھی نظر آ رہا ہے۔ اسی طرح اس کا نظریۂ انقلاب زمانہ ہے جس کا ثبوت ہمیں آج بھی مل

رہا ہے۔ انسان کی پوری کہانی میں ہمیں انقلاب نظر آتا ہے۔ خصوصاً دورِ حاضر میں تو یہ انقلاب روزانہ برپا ہو رہا ہے اور اس انقلاب کی رفتار ہر روز بڑھ رہی ہے۔

ابنِ خلدون کی طرف سے مؤرخوں کو تنبیہہ

جو نظریئے ابنِ خلدون نے اپنے "مقدمہ" میں پیش کیے۔ انہیں کے مطابق اس نے مؤرخوں کو تنبیہہ کی کہ جلد بازی سے گریز کریں اور ہر واقعہ کو اپنی تاریخ میں درج کرنے سے پہلے پرکھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ :-

"مورخ کے لئے لابدی ہے کہ وہ ملکی۔ سیاسی قواعد اور موجودات کے طبائع سے واقفیت رکھتا ہو۔ قومیں اور زمین و زمان عادات و اخلاق۔ سیرت۔ مذہب و ملّت اور دیگر حالات میں جن انقلابی دَوروں سے گذرتی رہتی ہیں۔ ان سے بھی وہ شناسا ہو۔ نیز قابلیت رکھتا ہو کہ حاضر و موجود کو غائب اور غیر موجود سے ملا کر دیکھے کہ ان میں اتفاق ہے یا اختلاف۔ اتفاق کا بھی سبب تلاش کرے اور اختلاف کی وجہ بھی دریافت کرے۔ اور سلطنتوں اور قوموں کے اُصول ان کی ابتدا اور ان کے حدوث کے اسباب و دواعی کی معلومات بھی بہم پہنچائے اور جو اشخاص ان امور میں ذمہ دار شخصیت رکھتے ہوں ان کے حالات و اخبار سے بھی شناسائی رکھتا ہو تاکہ وہ ان معلومات کے تحت ہر خبر کے سبب کا سراغ لگا سکے اور جو خبر اس تک

نقل کر کے پہنچی ہے۔ اگر وہ اس کے قواعد اور اصول پر
پوری اُترتی ہے تو اس کو صحیح جانے ورنہ اس کو کھوٹی جان
کر نظر انداز کر دے ......"

اس تنبیہہ کے بعد ابن خلدون مورخوں کو چند خطروں سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ خطرے یہ ہیں :۔

" اوّل ۔ راویوں اور عقیدوں کا اختلاف .... جب مؤرخ کسی رائے یا عقیدے کا پہلے سے پیرو ہوتا ہے تو اپنی رائے و عقیدہ سے موافق خبروں کو وہ ایک دم قبول کر لیتا ہے گویا جانب داری اور پاسداری کی پٹی اس کی چشم بصیرت پر بندھ جاتی ہے .... چنانچہ وہ خود بھی جھوٹی خبر کو بلا تامل قبول کر لیتا ہے۔ اور بے دھڑک اس کی نقل بھی اپنی تاریخ میں کرتا ہے۔

دوئم ۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ ناقلین و راویانِ اخبار پر بھروسہ کر لیا جاتا ہے ... اور جرح قدح کر کے ان کے حالات کا پتہ نہیں لگایا جاتا اور اس طرح جھوٹ (تاریخ) میں جگہ پا لیتا ہے۔

سوئم ۔ تیسرا راز یہ ہے کہ اکثر ناقلین اخبار اپنی دیکھی بھالی یا سُنی سنائی باتوں کے مقاصد کو سمجھنے میں کوتاہی برتتے ہیں....

چہارم ۔ چوتھا راز یہ ہے کہ سچائی کا وہم پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہم کئی صورتوں میں رُونما ہوتا ہے۔ اکثر تو اس طرح کہ ناقلین اخبار کو قابل اعتبار سمجھ لیا جاتا ہے۔ کبھی اس طرح کہ نقل شدہ حالات و اخبار کو واقعاتِ خارجی سے مطابق نہیں کیا جاتا تاکہ

ان کی قلعی کھلے۔

پنجم - پانچواں سبب یہ ہے کہ اکثر لوگ صاحب جاہ و مرتبہ حضرات کی ثنا خوانی و مدح سرائی کر کے ان کی ہر بات کو اچھے پیرایہ و رنگ میں اشاعت دے کر ان کے تقرب کے خواہاں ہوتے ہیں ......

ششم - چھٹا سبب مذکورہ بالا اسباب سے بھی اہم تر یہ ہے کہ جن لوگوں کی تاریخ لکھی جا رہی ہے ان کے مزاج اور طبیعت سے بھی مورخ شناسا ہو۔ یعنی ما فوق العادت واقعات کو نہ مانے اس سلسلے میں ابن خلدون ان افسانوں کا ذکر کرتا ہے جو سکندر کے متعلق مشہور تھے اور ان افسانوں کو لغو اور احمقانہ قرار دیتا ہے۔

تاویل اور اس کے خطرے میں نے گذشتہ ابواب میں مورخوں کی تاویل بازی کا رونا رویا ہے کہ کس طرح ان لوگوں نے تاویل کو اپنا شعار بنا کر میرے واقعات سے اپنی پسند اور اپنے شوق نظر کے مطابق نتائج نکالے اور اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور ساتھ ہی مجھ کو بھی بدنام کیا۔ تاویل صرف دانستہ ہی نہیں بلکہ نادانستہ بھی کی جاتی ہے۔ جب مورخ اپنے کسی خاص نقطۂ نظر کو مقبول بنانا چاہتا ہے تو اسی نقطہ نظر کے مطابق میرے واقعات کی تاویل کرتا ہے اور اپنے عقیدے کو برحق ثابت کرتا ہے۔ میرے خلف الرشید ابن خلدون نے دانستہ اور نادانستہ دونوں قسم کی تاویلوں کی مذمت کی ہے۔ نادانستہ تاویل کے متعلق

وہ لکھتا ہے :-

قیاس اور محاکات تو طبیعتِ انسانی کا خاصہ ہے... بسا اوقات ایک شخص اگلوں کے حالات سنتا ہے لیکن حالات میں جو وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوئی ہے اس کا خیال نہیں کرتا۔ اور ان حالات کو فوراً وہ اپنے مشاہدات و معلومات کی بنا پر قیاس کرتا ہے۔ حالانکہ ہر دور میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح مؤرخ غلطی کے گڑھے میں گر پڑتا ہے ..."

اس سلسلے میں ابن خلدون حجاج بن یوسف کا ذکر بطور مثال پیش کرتا ہے دورِ بنی اُمیہ میں معلم بڑا باعزت اور محترم سمجھا جاتا تھا لیکن بعد کو یہ پیشہ حقیر سمجھا جانے لگا۔ حجاج کا باپ معلم تھا اور اس لئے اس زمانے میں وہ محترم تھا۔ لیکن بعد کے مورخوں نے جب حجاج کی مذمت کی تو یہ ثابت کیا کہ حجاج ایک ذلیل پیشہ باپ کا بیٹا تھا اور اسی لئے اس نے ذلیل حرکتیں کیں۔ حالانکہ اس زمانے کے لحاظ سے حجاج کا باپ محترم تھا۔

چنانچہ ابن خلدون مورخوں کو بتاتا ہے کہ تبدیلیٔ زمانہ کے ساتھ قدریں بھی بدلتی ہیں۔ جو بات کل اچھی سمجھی جاتی تھی وہ آج بری سمجھی جاتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ مورخ صرف ماضی کے واقعات کا ہی مطالعہ نہ کرے بلکہ ماضی کی قدروں کو بھی معلوم کرے گویا تاریخ اوقت قدروں سے بھی واقعات تاریخ نمودار ہوتے ہیں۔ مثلاً زمانۂ ماضی میں فاتح سب سے زیادہ محترم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ سکندر نے فتوحات کو اپنا شیوہ بنایا تاکہ اس کو احترام و عزت حاصل ہو۔ ابن خلدون نے جس بات پر خاص طور سے زور دیا ہے وہ یہ ہے

کہ رائج الوقت قدروں کا علم مؤرخ کو صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ اپنے زمانے کی رائج قدروں کو بالکل بھول کر بلا تعصب اس زمانے کی قدروں کو دیکھئے جس زمانے کی وہ تاریخ لکھ رہا ہے۔ مثلاً رواجِ غلامی کو لیجئے۔ یہ رواج ہزاروں سال سے رائج تھا۔ اور اس کو بُرا نہ سمجھا جاتا تھا۔ گو یونان میں سقراط۔ افلاطون اور ارسطو جیسے مفکر پیدا ہوئے لیکن ان کو اس رواجِ غلامی میں کوئی عیب نظر نہ آیا۔ بقول افلاطون سقراط کہتا تھا کہ غلاموں کو ظلم برداشت کرنا چاہیئے۔ (حوالہ نمبر ۹)

افلاطون تو اپنے "قوانین" میں یہاں تک کہتا ہے کہ اگر کوئی آزاد یونانی شہری کسی غلام کو قتل کر دے تو قاتل صرف توبہ کر کے بری ہو سکتا ہے لیکن اگر کوئی غلام کسی آزاد شہری کو قتل کرے تو مقتول کے عزیزوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اس قاتل غلام کا خون بہائیں۔ (حوالہ نمبر ۱۰)

اسی طرح افلاطون کے شاگرد ارسطو کا نظریہ غلامی کے متعلق یہ تھا کہ بعض لوگ صرف غلامی کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں اس لئے اس قسم کے لوگوں کے لئے غلامی ہی مناسب ہے۔ (حوالہ نمبر ۱۱)

جب مؤرخ کو قدیم زمانے کی قدروں کا حال معلوم ہے تو اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے زمانے کی قدروں کے معیار سے قدیم زمانے کے لوگوں کو جانچے اور ان کی نیکی یا بدی کے متعلق فیصلہ کرے۔

ابن خلدون بحیثیت بانیٔ عمرانیات

عام لوگ مجھے علم جغرافیہ کی بیٹی سمجھتے ہیں۔ یہ انسان کی پیدا کردہ محض تشبیہات ہیں لیکن ان تشبیہات کے مطابق میں اپنی اولاد کا ذکر کرتی ہوں۔ ابن خلدون کے زمانے میں میں بالغ

ہو چکی تھی۔ اس لئے بقول انسان میرے بطن سے ایک لڑکا تولّد ہوا۔ جو آج کل بالغ ہو کر علمِ عمرانیات کے نام سے موسوم ہے۔ اس لغو تشبیہہ کی بنا پر میں کہہ سکتی ہوں کہ اس میرے فرزند کی تولید کے معاملے میں ابن خلدون نے دائی کا کام کیا۔ بوقت ولادت ابن خلدون نے میرے فرزند کا نام "فلسفۂ تاریخ" رکھا۔ لیکن بہت جلد اس کا نام بدل کر "عمرانیات" رکھا۔ چنانچہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لفظ عمرانیات بھی استعمال کیا۔

ابن خلدون کے "مقدمہ" کی شروعات تو میرے فلسفے سے ہوتی ہے۔ لیکن اس مقدمہ کا بیشتر حصہ میرے فرزند عمرانیات سے متعلق ہے۔ اس کے نزدیک میرا کام یہ ہے کہ میرے ذریعہ اجتماع انسانی کا پتہ چلے۔ وہ لکھتا ہے :- (حوالہ نمبر ۱۲)

"تاریخ درحقیقت ایک خبر ہے جو اجتماع انسانی کا پتہ دیتی ہے جس کو ہم آبادیٔ عالم سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو حالات اس آبادی کو بروئے مزاج و طبیعت لاحق و عارض ہوتے ہیں ان کی معلومات کا بھی اچھا ذخیرہ تاریخ فراہم کرتی ہے مثلاً آپس کی کشیدگی و اُلفت۔ جنبہ داری و عصبیت اور طرح طرح سے بعض انسانوں کا بعض پر غلبہ ... مثلاً حکومتوں و سلطنتوں کا قیام اور ان کے مراتب و مدارج اور انسانی دھندے۔ مثلاً کسب معاش علوم صنائع یا وہ اُمور جو آبادیٔ عالم سے قدرتاً پیدا ہوتے ہیں اور انسان اپنی کوششوں سے اپنی عملی زندگی میں بروئے کار لاتا ہے ..."

اس جستجو کے تحت ابن خلدون نے میرے پیٹ کا جائزہ لیا اور اس میں جو کچھ اس کو نظر آیا اس کو ایک علیحدہ نام دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن میرے اس فرزند کو نام دینے کے معاملے میں ابن خلدون بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ کیونکہ اس کا مدعا تو یہ تھا کہ میرے سے متعلق واقعات کو میرے فرزند کے ذریعہ پرکھے یعنی انسانی تہذیب و تمدن کا مطالعہ کرے اور اس تمدن کی روشنی میں میرے واقعات کو جانچے۔ چنانچہ اس نے میرے فرزند کا موضوع بیان بایں الفاظ مقرر کیا۔ (حوالہ نمبر ۱۲)

"اس کا موضوع عمران بشری اور اجتماع انسانی ہے اور اس کے ذیل میں متعدد مسائل ہیں۔ مثلاً ان عوارض و حالات کا بیان جو اس عمرانِ بشری کی ذات کو یکے بعد دیگرے لاحق ہوتے ہیں .....

نہ اس (نئے) علم کو ہم علمِ خطابت کہہ سکتے ہیں .....
نہ ہی اس علم کو سیاستِ مدن کہہ سکتے ہیں..... اس زیر بحث علم کا موضوع ہر دو مذکورہ علوم کے موضوعوں سے بالکل جداگانہ اور علیحدہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ علم بالکل نو ایجاد ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے کسی نے اس پر اب تک قلم نہیں اٹھایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس (علم) پر کوئی کتاب لکھی گئی ہو..... مگر وہ ہم کو دستیاب نہیں ہوئی ......

اس علم کے بعض مسائل ہم کو حکماء کے بعض متفرق کلمات میں بھی ملتے ہیں۔ لیکن یک جائی شکل میں نہیں ......"

اس تمہید کے بعد ابن خلدون اس نو ایجاد علم یعنی میرے نوزائیدہ فرزند کے متعلق لکھتا ہے :- (حوالہ نمبر ۱۳)

"اب ہم اپنی اس کتاب میں ان عمرانی حالات کو بیان کی روشنی میں لاتے ہیں جو انسان کو ملک و کسب اور علوم و صنائع میں اس کی اجتماعی زندگی میں پیش آتے ہیں اور ان کا بیان ایسے استدلالی پہلو سے ہوگا کہ معلوماتِ خاصہ و عامہ کے بارے میں جو تحقیق ہوگی وہ بالکل سامنے آجائے گی ..."

چونکہ ابن خلدون نے خود لفظ عمران اور عمرانی اپنی قلم سے لکھے اس لئے اس کے ایجاد کردہ علم کا نام عمرانیات پڑ گیا۔ مغرب میں یہ علم "سوشیولوجی" کہلاتا ہے۔

ابن خلدون کا قائم کردہ تصورِ عمرانیات اور عصبیت کی اہمیت

چونکہ ابن خلدون نے انسانی تمدن کو عمرانیات کا موضوع قرار دیا اس لئے اب اس کو تلاش ہوئی کہ یہ تمدن کہاں سے اور کس طرح آیا جس کی بنا پر اس نے اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہنا شروع کیا۔ ابن خلدون کے نزدیک انسان کے شرف کے اسباب یہ ہیں :-

(۱) انسان صاحبِ علم اور صاحبِ صنعت ہے۔ یہ علم و صنعت اس کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔

(۲) انسان ایک قائد کا حاجت مند ہے۔ بعض جانوروں میں بھی طریقِ قیادت پایا جاتا ہے لیکن یہ طریق جانوروں کو بذریعہ

الہام معلوم ہوا۔ لیکن انسان نے یہ طریقہ اپنی فکر و نظر سے معلوم کیا۔
(۳) انسان اپنے رزق کے لئے خود سامان مہیا کرتا ہے۔
(۴) انسان اجتماعی زندگی کا عادی ہے اور ایک دوسرے کی مدد کرتا ہے۔ اسی اجتماعی زندگی کی بنا پر انسان "مدنی الطبع" کہلاتا ہے۔

انسان کی ان چار خصلتوں پر ابن خلدون نے علیحدہ علیحدہ باب اپنے "مقدمہ" میں قائم کئے۔ لیکن ابن خلدون کی نظر میں اصل چیز جس سے اجتماعی زندگی پیدا ہوئی وہ "عصبیت" ہے۔ جس پر جماعت بندی کا انحصار ہوتا ہے۔ یہ عصبیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب پوری جماعت کا مقصد واحد ہوتا ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک انسان نے جو ترقی کی ہے وہ اسی عصبیت کی بدولت ہے۔ خاندان اور قبیلے کی بنیاد اسی عصبیت پر ہے۔ عصبیت کے متعلق وہ لکھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۱۴)

"رہائش اور بسنے میں خاندانی اور قبائلی عصبیت اور حمایت جس قدر ضروری ہے اسی قدر دوسرے اُمور میں بھی اس کی ضرورت و اہمیت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً نبوت کی اشاعت اور نبی کو کامیاب بنانا۔ کسی سلطنت کی بُنیاد ڈالنی اور اس کا وقار قائم کرنا یا کسی دعوت (یعنی تحریک) کی تبلیغ کرنا اور اس کو شائع کرنا۔ کیونکہ ان سب امور کا بروئے عمل بغیر جنگ و قتال کے ممکن نہیں۔ جب طبیعتِ انسانی میں خودسری اور خود رائی ابتدائے فطرت سے موجود ہے تو انسان کو بغیر طاقت و زور کے کس طرح کوئی بات منوائی جا سکتی ہے اور جنگ و قتال زور و طاقت کے استعمال میں عصبیت اور حمیت ہی

کارفرما ہے .....“

عصبیّت کیا کیا کرتی ہے

قبیلہ متعدد خاندانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جن خاندانوں میں عصبیّت قوی تر ہوتی ہے وہ خاندان اپنے قبیلوں میں ممتاز ہو جاتے ہیں۔ اور حکومت قبیلہ ان خاندانوں کے ہاتھ آجاتی ہے۔ ابن خلدون خاندانی عصبیت کو ”خاص عصبیّت“ کا نام دیتا ہے۔ جو عصبیّت افرادِ قبیلہ کو اپنے قبیلے سے منسلک کرتی ہے اس کو ابن خلدون ”عام عصبیّت“ کا نام دیتا ہے۔

جس قبیلے کی ”عام عصبیّت“ دوسرے قبیلے کی عام عصبیّت سے قوی تر ہوتی ہے وہ قبیلہ دوسرے قبیلوں پر غالب ہو جاتا ہے۔ ہر عصبیّت کا مقصد خواہ وہ قبیلے پر مبنی ہو یا قوم و ملک پر ایک ہی ہوتا ہے یعنی حصولِ حکومت۔ لیکن وہی قبیلہ یا قوم دیگر قبیلوں یا قوموں پر غالب آتا ہے جس کے افراد اخلاق حمیدہ کے حصول کے لئے ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابنِ خلدون کے نزدیک خدا بھی ایسی قوم کا ساتھ دیتا ہے جس کے افراد مائل بہ اتحاد ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۶)

”جب اللہ تعالیٰ کسی قوم و خاندان کو ملک و سلطنت کے شرف سے معزز اور موقّر بناتا ہے تو پہلے اس کی اخلاقی حالت کی اصلاح فرماتا ہے اور پھر یہ نعمت اس کو سرفراز فرماتا ہے۔“

اسی طرح جب خدا کسی قوم کو برباد کرنا چاہتا ہے تو وہ عمائدین اور

اکابرین قوم کو " بداطواریوں پر آمادہ کرتا ہے۔ رذائل سے ان کو متصف کرتا ہے اور بُرے راستوں پر ان کو چلاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ (وہ قوم) حکمرانی کی قابلیت کھو بیٹھتی ہے۔ اور اقتدار میں گرنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن حکومت سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔"

انحطاط پذیر قوم میں خاتمے سے پہلے یہ علامت ظاہر ہوتی ہے کہ " قوم شرفاء اور مُلک کی مایۂ ناز ہستیوں کا اکرام و احترام چھوڑ دیتی ہے۔ چنانچہ جب دیکھیں کہ کسی قوم کے افراد میں نیکی مفقود ہے تو جان لیجئے کہ اس کی ساری فضیلتیں رُو بہ زوال ہیں اور اب ملک بھی ہاتھ سے جانا چاہتا ہے۔"

اسبابِ زوالِ اقوام ابن خلدون کی عمرانیات نے جو شہرت حاصل کی اس کی بُنیاد اس کے معلوم کردہ اسبابِ زوالِ اقوام ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زمانہ کی تبدیلی سے اسبابِ زوال بھی بظاہر بدلتے ہیں۔ لیکن ابن خلدون نے جو اسباب دریافت کئے وہ بنیادی ہیں۔ اور باوجود تبدیلیٔ زمانہ آج بھی وہ اسباب کارگر نظر آتے ہیں۔ ابن خلدون نے سلطنت کے لئے پانچ دور مقرر کئے :-

پہلا دَور سلطنت کا وہ ہوتا ہے جس میں ظفر و کامیابی سلطنت کے قدم چومتی ہے۔ اس دور میں " قوم مدافعانہ و تحفظانہ اُمور میں بھرپور طاقت و قوت رکھتی ہے۔ ملکوں پر چھا جاتی ہے اور عنانِ حکومت دوسروں سے چھین لیتی ہے۔ اس دَور میں خوبیاں صرف بادشاہ تک محدود نہیں ہوتیں بلکہ پوری قوم خوبیوں سے آراستہ ہوتی ہے۔

دوسرا دَور وہ ہوتا ہے جب بادشاہ اپنی ذاتی اور شخصی حکومت کا خواہاں ہوتا ہے اور بجائے قوم پر بھروسہ کرنے کے وہ غلاموں اور دیگر بھاڑے کے ٹٹوؤں کی تعداد بڑھاتا ہے۔ اور اپنے سابق عمائدین اور معاونین کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ جو دل میں بادشاہ کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

تیسرا دور وہ ہوتا ہے جب قوم مالدار ہو جاتی ہے اور عیش و عشرت میں قوم مُبتلا ہو جاتی ہے ۔ شاندار عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں۔ بڑے بڑے کارخانے کھلتے ہیں۔ بڑے بڑے شہر بسائے جاتے ہیں عالی شان معابد اور مساجد کی بنیاد پڑتی ہے۔" ہر طرف عدل و انصاف کا دَور دورہ ہوتا ہے۔

چوتھا دور وہ ہوتا ہے جس میں قوم اپنے ماضی پر گذارا کرتی ہے دیگر ملکوں سے صلح و آشتی کے تعلق پیدا کرتی ہے۔ لیکن ہر پہلو میں اگلوں ہی کی لکیر کی فقیر ہوتی ہے اور ان کے نشاناتِ قدم پر چلتی ہے"۔

پانچواں دور وہ ہوتا ہے جس میں اسرافِ بیجا شروع ہوتا ہے اگلوں کی جمع کردہ دولت برباد کی جاتی ہے۔ سیاہ کار اور بداطوار لوگ اختیارات حاصل کرتے ہیں۔ بادشاہ کی اس حرکت سے لوگ بددل ہوتے ہیں۔ فوج میں بھی بددلی پھیلتی ہے

ہر دور کی مدّت کتنی ہوتی ہے؟ ابن خلدون نے ہر دور کی مدّت ایک قرن یعنی چالیس سال مقرر کی ہے۔ اس حساب سے کوئی قوم یا سلطنت تین قرنوں یعنی ایک سو بیس سال میں اپنے انتہائے کمال کو پہنچتی ہے۔ چوتھے دور میں قوم اپنے ماضی پر گذارا کرنے لگتی ہے۔ پانچویں دور کے اختتام پر

یعنی ابتدا سے دو سو سال بعد وہ قوم بربادی کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ گویا ہر قوم کی عمر کل دو سو سال ہے۔

ابن خلدون کے نزدیک ہر قوم اپنی عصبیت کی مقدار کے بموجب ترقی کرتی ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی طرفداری اور خویشاوندی کے ہیں۔ آج کل کی اصطلاح میں عصبیت کے معنی بالکل وہی ہیں جو "حُبِ قومی" کے ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں جب قبائلیت کا زور تھا تو قبیلے کی قوت کا انحصار بھی اسی عصبیّت پر تھا۔ جب قبیلے نے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی تو قبائلی عصبیّت حُبِّ قومی میں تبدیل ہو گئی۔

الغرض ابنِ خلدون کی عمرانیات کا محور اور مرکز یہی عصبیت ہے۔ یہ محورِ عصبیّت ایسا مستحکم اور پائیدار ہے کہ آج تک قائم ہے۔ دورِ حاضر کی قوموں کی بُنیاد بھی اسی عصبیّت پر ہے۔ جب سے مغرب میں دورِ قومیت رائج ہوا ہے تب سے یہی عصبیّت راج کر رہی ہے۔ یہ اصطلاح عصبیّت اتنی جامع ہے کہ مذہب بھی اس کے زُمرے میں آجاتا ہے۔ مُسلمانوں کی ترقی کا راز بھی عصبیّت اسلام تھی۔ اس لئے ابنِ خلدون کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ حکومت غلبہ سے حاصل ہوتی ہے اور غلبہ عصبیّت سے حاصِل ہوتا ہے۔ ابنِ خلدون نے عصبیّت کو دو قسموں میں منقسم کیا ہے۔ اوّل "ماتحت عصبیّت" یعنی انسان کی محبّت اپنے خاندان یا قبیلے سے دوئم "بادشاہ کے ساتھ عصبیّت" یعنی مرکزی عصبیّت کیونکہ بادشاہ پوری قوم کا نمائندہ ہوتا ہے۔

ابن خلدون کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ایسی قوم جو اپنی مرکزی عصبیت میں پوری فنا ہو جاتی ہے اس پر دوسری قوم مسلّط نہیں ہو سکتی۔ اگر ایک

خاندان سے حکومت نکل جاتی ہے تو اسی قوم کا دوسرا خاندان برسرِ حکومت آجاتا ہے۔ جب تک یہ قوم اپنی عصبیت میں فنا رہتی ہے تب تک دوسری قوم کی مجال نہیں کہ اس پر مسلّط ہو۔ ساتھ ہی ابن خلدون یہ بھی کہتا ہے:۔

"البتہ جب عالم میں بڑا انقلاب رُونما ہو مثلاً ملک کا مذہب دین بدل جائے یا آبادیٔ عالم بڑے پیمانے پر گھٹ جائے یا کوئی اور انقلاب عالم ظہور میں آئے تو پھر حکومت حکمران طبقے سے بالکل نکل جاتی ہے۔ اور ایک دوسری قوم حکومت سنبھال لیتی ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ پر لانا چاہے۔"

ابن خلدون اس سلسلے میں اسلام کی مثال پیش کرتا ہے جس کو قبول کر کے عربوں کا مُضر قبیلہ اُٹھا اور سلطنتوں کے تختے اُلٹ دئیے ابن خلدون نے قوموں کے جو اسبابِ زوال بتائے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ زوال سے پہلے انحطاط پذیر قوموں کی آبادی گھٹنے لگتی ہے جس سے فوج میں کمی پیدا ہوتی ہے۔ (حوالہ نمبر ۱۷)

ابن خلدون یہ بھی کہتا ہے کہ متمدن قومیں وحشی قوموں کے ہاتھوں برباد ہوتی ہیں کیونکہ "وحشی اقوام شجاعت اور بہادری کی دھنی ہوتی ہیں اور ان میں زبردست غلبہ کی طاقت ہوتی ہے۔ چونکہ قوموں کو غلبہ و برتری۔ بہادری و شجاعت۔ دلیری من چلے پن سے ملتا ہے اس لئے جس قوم میں بدویت و وحشت زیادہ ہوتی وہی قوم بہ نسبت دیگر اقوام کے جلد غلبہ حاصل کر سکے گی۔ خواہ فریقین تعداد اور قوتِ عصبیت میں برابر کیوں نہ ہوں"۔

نبوّت کے معاملے میں ابن خلدون کے عقلی دلائل انسان میں علاوہ قالب کے روح بھی ہے۔ برٹرینڈ رسل جیسا مرید عقل بھی روح کا قائل ہے۔ گو

وہ روح کو "دماغیت" کے نام سے پکارتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۴)

"یونانیوں کے زمانے سے حامیانِ مادہ اور حامیانِ دماغ کے درمیان بحث جاری ہے کہ اس عالم پر مادہ غالب ہے یا دماغ (یعنی روح) اہل مذہب خواہ عیسائی ہوں یا بُت پرست دماغ کے قائل ہیں۔ اس کے برعکس اہل مادہ کا نظریہ سائنسی ہے"۔

ابن خلدون دماغ کا قائل ہے۔ لیکن وہ دماغ کو روح سے منسوب کرتا ہے اور روح کی ہستی کو عقلی دلائل سے ثابت کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۱۹)

"بدیں صورت انسان کے دو رُخ ہوئے اعلیٰ اور اسفل۔ نیچے کے رُخ سے وہ جسم سے ملتا ہے اور اس جسم کے ذریعہ وہ مدارک حسیہ حاصل کرتا ہے۔ جن سے آگے بڑھ کر اس میں بالفعل تعقل کی قابلیت و استعداد پیدا ہوتی ہے اور اُوپر کے رُخ سے یہ عالمِ ملکوت سے ملتا ہے۔ جہاں سے یہ مدارکِ علمیہ غیبیہ کا اکتساب کرتا ہے ....."

اس تمہید کے بعد ابن خلدون انسان کو تین طبقوں میں منقسم کرتا ہے:۔

پہلا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو بالطبع روحانی ادراک سے عاجز و قاصر ہیں ان کے سارے علوم خیالی ہوتے ہیں اور محدود۔

دوسرا طبقہ ان بزرگوں کا ہے جن کی حرکتِ فکریہ عقلِ روحانی کی طرف بڑھتی ہے اور وہ اپنے ادراکات میں آلاتِ بدنیہ کے محتاج نہیں۔

تیسرا طبقہ ان مقدس بزرگوں کا ہے جو فطرت ہی سے بشری جسمانیت و روحانیت سے بے تعلق ہونے اور ملائکہ کے درجۂ اعلیٰ تک پہنچنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ اسی طبقے سے انبیاء کا تعلق ہے۔ جب ان پر وحی نازل ہوتی

ہے تو انہیں آواز کی گنگناہٹ سنائی دیتی ہے۔

تعلیم علوم کا صحیح اور مفید طریقہ

ابن خلدون نے اپنی عمرانیات میں درس و تدریس کے طریقے کو بھی شامل کیا۔ اس کا پیش کردہ طریق تعلیم آج بھی ویسا ہی کارآمد ہے جیسا کہ اس کے زمانے میں تھا۔ ہمارے زمانے میں جو اُستادوں کے لئے تربیت گاہیں قائم کی جاتی ہیں ان میں بھی یہی طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے :۔ (حوالہ نمبر ۱۹)

"تعلیم کا مفید ترین طریقہ یہ ہے کہ علوم کو رفتہ رفتہ اور تھوڑا تھوڑا ذہن نشین کیا جائے۔ مثلاً جب ایک خاص فن کو پڑھانے بیٹھیں تو اس ہر باب کے اصولی مسائل کو بیان کریں اور اجمالی طریقے سے اس کی تشریح بھی کرتے جائیں۔ مگر متعلم کی قوتِ عقلیہ اور اس کی استعداد کو ضرور پیش نظر رکھیں تاکہ جو بات اس کو بتائی جائے اس کا ذہن اس کو لیتا جائے۔ اسی نہج سے آخر فن تک تعلیم جاری رکھیں۔ تو اس صورت سے اس فن میں متعلم کو ایک خاص ملکہ حاصل ہو جائے گا لیکن یہ ملکہ صرف جزئی اور ضعیف ہوگا۔ لیکن متعلم کے دماغ کو ضرور اس قابل کر دے گا کہ وہ فن کے مسائل کو بالاجمال سمجھ سکے۔ اسی فن کی تعلیم پھر از سرِ نو شروع کریں۔ اور اس مرتبہ تعلیم کا معیار کچھ اور بلند کریں یعنی اجمال کو چھوڑ کر شرح و بسط کے ساتھ مسائل سمجھائیں اور ساتھ اختلافی مسائل پر بھی روشنی ڈالیں۔ اور وجہِ اختلاف بھی بتائیں اور اسی اسلوب سے

تعلیم کو آخر علم تک پہنچائیں .... اب پھر تیسری مرتبہ فن کی تعلیم سرے سے شروع کریں۔ اور اسی دور میں کسی مشکل۔ دشوار اور مغلق مسئلہ کو بغیر واجبی تشریح و توضیح اور تنقیح کے نہ چھوڑیں ......"

تبلیغ مذہب سے حکومت پختہ ہوتی ہے

سنہ ۱۹۴۷ء میں انگریز ہندوستان سے ایسے گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ جاتا ہے۔ لیکن اگر انگریز اپنی ایک سو نوّے سال کی حکومت میں اپنے مذہب کی اشاعت کرتے اور مسلمانوں کی طرح وہ کروڑوں کو عیسائی بنا لیتے تو ان کو اس طرح بے نیل و مرام نہ جانا پڑتا۔ باوجود اس کے کہ مسلمان ہندوستان میں بس کر "دیسی" بن گئے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے سنہ ۱۲۰۰ء سے لے کر وفات اورنگ زیب یعنی سنہ ۱۷۰۷ء تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی۔ ڈیڑھ سو سال محکوم رہنے کے بعد پاکستان کی صورت میں مسلمانوں کا دور پھر شروع ہوا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ مسلمانوں نے اسلام کی تبلیغ بھی کی اور اس طرح کم از کم دو بڑے صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت قائم ہو گئی۔

(حوالہ نمبر ۲۰) اس سلسلے میں ابن خلدون بتاتا ہے کہ اگر حاکم قوم کا مقصد صرف محکوم پر حکومت کرنا ہے تو حاکم قوم میں تقسیم پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ حاکم قوم میں حکومت کے دعویدار بہت کھڑے ہو جاتے ہیں جس سے حکومت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ غیر مذہب ہونے کی وجہ سے محکوم لوگ قوم کا ساتھ نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ حاکم قوم جلد عیش و عشرت میں پڑ جاتی ہے۔ لیکن اگر حاکم قوم اپنے دین کی اشاعت بھی اپنے

ذمہ لے تو حاکم قوم کو نیک اعمالی کا نمونہ بننا پڑتا ہے تاکہ اشاعتِ دین میں مدد مل سکے۔ جب حاکم قوم میں اپنے مذہب کی اشاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو ساری حاکم قوم کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ آپس میں کشاکش کا مادہ رفوچکر ہوتا ہے۔ اور اختلاف و نزع ان کے درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ ہر ایک دوسرے کی طرف مدد و مساعدت کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔ ... اور سب کا مطلب و مقصد واحد ہو جاتا ہے اور اس پر وہ مضبوطی سے جم جاتے ہیں ...۔"

مغلوب قوم کی ذہنیت

عمرانیات ابنِ خلدون کا ایک اور کلیہ جو آج بھی ویسا ہی سچا نظر آتا ہے جیسا کہ اس کے زمانے میں تھا۔ مغلوب قوم کی ذہنیت سے متعلق ہے۔ یعنی مغلوب قوم حاکم قوم کے طور و طریق۔ لباس و پوشاک۔ عقائد۔ عادت خصلت کی ذوق و شوق سے اتباع و تقلید کرتی ہے۔ اس ذہنیت کا سبب ابن خلدون اس طرح بیان کرتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۲۱)

"اس کا راز یہ ہے کہ انسان کی فطرت ہے کہ جو اس پر غالب آتا ہے اس کے کمال کا وہ معتقد اور گرویدہ ہو جاتا ہے یا تو انتہائی تعظیم کی وجہ سے غالب کا کوئی نہ کوئی کمال اس کی نظر میں بچ جاتا ہے۔ اور اس کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ یا اس کو یہ دھوکا لگتا ہے کہ غالب کا غلبہ اس پر بہ تقاضائے طبع نہیں بلکہ بے پناہ کمال کی وجہ سے ہے۔ جیسے ہی کہ یہ خیال و عقیدہ دل میں سمایا مغلوب غالب کے ہر رنگ میں رنگنے لگتا ہے۔ اور اپنے عمل سے اس کی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی فعل و عمل کو ہم اقتدار کہتے ہیں یا مغلوب اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ غالب کے اقتدار کا سبب نہ عصبیت ہے نہ قہر و طاقت۔ بلکہ یہی عادات و خصائل و عقائد اس کے غلبے کا راز ہیں۔ جو اس کی نظر میں رچ گئے ہیں… چنانچہ اسی غلط فہمی کے ماتحت اور زیر اثر آپ دیکھیں گے کہ مغلوب غالب کی ہر پہلو سے نقل کرتا ہے۔ کیا لباس و پوشاک کیا مرکب و صلاح اور کیا حالاتِ زندگی۔ اولاد کا بھی یہی روّیہ رہتا ہے کہ وہ بھی اپنے آباؤ اجداد کی ہو بہو نقل اُتارتی ہے …. اسی طرح ہر ملک کے حالات کو سامنے لائیے اور دیکھیے کہ زیر فرمان مخلوق کس طرح اپنے حاکمِ وقت کے لباس و پوشاک اور وضع قطع میں اس کی اکثر نقل کرتی ہے۔ شاہی لشکر کی وردی کی بھی تقلید کرتی ہے۔…"

گو آج ہندوستان سیاسی لحاظ سے انگریزوں کے ماتحت نہیں ہے۔ لیکن "انگریزیت" کا غلبہ آج پہلے سے بھی زیادہ ہے۔ انگریز اور امریکی آج ہم پر براہ راست حاکم نہیں لیکن وہ ہم سے دُور بھی نہیں ہیں۔ گو بہ لحاظ فاصلہ ان کے ملک ہم سے دور ہیں لیکن رسل و رسائل کی آسانی کی وجہ سے انگریز اور امریکی ایک طرح سے ہمارے ہمسائے ہیں۔ اگر ہمسایہ صاحبِ اقتدار ہوتا ہے تب بھی گھٹیا قوم باوجود "آزاد" ہونے کے اپنے با اقتدار ہمسائے کا اثر قبول کرتی ہے۔ اس کے متعلق ابن خلدون کہتا ہے :۔

"جب ایک قوم دوسری قوم کی ہمسایہ ہو اور فی الجملہ اس

کے زیر اثر ہو تو متاثر قوم اپنی پڑوسی کا تشبہ اور اقتدا میں بہت کچھ اثر لیتی ہے۔"

ابن خلدون کی عمرانیات کی وسعت

ابن خلدون کا "مقدمہ" حکمت عمرانیات سے پُر ہے عالم اسلام میں بلاشبہ یہ پہلا مورخ اور مفکر ہے جس نے انسان کی "انسانیت" کا پہلو دیکھا۔ اور سماج انسانی کے جملہ پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی۔ کیونکہ انسانی زندگی مختلف عناصر سے متاثر ہوتی ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک تاریخ نگاری صرف واقعہ نگاری ہی نہیں ہے بلکہ ہر واقعہ کا سبب بتانا بھی مورخ کا فرض ہے۔ لیکن اسباب واقعات معلوم کرنے کے لئے مورخ کو عمرانیات کا علم ضروری ہے اور اسی خیال کے تحت اس نے اپنا "مقدمہ" لکھا۔ اس کے نزدیک تاریخ "العمران والاجتماع البشری" کی کہانی ہے یعنی انسان نے مجتمع ہو کر اور ایک دوسرے کی امداد سے کیا کیا کارنامے کئے لیکن تاریخ میں علاوہ اجتماع البشری کے اور چیزیں بھی ہیں جو انسان کے افعال و خیال پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ مثلاً مختلف ملکوں کی ساخت۔ آب و ہوا۔ ہمسایہ ملکوں کی سماجی حالت وغیرہ وغیرہ۔

ابن خلدون کی نظر میں اس کا قائم کردہ علم عمرانیات کس قدر وسیع تھا۔ اس کا اندازہ اس کے "مقدمہ" کی فہرست عنوانات سے ہوتا ہے اس فہرست کے چند عنوان اور موضوع ذیل میں بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں :-

باب اول۔ انسانی آبادی کا اجمالی بیان۔

پہلا مقدمہ۔ اجتماع انسانی ایک ضروری اور ناگزیر شے ہے۔

دوسرا مقدمہ - آباد رقبہ زمین کی تقسیم۔ درختوں۔ دریاؤں۔
اقلیموں کا بیان۔

تیسرا مقدمہ - معتدل وغیر معتدل اقالیم۔ وہاں کے انسانوں
پر آب وہوا کا اثر۔

چوتھا مقدمہ - ہوا اخلاق بشری پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

پانچواں مقدمہ - قحط اور ارزانی سے کیا تبدیلیاں رُونما ہوتی ہیں۔

چھٹا مقدمہ - فطرت وریاضت کی معاونت سے غیب دانی میں
لوگوں کے اقسام اور وحی اور خواب کی بحث -
نبوت کی حقیقت وغیرہ۔

باب دوئم - بدوی آبادی۔ وحشی اقوام وقبائل کی بودوباش اور
ان کے حالات دکوائف کا بیان۔

فصل اوّل - قبائلِ انسانی کا مراتب بدو وحضر کو طے کرنا ایک
فطری شے ہے۔

فصل دوئم - بدوٴں کا خانہ بدوش ہونا طبعی ہے۔

فصل سوئم - بدویت حضریت سے مقدم اور سابق ہے۔ بڑے
شہر پہلے چھوٹی بستیاں تھے۔

فصل چہارم - دیہاتی بہ نسبت شہریوں کے بھلائی اور نیکی سے
زیادہ قریب ہیں۔

فصل پنجم - دیہاتی شہریوں سے زیادہ بہادر اور شجاع ہوتے ہیں۔

فصل ششم - اوامر واحکام کی تعمیل شہریوں کی بہادری کو
برباد کر ڈالتی ہے۔

فصل ہفتم - اہلِ عصبیت ہی بدوی طریق پر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔
فصل ہشتم - عصبیت۔ نسبی اتحاد - اور دیگر قریبی تعلقات سے پیدا ہوتی ہے۔

(چند فصلیں دانستہ حذف کی جاتی ہیں - صرف چند بطورِ نمونہ پیش ہیں)

فصل ۱۲ - عصبیت والی قوم پر غیر قوم کا آدمی حکمراں نہیں ہو سکتا۔
فصل ۱۶ - وحشی اقوام دوسری اقوام کے مقابلے میں غلبہ جلد حاصل کر لیتی ہیں۔
فصل ۲۳ مغلوب لوگ اہلِ اقتدار کے طور طریق اور لباس وغیرہ میں نقل کرتے ہیں۔

باب سویم - فصل ۱ عام سلطنت و مُلک قومی شوکت و عصبیت سے حاصل ہوتے ہیں۔
فصل ۵ دینی دعوت عصبیت کی قوت کو دو چند کر دیتی ہے
فصل ۶ دینی دعوت عصبیت کو دو چند کر دیتی ہے۔
فصل ۱۱ - جب کسی قوم میں سلطنت آتی ہے تو تعیش بھی اس کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔
فصل ۱۴ انسانوں کی طرح سلطنتوں کی عمریں بھی طبعی ہوتی ہیں۔
فصل ۲۳ - سلطنت کی حقیقت - اس کے اقسام و اصناف۔
فصل ۳۳ - مذہبِ عیسوی میں الفاظ "پاپا" اور "بطریق" کی تحقیق۔
فصل ۳۷ جنگ - قوموں کے مختلف اسلوب جنگ د

طریقۂ صف بندی۔

فصل ۴۰ سلطنت کی تجارت سے رعایا کو نقصان ہوتا ہے۔

باب پنجم۔ معاش اور اس کے حصول کے ذرائع (اس باب میں ابن خلدون علم معیشت کے جملہ موضوعات کا ذکر کرتا ہے۔ کیونکہ ابن خلدون کے نزدیک علم معیشت علم عمرانیات کا جزو اعظم ہے)

فصل ۲ معاش کے طریقے۔ اس کے اصناف و اسباب۔

فصل ۷ دینی اور مذہبی لوگ اکثر مالدار نہیں ہوتے۔

فصل ۹ تجارت کے معنی اور اس کے اقسام و اصناف۔

فصل ۱۴ اشیاء کی ارزانی اہل حرفہ کے لئے مضر ہے۔

باب ششم۔ علم کی قسمیں۔ تعلیم اور اس کے طریقوں میں عوارض و لواحق۔

فصل ۱ تعلیم اور تعلیم عمران بشری کے لئے طبعی اُمور ہیں۔

فصل ۳ آبادی جس قدر بڑھتی ہے اور شہریت کا زور ہوتا ہے علم کا چرچا بھی بڑھتا ہے۔

(اس باب میں ابن خلدون نے جملہ علوم نقلیہ و عقلیہ کو بیان کیا ہے علم تفسیر سے لے کر علم طب و طبیعات تک)

فصل ۲۵ فلسفہ کی خرابیاں اور اس کا بطلان۔

فصل ۲۹ علوم میں تالیفات کا اختصار بھی تعلیم میں خلل کا باعث ہوتا ہے۔

(یہاں ابن خلدون کی مراد اس چیز سے ہے جو آج کل "نوٹ"

کہلاتی ہے جس کو رٹ کر ہمارے طلبار امتحان تو پاس کر لیتے ہیں لیکن علم کے معاملے میں کورے ہی رہتے ہیں۔)

فصل نمبر ۳۰۔ تعلیم علوم کا صحیح و مفید طریقہ۔

فصل نمبر ۳۲ بچوں کی تعلیم۔ ممالک اسلامیہ میں اس تعلیم کے مختلف طریقے۔

فصل نمبر ۳۳ تشدد طالب علم کے حق میں مُضر ہے۔

فصل نمبر ۳۴ علم کی خاطر سفر اور مشائخ زمانہ سے ملاقات تعلیم کو چار چاند لگاتی ہے۔ گو یہ فہرست مختصر کر کے پیش کی گئ ہے۔ لیکن پھر بھی اس سے ابن خلدون کے پیش کردہ علم عمرانیات کی جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ فنونِ لطیفہ پر بھی اس نے تبصرہ کیا۔ اپنے "مقدمہ" کے متعلق وہ کہتا ہے:۔

"جس چیز نے مجھے اس (مقدمہ) کی تصنیف کی توفیق دی وہ الہام الہٰی تھا جس نے مجھے ایک جدید فلسفے سے شناسا کرایا اور مجھے اس علم اور اس کے رازوں کا حامل اور مفسّر بنا دیا۔"

ابن خلدون کا نظریۂ الہام

گو ابن خلدون عقلی دلائل اور نظرئے پیش کرتا ہے لیکن وہ الہام کا قائل ہے۔ اس کو تاریخ میں ایسے واقعات نظر آئے جن کے اسباب معلوم کرنے سے انسانی عقل قاصر ہے۔ مثلاً۔ ایک قدیم ریگستان سے عربوں کا خروج اور ان کی عالمگیر فتوحات معجزے سے کم نہیں۔ چنانچہ اس

نے علم تاریخ کو علم الٰہی کا درجہ دیا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے عربوں کی مذمت بھی کی۔ عربوں کے متعلق اس نے صاف صاف لکھا:۔

"واقعہ یہ ہے کہ عرب ایک وحشی قوم ہے جس میں وحشیانہ عادات و خصائل ایسے جڑ پکڑ گئے ہیں کہ یہ ان کے جبلی و فطری عادات شمار ہونے لگے ہیں اور یہ وحشت عربوں کو اس لئے پسند ہے کہ اس میں ان کو دوسروں کی تابعداری سے چھٹکارا ملتا ہے۔ اور کسی کی سیاست کے سامنے وہ اپنا سر نہیں جھکاتے۔ ان کا یہ رجحانِ طبع ظاہر ہے کہ آبادی اور تمدّن کے سخت خلاف ہے....." (حوالہ نمبر ۲۲)

ابن خلدون کا فلسفہ تاریخ دراصل عمرانیات ہے اور اس عمرانیات کا مرکز و محور "عصبیت" ہے۔ عصبیت کی جائے پیدائش ریگستان ہوتی ہے۔ انبیاء اسی عصبیت کو فروغ دے کر وحشیوں کو قوموں میں تبدیل کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے یہودیوں کی عصبیت کو فروغ دیا۔ اسی طرح بانیٔ اسلام نے عربوں کو قوم بنایا۔ جب تک کسی قوم میں عصبیت باقی رہتی ہے تب تک وہ اغیار کے قابو میں نہیں آتی۔ لیکن جب قوم بن کر یہ خانہ بدوش شہروں میں آباد ہو جاتے ہیں۔ تو یہ عصبیت ختم ہو جاتی ہے اور کوئی دوسرا وحشی قبیلہ تازہ دم عصبیت لے کر اٹھتا ہے اور شہری تمدن والوں پر غالب آتا ہے۔ لیکن وہ تازہ دم قبیلہ بھی شہروں میں بس کر اپنی عصبیت کھو بیٹھتا ہے اس طرح ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے کی داستان کا نام عمرانیات ہے۔

اس میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ جو علم عمرانیات ابن خلدون نے پیش کیا وہ خالص اس کی اپنی جدت واختراع پر مبنی ہے۔ اس نے رائج الوقت علوم سے روگردانی کر کے اس نئے علم کی بنیاد ڈالی اور ایسی بنیاد ڈالی جس پر ہمارے زمانے میں ایک عالیشان عمارت تعمیر ہوئی۔ یہ عمارت آج کل مغرب میں سوشیولوجی کے نام سے موسوم ہے۔ اس علم عمرانیات کے شیدائیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ علم بذات خود مکمل سائنس ہے۔ ابن خلدون کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنے ذہن کو ان قیود سے آزاد کیا جن میں اس کے ہم عصر اہل فکر جکڑے ہوئے تھے۔ بقول ایک جرمن اہل قلم ابن خلدون "وہ آخری ستارہ تھا جو آزاد خیالی کے آسمان پر طلوع ہوا۔"

ابن خلدون نے فلسفۂ تاریخ کی جو بنیاد ڈالی اسی پر اطالوی مورخ ویکو (۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء) نے تقریباً ڈھائی سو سال بعد اپنے فلسفۂ تاریخ کی عمارت تعمیر کی۔ یہی عمارت آج تک فلسفۂ تاریخ کے نام سے موسوم ہے مگر اس کا بانی ابن خلدون ہی تھا۔

ابن خلدون بحیثیت مؤرخ ایسے مفکر اور جدت طراز مؤرخ سے جس نے تمام مؤرخوں کے لئے مشعل راہ روشن کی۔ امید کی جا سکتی ہے کہ اس کی اپنی نوشتہ تاریخ نمونۂ کمال ہوگی۔ لیکن افسوس کہ ابن خلدون کی اپنی تاریخ میں تقریباً وہی خامیاں نظر آتی ہیں۔ جن کی اس نے مذمت کی۔

اس کی یہ تاریخ علاوہ "مقدمہ" کے دو حصوں میں منقسم ہے پہلا حصہ حضرت آدمؑ سے شروع ہوتا ہے اور اس کے اپنے زمانے یعنی چودھویں عیسوی کے اختتام تک جاتا ہے۔ اس حصے میں تمام عرب سلطنتوں کے

آغاز و انجام کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ اس حصے میں غیر عرب قوموں مثلاً ایرانیوں۔ ترکوں۔ یہودیوں۔ رومی (بازنطیون) یونانیوں۔ شامیوں اور فرنگیوں کی حکومتوں کا بھی تذکرہ ہے۔

(۲) دوسرا حصہ بربر قبیلوں مثلاً زناتہ وغیرہ سے متعلق ہے۔

ضخامت کے لحاظ سے اس کی مکمل "تاریخ معہ مقدمہ" سات جلدوں میں تھی۔ جس کی ساتویں جلد بربر قبیلوں سے متعلق ہے۔ اسی ساتویں جلد میں ابن خلدون کی خودنوشتہ سرگذشت بھی شامل ہے۔ جو حصے بازنطینی۔ رومیوں اور یونانیوں سے متعلق ہیں ان کے لئے ابن خلدون نے کُل مواد ابن العمید کی نوشتہ تاریخ سے حاصل کیا۔ اس کتاب کا نام کسی قدر طویل ہے۔

کتاب العبر و دیوان المبتدا و الخبر فی ایام العرب
والعجم والبربر عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر

اس کتاب کی چوتھی جلد میں تاریخ اندلس از ابتدائے مسلم عہد تا زمانۂ بنو الاحمر کے علاوہ فاطمیان مصر اور قرامطہ کا بھی تذکرہ ہے۔ آلِ بویہ اور آل سبکتگین یعنی دولتِ غزنویہ کا بھی تذکرہ اسی چوتھی جلد میں ہے۔ پانچویں جلد میں آلِ سلجوق اور صلیبی جنگوں کا حال ہے۔ اور مملوک حکمرانوں کے بھی حالات اسی جلد میں ہیں۔

ابن خلدون کے ماخذ مندرجہ ذیل تاریخیں تھیں :۔

(۱) ابن ہشام کی "سیرت رسول اللہ" جو ابن اسحق کی "سیرت" کا خلاصہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے ابن اسحق کی اصل کتاب ابن خلدون کے ہاتھ نہ لگ سکی۔

(۲) واقدی کی کتاب "مغازی" جس میں غزوات کا تذکرہ ہے۔

(۳) بلاذری کی "فتوح البلدان" اور "انساب الاشراف" جس میں اسلامی فتوحات کا تذکرہ بالترتیب ہے۔

(۴) ابن عبدالحکم کی "فتوح المصر" جو فتح مصر سے متعلق سب سے قدیم تاریخ ہے۔

(۵) طبری کی "تاریخ الرسل والملوک" جو بلحاظ صحت اور تفصیلات سب سے معتبر سمجھی جاتی ہے۔

(۶) مسعودی کی "مروج الذہب" اور "تنبیہ الاشراف"۔ اس آخرالذکر کتاب میں سعودی نے اپنا فلسفۂ تاریخ بھی بیان کیا ہے۔

(۷) ابن الاثیر کی "الکامل فی التاریخ" جس میں طبری کی تاریخ کا تکملہ ہے۔

ابن خلدون کی آخری جلد بربر قبیلوں سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے "مقدمہ" میں لکھتا ہے:۔

"میں اس کتاب میں ملک بربر کے متعلق وہ حالات لکھ رہا ہوں جو میرے ہاتھ براہ راست یا بالواسطہ لگے کیونکہ میرا مقصد صرف مغرب کی تاریخ لکھنا ہے کہ اس علاقے میں کون کون سی قومیں اور سلطنتیں رونما ہوئیں۔ مجھے مشرق اور اس کی قوموں کا حال نہیں معلوم اور رائج الوقت تاریخیں میرا مقصد پورا کرنے کی اہل نہیں"۔

گویا مشرقی عالم اسلام کے حالات کے متعلق ابن خلدون خود اپنی نادانی کا اعتراف کرتا ہے۔ اس علاقے کی تاریخ کے لئے مواد اس نے

دیگر تاریخوں سے حاصل کیا۔ لیکن ساتھ ہی ان دیگر تاریخوں کو اس نے پوری طرح معتبر نہیں سمجھا۔ لیکن مغرب کے حالات وہ خوب جانتا تھا۔ کیونکہ وہ خود اسی علاقے کا باشندہ تھا۔ چنانچہ جو تاریخی حالات اس نے مغرب سے متعلق لکھے وہ صحیح اور معتبر ہیں کیونکہ علاوہ تاریخ کے وہ اس علاقے کے جغرافیائی حالات سے بھی بخوبی واقف تھا اور جغرافیہ ہی تاریخ کا پس منظر ہے۔ وہ مغرب کے تمام بربر قبیلوں مثلاً زناتہ۔ قطامہ۔ مسمودہ۔ سنجہ وغیرہ سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ وہ ان بربر قبیلوں کی ابتدا اور ان کے خروج کا ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ قبل از اسلام یہ قبیلے کس حالت میں تھے۔

اسی طرح اندلس سے متعلق تاریخی حالات بھی ابن خلدون سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا اس کو پرانی تاریخیں دستیاب تھیں جو بعد کو تلف ہو گئیں۔ ابن خلدون نے جو کچھ تاریخ اندلس کے متعلق لکھا اس کے متعلق مشہور مغربی مؤرخ ڈوزی کی رائے یہ ہے:۔

"قرون وسطیٰ کے عیسائیوں کی کتابوں میں جو کچھ اندلس کے عیسائیوں کے متعلق ہے اس کی مقابلتاً کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ کسی عیسائی مؤرخ نے ان کے حالات کو ایسی صحت اور صفائی سے بیان نہیں کیا جس طرح ابن خلدون نے بیان کیا۔"

گو تاریخ مغرب کے معاملے میں ابن خلدون بلاشبہ لاثانی ہے۔ لیکن مشرقی عالمِ اسلام کی تاریخ نگاری میں ابن خلدون کا کوئی مقام نہیں۔ اس نے سابق مسلم مورخین کی طرح انبیاء کا تذکرہ بھی لکھا۔ لیکن اس تذکرے میں اس نے روایات ہی پر اکتفا کیا باوجود اس کے کہ وہ خود

اپنے مقدمے میں ان روایات کی مذمت کرتا ہے۔ اور بعض روایات کو خلاف عقل ہونے کی بنا پر لغو سمجھتا ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"کیا کیجئے کہ نا اہل مورخوں نے من گھڑت خرافات اور بے بُنیاد باتیں اس میں ملا دیں اور لغو کمزور بُنیاد باتوں کو ادھر اُدھر سے لے کر یا خود ساختہ اس میں شامل کر دیا۔ پھر متاخرین بہت سے لکیر کے فقیر ہو کر انہیں کے قدم بہ قدم چلے۔ اور اپنی سُنی سُنائی باتوں کو ہم تک پہنچایا نہ انہوں نے واقعات کے اسباب پر نظر رکھی اور نہ خاص خاص حالات کا لحاظ کیا اور نہ بے اصل اخبار اور محض ڈھکوسلوں سے تاریخ کے دامن کو پاک کیا ۔۔۔۔ اگرچہ مسعودی اور واقدی کی تاریخوں کا دامن بھی طعن والزام سے پاک نہیں جو حفاظ و ثقات کے نزدیک مشہور و معروف ہیں لیکن پھر بھی عام طور پر لوگوں نے ان کی روایات کو قبولیت کا درجہ دیا ہے۔۔۔۔"

لیکن اس کے باوجود ابن خلدون نے اس قسم کے مورخین سے استفادہ کیا۔ البتہ ابن خلدون کی حمایت میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس کو جو مواد ملا وہ خود روایات اور افسانوں پر مبنی تھا۔ کیونکہ یہ قدیم مورخ ابن خلدون کی نصیحتوں سے نا آشنا تھے۔ اس کے علاوہ بیشتر تاریخیں جو ابن خلدون کے ہاتھ آئیں روزنامچہ کی صورت میں تھیں جن کے مندرجہ واقعات میں علت و معلول کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی تاریخ کو باعتبار زمانہ نہیں بلکہ باعتبار موضوع مختلف حصوں میں منقسم کیا اور

ہر حصّہ کو ابواب میں منقسم کیا۔ ہر سلطنت کا تذکرہ مسلسل صورت میں کیا۔ گو اس قسم کی تقسیم ابن خلدون سے پہلے بلاذری وغیرہ کر چکے تھے۔ لیکن ابن خلدون کی تقسیم بہتر ہے اس کے علاوہ ابن خلدون کا طرز بیان عبارت آرائی اور قافیہ اور سجع سے مبرّا ہے۔

ساتواں باب

میرا ساز و سامان اور اُس کی تباہی

میرے روحانی پہلو یعنی میرے فلسفہ کا ذکر سُنتے سُنتے آپ تنگ آ گئے ہوں گے لیکن روح ایسی چیز ہے جس کو ہر کس و ناکس نہیں سمجھ سکتا۔ عوام تو میری مادی صورت کے شیدا ہیں کیونکہ وہ میرے اس پہلو کو اپنے حواس خمسہ کے ذریعہ بغیر سوچ بچار دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن میری مادی صورت صرف قالب ہے۔ انسان کی لاپرواہی اور غفلت سے میرے قالب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ میرے ہاتھ پیر آنکھ ناک کان آج مُنتشر ہیں۔ میرے بعض اجزائے جسم تو آج بھی زیر زمین دفن ہیں۔

میرے مُنتشر اجزا میرے اجزائے جسم کے مُنتشر ہونے کا سبب یہ ہے کہ میں نے کسی ایک خاص مقام پر مستقل سکونت اختیار نہ کی۔ جہاں کہیں انسان متمدن ہو کر مجھے طلب کرتا تھا میں وہیں پہنچ جاتی تھی۔ چنانچہ میری شکل و شباہت بھی بدلتی رہی۔ انسان کے ایامِ وحشت میں میں غاروں میں رہی جہاں تصویروں کی شکل میں میری نشانیاں آج بھی موجود ہیں۔ انسان نے جب کِل کِل کانٹے بنانا سیکھے تو میں پتھروں پر کندہ کی گئی جو آج بیشتر زیر زمین ہیں۔ میں کاغذوں پر تحریری صورت میں بہت بعد کو آئی۔ کیونکہ

انسان نے لکھنا پڑھنا حال ہی میں سیکھا ہے۔ جنوبی امریکہ کے علاقے یوک ٹن میں جو قوم آباد تھی وہ باوجود مہذب اور متمدن ہونے کے تحریر سے بالکل ناآشنا تھی۔ چنانچہ اُن کے حالات ان کی عمارتوں ہی سے معلوم ہوسکتے ہیں۔

میرے حالات جو نوشتہ صورت میں دَورِ قدیم میں ملتے ہیں وہ بہت محدود ہیں۔ اکثر ملکوں میں عہدِ قدیم میں کاغذ کا بھی رواج نہ تھا۔ اس لئے عہدِ قدیم کے متعلق میرا سامان اشیاء کی صورت میں ہے جو آج کل عجائب خانوں میں ملتی ہیں۔ اشیاء کے معاملے میں مَیں فراعنہ مصر کی خاص طور سے ممنون ہوں۔ جن کی بدولت میرے متعلق ان کے زمانے کی ہر چیز دستیاب ہے۔ ان فراعنہ کا تذکرہ میں آگے چل کر اسی باب میں کرونگی۔

تاریخ ٹھوس صورت میں

اب تک میں نے اپنے روحانی پہلو کا ذکر کیا ہے یعنی یہ کہ مجھ میں کیا کیا معانی پنہاں ہیں اور میں کن تصوّرات کی حامل ہوں لیکن روح کے ساتھ میرا قالب بھی ہے۔ سب سے پہلے میرا قالب پتھروں پر نقوش کی صورت نمودار ہوا۔ یہ نقوش آج بھی غاروں میں موجود ہیں۔ جہاں انسان نے اپنا پہلا آشیانہ بنایا۔ یہ نقوش تصویروں کی صورت میں ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ وحشی دور میں کن کن چیزوں اور کن کن باتوں کو انسان پسند کرتا تھا۔ اور اس کے خیال کی پرواز کس مقام تک تھی۔ اس زمانے میں انسان شکم علیہ السلام کے تقاضے پورا کرنے میں بے طرح مصروف تھا۔ لیکن جب وہ آفاتِ ناگہانی سے دوچار ہوتا تھا تو اس کے دماغ میں ایسی ہستی کا تصور بھی آتا تھا جو ان آفات کو نازل کرتی تھی۔ اس وقت انسانی ذہن اتنا محدود تھا اور اس کے سامنے

سامان کائنات باد و باراں، پہاڑوں اور درختوں کی صورت میں اس کثرت سے تھے کہ وہ اس کثرت کا اس حد تک شکار ہوا کہ اس نے ہر سامانِ کائنات کو کائنات گر سمجھا اور سینکڑوں معبود قائم کئے۔ شکم کے تقاضوں کے معاملے میں مجھے وحشی اور "متمدن" انسان میں آج کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ان وحشیوں نے اپنے غاروں میں گائے بیلوں کی تصویریں بنائیں جن کا گوشت وہ کھاتے تھے۔ اسی طرح متمدن انسان بھی آج موٹر کاروں کی تصویریں بناتا ہے جن پر وہ سوار ہوتا ہے۔ بلکہ آج تو انسانی ضروریات اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ وہ سینکڑوں "سامانِ تمدن" کی تصویریں بناتا ہے۔ تصویر بنانے کا دستور گویا آج بھی جاری ہے۔ شبیہہ نگاری جس کے لوگ آج اس قدر شیدا ہیں اسی ایامِ وحشت کی یادگار ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ وحشی صرف انسان کی تصویر بناتے تھے میری تیری نہیں۔ کیونکہ ان وحشیوں میں ہوسِ یادگار نہ تھی لیکن یہ متمدن انسان تو میری تیری تصویریں بناتا ہے کیونکہ وہ اپنی یادگار قائم کرنا چاہتا ہے۔

انسان نے گویا میرے پیدا کردہ انقلابات سے کوئی سبق نہ سیکھا۔ میرے ہر انقلاب نے گزشتہ یادگاروں کو مٹا دیا۔ نمرود کی جنت آج زیرِ زمین ہے۔ اس جنت کا نشان ایک بلند برج تھا جس کا ذکر کتاب "پیدائش" میں اس طرح ہے:۔ (حوالہ نمبر ۱)

"انہوں نے آپس میں کہا آؤ ہم اینٹیں بنائیں اور ان کو آگ میں خوب پکائیں۔ سو انہوں نے پتھر کی جگہ اینٹ سے اور چونے کی جگہ گارے سے کام لیا۔ پھر وہ کہنے لگے کہ آؤ ہم

اپنے واسطے ایک شہر اور ایک بُرج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے بنائیں اور یہاں اپنا نام کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمام روئے زمین پر پراگندہ ہو جائیں ؏

لیکن میری بدولت اس ہوسِ یادگار کا کیا انجام ہوا اس کا ذکر اسی کتاب پیدائش سے سنئے اور عبرت حاصل کیجئے :- (حوالہ نمبر ۲)

" اور خداوند اُس شہر اور بُرج کو جسے بنی آدم بنانے لگے دیکھنے کو اُترا۔ اور خداوند نے کہا دیکھو یہ لوگ سب ایک ہیں۔ اور سبھوں کی ایک ہی زبان ہے۔ وہ جو یہ کرنے لگے ہیں تو اب کچھ بھی جس کا ارادہ کریں ان سے باقی نہ چھوٹے گا"۔

لیکن کیا خدا کو یہ ہوس یادگار پسند آئی ؟ نہیں ہرگز نہیں۔ چنانچہ اسی خدا نے جو ان کی یادگار دیکھنے کے لئے اُترا تھا مجھے اشارہ کیا۔ اس اشارے پر مَیں نے جو کچھ کیا اس کا حال بھی اسی کتاب پیدائش سے سنئے :-

" (خدا نے کہا) سو آؤ ہم وہاں جا کر ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں۔ تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات سمجھ نہ سکیں۔ پس خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز آئے اس لئے ان کا نام بابل ہوا۔ کیونکہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبان میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے ان کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا"۔

جس نے اس فردوسِ بابل کا خاتمہ کیا وہ ہمورابی تھا جس نے ایک اور بُرج بنوایا جس کے متعلق اس کے فرزند نے دعویٰ کیا کہ وہ آسمان کا مقابلہ کرلے گا۔ (حوالہ نمبر ۳) انبیاء اور میری نظر میں یہ دعویٰ خدائی سے کم نہ

تھا۔ کیونکہ صرف خدا ہی لایزال ہے۔ لیکن ساتھ ہی میں انسان کی اس کمزوری یعنی ہوس یادگار کی ممنون بھی ہوں کیونکہ اس کی بدولت میری بھی یادگار قائم ہوتی ہے خواہ وہ عارضی ہی سہی۔ انسان کی فطرت ہے کہ "ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت"۔ اس طرح میرے افسانوں کے لئے نیا مواد اور میرے لئے نئے سامان مہیا ہوتے رہتے ہیں۔

میں ہزاروں سال سواحلِ دجلہ و فرات اور نیل میں مقیم رہی کیونکہ انسان تلاشِ معاش میں ان علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کرتا تھا۔ جہاں اس کو روزی آسانی سے حاصل ہو سکتی تھی تہذیب و تمدّن قائم کرنے کے لئے فارغ البالی ضروری ہے۔ ان زرخیز علاقوں میں مَیں نے عجیب عجیب تماشے دیکھے۔ انہیں علاقوں میں مذہب کی بُنیاد پڑی۔ یہیں علم و حکمت بھی شروع ہوا اور یہیں انسان نے حیاتِ جاودان کی تلاش بھی شروع کی۔ "آبِ حیات" کی کہانی بھی اسی علاقے سے متعلق ہے۔ انسان کی "مُشتِ خاک" سے ابتدا کا تصوّر بھی یہیں پیدا ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ انسان کی آمد سے پہلے اس دُنیا پر متعدد خداؤں کا رواج تھا لیکن ان خداؤں کو بھی روزی پیدا کرنی پڑتی تھی۔ جس سے وہ تنگ آ گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے سازش کی کہ کسبِ روزی کے لئے انسان کو پیدا کیا جائے تاکہ خداؤں کو آرام نصیب ہو۔ دھرتی ماتا بھی ایک دیوی تھی لہٰذا ان خداؤں نے سازش کی کہ اس کے "بطن" سے ایک مُشتِ خاک لی جائے اور اس سے انسان کو بنایا جائے۔ چنانچہ ایک خدا نے دھرتی ماتا کے بطن سے ایک مُشتِ خاک لے کر انسان کو بنایا۔ (حوالہ نمبر ۴)

تلاشِ آبِ حیات

جب انسان نے دیکھا کہ یادگاریں عمارتوں کی صورت میں ختم ہو جاتی ہیں تو انسان نے موت پر فتح پانے کی ٹھانی اور حیاتِ جاوداں حاصل کرنے کے لئے اس نے کسی جڑی بوٹی کی تلاش شروع کی۔ اہلِ بابل موت کو سزا سمجھتے تھے۔ لیکن جب انسان کوئی خطا نہ کرے تو پھر اس کو سزائے موت نہ ملنی چاہیئے۔ چنانچہ ایک شخص "گِل گمیش" نامی اٹھا اور اس نے کہا:۔

"انسان کیا ہے اس کی زندگی کے دن معین ہیں۔ وہ خواہ جو کچھ کرے اس کی حقیقت ہوا سے زیادہ نہیں"۔

جب گِل گمیش اس جڑی بوٹی کی تلاش میں نکلتا ہے تو لوگ اس کو اس طرح سمجھاتے ہیں:۔

"اے گِل گمیش! تو ناحق سرگردانی کر رہا ہے۔ جس حیاتِ جاوداں کی تجھے تلاش ہے وہ تجھے حاصل نہیں ہوگی۔ کیونکہ جب خداؤں نے انسان کو پیدا کیا تو موت اس کی قسمت میں لکھ دی۔ اور اس کی زندگی پر قابو انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ گِل گمیش! اپنا پیٹ بھر۔ مزے اڑا اور ناچ گانے میں زندگی بسر کر۔ اچھے اچھے کپڑے پہن۔ منہ ہاتھ دھو۔ اپنے بچے کو دیکھ جو تیری انگلی پکڑے ہوئے ہے۔ اپنی بیوی کو آغوش میں لے۔ انسان کا بس یہی کام ہے"۔ (حوالہ نمبر ۵)

لیکن گِل گمیش پر تو حیاتِ جاوداں کا خبط سوار ہے۔ چنانچہ وہ چل کھڑا ہوتا ہے اور بڑی تلاش کے بعد حیاتِ جاوداں کی بوٹی اس کے ہاتھ لگتی ہے۔ اس کو لے کر وہ واپس ہوتا ہے۔ راستے میں اُسے ایک

دریا ملتا ہے۔ اپنی بوٹی کو کنارے پر رکھ کر وہ اس دریا کی گہرائی معلوم کرنے کے لئے دریا میں داخل ہوتا ہے اور اس میں نہا کر اپنی تکان دور کرتا ہے۔ جب کنارے پر واپس پہنچتا ہے تو کیا دیکھتا ہے؟ ایک سانپ اس بوٹی کو لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ اس طرح سانپوں کو تو حیاتِ جاوداں حاصل ہو جاتی ہے لیکن انسان مُنہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

کیا اہلِ بابل کے یہ افسانے صحیح ہیں؟ نہیں، یہ محض افسانے ہیں لیکن ان کو دانستہ گڑھا جاتا تھا تاکہ ان کے ذریعہ انسان کو عقل و حکمت کا سبق دیا جائے۔ یہ ذریعہ تعلیم اہلِ یونان نے جاری رکھا۔ افلاطون وغیرہ اسی طرح تعلیم دیتے تھے اور اپنے دقیق فلسفہ کو عام فہم بناتے تھے۔ یہ طریقہ آج بھی رائج ہے۔ اس زمانے میں ڈرامے اور ناول اسی نیت سے لکھے جاتے ہیں لیکن اس طریقے کے بانی اہلِ بابل تھے۔ یہ لوگ فنِ تحریر سے بھی واقف تھے۔ ان کی تحریریں کتبوں کی صورت میں ملتی ہیں جن کو ماہرینِ آثار الصنادید کھود کھود کر نکالتے ہیں۔ یہ ماہرین میرے ممد و معاون ہیں جن کی میں ممنون و مشکور ہوں۔

فراعنۂ مصر کی تاریخی خدمات

لیکن اپنے آثار کے معاملے میں سب سے زیادہ ممنون میں فراعنۂ مصر کی ہوں جن کی بدولت ہزاروں سال پُرانے سامان آج تک محفوظ ہیں۔ یہ حکمرانِ مصر اپنی بدعقیدگی کے لئے بدنام ہیں لیکن ساتھ ہی یہ میرے محسن بھی ہیں۔ قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ دوسری دُنیا یعنی عاقبت بھی بالکل اسی دُنیا کی طرح ہے جہاں انسان کی ضروریات بھی اس دنیا کی ضروریات کے مشابہ ہیں۔ چنانچہ مصر کے امراء اور خصوصاً فراعنہ کی قبروں میں

ضروریات کا ہر ساز و سامان رکھا جاتا تھا۔ ملکہ اور شہزادیوں کے لئے سامانِ حسن مثلاً غازہ۔ اُبٹن۔ کنگھی۔ آئینہ وغیرہ فراہم کیا جاتا تھا۔

ان حکمرانِ مصر کی قبریں گویا ایک قسم کا عجائب خانہ ہوتا تھا۔ اور ہر زمانے کے تمدن کا سارا ساز و سامان یکجا کر دیا جاتا تھا۔ غلہ اور پکا ہوا کھانا بھی رکھ دیا جاتا تھا۔ جس سے آج میرے محرر پتہ چلا لیتے ہیں کہ اس زمانے میں لوگ کس قسم کا کھانا کھاتے تھے۔ کس قسم کی پوشاک پہنتے تھے۔ کون سی سواری کا رواج تھا وغیرہ وغیرہ۔ قبروں کی دیواروں پر تصویریں بھی بنائی جاتی تھیں جن سے ان کے مذہبی عقائد کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حتیٰ کہ فرعونوں کی لاش پر مسالہ لگا کر تابوت میں رکھ دیا جاتا تھا۔ چنانچہ متعدد فرعونوں کی لاشیں آج لندن کے برٹش میوزیم (عجائب گھر) میں محفوظ ہیں۔

ان فرعونوں کے زمانے میں میرے صحیفے بھی لکھے گئے۔ یہ صحیفے ان کے ملازم مؤرخوں نے لکھے لیکن یہ کتابیں تلف ہو گئیں۔ کتاب کی صورت میں جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں ان کا ماخذ صرف ایک کتاب ہے جو ایک مصری مورخ منی تھو نامی نے چار ہزار سال بعد عہد بطلیموس اوّل (۳۰۵ تا ۲۸۵ قبل مسیح) میں لکھی۔ جب مصر کی حکومت یونانیوں کے ہاتھ آ چکی تھی۔ منی تھو کی نوشتہ تاریخ بھی تلف ہو گئی۔ اس کے محض حوالے ملتے ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ فرعونوں کا راج ۴۲۴۱ سنہ قبل مسیح میں قائم ہو چکا تھا۔ اس منی تھو کی تلف شدہ تاریخ کے مطابق فرعونوں کے مختلف خاندان تیس تھے۔ اس حساب سے میرے تحریری صحیفے آج چھ ہزار سال پرانے ہیں۔ کیونکہ مسیح کی وفات کے بعد دو ہزار سال مزید گذر چکے ہیں۔ ان فرعونوں کے عہد کی سب سے بڑی خصوصیت

یہ تھی کہ تقریباً تین ہزار سال تک مصر ایک قسم کی حکومت ہی کے تحت برابر رہا۔ اور ایک ہی قسم کی تہذیب رائج رہی جو آج فرعونی تہذیب کہلاتی ہے۔ (حوالہ نمبر ۶)

اہرامِ مصر اس تہذیب کا نشان جو ٹھوس صورت میں ہے وہ "اہرام" کی شکل میں ہے جس کو دیکھ کر آج بھی ماہرینِ تعمیر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ ایسی ٹھوس عمارت آج سے چھ ہزار سال پیشتر بغیر مشین کس طرح تعمیر ہوئی۔ میری خوش نصیبی سے ان احرام کی تعمیر کے متعلق چند اشارے یہودیوں کی توریت کی کتاب "خروج" میں ملتے ہیں کہ کس طرح یہودیوں کے خون سے یہ اہرام تعمیر ہوئے۔ یہ کتاب حضرت موسیٰ ؑ سے متعلق ہے اور اس نبی کے روح افزا حالاتِ زندگی اس میں درج ہیں۔ یہ کتاب خروج بتاتی ہے کہ یہودیوں سے بیگار کا کام لیا جاتا تھا جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہے: (حوالہ نمبر ۷)

"اور مصریوں نے بنی اسرائیل پر تشدد کر کر کے ان سے کام کرایا اور انہوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور کھیت میں ہر قسم کی خدمت لے لے کر ان کی زندگی تلخ کر دی۔ ان کی سب خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے تشدد کی تھیں۔"

لیکن ان یہودیوں کے خون سے جو اہرام تعمیر ہوئے وہ آج میری سب سے ٹھوس اور مستحکم نشانیاں ہیں اور میرے سامان کے خزانے ہیں جو بدستور محفوظ ہیں۔ آج ان اہرام کا بیان ایسا ہی ہے جیسا کہ چاند اور سورج کا۔ یعنی چاند اور سورج بدستور موجود ہیں لیکن ان کے بیان سے انسان تھکتا نہیں۔ اسی طرح گذشتہ چھ ہزار سال میں لاکھوں

انسان ان اہرام کو دیکھ چکے تھے۔ ہزاروں ان کے متعلق لکھ چکے ہیں۔ لیکن ان نشانیوں کی ہستی اور اہمیت بدستور قائم و دائم ہے۔ قدیم زمانے کے مصری اہلِ قلم بھی ان کو دیکھتے تھے اور ان کی عظمت و شان کو دیکھ کر ان کی زبان سے نکلتا تھا:۔

"اے آسمان! تو ان پر لوبان برسا"

اسی طرح نپولین سے لے کر آج تک اہل مغرب وہاں جاتے ہیں۔ اور ان کی چھان بین کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے رموز کا پتہ نہیں ملتا۔ یہ مغربی مؤرخ بیشتر ان اہرام کے طول و عرض ناپتے ہیں۔ اور ان کی بلندی سے فرعونوں کی عظمت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اطالوی سیاح بلزونی ان اہرام میں سے ایک کے اندر داخل بھی ہوا اور اس کے تہہ خانے دیکھے۔ لیکن ان تہہ خانوں کو خالی پایا۔ جب وہ ان تہہ خانوں سے نکل رہا تھا تو ایک دیوار پر اس کی نظر پڑی جس پر لکھا تھا:۔

"استا محمد احمد سنگ تراش نے اس کو کھولا اور استا عثمان بھی اس وقت موجود تھا اور سلطان علی محمد شروع سے آخر تک موجود تھا" (حوالہ نمبر ۲)

یہ عبارت عربی میں تھی اور تقریباً ایک ہزار سال پہلے اس دیوار پر لکھی گئی تھی۔ غریب بلزونی کے کچھ بھی ہاتھ نہ لگا۔ اس قسم کے تصرفات فرعونوں کے زمانے ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ ہر فرعون کے دفن کے بعد "کفن چور" باوجود جملہ احتیاطوں کے قبروں میں گھس کر قیمتی چیزیں چرا لیتے تھے۔ چنانچہ اکثر اہرام جو زیرِ زمین نہیں ہیں اب خالی ہیں۔ یہ اہرام دراصل فرعونوں کی قبریں تھیں۔

جب ان کفن چوروں سے فرعون بے بس ہو گئے تو انھوں نے زیرِ زمین قبریں تعمیر کرنے کی ترکیب نکالی۔ لیکن ان قبروں کو بھی کفن چوروں نے نہ چھوڑا۔ البتہ چند زیرِ زمین قبریں کسی طرح بچ گئیں لیکن ان پر بھی ہمارے زمانے کے کفن چوروں نے ہاتھ مارا جو اپنے آپ کو "ماہرین مصریات" کہتے ہیں۔ ان میں سے دو شخص لارڈ کارنارواں اور ہوورڈ کارٹر خاص طور پر مشہور ہوئے جنھوں نے ۱۹۲۲ء میں فرعون طوت انخ عاموں کی قبر کھودی جس میں سے ایسا بیش بہا خزانہ برآمد ہوا کہ دنیا حیرت زدہ ہو گئی۔

یہ فرعون طوت مشہور فرعون اخناطون کا جانشین تھا۔ اخناطون اس لئے مشہور ہے کہ اس کے دماغ میں خدائے واحد کا تصور آیا۔ لیکن بہت جلد جملہ پجاری طبقہ اس حامئ توحید فرعون کے خلاف ہو گیا۔ کیونکہ اس نے بُت پرستی ختم کرنی چاہی۔ انجام یہ ہوا کہ اخناطون کو زہر دے کر مارا گیا۔ اور اس کا داماد طوت انخ عامون تخت نشین ہوا۔ یہ نہایت ہی بُزدل اور نکمّا تھا۔ اس کے عہد میں بُت پرستی پھر رائج ہوئی۔ جب یہ مرا تو مُلک کے تمام کاریگر ہر قسم کا ساز و سامان بنانے پر متعین کئے گئے جو اس کی قبر میں رکھنا ضروری تھا۔ یہ پورا ساز و سامان ۱۹۲۲ء میں برآمد ہوا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے یا بعد کے کفن چوروں کی رسائی اس کی قبر کے اندر تک نہ ہو سکی۔ اس سامان کا ذکر حال ہی میں ایک باتصویر کتاب موسومہ "طوت انخ عامون کی زندگی اور موت" میں شائع ہوا ہے۔

(حوالہ نمبر ۹)

اگر اس برآمد شدہ سامان کی فہرست بمعہ تصاویر مفصل تیار کی جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ اس فرعون کی قبر میں شکار کا سامان بھی

پایا گیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شکار کا شوقین تھا۔ ایک اور کتاب موسومہ "طوت النخ عامون کا خزانہ" میں اور بہت سی تصویریں ہیں لیکن ان دونوں کتابوں میں جو ذکر اس سامان کا ہے وہ نہایت مختصر ہے۔ (حوالہ نمبر ۱۰)

فراعنۂ مصر کے مہیّا کردہ میرے سامان کا ذکر ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ میں اس دورِ جدید کے کفن چوروں کا شکریہ ادا کروں جن کی بدولت یہ جملہ سامان آج عجائب خانوں میں محفوظ ہے گو یہ سامان اتنا منتشر ہو چکا ہے کہ شائقین کو تمام ملکوں کا چکّر لگانا پڑتا ہے لیکن عمارات اور بڑے بڑے مجسّمے اب تک مصر ہی میں موجود ہیں۔ سب ہرم کے ساتھ یہ مجسّمے بھی نصب کئے جاتے تھے۔ یہ بھی بذاتِ خود اپنی اپنی کہانی سناتے ہیں۔

میری سات نشانیاں

اب تک میں نے فراعنۂ مصر کے فراہم کردہ ساز و سامان کا ذکر کیا ہے۔ اب میں اپنے چند عجائبات کا ذکر شروع کرتی ہوں جو عمارتوں کی صورت میں تھے لیکن جن کو انسان یا زمانے نے ختم کر دیا۔ اصولاً مجھے اپنے اُن عجائبات کا تذکرہ سب سے پہلے کرنا چاہیئے۔ جن سے عہدِ قدیم کے لوگ ششدر رہ جاتے تھے۔ عہدِ قدیم میں ان عجائبات کی تعداد سات تھی:۔

(۱) سب سے بڑا ہرم جو جیزہ میں فرعون خوفو (سنہ ۲۹۰۰ء تا سنہ ۲۸۷۷ء قبل مسیح) کے عہد میں تعمیر ہوا۔

(۲) اسکندریہ کا روشنی مینار جو سکندر کی وفات (سنہ ۳۲۳ قبل مسیح) کے بعد تعمیر ہوا۔

(۳) فردوس نمرود جو بابل میں بنائی گئی۔ اس کا بانی بنو قدنزار دویم (عہد حکومت ۶۰۵ سنہ تا ۵۶۲ سنہ قبل مسیح) تھا۔

(۱) دُنیا کا سب سے بڑا مجسمہ جو پینتیس گز لمبا تھا۔ اور "مجسمہ قلوسوس" کے نام سے موسوم تھا۔ اس کا تذکرہ سب سے پہلے ۱۴۶ سنہ قبل مسیح فیلون بازنطوی نے کیا لیکن سینکڑوں سال پہلے یہ نصب ہو چکا تھا۔ غالباً یہ پانچویں صدی قبل مسیح میں بنایا گیا۔ یہ جزیرہ رہوڈس میں نصب کیا گیا۔

(۵) موسولُوس کا عظیم الشان مقبرہ جو بمقام ہالی قرناسوس ۳۵۰ سنہ قبل مسیح تعمیر ہوا۔

(۶) عرتمیس کا مندر بمقام عفی سُوس۔ عرتمیس ایک یونانی دیوی تھی جس کو رومی بھی پوجتے تھے۔ یہ مندر ۳۲۳ سنہ قبل مسیح بنایا گیا۔ گو اس سے پیشتر بھی یہ مندر تھا۔

(۷) ذی عوس کا مجسمہ بمقام اولمپیا۔ یہ مقام وہ تھا جہاں قدیم یونانی ہر چوتھے سال کھیل کود کا جلسہ منعقد کرتے تھے۔ یہ مجسمہ ۴۳۳ سنہ قبل مسیح نصب کیا گیا۔

ان عجائبات میں سے صرف ایک یعنی خوفو کا ہرم آج نظر آتا ہے باقی چھ نابود ہو گئے۔ میری یہ شاندار نشانیاں کس طرح تلف ہوئیں۔ اس کا حال بھی سُنئے۔ اب میں ان نشانیوں کا تذکرہ اور ان کے انجام کا حال سناتی ہوں۔

میری قدیم نشانیوں کا حال اور انجام

میری سب سے قدیم نشانی یعنی ہرم خوفو آج بھی نظر آتا ہے لیکن یہ بھی زخم خوردہ ہے۔ یہ آج سے چھ ہزار

سال پہلے تعمیر ہوا۔

یہ دراصل مقبرہ تھا۔ جس کے تہہ خانوں میں ایک مندر تھا۔ لیکن یہ تہہ خانے آج نظر نہیں آتے۔ صرف ان تہ خانوں کی بنیاد باقی ہے۔ البتہ حرم کا اوپری قالب بدستور موجود ہے۔ اس کے طول و عرض کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اگر اس حرم کے پتھروں کو نکالا جائے تو ان پتھروں سے دس فٹ اونچی اور ایک فٹ چوڑی دیوار بنائی جا سکتی ہے۔ جو پورے ملک فرانس کو اپنے محیط میں لے سکتی ہے۔ یہ نپولین کا اندازہ تھا اور صحیح تھا۔ (حوالہ نمبر ۱۱)

اس حرم میں پچیس لاکھ پتھر لگائے گئے۔ ہر پتھر کا وزن پچاس من ہے۔ بعض کا وزن چار سو بیس من بھی ہے۔ اس زمانے میں از قسم مشین کوئی چیز نہ تھی۔ ہر پتھر کو آدمی گھسیٹ کر اوپر لے جاتے تھے۔ یہ آدمی بیگاری مزدور تھے جو بنی اسرائیل کہلاتے تھے اور بعد کو اُمتِ موسیٰ ؑ کے نام سے موسوم ہوئے اور اب یہودی کہلاتے ہیں۔ اس قوم کی مصیبتوں کا حال جو اس کو مصر میں پیش آئیں ایک یہودی نے ناول کے طرز میں بیان کیا ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔ (حوالہ نمبر ۱۲)

اپنی قوم کو اس مصیبت سے نکالنے کی خاطر حضرت موسیٰ کو نبوت ملی۔ یہودیوں کی توریت (کتاب خروج) میں بھی ان مصیبتوں کا تذکرہ ہے۔ اس حرم کے طول و عرض میں بالکل صحیح تناسب ہے۔ جس سے اس زمانے کی انجنیروں کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر میں ہزاروں یہودی مارے گئے۔ گویا ایک فرعون خوفو کو دفن کرنے کی خاطر یہ سب مصیبتیں انسان کو جھیلنی پڑیں۔

مسلمانوں کے عہد میں کئی محققین نے اس ھرم کے رموز معلوم کرنے کی کوشش کی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے بھی اس ھرم میں گھسنے کی کوشش کی۔ اس کے جانشین مامون الرشید (۸۱۳ء تا ۸۳۳ء) کے حکم سے اس ھرم میں ایک سوراخ کیا گیا۔ یہ سوراخ آج تک مامون کے نام سے مشہور ہے۔ خلیفہ مامون کس طرح اس سوراخ سے اس ھرم میں داخل ہوا اس کا تذکرہ مؤرخ ابن جوزی نے اس طرح کیا ہے کہ جب یہ خلیفہ داخل ہوا تو اس کو ایک کتبہ نظر آیا جس میں لکھا تھا کہ :۔

"بادشاہ فلاں ابن فلاں سالِ فلاں میں اس ھرم کو کھولیگا اور اس کھولنے پر جو روپیہ وہ صرف کرے گا اس کے عوض میں ہم یہ رقم پیش کرتے ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی وہ تلاش جاری رکھے تو وہ بے کار روپیہ خرچ کرے گا اور اس کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

اسی جگہ مامون کو ایک خزانہ ملا۔ اس خزانے کی رقم کو گنا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ رقم بالکل اتنی ہے جتنی کہ اس ھرم میں سوراخ کرنے پر صرف کی گئی تھی۔ چنانچہ اس رقم کو لے کر مامون واپس ہو گیا۔

اس قسم کے بے شمار افسانے اس ھرم کے متعلق مشہور تھے۔ مشہور صوفی ذوالنون مصری ان اھرام کے اردگرد چکر لگایا کرتے تھے تاکہ وہ اسرارِ الٰہی معلوم کر سکیں۔ انہیں اسرار کو معلوم کرنے کے لئے محققینِ مغرب بھی آج تک چکر لگا رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مصر کی یہ قدیم نشانی کس قدر پُر اسرار ہے۔ جس کی خاطر اہل دل اور اہلِ دماغ دونوں آج تک سرگرداں ہیں۔

میری دوسری نشانی یعنی اسکندریہ کا روشنی مینار

احرام مصر کے سوا میرے باقی چھ عجائب معدوم ہو چکے جن کا صرف تذکرہ اب کتابوں میں پایا جاتا ہے

ان معدوم عجائب میں پہلا مقام اسکندریہ کے روشنی مینار کو حاصل تھا۔ اس شہر کو سکندر نے آباد کیا اور اس کے مشیروں نے یہ مینار جہازوں کی رہبری کے لئے تعمیر کرایا۔ جو ایک جزیرہ موسومہ فردس پر واقع تھا۔ اس شہر اسکندریہ کی تکمیل بھی بعد وفاتِ سکندر ہوئی۔ جب بطلیموس خاندان کے ہاتھ مصر کی حکومت لگی تو اس شہر کو عروج حاصل ہوا۔ جب رومیوں نے یونان کو آن دبوچا تو وہاں کے آزاد خیال حکماء نے اسی شہر میں پناہ لی۔ اس شہر کو عشق باز ملکہ قلوپطرہ کی حکومت کا بھی فخر حاصل ہوا۔ ان حکما کی بدولت یہاں مشہور عالم کتب خانہ بھی قائم ہوا۔ جس کو بالآخر رومیوں نے نذرِ آتش کیا۔ لیکن اس کے جلانے کا الزام مسلمانوں کے سر تھوپا گیا۔ اس کتب خانے کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا۔

ان پناہ گزین حکما میں مشہور حکیم جالینوس بھی تھا جس نے سنہ ۱۶۴ء میں اسکندریہ کے کتب خانے کا تذکرہ لکھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ مصر کے حکمران بطلیموس دوئم نے یہ قانون جاری کیا کہ ہر سیاح جو کتابیں لے کر آئے اس کو ان کتابوں کے اصل نسخے اس کتب خانے میں داخل کرنا لازم ہے۔ صرف نقل اس کے پاس رہ سکتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ سکندر کی لاش بھی یہیں دفن کی گئی۔ لیکن اس معاملے میں مورخوں میں اختلاف ہے۔ اس شہر میں ہر قوم کے لوگ آباد تھے۔ اس شہر سے ملحق جزیرۂ فردس تھا۔ جس پر روشنی مینارہ تعمیر کیا گیا تھا یہ مینارہ

کئی منزلوں میں منقسم تھا۔اس کی کُل بلندی چار سو فٹ تھی۔اس کی چوٹی پر ایک آتش دان تھا۔جو رات بھر بلکہ دن میں بھی روشن رہتا تھا۔ اس مینارہ کا طول و عرض اتنا وسیع تھا کہ اس میں تین سو کمرے تھے۔ جن میں پہرے دار رہتے تھے۔جو اس آتش دان کو روشن رکھتے تھے۔ اس آتش دان کے اِردگرد شیشہ تھا جس کے ذریعہ اس کی روشنی دُور دُور تک جاتی تھی۔جب مصر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو مسلمانوں نے بھی اس مینار کو قائم رکھا لیکن بازنطینی شہنشاہ اس مینار کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ چال چلی کہ اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے پاس ایک ایلچی بھیجا جس نے بتایا کہ اس مینار کے نیچے ایک بڑا دفینہ ہے چنانچہ عربوں نے اس جگہ کی کھدائی کی جس سے اس مینار کو ایسا نقصان پہنچا کہ یہ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گیا۔لیکن یہ محض افسانہ ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مینار کو ایک زلزلے نے برباد کیا۔

میری تیسری نشانی یعنی فردوس نمرود

یہ فردوس بڑے بڑے چبوتروں کی صورت میں تھی۔جو یکے بادیگرے مسلسل بنائے گئے تھے۔ دیکھنے میں یہ فردوس پہاڑ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی صورت پہاڑ کی سی کیوں تھی؟ اس لئے کہ جب اس کا بانی بنو قدنزار ایرانی شہزادی بیاہ کر لایا تو وہ سسرال پہنچ کر رنجیدہ ہوئی یہ پہاڑی علاقے کی رہنے والی تھی۔اس شہزادی کی خوشی کی خاطر اس کے شوہر نے یہ مصنوعی پہاڑ بنوایا جو فردوس کے نام سے موسوم ہوا۔اس پہاڑی فردوس کی بلندی ساڑھے تین سو فٹ تھی۔بابل میں گرمی بہت ہوتی تھی۔اس کے سدِباب کے لئے پانی کی سخت ضرورت تھی۔چنانچہ

دریائے فرات سے پانی لے کر اوپر چڑھایا جاتا تھا۔ جس سے باغ کی آبپاشی کی جاتی تھی کیونکہ ہر چبوترے پر باغ تھا۔ ....

جن چبوتروں پر محل واقع تھے ان پر پانی ایک اور طرح بھی استعمال ہوتا تھا۔ محل کی کھڑکیوں پر سبز بیلیں لٹکتی رہتی تھیں جن پر پانی چھڑکا جاتا تھا گویا یہ بیلیں خس کی ٹٹی کا کام دیتی تھیں جن سے محل کے کمرے موسم گرما میں ٹھنڈے رہتے تھے۔

یہ فردوس فنِ انجینیری کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بھی مصر کی طرح بابل میں بھی یہ فن کمال کو پہنچ چکا تھا۔ اسی طرح دوسرا فنِ انجینیری کا کمال یہ تھا کہ یہ مصنوعی پہاڑ پتھر کا نہیں بلکہ اینٹوں کا تھا کیونکہ اس علاقہ عراق میں کوئی پہاڑ نہ تھا۔ لیکن محلوں کی چوکھٹیں پتھر کی ہوتی تھیں جن کے لئے بڑے فاصلوں سے پتھر لایا جاتا تھا۔

چونکہ محلوں کی کچی چھتوں کو پانی سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے ان چھتوں کی حفاظت کے لئے سرکنڈے گارے میں ملائے جاتے تھے۔ اور چھت پر تارکول کی تہہ لگائی جاتی تھی۔ اور اس تہہ پر پگھلا کر سیسہ پلایا جاتا تھا۔ اس فردوس کے نوشتہ حالات یونانیوں اور رومی مؤرخوں کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں جو مشرق کو بہ نظرِ حقارت دیکھتے تھے۔ لیکن یہ متعصب مؤرخ بھی اس فردوس کے ثناخواں تھے جو اس کی عظمت وشان کا بیّن ثبوت ہے۔ یہ متعصب مؤرخ اہرام مصر۔ مینارا سکندریہ۔ قلوسوس کا مجسمہ اور ارتمیس کا مندر بھی دیکھ چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس فردوس کی تعریفیں کرتے تھے اور

اس کو سات عجائبات عالم میں شمار کرتے تھے۔

ان مورخوں کے ذریعہ جو حالات اس فردوس سے متعلق ہم تک پہونچے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ہر چبوترہ ایک بڑی لمبی چوڑی محراب پر ٹکا ہوتا تھا۔ جو اینٹوں کی تھی۔ گویا ہر چبوترہ ایک وسیع چھت تھی جس پر لاکھوں من مٹی باغ لگانے کی خاطر ڈالی جاتی تھی۔ ہر چبوترے پر بذریعہ پمپ پانی پہونچایا جاتا تھا۔ یہ پمپ ہاتھ سے یا بیلوں سے چلائے جاتے تھے۔ ہر چبوترے پر باغ ہوتا تھا جس میں ہر ملک کے پھولدار پودے لگائے جاتے تھے۔

اس فردوس کے دونوں طرف شہر بابل آباد تھا جس میں مندر اور محلات بکثرت تھے۔ غلّہ کو جمع کرنے کے لئے گودام بھی تھے۔ شہر کے بعد لہلہاتے ہوئے کھیت تھے جن کی آبپاشی کے لئے نہریں تھیں۔ کھیتوں کے بعد ریگستان تھا جس پر بادِ سموم کا قبضہ تھا۔ پانچویں صدی قبل مسیح سے شہر بابل کا زوال شروع ہوا اور ایک صدی بعد یہ شہر نابود ہو گیا۔

میری چوتھی نشانی یعنی قلوسوس کا مجسمہ

قلوسوس کا نام آج تک ایک اصطلاح کی صورت میں مغربی زبانوں میں موجود ہے۔ اس اصطلاح کی صورت میں اب اس نام کے معنی لمبے چوڑے اور بھاری بھرکم کے ہیں۔ یہ مجسمہ جزیرہ رہوڈنس میں بن کر وہیں نصب ہوا۔ یہ پینتیس گز لمبا تھا۔ دراصل یہ آفتاب کا بت تھا۔ جس کی پوجا کی جاتی تھی۔ یہ بجائے پتھّر کے کانسے کا بنا ہوا تھا۔ یہ اتنا وزنی تھا کہ اس کو عمارت کی طرح منزل بہ منزل بنایا گیا تھا۔ اس کے مختلف حصّے مٹی کے سانچے میں ڈھالے گئے تھے۔ اس پر پانچ سو من کانسہ اور

تین سو من لوہا خرچ ہوا۔ (حوالہ نمبر ۱۳)

اس کی شکل و صورت بالکل انسان کے مطابق تھی اور حسن و جمال میں بے نظیر تھا جسم میں مکمل تناسب تھا۔ یہ بھی مشہور تھا کہ جب یہ مکمل ہوا تو اس کے بنانے والے کو اس میں کچھ نقص نظر آیا۔ اس پر ایسی شرم سوار ہوئی کہ اس نے خودکشی کر لی۔

یہ بت کیوں بنایا گیا؟ اس کی وجہ مورخ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اس جزیرے کے لوگ بڑے آزادی پسند تھے لیکن ساتھ ہی وہ ہر فن مولا بھی تھے اس لئے اس جزیرے پر قبضہ کرنے کے لئے حکومت اثینیہ بڑی آرزومند تھی مگر ساتھ ہی اور حکومتوں کی نظریں بھی اس جزیرے پر رہتی تھیں۔ پانچویں صدی قبل مسیح یہ جزیرہ حکمران ایران دارا کے ہاتھ لگا لیکن ۳۳۴ء قبل مسیح سکندر نے ایرانی حکومت کو ختم کیا۔ سکندر کے بعد یہ جزیرہ بطلیموس خاندان کے ہاتھ لگا لیکن مقدونیہ کے حکمران نے اس پر حملہ کیا۔ بطلیموس اول نے ان جزیروں والوں کا ساتھ دیا اور مقدونیہ کا حکمران ہارا۔ اور اس جزیرے کو رہائی ملی۔ اس جزیرے کے لوگ آفتاب کو پوجتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے بطور شکرانہ یہ بت آفتاب کی پوجا کے لئے بنایا۔

اس بت کا بنانے والا چارلیس نامی تھا۔ علاوہ کاریگر ہونے کے یہ شخص بہادر سپاہی تھا۔ اور اپنے وطن کی خاطر وہ مقدونیہ کے خلاف لڑا بھی تھا۔ چنانچہ بعد فتح جب اس بت بنانے کا فیصلہ کیا گیا تو اسی چارلیس کو اس کام پر تعینات کیا گیا۔ یہ بت ۲۸۰ء قبل مسیح تیار ہوا لیکن ۲۲۴ء قبل مسیح زلزلہ آیا اور یہ بت گر کر ٹوٹ گیا۔ مصری اور یونانی انجینئروں نے اس کی مرمت کرنی چاہی لیکن وہ ناکام رہے۔

آٹھ سو سال تک یہ عالی شان بت اسی کس مپرسی میں پڑا رہا۔ اس

عرصے میں اس جزیرے کے لوگ عیسائی ہو گئے۔ ۶۶۶ء میں مسلمان یہاں بحیثیت فاتح پہنچے۔ مسلمان تو کسی طرح بت پرستی پسند نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس بت کے ٹکڑوں کو ایک یہودی تاجر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

میری پانچویں نشانی
یعنی مقبرۂ موسولوس

یہ مقبرہ ایشیائے کوچک کے علاقے قاریہ میں تھا۔ جہاں یونانی آباد تھے۔ جن پر ایرانی کسریٰ حملے کیا کرتے تھے۔ علاقہ قاریہ کا مشہور ترین شہر ہالی قرناسوس تھا۔ جہاں یہ مقبرہ ۳۵۰ء قبل مسیح تعمیر ہوا۔ ایرانی کسریٰ یہ چال چلتے تھے کہ یونانی حکومتوں کو فتح کرنے کے بعد مفتوحہ حکمران کو اپنا باجگذار بنا کر اسی کے سپرد اپنا مفتوحہ علاقہ کر دیتے تھے اور ایران واپس چلے جاتے تھے۔ اپنے آقا کی غیر حاضری میں یہ باجگذار حکمران تقریباً خود مختار ہو جاتے تھے۔ بلکہ اپنے ہمسایہ حکمرانوں پر بھی حملے کرتے رہتے تھے۔ انہیں باجگذار حکمرانوں میں یہ موسولوس بھی تھا جو اوائل چوتھی صدی قبل مسیح میں علاقہ قاریہ کا حکمران تھا۔ اس کی بیوی ارتمیس نامی اس پر فدا تھی۔ جب مولوسوس نے ۳۵۳ء قبل مسیح وفات پائی تو اس کی بیوہ ملکہ نے تین سال بعد یعنی ۳۵۰ء ق م میں یونانی انجینئروں اور معماروں کو مقبرے کی تعمیر پر مامور کیا۔ ان یونانی کاریگروں کے نام بھی ہم تک پہنچے ہیں۔

ان کاریگروں کو بیوہ ملکہ نے حکم دیا کہ وہ ایسا مقبرہ تعمیر کریں جو دنیا میں لاثانی ثابت ہو۔ ان لوگوں نے طے کیا کہ مجوزہ مقبرے میں بجائے وسعت کے خوبصورتی پر زور دیا جائے۔ دو سال کے اندر یہ ملکہ بھی مر گئی لیکن ان کاریگروں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے نام کی خاطر اس مقبرے

کی تکمیل کر کے چھوڑیں گے۔ یہ مقبرہ تاج محل کی طرح سنگ مرمر کا تھا۔ اس کے اردگرد مستطیل کی صورت میں دیوار تھی۔ جس پر دیویوں اور دیوتاؤں کی تصویریں اُبھری ہوئی صورت میں کندہ تھیں۔ اصل قبر ایک اونچے چبوترے کے اندر تھی۔ اس چبوترے پر متعدد ستون تھے جو تناسب اور خوبصورتی میں لاثانی تھے۔

اس چبوترے پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ جن کے آخر میں آمنے سامنے شیروں کے مجسمے تھے۔ مقبرے کی چوٹی پر بطور کلس ایک رتھ تھا جس میں گھوڑے جُتے ہوئے تھے۔ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ گھوڑے اس رتھ کو ہوا میں اُڑائے چلے جا رہے ہیں۔ اس رتھ میں موسولوس کا مجسمہ بھی تھا جو شکستہ صورت میں آج تک دستیاب ہے۔ اس رتھ میں چار گھوڑے جُتے ہوئے تھے جن کی لگام اسی موسولوس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے پہلو میں ایک عورت تھی جو اس کی بیوہ ارتمیس خود تھی۔

یہ مقبرہ بارھویں صدی عیسوی تک برقرار رہا۔ لیکن اس صدی کے آخر میں عیسائی سردار صلیبی جنگ کے سلسلے میں اس علاقے میں پہنچے۔ عثمانی ترکوں کی آمد بلادِ روم سے پہلے ان عیسائیوں نے اپنی حفاظت کے لئے ایک قلعہ ۱۴۰۲ء میں تعمیر کیا اور اس تعمیر کی خاطر اس مقبرے کو توڑا اور اس کے پتھر سے یہ قلعہ بنایا۔ لیکن ان عیسائیوں نے اس کی بربادی کا الزام سلیمان عالی شان (۱۵۲۰ء تا ۱۵۶۶ء) کے سر تھوپا۔ حالانکہ اس سے بہت پہلے ہی اس مقبرے کو عیسائی برباد کر چکے تھے۔

میری چھٹی نشانی یعنی ارتمیس کا مندر

ابتداً ارتمیس یونانیوں کی دیوی تھی۔ جس کو بعد میں رومیوں نے اپنایا اور اس کا نام ڈائنا رکھا۔ یہ

دیوی شکار سے منسوب تھی۔ اس لئے اس کا بُت چھریرا بنایا جاتا تھا۔ کیونکہ شکاری پھرتیلا ہوتا ہے۔ یہ مندر شہر عفی سوس میں تعمیر کیا گیا۔ اس کا سالِ تعمیر سنہ ۳۲۳ قبل مسیح ہے۔ یہ مندر اس زمانے کا ہے جب سکندر کی بدولت یونانی تہذیب پر مشرقی رنگ چڑھ چکا تھا۔

اس مندر میں ایک دیوی کا بُت تھا جس کا چہرہ تو یونانی تھا مگر اس کا جسم فراعنہ مصری کی سوکھی ہوئی لاشوں کی طرح تھا۔ اس بُت کے چاروں طرف ہزاروں چھوٹے چھوٹے بت رکھے رہتے تھے۔ جن کو زائرین خرید کر برکت کے لئے اپنے گھر لے جاتے تھے۔ سینکڑوں بت تراش اس طرح اپنی روزی پیدا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر ٹانگنے کے بعد مذہب عیسوی کا سب سے جوشیلا مبلغ سینٹ پال اس مندر میں بھی پہونچا اور ان بت تراشوں کو بُرا بھلا کہا۔ یہ بت تراش چاندی کے بت تراش کر فروخت کرتے تھے۔ اور اس لئے یہ بُت قیمتی ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود غریب غربا بھی ان کو خریدتے تھے۔

یہ مندر کئی مرتبہ توڑا گیا۔ جس عمارت کو سینٹ پال نے دیکھا وہ سنہ ۳۲۳ قبل مسیح تعمیر ہوئی تھی یعنی سکندر کی وفات کے بعد۔ مگر اس کی تعمیر اس زمانے میں شروع ہو گئی تھی جب سکندر اس راستے سے گذرا تھا۔ چنانچہ سکندر اس شرط پر اس تعمیر کا خرچہ برداشت کرنے پر تیار ہوا کہ اس مندر کو اس کے نام سے منسوب کیا جائے لیکن پجاریوں نے انکار کر دیا۔ البتہ ان پُجاریوں نے سکندر کی تصویر بنا کر اس مندر میں ٹانگی لیکن سکندر نے اعتراض کیا کہ اس تصویر میں اس کی شبیہہ نہیں ہے۔ لیکن سکندر کا گھوڑا اس تصویر کو دیکھ کر ہنہنایا جو اس بات کا ثبوت تھا

کہ یہ تصویر سکندر کی ہے۔ سکندر کے متعلق اس قسم کے افسانے عام تھے

یہ مندر دو صدیوں تک قائم رہا۔ لیکن رومیوں کے عہد میں جب وحشی قوطی قوم کی یورشیں شروع ہوئیں تو ۲۶۰ء کے لگ بھگ یہ مندر بھی اس قوم کا شکار ہوا۔

میری ساتویں نشانی یعنی مجسمۂ ذی عوس

ذی عوس، یونانیوں کا سب سے بڑا معبود تھا۔ برق و باراں اسی کے تحت تھی۔ یہ بت ادلمپیا کے علاقے میں نصب تھا۔ جہاں ہر چوتھے سال یونانی اپنے کھیل کُود کے جلسے منعقد کرتے تھے۔ ان جلسوں میں عورت اور مرد دونوں آتے تھے۔ ان کھیلوں میں کھلاڑی بالکل برہنہ ہوکر اپنے کرتب دکھاتے تھے۔

جس مندر میں ذی عُوس کا مجسمہ نصب تھا وہ ۴۵۶ قبل مسیح تعمیر ہوا یہ بت مشہور بُت تراش فیدیاس نامی کا بنایا ہوا تھا۔ یہ بت ایسا معدوم ہوا کہ آج اس کا کوئی نشان تک نہیں ملتا۔ اس کے متعلق جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں وہ یونانی سیاح پوسونیاس نامی کے ذریعہ سے جس نے دوسری صدی عیسوی میں اپنا سفرنامہ لکھا۔

ذی عوس کا بُت اس طرح بنایا گیا تھا کہ وہ ایک طلائی تخت پر بیٹھا ہوا ہے اور یہ تخت زر و جواہر سے مرصع ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بُت ہے۔ جو فتح و نصرت کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں عصائے شاہی تھا جس کے سرے پر عقاب بنا ہوا تھا۔ کھیل کود میں حصہ لینے والے اس بُت کے سامنے اپنی فتح کے لئے دعا مانگتے تھے۔

ذی عوس کا یہ بت اتنا مقبول و مشہور تھا کہ ایپک طی طوس جلیا

نامی فلسفی بھی رومتہ الکبریٰ میں پہلی صدی عیسوی کے آخر میں اس بُت کی زیارت کی تلقین کیا کرتا تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ وہ شخص بدنصیب ہے جو بغیر اس کی زیارت کے مرے۔ گو ذی عوس طلائی تخت پر بٹھایا گیا تھا لیکن اس کا بُت ہاتھی دانت کا تھا۔ جس پر طلائی کام تھا۔ اس بت کی لمبائی چالیس فٹ تھی۔

بجز ھرم کے میری باقی چھ نشانیاں آج نابود ہیں۔ یہ نابُود نشانیاں تو محض عمارات یا بتوں کی شکل میں تھیں لیکن میرا اصل رونا تو ان متعدد شہروں کے لئے ہے جو انسان کی سفاکی یا قہرالٰہی کے نذر ہوئے۔ ان شہروں کا ذکر بھی لازم ہے۔

میرے برباد شدہ شہر خدا بھلا کرے ماہرین آثار الصنادید کا جن کی بدولت میرے ان برباد شدہ شہروں کا پتہ چلا۔ ان شہروں میں مصر کا قدیم شہر اختاطون بھی ہے جہاں سرزمین مصر میں پہلی مرتبہ توحید کا چرچا ہوا۔ ان شہروں میں سے جہاں توحید کا چرچا ہوا دو مشہور ہیں۔ اوّل سدوم اور عمورہ۔ دوئم مصر کا شہر اختاطون۔ یہ دونوں شہر اس لئے برباد ہوئے کہ اس کے باشندے صرف توحید ہی سے منحرف نہ ہوئے بلکہ بداعمالیوں میں مُبتلا ہو گئے۔

سدوم اور عمورہ کا انجام پہلے میں سدوم اور عمورہ کی بربادی کا ذکر کرتی ہوں۔ ان شہروں کا تذکرہ کتاب "پیدائش" میں اس طرح ہے کہ یہاں کے باشندوں کی بداعمالی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ جب خدا نے ان شہروں کو برباد کرنے

فیصلہ کیا تو حضرت ابراہیمؑ نے خدا سے ان کے حق میں شفاعت کی۔ اور کہا کہ ان دونوں شہروں میں پچاس یا چالیس راستباز لوگ مل جائیں تو ان کو تباہ نہ کیا جائے۔ جب بیس راستبازوں پر سودا طے ہونے لگا تو اس قلیل تعداد میں بھی راستباز نہ مل سکے بالآخر حضرت ابراہیم نے کہا:۔ (حوالہ نمبر ۱۴۴)

"خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار کچھ اور عرض کروں شاید وہاں دس (راستباز) ملیں۔ اس (یعنی خُدا) نے کہا میں دس کی خاطر بھی اُسے نیست و نابود نہیں کروں گا۔"

لیکن ان شہروں میں دس راست باز بھی نہ تھے۔ چنانچہ خدا نے دو فرشتوں کو ان شہروں کی بربادی پر تعینات کیا۔ لیکن اہلِ شہر نے ان فرشتوں سے بھی بدفعلی کرنی چاہی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فرشتوں نے ان شہروں کو نیست و نابود کر دیا۔ صرف حضرت لوط بمعہ اپنے خاندان کے بچے۔ ان شہروں سے دھواں اُٹھا اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ یہ بربادی بڑی عبرت آموز ہے۔ اور اسی لئے اس کا تذکرہ کتاب پیدائش میں کیا گیا۔

مصر کے شہر اخناطون کا انجام

جب قائل توحید فرعون اخناطون اپنے بت پرست شہر تھیبس سے تنگ آ گیا جہاں کے پجاری توحید کے سخت مخالف تھے تو اس نے ایک نیا شہر "اختاطون" کے نام سے تھیبس سے بہت دُور آباد کیا۔ اس شہر میں مقیم ہو کر اس نے قسم کھائی کہ اب وہ اس شہر سے باہر نہ جائے گا۔ کیونکہ اس کی تمام حکومت میں بُت پرستی رائج تھی۔ لیکن پجاریوں نے اس کو زہر دے کر ختم کر دیا۔

اس حامیٔ توحید کا جانشین طوت انخ عامون جیسا ڈرپوک اور بزدل ہوا۔ جس کے راج میں بُت پرستی پھر رائج ہوگئی۔ اس شہر کو دانستہ برباد کیا گیا۔ اس کی بربادی کا حال دو جلدوں میں ۱۹۲۳ء میں ماہرینِ "مصریات" فرینک فرٹ اور پینڈل بری نے شائع کیا ہے۔ (حوالہ نمبر ۱۵)

فرعون اخناطون نے پرستارانِ توحید کے لئے اپنے اس دارالسلطنت میں اوقاف بھی قائم کئے اور ان پرستارانِ توحید میں سے ایک صدرِ اعظم بھی مقرر کیا۔ یہ توحید پرست فرعون اس درجہ قائل توحید تھا کہ اس نے اپنے باپ کا نام بھی ہر عمارت سے مٹا دیا۔ اور اپنے دانست میں دیوتا عامون کی پرستش ہمیشہ کے لئے ختم کر دی۔ اسی طرح اس نے قبروں میں ساز و سامان دفن کرنے کا رواج بھی ختم کیا۔ اس نے ایک حمد بھی لکھی جس کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

اے خدا تیرے طلوع سے آسمان منور ہو جاتا ہے۔
(اے خدائے واحد) عاطون تو زندہ ہے۔ زندگی کا آغاز تجھ سے ہی ہے۔ گو تو بہت دُور ہے لیکن تیری شعاعیں زمین پر ہیں۔
تو اعلیٰ ہے لیکن دن کی روشنی میں تیرے قدموں کے نشان نظر آتے ہیں۔

اخناطون کی گوشہ نشینی سے سلطنت میں فتنہ فساد شروع ہوا۔ اس زمانے میں شام بھی فرعونوں کے زیرِ نگیں تھا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن کے حکمرانوں نے سر اٹھایا۔ حطی قوم کی حکومت بڑھتے بڑھتے شام تک پہنچی جس کے حکمرانوں نے اس قوم سے مصر کے خلاف سازشیں شروع

کیں۔ اخناطون قائلِ توحید ہونے کی وجہ سے تشدد کے خلاف تھا۔ اسی کشمکش میں اخناطون نے کُل سترہ سال حکومت کر کے ۱۳۵۸ قبل مسیح وفات پائی اور آٹھ سال کے اندر اُس حکمران خاندان کا جو فراعنہ کا اٹھارہواں خاندان کہلاتا تھا اور شہر اخناطون ہمیشہ کے لئے ختم ہوا۔ اب یہاں ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے جو الامرنہ کہلاتا ہے۔

پاکستان کے دو شہر اور ان کا خاتمہ

پاکستان میں بھی میرے دو شہر برباد ہوئے اور ایسے برباد ہوئے کہ آج ان شہروں کے متعلق یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کے نام کیا تھے؛ جہاں یہ کسی زمانے میں آباد تھے وہاں اب دو گاؤں ہیں ایک ضلع منٹگمری میں آج ہڑپہ کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرا ضلع لاڑکانہ میں مہنجو دارو کہلاتا ہے۔ یہ شہر ایسی تہذیب کے مرکز تھے جس کا آغاز ۲۳۵ سنہ قبل مسیح سے پہلے یعنی آج سے تقریباً چار ہزار تین سو سال سے پیشتر ہوا۔ اور ان شہروں کا خاتمہ آریا قوم کے ہاتھ سے تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح ہوا۔

(حوالہ نمبر ۱۶)

یہ دونوں شہر بہ لحاظ تمدن و تہذیب اپنے زمانے میں لاثانی تھے۔ ان کا تعلق تجارت اور تہذیب کے معاملوں میں بابل کے حکمران خاندان عقاد سے تھا۔ جو کھدائی ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان شہروں میں زمین دوز نالیاں تھیں جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کے انجینئر اپنے فن میں کمال پیدا کر چکے تھے۔ مہنجو دارو میں جو قلعہ تھا اس میں علاوہ غلہ کے گوداموں اور ایوان کے ایک کالج بھی تھا۔

یہ دونوں شہر دریا کنارے آباد تھے اور ان کے درمیان ذریعہ رسل و

رسائل دریا تھا جس کی وجہ سے ان شہروں کی زمین تر رہتی تھی۔ اس تری کو آج کل پنجاب میں "سیما" کہتے ہیں۔ اس کی روک تھام کے لئے مکانات پکی اینٹوں سے بنائے جاتے تھے اور دریاؤں میں بند بنائے جاتے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب اور سندھ دونوں ایسے خشک نہ تھے جیسے آج ہیں۔ بہ نسبت آج کے اس زمانے میں بارش زیادہ ہوتی تھی۔ اس لئے ان علاقوں میں بڑے بڑے شہر کافی تعداد میں تھے۔ بلوچستان بھی ایسا خشک نہ تھا جیسا وہ آج ہے۔

(حوالہ نمبر ۱۷) - یہ بھی ثابت ہے کہ جو شہر مہنجوداڑو میں آباد تھا۔ وہ نو مرتبہ دریائے انڈس کے طوفان کے نذر ہوا۔ اور ہر غرق آبی کے بعد دوبارہ بنایا گیا۔ یہ نو[9] طوفان چند سالوں میں نہیں آئے۔ اغلب خیال یہ ہے کہ زمانہ طوفان کئی صدیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہر طوفان کے بعد جو تعمیر ہوئی وہ ایک ہی قسم کی تھی۔ جس سے ظاہر ہے کہ ان شہروں میں جو تمدن رائج تھا اس میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ملک ہندوستان ہمیشہ سے قدامت پسند رہا ہے ماہرین آثار الصنادید کا اندازہ ہے کہ ان نو طوفانوں کا زمانہ سات سو سال ہے اس کے یہ معنی ہیں کہ ان شہروں کے تمدن میں سات سو سال تک کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

ان شہروں کو کس نے برباد کیا؟ جو شہادت ماہرین کے ہاتھ آئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان شہروں کے برباد کرنے والے مغرب سے آئے۔ ان کی آمد ۲۰۰۰ء قبل مسیح شروع ہوئی اور ۱۵۰۰ء قبل مسیح میں یہ لوگ ان شہروں پر مسلط ہو گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان شہروں کی تہذیب ۲۵۰۰ء

اور ۱۵۰۰ قبل مسیح کے درمیان عروج پر پہنچی۔

جو سازو سامان ان شہروں کی کھدائی سے برآمد ہوا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ان شہروں کا نظم ونسق ایسے حکمرانوں کے ہاتھ میں تھا جو علاوہ حکمران ہونے کے پوجاری بھی تھے۔ گویا بادشاہ مہا پوجاری ہوتا تھا۔ جس کی حکومت مطلق العنان ہوتی تھی۔ بیشتر رعیت کاشتکاری کرتی تھی۔ گندم کے علاوہ مٹر اور رائی بھی پیدا ہوتی تھی اس کے علاوہ جَو کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ کپڑا بنانے کے لئے کپاس بھی پیدا ہوتا تھا۔ کپڑا عراق تک جاتا تھا۔ کپاس کا نام "سندھو" تھا۔ یونانی زبان میں کپاس کو "سنڈون" کہتے تھے جو لفظ سندھو سے مشتق تھا۔

کاشت کے علاوہ جانور پالنے کا دستور بھی تھا۔ مویشیوں میں بھینس۔ بکری۔ بھیڑیں مقبول تھیں۔ کتّے بھی پالے جاتے تھے۔ بھیڑ اور بکری کے بالوں سے کپڑا بُنا جاتا تھا۔ اونٹ پالنے کا دستور بھی تھا۔ اس کے علاوہ گدھے اور گھوڑے بھی ہوتے تھے۔ ہاتھی پالنے کا رواج بھی تھا۔

بمقام ہڑپّہ جو شہر آباد تھا وہ دریائے راوی کی ایک شاخ کے ساحل پر تھا۔ مہنجو دارو کے مقام پر جو شہر تھا وہ دریائے انڈس کے ایک جزیرے پر تھا۔ بہ نسبت ہڑپّہ کے مہنجو دارو والا شہر زیادہ نذرِ طوفان ہوتا تھا۔

بمقام مہنجو دارو جو قلعہ تھا اس میں علاوہ حمام اور کالج کے مرکزی مندر بھی تھا۔ حمام تالاب کی شکل میں تھا اور کالج سے ملحق تھا۔ کالج سے ملحق مرکزی مندر تھا۔ مہنجو دارو والے شہر کا رقبہ ایک مربع میل تھا۔ قلعہ کے اردگرد فصیل تھی۔ قلعہ کے باہر اصل شہر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ

شہر کے اِرد گرد فصیل بھی تھی۔ پانی کے لئے پکے کنوئیں تھے۔ بعض گھروں میں بھی کنوئیں ہوتے تھے۔ عوام کے لئے سڑکوں اور گلیوں میں سبیل ہوتی تھی جس کو ہندو "پیاؤ" کہتے ہیں۔ گھروں میں غسل خانے بھی ہوتے تھے۔ کھدائی میں غسل خانوں کے آثار بھی نکلے ہیں جن کے فرش پر پیروں کے نشان پائے گئے۔ ان نشانوں میں نیل کی آمیزش پائی گئی جس سے ظاہر ہے کہ نہاتے وقت لوگ تیل کی مالش کرتے تھے۔

ان شہروں میں فنِ تحریر بھی رائج تھا۔ ان کی زبان میں چار سو حروف تہجی تھے۔ یہ حروف مصریوں کی طرح تصویر نما تھے۔ لیکن جیسے جیسے زبان ترقی کرتی گئی حروف کی تعداد کم ہوتی گئی۔ حروف کا کم ہونا دماغی ترقی کی علامت ہے۔ ان کی تحریر فارسی اور عربی کی طرح دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی تھی۔ لیکن ان کی تحریر ابھی تک چیستاں ہے۔ جس کو کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ یہ تحریریں کتابوں کی شکل میں نہیں بلکہ مہروں کی صورت میں ہیں جو مختلف اشیا پر ثبت کی جاتی تھیں۔ ان مہروں میں جانوروں کی اُبھری ہوئی تصویریں ہیں جن میں ہاتھی۔ بیل۔ شیر شامل ہیں۔ تصویر کے اُوپری حصے میں چند حروف بھی ہیں جن کو آج کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز پر اس کے مالک کی مہر لگائی جاتی تھی اور یہ ثبوتِ ملکیت سمجھا جاتا تھا۔

ان شہروں میں کون سا مذہب رائج تھا اور اس مذہب کی کیا نوعیت تھی؟ اس کا جواب کسی تحریر کی بنا پر نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ کوئی تحریر ہاتھ نہیں لگی۔ جو ساز و سامان ہاتھ آیا ہے صرف اسی کی بنا پر ان کے مذہب کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ بہت سی چیزوں پر ایک عورت کی تصویر پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بت بھی ملے ہیں جو عورت کے

ہیں۔ یہ بُت گھروں میں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک مہر بھی ملی ہے جس میں ایک عورت کی تصویر ہے جس کے بطن سے ایک پودا نکل رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ لوگ "دھرتی دیوی" کی پوجا کرتے تھے۔ اور زمین کی شادابی اور زرخیزی اسی دیوی سے منسوب کی جاتی تھی۔ ان شہروں میں پجاری برہمن نہیں ہوتے تھے کیونکہ ان کے عروج کے زمانے میں آریا قوم کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔

جب ان شہروں کا زوال شروع ہوا تو آریا قوم نمودار ہوئی اور اس قوم کے اثرات نمودار ہونے لگے۔ آلائے تناسل کی پرستش بھی رائج ہوئی اور پیپل کا درخت بھی پوجا جانے لگا۔ لیکن ان شہروں میں مُردے آخر وقت تک دفن کیے جاتے تھے۔ اور قبروں میں مُردے کے لئے برتن بھی دفن کیے جاتے تھے۔

ان شہروں کا خاتمہ آریا قوم کے ہاتھ سے ہوا۔ جس نے ان شہروں کو آگ لگا کر ختم کیا۔ اس آتش زدگی کے نشانات بھی ملے ہیں۔

میرے عراقی شہر اور اُن کی بربادی!

جس زمانے میں ہڑپّہ اور مہنجو دارو کے شہر عروج پر تھے اسی زمانے میں عراق میں بھی چند شہر تہذیب و تمدن میں شہرۂ آفاق تھے۔

عاشوریوں کے راج میں تین شہر مشہور تھے۔ یعنی

(۱) شہر نینواہ جس کو بادشاہ سناخریب نے ۷۰۵ قبل مسیح دوبارہ بسایا۔

(۲) شہر نمرود جس کو خاندان نمرود نے نویں صدی قبل مسیح آباد کیا۔

(۳) شہر عاشور جو عاشوری حکمرانوں کا دارالحکومت آٹھویں صدی قبل مسیح تھا۔

شہر نینواہ میں بادشاہ عاشور بنی فال کا محل تھا جس میں کتب خانہ

بھی تھا لیکن اس کتب خانے کی کتابیں اینٹ کی شکل میں تختی کی طرح تھیں۔ اِن تختیوں پر عبارت کندہ کر کے آگ میں اینٹ کی طرح پکایا جاتا تھا۔ اس قسم کی جو کتابیں پائی گئیں ان کی تعداد چھبیس ہزار ہے۔ انہیں کتابوں میں گل گمیش کا زمانہ زندگی خاندان عاشورہ کے زمانے سے سینکڑوں سال پہلے تھا۔

شہر نمرود عاشوری خاندان کے زمانے تک قائم رہا۔ اور انہیں عاشوریوں نے اس شہر کا خاتمہ کیا۔ شہر عاشورہ شروع میں عاشوری حکمرانوں کا دارالحکومت تھا۔ جو کچی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ جب عاشوری حکومت کی توسیع ہوئی تو شہر کس مپرسی کے نذر ہو گیا۔

اسی علاقۂ عراق میں حضرت ابراہیم بھی پیدا ہوئے اور نمرود کا مقابلہ کیا۔ اہلِ عقیدہ ان عراقی شہروں کی تباہی کا باعث یہ بتاتے ہیں کہ ان شہروں کے حکمرانوں نے توحید کو نہ مانا اور وہ خود بھی تباہ ہوئے اور ان کے شہر بھی برباد ہوئے۔

ایشیا کے دیگر شہر جو برباد ہوئے

ایسے برباد شدہ شہروں کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ یہ شہر بشیز انسان کی غفلت یا اس کی سفاکی کے نذر ہوئے۔ بعض کو حوادث نے برباد کیا۔ قوم حطّی نے کئی شہر اس علاقے میں بسائے۔ جو آج کل ترکی کہلاتا ہے۔ شہر انقرہ جو آجکل ترکوں کا دارالحکومت ہے۔ اسی قوم حطّی نے بسایا تھا۔ اس قوم کے زمانے میں فراعنۂ مصر کا زور تھا۔ ان فرعونوں نے حطّیوں کے کئی شہر برباد کئے۔ لیکن آخر میں فرعون ایسے کمزور ہو گئے کہ فرعون طوت انخ عامون کی بیوہ نے حطّی بادشاہ شبئیّ لی لُما سے عقد کرنے کے لئے ایک ایلچی بھیجا۔

قوم حطّی نے علاوہ انقرہ کے کئی اور شہر آباد کئے جن کے آثار اب بھی

موجود ہیں۔ ایک شہر اُس جگہ تھا جہاں اب ایک گاؤں آباد ہے جو بغاز کوئی کہلاتا ہے۔ اسی شہر کے قریب ایک اور شہر تھا جہاں اب لیشں کوئی گاؤں آباد ہے۔ اسی طرح ایک اور شہر وہاں آباد تھا جہاں اب اجالا ہیوک گاؤں واقع ہے۔ ترکی کے شمال مغرب میں ایک قصبہ کاراتیب کے نام سے ہے لیکن حطیوں کے زمانے میں یہاں ایک بہت بڑا شہر تھا جو حطّی بادشاہ اسی تواذنامی کا دارالحکومت تھا۔ اس بادشاہ کے علاقے میں دو زبانیں رائج تھیں کیونکہ جو کتبے اس شہر کی کھدائی میں ملے ہیں وہ دو زبانوں میں ہیں ان میں ایک زبان مصر کی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعونوں کا اثر اس دُور دراز علاقے میں بھی تھا۔

(حوالہ نمبر ۱۸) حطّی قوم کی کئی سلطنتیں تھیں۔ جن میں سب سے بڑی النخ کے نام سے موسوم تھی۔ اور اس کے پایۂ تخت کا نام بھی الالنخ تھا۔ یہ سلطنت بعد میں نق میپا خاندان کے ہاتھ لگی۔ اس خاندان کے ایک بادشاہ ادریمی نامی نے اپنی سرگذشت کو اپنے مجسّمہ پر کندہ کرایا لیکن آج قوم حطّی کے آباد کردہ تمام شہر تودۂ خاک ہیں۔

لنکا کے برباد شہر ہندوستان سے ملحق جنوب میں جو جزیرہ لنکا کے نام سے ہے وہاں بھی کئی شہر آباد ہوئے۔ جب آریا قوم نے ہندوستان پر یورشیں شروع کیں۔ اور وادیٔ انڈس کی تہذیب کو برباد کیا تو ایک ہزار سال کے بعد یعنی ۵۴۳ سنہ قبل مسیح آریوں کی ایک ٹولی اس جزیرہ میں بھی پہنچی اور یہاں اپنی حکومت قائم کی۔ جو ۱۸۱۵ سنہ ء تک قائم رہی۔ لنکا میں یہ آریا حکمران سن ہالی خاندان کے نام سے موسوم تھے۔

سن ہالی حکمران خاندان کا پایۂ تخت کینڈی میں تھا۔ جب ہندوستان سے

بدھ مذہب ۳۰۰ سنہ قبل مسیح لنکا میں پہنچا تو سن ہالی خاندان نے یہ مذہب اختیار کیا۔ اس خاندان نے اپنے پیغمبر بدھ کے نام پر اپنے شہروں میں اعلیٰ قسم کی عمارتیں تعمیر کیں جن میں مندر سب سے زیادہ خوبصورت ہوتے تھے۔ شہروں میں سب سے وسیع انورادھا پورا نامی تھا جن کا رقبہ ڈھائی سو مربع میل تھا۔ دوسرا بڑا شہر پولن نروا کے نام سے تھا۔

ان شہروں کی شہرت سُن کر جنوبی ہند سے تامل برہمنوں کی ایک ٹولی لنکا پہنچی جس نے لڑائیاں شروع کیں جو صدیوں تک جاری رہیں ان لڑائیوں نے سن ہالی حکومت کو ایسا کمزور کر دیا کہ وسیع شہر بھی برباد ہونے لگے ان برہمنوں کے حملے ۱۴۵ سنہ قبل مسیح شروع ہوئے۔

ان حملوں نے انورادھا پورا اور پولن نروا دونوں شہروں کا خاتمہ کیا۔ اس برہمن حکمران خاندان کا پایۂ تخت کینڈی تھا۔ لیکن یہ شہر ان دو شہروں کی برابری نہ کر سکا۔ اب ان دونوں شہروں کو جنگل نے ڈھک لیا ہے۔ البتہ ان کے دو ایک مندر اب بھی نظر آتے ہیں اور اپنی عظمت رفتہ کی کہانی سُناتے ہیں۔ ان شہروں کی بربادی کا باعث یہ تھا کہ برہمن حملہ آور بدھ مذہب کے سخت مخالف تھے۔ اور اس مذہب کے مٹانے کو کارِ ثواب سمجھتے تھے۔

آتش فشاں پہاڑ کا برباد کردہ شہر پومپیائی

اب تک میں نے جن شہروں کا تذکرہ کیا ہے وہ انسان کی غفلت یا سفاکی کا شکار ہوئے اور اس لئے ان کا خاتمہ آہستہ آہستہ ہوا لیکن شہر پومپیائی جس کا ذکر میں شروع کر رہی ہوں وہ یکایک ختم ہوا۔ یہ شہر آتش فشاں پہاڑ وِسوویس سے ملحق تھا۔ اس لئے زلزلے آتے رہتے تھے

بربادی سے پہلے آخری زلزلہ ۶۳ء میں آیا۔ جس سے اس شہر کو نقصان پہنچا۔ لیکن سالوں کے اندر اس نقصان کی تلافی ہوگئی۔

یہ شہر یونانیوں نے آٹھویں صدی قبل مسیح بسایا تھا۔ ۸۰ء قبل مسیح یہ شہر رومیوں کے ہاتھ آیا۔ اور اب رومی بھی یہاں آباد ہوگئے ننانویں سال بعد یعنی ۲۴ اگست ۷۹ء کو آتش فشاں پہاڑ یکایک پھٹا اور آناً فاناً میں یہ شہر برباد ہوگیا۔ اتفاق سے اس موقع پر ایک مورخ پلی نی نامی اس وقت وہاں موجود تھا۔ جس نے یہ واقعہ بچشم خود دیکھا۔ اور قلم بند کیا۔ اس پہاڑ سے پگھلے ہوئے پتھر رقیق صورت میں بہتے ہوئے آئے اور پورا شہر ان کی زد میں آکر "غرق" ہوگیا۔ اس تباہی سے جاندار تو ختم ہوگئے لیکن ہر چیز بدستور محفوظ رہی۔

چند دنوں بعد جب یہ رقیق آگ ٹھنڈی ہوگئی تو وہ لوگ واپس آئے جن کو بھاگنے کا موقع مل گیا تھا اور کھود کھاد کر انہوں نے اپنی چند چیزیں برآمد کیں۔ لیکن اصل شہر ۱۷۰۹ء تک اسی حالت میں دبا پڑا رہا۔ اس سال یعنی ۱۷۰۹ء میں ایک آسٹروی شہزادہ وہاں پہنچا۔ اور سرنگ کے ذریعہ چند مجسمے نکالے۔ ۱۷۵۰ء سے کھدائی کا سلسلہ باضابطہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔

(حوالہ نمبر ۱۹) بوقت بربادی شہر پومپیائی کی آبادی زیادہ سے زیادہ بیس ہزار تھی۔ جو یونانیوں، رومیوں، تاجروں اور غلاموں پر مشتمل تھی۔ اس آبادی پر تاجروں کا زور تھا۔ اس شہر میں ایک عجیب رواج یہ تھا کہ لوگ اشتہار کاغذ کی بجائے مکانوں پر لکھتے تھے۔ دکاندار بھی اپنے حسابات اپنی دوکانوں کی دیواروں پر لکھتے تھے۔ عشاق اپنی عشق بازی کی داستان

بھی اسی طرح دیواروں پر ثبت کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس شہر میں کاغذ کی کمی تھی۔ دیواروں پر لکھی ہوئی عبارتیں زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق تھیں۔ حتیٰ کہ رنڈی خانوں کا ذکر بھی ان دیواروں پر قلم بند کیا جاتا تھا۔ کسی مسخرے نے ایک دیوار پر لکھا۔ (حوالہ نمبر ۲۰)

"اے دیوار مجھے تعجب ہے کہ ایسی احمقانہ تحریروں کے بوجھ سے تو گری نہیں"

دیگر رومی شہروں کی طرح پومپیائی شہر میں بھی بڑے بڑے اکھاڑے تھے۔ جہاں مجرموں کو شیروں کے مقابلے میں چھوڑ دیا جاتا تھا۔ حمام بھی بکثرت تھے۔ ان میں بعض نجی مکانوں میں تھے۔ بعض عوام کے لئے گلیوں میں تھے۔ ان حماموں اور مکانوں کے فرش "موزیک" کے ہوتے تھے۔ جن کا رواج آج کراچی میں بھی ہے۔ دیواروں پر جو نقوش ہوتے تھے وہ بھی موزیک سے بنائے جاتے تھے۔ امیروں کے ہر گھر میں فواروں کا رواج تھا۔

شراب خانے بکثرت تھے۔ ان میں سے ایک کی دیوار پر یہ عبارت لکھی ہوئی پائی گئی :-

"اے مالک شراب خانہ تجھ پر لعنت۔ تو شراب کی جگہ پانی فروخت کرتا ہے اور خود خالص شراب پیتا ہے"

یہ شہر تجارتی مرکز بھی تھا۔ یہاں کے انگوروں کی شراب مشہور تھی۔ زیتون کے درخت بکثرت تھے۔ تجارت کی وجہ سے یہاں تاجر بکثرت تھے۔ اسی لئے اس شہر کا مذاق طبیعت اعلیٰ نہ تھا۔ چونکہ اس شہر پر آفت یکایک آئی اس لئے سڑکوں پر جو لوگ جا رہے تھے وہ لاوا میں دب کر وہیں رہ گئے۔ اور اس طرح مدفون ہونے سے ان کی لاشیں گلنے سڑنے سے محفوظ رہیں۔

امریکہ کے قدیم شہروں کی بربادی

مشرق و مغرب کے باشندے ایک عرصے تک مغالطے میں رہے کہ دُنیا کے کُل تین حصّے ہیں۔ یعنی ایشیا۔ یورپ اور افریقہ۔ اس وقت امریکہ اور آسٹریلیا کا پتہ نہ تھا۔ حالانکہ امریکہ کے باشندے ایک زمانے میں براعظم ایشیا سے گئے تھے۔ اور اپنے ساتھ مشرقی تہذیب بھی لے گئے تھے۔ جس کے اثرات اور نشانات پندرھویں صدی عیسوی میں ہسپانوی حملہ آوروں کو نظر آئے۔ یہ اثرات مگر بُت پرستی تک محدود تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ ایشیا سے امریکہ پہنچے وہ ایسے زمانے میں گئے جب مشرق میں توحید کا چرچا نہ تھا۔

امریکہ پہنچ کر نو آمد ایشیائی باشندے تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے یا علیحدہ علیحدہ گروہ کی صورت میں پہنچے۔ وہاں پہنچ کر علیحدہ علیحدہ علاقوں میں آباد ہوئے۔ اور آب ہوا کے فرق سے ان لوگوں میں بھی تفریق پیدا ہو گئی۔ لیکن باوجود اس تفریق کے چند باتیں ان میں مشترکہ تھیں۔ خصوصاً مذہب کے معاملے میں۔ جب ہسپانی کولمبس کی قیادت میں ۱۴۹۸ء میں جنوبی امریکہ پہنچے تو انہوں نے امریکہ کے باشندوں کو تین گروہوں میں منقسم پایا۔ جو (۱) ازتقی (۲) عنکا اور (۳) مایا کہلاتے تھے۔

مایا گروہ کا مرکز علاقہ یوکٹن کہلاتا تھا۔ اس علاقے کا صدر مقام چی چن اتزا کے نام سے موسوم تھا۔ عنکا کا علاقہ پیرو تھا۔ ازتقی گروہ کا علاقہ میکزیکو تھا۔ ازتقی گروہ میں مذہب یہود کے اثرات تھے ایک مغربی محقق لارڈ کنگس برو نے تو یہ دعویٰ کیا کہ یہودیوں کی ایک ٹولی یہاں آکر آباد ہو گئی تھی۔ (حوالہ نمبر ۲۱)

امریکہ کے یہ باشندے کب اس برعظم میں پہنچے اور کب اور کس طرح متمدن ہوئے اس کا کسی کو پتہ نہیں۔ اس لاعلمی کی وجہ یہ ہے کہ عنکا گروہ باوجود متمدن ہونے کے فن تحریر سے نا آشنا رہا۔ باقی دو گروہوں کے متعلق جو تحریری معلومات تھیں ان کو ہسپانی حملہ آوروں نے برباد کر دیا۔ اب تک ان قدیم امریکی باشندوں کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوا ہے وہ اس زمانے کے امریکن محققین کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ گو یہ جستجو چند محققین تک محدود ہے۔ لیکن اس وقت تمام دُنیا میں چند چیزیں ایسی رائج ہیں جو امریکہ کے قدیم باشندوں نے معلوم کیں۔ مثلاً اناج میں مکئی ترکاریوں میں آلو اور ٹماٹر۔ منشی چیزوں میں تمباکو۔ دواؤں میں کونین، کارآمد چیزوں میں ربڑ جس سے ہمارے زمانے میں ٹائر اور ٹیوب کے علاوہ اور دیگر چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں۔

آج یہ قدیم امریکی باشندے "ریڈ انڈین" یعنی سرخ ہندوستانی کے نام سے موسوم ہیں۔ اور تہذیب و تمدن کے معاملے میں پس ماندہ ہیں لیکن جب اہلِ مغرب خصوصاً ہسپانی پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اس برعظم میں پہنچے تو اس زمانے میں یہ پسماندہ لوگ تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے بامِ عروج پر تھے۔ ایک امریکی مؤرخ پریس کٹ (۱۷۹۶ء تا ۱۸۵۹ء) نامی نے اپنی مشہور تاریخ "فتح پیرو" اور "فتح میکسیکو" میں ان قدیم باشندوں کے تمدّن کا مفصل تذکرہ کیا ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔ اس کی تاریخ شائع ہونے کے بعد دیگر امریکی مؤرخوں نے مزید تحقیق کی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پسماندہ گروہ اپنے زمانے میں تمدّن کے معاملے میں دُنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہ تھے۔

(حوالہ نمبر ۳۲) مایا قوم تو تمدن کے اس درجہ تک پہنچ چکی تھی کہ ان کے دارالحکومت چی چن اتزا کے شہر میں علم نجوم کی تحقیق کے لئے ایک رصدگاہ تھی۔ ان کی جنتری آج کل کے حساب سے ایسی مکمل تھی کہ مغربی حملہ آوروں کو یقین نہ آیا کہ یہ مایا قوم کی تیار کردہ ہے۔ یہ رصدگاہ دومنزلہ تھی۔ اس شہر میں جو قبرستان تھا۔ اس میں قبریں احرام نما تھیں اور قبریں ایک دوسرے کے اُوپر تھیں۔ یہ شہر چی چن اتزا دو شہروں پر مشتمل تھا۔ اس میں سے پُرانا شہر تو جنگل کے نذر ہو گیا۔ نیا شہر آج بھی باقی ہے مگر ویران ہے۔ اس میں بارہ عالیشان عمارتیں آج بھی نظر آتی ہیں۔ ان دونوں شہروں کا رقبہ بارہ مربع میل تھا۔ اس شہر میں علاوہ مندروں کے شاہی محل بھی تھا۔ دُور دور تک منہدم شدہ مکانوں کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس شہر میں ایک کنواں بھی تھا جس میں مایا گروہ زندہ انسانوں کو پھینکتے تھے۔ یہ ایک قسم کی قربانی تھی جو وہ اپنے معبود کو خوش کرنے کے لئے دیتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جو لوگ اس طرح پھینکے جاتے تھے ان کو حیاتِ جاوداں حاصل ہو جاتی ہے۔

عنکا گروہ کا دارالحکومت شہر قزقوبین تھا۔ یہ لوگ سورج کی پرستش کرتے تھے۔ جس کے لئے ایک عالی شان مندر اس شہر میں تھا۔ یہ لوگ انسانوں کی قربانی نہیں چڑھاتے تھے۔ مایا قوم کی طرح عنکا قوم نے بھی اقامتی درس گاہیں تعلیم نسواں کے لئے قائم کی تھیں۔ جو اس شہر میں واقع تھیں۔ اس درس گاہ میں جن لڑکیوں کو تعلیم دی جاتی تھی وہ "دوشیزہ آفتاب" کہلاتی تھیں کیونکہ سورج ان کا معبود تھا۔ عنکا قوم کا جو طرزِ حکومت تھا وہ ایک حد تک اصولِ اشتراکیت پر مبنی تھا۔ جملہ زمین مشترک تھی۔

کوئی شخص بے گھر یا بے روزگار نہ تھا۔ شادی کے بعد ہر کاشتکار کے کھیت میں اضافہ کیا جاتا تھا۔ ہر شخص کے ذمّہ کوئی نہ کوئی کام ہوتا تھا۔ کاہلوں اور نکموں کو سزا دی جاتی تھی۔ قدم قدم پر پابندیاں تھیں۔

جب عنکا قوم دوسری قوم کو فتح کرتی تھی تو مفتوحہ لوگوں کو غلام نہیں بنایا جاتا تھا بلکہ ان کو اپنی قوم میں مدغم کر لیا جاتا تھا۔ ان میں فن تحریر کا بالکل رواج نہ تھا۔ اس لئے ان کے تاریخی حالات معلوم کرنے کا ذریعہ محض ان کی عالی شان عمارتیں ہیں۔ ان کے قاصد جب ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے تھے تو ان کے پاس خطوں کی بجائے ایک رسّی ہوتی تھی۔ جس میں مختلف قسم کی گرہ ہوتی تھیں۔ ان گرہ سے یہ لوگ پیغام کی نوعیت معلوم کر لیتے تھے۔

ازتقی قوم میکسیکو کے علاقے میں آباد تھی۔ اس قوم کا پایۂ تخت بھی میکسیکو کہلاتا تھا۔ اس شہر میں امراء کے عالی شان مکان تھے اور ازتقی قوم کے بادشاہ مونتوزوما نامی کا محل بھی یہیں تھا۔ یہ شہر آج بھی قائم ہے۔ لیکن اصل شہر برباد ہو گیا۔ برباد شدہ شہر کو ازتقی لوگ اپنی زبان میں تنوچیط کہتے تھے۔ اس شہر سے قریب ایک جھیل تھی جس میں نمک پیدا ہوتا تھا۔ (حوالہ نمبر ۲۳)

جب ہسپانیوں نے اس علاقے کو فتح کیا تو یہاں کا بادشاہ مونتوزوما تھا جو ۱۵۰۲ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ ۱۵۲۰ء میں یہ ہسپانیوں کے ہاتھ لگا اور زخم خوردہ ہو کر اسی سال فوت ہوا۔ اس کی زندگی کی کہانی ایک افسانہ بن کر رہ گئی۔ مشہور ناول نگار رائڈر ہیگرڈ نے اس کی دختر پر ایک افسانہ بھی لکھ مارا۔ اس شہر میں جو امراء کے مکانات تھے

وہ باوجود عالی شان ہونے کے خوبصورت نہ تھے۔ گو ان میں قیمتی پتھر بھی آویزاں ہوتے تھے اور صحن میں فوّارہ بھی ہوتا تھا۔ (حوالہ نمبر ۲۴)

اس شہر کی گلیاں تنگ و تاریک تھیں۔ صرف ایک سڑک لمبی تھی جو پورے شہر سے گذرتی تھی۔ اس سڑک کے دو طرفہ پارک تھے جو چبوتروں پر بنائے گئے تھے۔ ان پارکوں میں عجیب عجیب قسم کے پودے اور درخت تھے۔ بڑی سڑکیں سیمنٹ کی تھیں۔ وینس کی طرح اس شہر میں بھی نہریں تھیں۔ ان نہروں پر متعدد پُل تھے جو باسانی اُٹھائے جا سکتے تھے۔ اس شہر میں تقریباً ساٹھ ہزار مکانات تھے جن میں تین لاکھ لوگ رہتے تھے۔

شہر میں پولیس رہتی تھی جس کے فرائض میں شہر کی صفائی بھی تھی۔ ایک ہزار مزدور شہر کی صفائی پر تعینات رہتے تھے۔ نہروں کا پانی کھاری تھا۔ پینے کے لئے پانی کئی میل سے بذریعہ پائپ یعنی نل لایا جاتا تھا۔ یہ نل پکی ہوئی مٹی کے ہوتے تھے جو اکثر ٹوٹ جاتے تھے اس لئے ان نلوں کی دوہری لائن تھی۔

امریکہ کے تمام قدیمی شہر ہسپانیوں کے ہاتھ سے برباد ہوئے۔ اب ان کی صرف کہانی باقی ہے۔

آٹھواں باب

میرا رُوحانی پہلو

اب تک آپ نے میرے مادّی اور فلسفیانہ پہلو دیکھے ہیں۔ لیکن میرا ایک اور پہلو بھی ہے جس کو میں روحانی کہتی ہوں۔ اس روحانی پہلو کے ذریعہ میرا تعلق خدا سے قائم ہوتا ہے۔ اب تک میں نے مذاہب کی آمد کا ذکر دانستہ نہیں کیا۔ حالانکہ جو انقلاب انسانی زندگی میں مذہب اور خصوصاً الہامی مذاہب سے ہوا ہے ایسا انقلاب کوئی بادشاہ یا کوئی تحریک پیدا کر سکی۔

انقلاب فرانس کا بڑا گانا گایا جاتا ہے کہ اس انقلاب نے انسان کو آزادی کا سبق پڑھایا۔ لیکن چند دنوں کے اندر نپولین نے اس سبق کو فرانس کے باشندوں کے ذہن سے مٹا دیا۔ اسی طرح ہٹلر نے جرمن کے ذہن کو مقید کر دیا۔ پہلی عالمگیر جنگ (سنہ ۱۹۱۴ تا سنہ ۱۹۱۸ء) کے متعلق دعویٰ کیا گیا تھا کہ یہ آزادی کی خاطر لڑی جا رہی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ مغرب کا سب سے بڑا ملک روس اشتراکیت میں گرفتار ہو گیا۔ اشتراکیت کی بیڑیاں زار روس کی بیڑیوں سے بھی سخت ثابت ہوئیں۔ رفتہ رفتہ تمام مشرقی یورپ پر مطلق العنانی چھا گئی جو آج تک موجود ہے۔

اصل آزادی آزادیٔ ذہن ہے

اصل آزادی آزادیٔ ذہن ہے۔ جس قوم کا ذہن مقید ہے وہ سیاسی آزادی بھی قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس اصل آزادی یعنی آزادیٔ ذہن کا بیج اس دُنیا

میں انبیار نے لیا۔ الہامی مذاہب میں سب سے پہلا یہودی مذہب تھا جس کے بانی حضرت ابراہیمؑ تھے۔ اس نبی کی آمد سے پہلے انسان ہر چیز کو پوجتا تھا۔ اور اس طرح انسانی ذہن پر سینکڑوں بیڑیاں مسلّط تھیں۔ حضرت ابراہیم کی تلقینِ توحید نے ایک دم ان بیڑیوں کو کاٹ کر پھینک دیا۔ جب بنی اسرائیل کو فراعنہ مصر نے مقید کیا تو حضرت موسیٰؑ پھر پیغام آزادی یعنی پیغامِ توحید لے کر اُٹھے اور بنی اسرائیل کو مصر سے باہر لے آئے۔ لیکن انسان کا ذہن ہمیشہ کسی نہ کسی بیڑی کا طلبگار رہتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے فوراً بعد قوم بنی اسرائیل پوجاریوں کی بیڑیوں میں پھنس گئی۔

ان نئی بیڑیوں کو توڑنے کے لئے حضرت عیسیٰؑ اٹھے اور پوجاریوں کی مذمت کی۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں کوڑھیوں اور محتاجوں کو حقیر سمجھا جاتا تھا اور لوگ سماجی قیدوں میں بھی مقید تھے۔ سب سے پہلے حضرت عیسیٰ نے ان سماجی بیڑیوں کو توڑا۔ کوڑھیوں کو ہاتھ لگانا جُرم سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ ان کوڑھیوں کے پاس جا کر اور ان کو چھو کر ان کو اچھا کرتے تھے۔ اسی طرح رنڈیوں کو ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ حضرت موصوف نے ان کو نیکی کی تلقین کی اور مریم ماجدلین جیسی طوائف تائب ہو گئی۔ اس عورت کی اصلاح حضرت عیسےٰ نے جس طرح کی۔ اس کی تفصیل لوقا کی انجیل باب ہفتم اور ہشتم میں پائی جاتی ہے۔

ذہنِ انسانی کو مُقید کرنے والوں پر عیسیٰ کی لعن طعن

حضرت عیسیٰ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے یہودی فقیہوں اور فریسیوں کی سر بازار مذمت کی جنہوں نے اپنی قوم کے ذہن کو مقید کر رکھا تھا۔ تمام لوگ ان فقیہوں کے دل سے مرید تھے۔ لیکن تنہا ایک شخص اٹھتا

ہے اور سر بازار ان پر لعن طعن کرتا ہے۔ اس لعن طعن کا اقتباس مندرجہ ذیل ہے:۔ (حوالہ نمبر ۱)

• اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو۔ کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم بیواؤں کے گھروں کو دبا بیٹھے ہو اور دکھاوے کے لئے نماز کو طول دیتے ہو۔ تمہیں زیادہ سزا ہو گی۔

اے اندھے راہ بتانے والو تم پر افسوس! جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ بات نہیں لیکن اگر مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہو گا۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو دہ یکی دیتے ہو پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو نگل جاتے ہو۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پیالے اور رکابی کو اوپر سے صاف کرتے ہو مگر وہ اندر سے لوٹ اور ناپرہیزگاری

سے بھرے ہیں۔ اے اندھے فریسی! پہلے پیالے اور رکابی کو اندر سے صاف کرتا کہ اوپر سے بھی صاف ہو جائیں۔

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! کہ تم سفید کی پھری قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری پڑی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔"

بشارتِ آزادی حضرت عیسیٰؑ کا دوسرا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے ان مقید لوگوں کو آزادی کی بشارت دی یہ بشارت متی کی انجیل باب پنجم میں اس طرح درج ہے۔ اور "خطبۂ کوہ" کے نام سے موسوم اور مشہور ہے۔ (حوالہ نمبر ۲)

"مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں۔ کیونکہ آسمان کی بادشاہی ان ہی کی ہے۔

مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے بھوکے اور پیاسے ہیں۔ کیونکہ وہ آسودہ ہوں گے۔

مبارک ہیں وہ جو رحم دل ہیں کیونکہ ان پر رحم کیا جائے گا۔

مبارک ہیں وہ جو دل کے پاک ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔

مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔

مبارک ہیں وہ جو راست بازی کے سبب سے ستائے گئے ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہت انھیں کی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کا تیسرا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خدا کی رحیمی اور کریمی پر

پر زور دیا۔ یہودی پوجاری لوگوں پر اپنا رعب داب قائم رکھنے کے لئے خدا کو صرف قاہر اور جابر بتاتے تھے۔ خدا کے رحم و کرم کا ذکر نہ کرتے تھے۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ نے عفو اور رحم کی تلقین کی۔ کیونکہ خدا خود عفو اور رحم کا نمونہ ہے۔ مسخ شدہ یہودی شریعت میں "آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت" کا قانون رائج تھا۔ لیکن حضرت عیسےٰ نے خدا کے عفو اور رحم کے نمونے پر انسان کو بھی عفو اور رحم کی تلقین کی۔ اسی خطبۂ کوہ میں حضرت عیسیٰؑ نے کہا:۔

"تم سُن چکے ہو کہ کیا کہا گیا تھا۔ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا۔ بلکہ جو کوئی تیرے دہنے گال پر چانٹا مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔

تم سن چکے ہو کہ کہا گیا تھا کہ اپنے پڑوسی سے محبت رکھو اور اپنے دشمن سے عداوت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے بھی محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لئے دعا کرو۔"

حضرت عیسیٰ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کی تعلیم پر چلنے سے انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ الزام سراسر غلط ہے۔ اسی خطبۂ کوہ میں انہوں نے کہا:۔

"مانگو تو تم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔ کیونکہ جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے واسطے کھولا جائے گا۔"

انسانی ترقی کی سدِّراہ یعنی "بدعت"

حضرت انسان کی فطرت عجیب و غریب ہے۔ جب کوئی نیا پیغامِ آزادی آتا ہے تو وہ اس کو "بدعت" قرار دیتے ہیں اور اس کو اپنے رائج الوقت عقیدے کے مقابلے میں "کفر" سمجھتے ہیں۔ لیکن بالآخر یہ بدعت مقبول ہو جاتی ہے۔ اور ان کا عقیدہ پاش پاش ہو جاتا ہے۔ لیکن انسان ہمیشہ عقیدے کا بھوکا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب بدعت مقبول عام ہو جاتی ہے تو یہ بدعت بھی عقیدت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ سینکڑوں پجاری اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اس عقیدے کی آڑ میں روزی کماتے ہیں۔ ہندوؤں میں برہمن اسی طرح پیدا ہوئے۔ یہ پوجاری اپنا زور قائم رکھنے کے لئے اس نئے اور سیدھے سادے مذہب کو پیچیدہ کر دیتے ہیں۔ اب یہ بدعت بھی پرانے عقیدوں کی طرح "راسخ" ہو جاتی ہے۔ اور پرانے عقیدوں کی طرح یہ راسخ الاعتقادی بھی انسان کے ذہن کو مقید کر دیتی ہے۔

انسانوں کو اس قید سے چھڑانے کے لئے پھر کوئی نبی اٹھتا ہے۔ اور یہ کہانی از سرِ نو شروع ہوتی ہے۔ شاباش ہے کہ وہ حق کی خاطر ہر طرح کی مصیبتیں جھیلتے ہیں تاکہ ذہنِ انسانی آزاد ہو۔ زکریاؑ کے سر پر آری چلائی گئی۔ موسیٰؑ نے فرعون کی سختیاں جھیلیں۔ عیسےٰؑ صلیب پر ٹانگے گئے۔ بانیٔ اسلامؐ کو جلاوطن کیا گیا۔ لیکن حضرت انسان کا ذہن آج بھی اصل تصورِ آزادی سے محروم ہے۔ آج بھی حق ویسا ہی تلخ ہے جیسا کہ وہ موسیٰؑ، عیسےٰؑ اور پیغمبرِ اسلامؐ کے زمانے میں تھا۔ آج بھی نئی بات کو بدعت سمجھا جاتا ہے۔ سر سیّد کو ہمارے زمانے ہی میں کافر قرار دیا گیا۔ الغرض باوجود اس طویل کہانی کے ابوجہل اور ابوجہلیت

کسی نہ کسی طرح لوٹ کر پھر آجاتی ہے۔

کیا اس حالت میں انسان کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیئے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ میرے صحیفے تو یہ بتاتے ہیں کہ اگر یہ انبیاء وقتاً فوقتاً نہ آتے تو آج انسان پھر اسی مقام پر لوٹ کر چلا جاتا جہاں سے اس نے اپنا "ذہنی سفر" شروع کیا تھا۔ میرے صحیفوں کو جن لوگوں نے پُر کیا ہے وہ بھی "ذہنی مسافر" تھے۔ جو آج انبیاء کے نام سے موسوم ہیں۔ صرف یہ انبیاء ہی حقیقی معنوں میں قائد تھے۔

حضرت عیسٰی کی روح افزا تعلیم کو بھی حسب دستور ان کے پیشہ ور پادریوں نے مسخ کیا۔ بانیٔ اسلام کی آمد سے پہلے خدا پرستی کی جگہ "مذہب پرستی" نے لے لی۔ یہودی فقیہوں کی رائج کردہ لغو رسومات لوٹ کر آگئیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ یہودی فقیہوں نے رومی حکمرانوں سے سازش کر کے حضرت عیسٰیؑ کو "باغی" قرار دیا۔ عیسٰی کی تلقین کردہ ذہنی آزادی کو یہ مقید کرنے والے فقیہہ کس طرح پسند کر سکتے تھے۔ حضرت عیسٰی کی صلیب کے بعد ان فقیہوں نے ان کے مذہب کو بھی نکال باہر کیا۔ اب اس مذہب کو ایسے علاقوں میں پناہ لینی پڑی جہاں اصنام پرستی رائج تھی اور تین معبودوں کا راج تھا۔ چنانچہ یہاں توحید، تثلیث کی صورت میں مسخ ہو گئی۔ ذہن انسانی پر بیڑیاں پھر مسلط ہو گئیں۔ کلیسا نے بذاتِ خود ایک ادارہ بن کر خدا کی جگہ لے لی۔ پاپائے روم خدا کا جانشین بن گیا۔ پیشہ ور پادریوں نے زور پکڑا اور جنّت فروخت ہونے لگی۔

اب جہلیت پھر انسانی ذہن پر چھا گئی۔ فلسفہ یونان جو آزادی

ذہن پر مبنی تھا۔ دفن کر دیا گیا۔ رومتہ الکبریٰ کی جگہ قسطنطنیہ نے لی۔ یہاں مشرقی کلیسا قائم ہوا اور مذہب عیسوی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ لیکن دونوں عیسائی فرقے ذہن انسانی کو مقید کرنے میں یکساں کوشاں تھے۔ رومیوں نے ایک حد تک یونانیوں سے متاثر ہو کر انسان کی آزاد خیالی کو برداشت کیا تھا لیکن قسطنطنیہ کی بازنطینی حکومت نے انسان کے ذہن میں تالے لگا دیئے۔

آمدِ اسلام سے پہلے ذہنِ انسانی کی حالتِ زار

اسلام ساتویں صدی عیسوی میں نمودار ہوا۔ اسلام کی آمد سے پہلے صرف دو الہامی مذہب باقی رہ گئے تھے۔ یعنی مذہب یہود اور مذہب عیسوی۔ سب سے پہلے یہودیوں کا مذہب مسخ ہو گیا۔ اس کے مسخ کرنے والے اس کے اپنی پوجاری تھے جو آج "ربی" کہلاتے ہیں۔ لیکن آمد عیسیٰ سے پہلے قوم یہود دو فرقوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ ایک فرقہ "فریسی" کہلاتا تھا۔ جو اصل توحید اور اس کی روح کو فراموش کر کے صرف لفظوں میں گرفتار تھا۔ دوسرا فرقہ "صدوقی" کے نام سے موسوم تھا۔ یہ فرقہ یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر کسی قدر ذہنی بیڑیوں سے آزاد تھا۔ ان دو فرقوں کے علاوہ ایک فرقہ موسومہ "السینی" بھی تھا۔ جس کا رہبانیت کی طرف رُجحان تھا۔

مگر یہ تینوں فرقے اصل آزادئ توحید کو کھو چکے تھے اور پوجاریوں کے جال میں پھنس گئے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ ان کو اس جال سے رہا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس قوم نے جو کچھ اس حامئ آزادی کے ساتھ کیا اس کا حال مختصراً آپ کو بتایا جا چکا ہے۔ انہوں نے صرف عیسیٰ ہی کو صلیب پر نہ چڑھایا۔

بلکہ مذہب عیسوی کی نکال کر ایسے علاقوں میں بھیج دیا۔ جہاں توحید تثلیث میں بدل گئی۔

مذہب عیسوی اپنے وطن سے نکل کر پھیلا ضرور مگر مسخ ہو کر پھیلا جب یہ مذہب اٹلی میں پہنچا تو وہاں قدیمی رومی اثرات سے اس کو دوچار ہونا پڑا۔ رومی روایات حکومت پر مبنی تھیں۔ چنانچہ اٹلی میں پاپائے اعظم مذہب عیسوی کی آڑ لے کر ایک طرح کا "شہنشاہ روم" بن بیٹھا۔ اس نے شاہ گری شروع کر دی جس سے یہ حامئ توحید مذہب سیاست میں بری طرح پھنس گیا۔ اس پاپائے اعظم نے ذہن انسانی میں تالے لگائے۔ ہر کتاب پہلے پاپا کے سامنے پیش کی جاتی تھی۔ اگر کتاب کے کسی جملے سے ذہنی آزادی کا اظہار ہوتا تھا تو وہ کتاب ضبط کر لی جاتی تھی۔ اسی طرح بعد کو "احتسابی" عدالتیں بھی قائم کی گئیں جن کے سامنے آزاد خیال عیسائی پیش کئے جاتے تھے اور ان کو جلتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جاتا تھا۔ یہ بھی اسی قسم کی آتش نمرود تھی جس میں حضرت ابراہیم کو ڈالا گیا تھا۔ الغرض مذہب عیسوی مشرق میں تقریباً مفقود ہو گیا۔ اور صرف مغرب میں یہ مذہب پھیلا۔ لیکن مسخ ہو کر پھیلا۔

ایران میں ذہن انسانی کی زبوں حالی

اب رہا مشرق جو مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں ایران میں زرتشتی مذہب رائج تھا۔ جو مسئلہ خیر و شر پر مبنی تھا۔ ممکن ہے کہ زرتشت نے توحید کی تلقین کی ہو۔ لیکن بوقت آمد اسلام یہ مذہب بھی بدل چکا تھا۔ اس میں دو خدا پیدا ہو چکے تھے۔ خدائے خیر "اہورمزدا" کہلاتا تھا جس کو مسلمان "یزداں" کہتے ہیں۔ خدائے شر "اہرمن" کے نام سے موسوم تھا۔ جو وہی کام کرتا تھا جو

مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ابلیس کرتا ہے۔ زرتشتی اس خیر و شر میں بُری طرح پھنس چکے تھے اور اگر ان میں تصور توحید تھا تو وہ ان دو خداؤں کے درمیان غرق ہو چکا تھا۔ لیکن یہ مذہب ایران میں صرف حاکم طبقے میں پایا جاتا تھا۔ باقی لوگ قبیلوں میں بادیہ پیمائی کرتے تھے۔ آگ کو پوجا جاتا تھا۔ ان میں بھی پیشہ ور پوجاری پیدا ہو چکے تھے۔ جو "مغ" کہلاتے تھے۔ لیکن عربی زبان میں اس کے معنی آتش پرست ہو گئے۔ لیکن اصل پہلوی زبان میں پوجاری "ہربید" کہلاتے تھے۔ بعد کو "مُبید" کہلانے لگے۔

بابُل کی طرح ایران میں بھی حکمران کو مذہب میں بڑا دخل تھا۔ زمانۂ قدیم میں مذہب اور حکومت ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں ہوتے تھے۔ ان دونوں میں جو بیگانگی ہمیں آج نظر آتی ہے وہ دَورِ جدید میں پیدا ہوئی۔ لیکن ایسی یگانگت سے مذہب مسخ بھی ہو جاتا ہے۔ پُرانے زمانے میں حکمران اپنے آپ کو مقبول بنانے کے لئے اپنی پوجا شروع کرا دیتے تھے۔ فراعنۂ مصر اسی ضرورت کے تحت خدا بنے۔

اور الہامی مذاہب کی طرح مذہب زرتشت بھی شروع میں خالص تھا اور توحید کا حامی تھا۔ توحید کا تعلق ذہن انسانی سے ہے۔ صرف آزاد ذہن ہی توحید کو سمجھ سکتا ہے۔ زرتشت نے کئی حمدیں لکھیں۔ بیشتر ان حمدوں میں "اعلیٰ ذہن" کا ذکر ہے۔ میری تاویل کے مطابق اعلیٰ ذہن سے زرتشت کی مراد آزاد ذہن ہے۔ ایک حمد میں زرتشت کہتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۳)

"اے وہ ہستی جس نے سب سے پہلے ذہن کو نور سے منور کیا

تو نے ہی راست بازی اپنی مرضی سے پیدا کی۔

اعلیٰ ذہن کو تو ہی برقرار رکھتا ہے

اے حکیم تو نے اپنی روح سے اعلیٰ ذہن کو بڑھایا۔
اے مالک یہ روح اب بھی تجھ میں موجود ہے
اسی اعلیٰ ذہن سے پہچانا کہ تو ہی اوّل و آخر ہے
تو ہی اعلیٰ ذہن کا پیدا کرنے والا ہے۔"

دو خداؤں یعنی اہورمزدا اور اہرمن کا تصوّر شروع میں نہ تھا۔ چنانچہ ایک حمد میں زرتشت کہتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۴)

"بروز جزا جب وہ شر کو خیر سے مغلوب کرے گا
جب ایک دوسرے پر فتح پائے گا۔
جس کی بشارت جھوٹے خداؤں اور انسانوں کو دی جا چکی ہے۔
تو اے مالک نجات سے تیری پرستش میں اضافہ ہوگا۔"

زرتشت کا زمانۂ زندگی جدید تحقیق کے مطابق ۶۶۰ء تا ۵۸۳ء قبل مسیح تھا۔ اس کے مذہب کا اصل مرکز وہ علاقہ تھا جو اس زمانے میں "فارس" کہلاتا تھا جس سے لفظ "فارسی" مشتق ہے۔ جب تک زرتشتی مذہب بادشاہوں سے دُور رہا تب تک یہ مذہب آلائش سے پاک رہا۔ لیکن جب ایران کی حکومت ساسانی خاندان کے ہاتھ لگی اور اردشیر پسر پاپک نے ایران کے بیشتر حصّوں پر معرکۂ ہُرمز (۲۲۶ء) کے بعد قبضہ کیا تو اس اردشیر نے زرتشتی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا۔

(حوالہ نمبر ۵) جب کوئی مذہب سرکاری بن جاتا ہے تو مصلحت حکومت اس پر غالب آجاتی ہے۔ اور حکمران کوشش کرتے ہیں کہ ان کا مذہب مقبولِ عام بنانے کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔

اوّل۔ مذہب کو عام فہم بنایا جائے۔ لیکن تصورِ توحید ایسی

چیز ہے جس کو عوام نہیں سمجھ سکتے۔ عوام تو مذہب کو مجازی صورت میں سمجھ سکتے ہیں۔ حقیقی صورت میں مذہب کو سمجھنا عوام کے بس کا روگ نہیں۔

دوئم۔ پوجاریوں کو ہاتھ میں لیا جائے۔ عوام پر پوجاریوں کا اثر بہ نسبت بادشاہوں کے زیادہ ہوتا ہے۔ پوجاریوں کو ایسی حالت میں ملایا جا سکتا ہے جب ان کو پوری آزادی دی جائے۔ پوجاری آزاد ہو کر اپنی من مانی کرتے ہیں اور حکومت کے حامی ہو جاتے ہیں۔ حکومت اور پوجاریوں کا گٹھ جوڑ ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔

اردشیر نے بھی اسی خیال سے زرتشتی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ چنانچہ اردشیر نے زرتشتی پوجاریوں یعنی مبیدوں کو بڑی بڑی جاگیریں دیں۔ اور وظیفے مقرر کئے اور سات مبیدوں کی ایک مجلس مقرر کی۔ اس مجلس نے ایک نوجوان مبید ارداوراف نامی کو اپنا سردار منتخب کیا۔ بعد انتخاب اس نوجوان مبید کو کوئی دوا کھلائی گئی جس سے وہ سات دن تک برابر سوتا رہا۔ اردشیر اور ساتوں اراکین مجلس اس خفتہ مبید کے پاس بیٹھے رہے۔ جب وہ بیدار ہوا تو اس نے پورا "کلام اللہ" جو زرتشت پر نازل ہوا تھا زبانی سنایا جس کو قلم بند کیا گیا۔ زرتشتی اس کلام اللہ کو "اوستہا" کہتے تھے۔

(حوالہ نمبر ۶۴) اصل اوستہا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اکیس جلدوں میں تھا اور بارہ ہزار بیل کی کھالوں پر بہ حروف طلائی لکھا ہوا تھا۔ لیکن جب سکندر کے ہاتھ سے خاندان ہخامنش کے آخری حکمران

دارا دوئم کا خاتمہ ہوا تو اوستہا کا اصل نسخہ بھی تلف ہو گیا۔ جدید تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اسی خاندان ہخامنش کا بانی ازتاکسرکسس نامی تھا جو ۴۶۵ سنہ قبل مسیح تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ اردشیر دراز دست کے نام سے بھی موسوم ہے۔ اسی بادشاہ کے زمانے ہی میں ایک بت "اناہتا" نامی کی پرستش شروع ہو گئی تھی۔ اس بُت کا سب سے بڑا مندر استخر میں تعمیر ہو چکا تھا۔ جو ہخامنش حکمرانوں کا صدر مقام تھا۔ استخر بابل کے قریب تھا۔ جہاں صدیوں سے بت پرستی رائج تھی۔ زرتشت کا خالص مذہب جو توحید پر مبنی تھا اس بُت پرستی سے بالآخر متاثر ہوا۔

ساسانی حکمران اردشیر کے زمانے میں جو اوستہا از سر نو قلم بند ہوا اس کے مطابق اس حکمران نے بتوں کا خاتمہ کیا۔ اور سورج اور چاند کی پرستش ممنوع کر دی۔ مرتے وقت اس اردشیر نے اپنے جانشین فرزند شاپور اوّل کو جو وصیت کی وہ قابل نقل ہے کیونکہ اسی کی وجہ سے معبدوں کا زور ہوا۔ اور توحید پاش پاش ہوئی۔ وہ وصیت یہ تھی :- (حوالہ طبری)

> "مندر اور تخت ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کو سہارا دینا چاہیئے۔ بادشاہ بغیر مذہب ظالم ہو جاتا ہے"

شاپور اوّل (سنہ ۲۴۱ تا سنہ ۲۷۲ء) نے اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کرنا چاہا مگر اس کے زمانے میں ایک دوسرا بانی مذہب پیدا ہوا۔ جو مانی کے نام سے مشہور ہے۔ شروع میں وہ شاپور کے دربار میں بہ حیثیت مصاحب رہا لیکن بعد میں مانی جلا وطن کیا گیا۔ پھر بھی مانی کا مذہب پھیلتا رہا۔ اور مغرب تک پہنچا اور مسلمانوں کے زمانے تک ماوراالنہر میں قائم

رہا۔ اس مذہب کے ماننے والے دو زمروں میں منقسم تھے یعنی خواص اور عوام جو "سامعین" کہلاتے تھے۔ خواص پوجاری کا کام کرتے تھے اور پادریوں کی طرح مجرّد رہتے تھے۔ حضرت موسیٰ کا شمار شیطانوں میں تھا۔ اسی طرح تمام انبیاء بھی بُرے سمجھے جاتے تھے۔ مانی مذہب کے لوگ حضرت عیسیٰ کے قائل تھے مگر تثلیث کے ساتھ۔

الغرض مانی مذہب چوں چوں کا مربّہ تھا۔ بدھ مت کے اثرات بھی اس مذہب پر تھے۔ تناسخ بھی مانی مذہب میں شامل تھا۔ سب کچھ تھا لیکن پورے ایران سے توحید مفقود ہو چکی تھی۔ کہیں کہیں زرتشتی مذہب بھی ایران میں نظر آتا تھا لیکن مسخ صورت میں۔ بیشتر ملک مانی کا معتقد ہو گیا۔ لیکن اب حکمران ملک مانی کے خلاف ہو گئے ۔ شاہ بہرام اوّل نے اس کو مروا کر اس کی لاش میں بھُس بھروایا اور شہر جُند شاپور کے پھاٹک پر ٹنگوا دی۔ بہرام مانی سے غالباً اس لئے ناراض ہوا کہ اس نے اپنے مذہب کو حکومت کا آلۂ کار بنانے سے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ مانی کے مذہب کا رُجحان عیسائیت کی طرف تھا جس کو حکمران ایران اپنے سرکاری مذہب کا مدِّ مقابل سمجھتے تھے۔ ان حکمرانوں کی شکایت تھی کہ :۔ (حوالہ نمبر ۸)

"عیسائی ہماری مقدّس تعلیمات کو برباد کرتے ہیں اور انسان کو تعلیم دیتے ہیں کہ صرف خدائے واحد کی بندگی کریں۔ سورج اور چاند کی پوجا نہ کریں ...."

اس سے صاف ظاہر ہے کہ آمدِ اسلام سے پہلے توحید ایران سے مفقود ہو چکی تھی اور باوجود تثلیث کے ایرانی عیسائیت سے متنفّر تھے۔

دیارِ ہند میں ذہنِ انسانی کی زبوں حالی!

ایران کے مشرق میں وہ عجیب و غریب ملک تھا جو اب ہندوستان کہلاتا ہے لیکن زمانۂ قدیم میں اس کے باشندے اس کے نام کے معاملے میں بھی متفق نہ تھے۔ جس طرح اس ملک کا قالب پُرآشوب رہا ہے اسی طرح اس کی روح کو بھی کبھی قرار نصیب نہ ہوا۔ قالب کے معاملے میں یہ ملک ہمیشہ سے مختلف اقوام کا بازی گاہ رہا ہے۔ اس کی وسعت اور اس کی زرخیزی ہمیشہ اس کو مصیبت میں مُبتلا کرتی رہی۔ اس کی روح کی بیقراری کا باعث بھی اس کی وسعت ہی ہے۔ اس کی آب و ہوا ایسی ہے کہ اس کے باشندوں کو روزی آسانی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد انسان کو دُور کی سُوجھتی ہے۔ لیکن دُور کی سوجھ بوجھ کے معاملے میں اس بدنصیب ملک کو کبھی کوئی ایسا رہبر نصیب نہ ہوا جو تمام باشندوں کو ایک ہی بات سمجھاتا۔

کیا خدائے لایزال نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اور کوئی نبی اس وسیع مُلک میں نہ بھیجا۔ عقل اس معمے کو حل نہیں کر سکتی۔ یہاں کے اصل اور قدیمی باشندے جنگلوں میں مقید رہے۔ صرف مغربی علاقے میں ایک قسم کا تمدن نمودار ہوا۔ جہاں تقریباً دو ہزار سال بُتوں کا راج رہا۔ یہ علاقہ بقیہ مُلک سے بالکل نا آشنا رہا۔ گویا تہذیب و تمدن کے معاملے میں بھی یہ مُلک اتحاد سے محروم رہا۔ ہر علاقہ اپنا راگ گاتا رہا۔

یہاں کے باشندوں نے میری طرف کبھی توجہ نہ کی۔ یہ لوگ شروع سے ہی تقدیر کے غلام رہے۔ گو مغربی علاقے میں تمدن قائم ہوا اور فنِ تحریر بھی رائج ہوا لیکن اس قدیم تمدن نے بھی مجھ کو طلب نہ کیا۔

اور اس لئے میرے صحیفے اس ملک میں گونگے ہی رہے۔ جب پندرھویں صدی قبل مسیح یہاں آریا قوم پہنچی اور موہنجو دارو اور ہڑپہ کی تہذیب کو برباد کیا تب بھی کسی نے میری طرف توجہ نہ کی۔ حالانکہ آریا قوم فن تحریر سے واقف تھی۔

آریا قوم اپنے ساتھ اپنے بُت بھی لائی۔ یہ بُت وہی تھے جو اس قوم کی دوسری شاخ کے ساتھ مغرب میں پہنچے۔ یہ عجیب معمّہ ہے جو ابھی تک حل طلب ہے کہ آریا قوم انبیاء یعنی الہامی مذاہب سے کیوں محروم رہی۔ اس قوم کے دماغ میں روحانی قوت کا تصوّر ضرور پیدا ہوا اور انہوں نے بُت بھی تراشے لیکن ان کا ذہن شروع ہی سے مجاز میں ایسا گرفتار ہو گیا کہ بُتوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ برعکس ان کے سامی قوموں کو کثرت میں وحدت نظر آگئی۔ بعض فلسفی اس فرق کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ آریا قوم کی جولانگاہ ایسے علاقے تھے جہاں ہر چیز کثرت سے تھی۔ برعکس اس کے سامی قوم ایسے علاقے میں تھی جہاں بجز صحرا کے کوئی چیز نہ تھی۔ نیچے صحرا تھا اور اوپر آسمان۔ اس لئے سامی کو بجز وحدت کے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لیکن فلسفیوں کا یہ جواب محض قیاس آرائی ہے۔

جب آریا قوم دیارِ ہند میں پہنچی تو ان کو شمالی علاقوں میں اپنے لئے میدان صاف نظر آیا۔ یہاں کے قدیم باشندے اپنی روزی آسانی سے پیدا کرتے تھے۔ اور جفاکشی سے ناآشنا تھے۔ برعکس اس کے آریا قوم تلاش روزی میں سرگرم تھی۔ جمنا گنگا کے سبزہ زاروں کو دیکھ کر اس قوم کی آنکھیں کھُل گئیں۔ اور فوراً ڈیرے ڈال دئے۔ اپنے بتوں کو جیب سے نکالا اور ان سبزہ زاروں میں نصب کیا۔

(حوالہ نمبر ۹) — یہ بُت سینکڑوں کی تعداد میں تھے جن کا ذکر باعث طوالت ہوگا۔ یہ عجیب بات ہے کہ آریا قوم کے ذہن میں "خالق" کا تصور نہ تھا۔ ان کے نزدیک سب سے بڑا دیوتا اندرا نامی تھا۔ مغرب میں جو آریا قوم کی شاخ پہنچی اس نے اس اندرا کو ذی یوس کا نام دیا۔ ہندوستان میں بسنے کے بعد آریا قوم کے دماغ میں خالق کا تصور پیدا ہوا اور "برہما" کے نام سے خالق کا بُت بھی تراشا۔ آریا قوم چونکہ ماری ماری پھرتی تھی اور سربکف رہتی تھی اس لئے اس قوم کے دماغ پر قربانی کا تصور غالب تھا۔ چنانچہ "وشنو" کے نام سے ایک بُت تراشا۔ جو قربانی کا شائق تھا۔ جب اس قوم کو حکمران کی ضرورت محسوس ہوئی تو "ورنا" کا بت تراشا گیا۔ لیکن آریوں کی عبادت کا جزو اعظم قربانی تھا۔

قربانی کے لئے جانور مخصوص تھے۔ قربانی دراصل ایک قسم کی "بھینٹ" تھی جو یہ بُت طلب کرتے تھے۔ بغیر بھینٹ کے یہ دیوتا ان کو کچھ نہ دیتے تھے۔ بوقت قربانی یہ دیوتا آسمان سے اترتے تھے اور بھینٹ چڑھانے والوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے تھے اور ان کی مرادیں ان کی پیش کردہ قربانی کے مطابق پوری کرتے تھے۔ جتنی قربانی اتنا ہی معاوضہ۔ قربانی چڑھانے کے لئے ایک بوٹی "سوما" کو پیس کر پیتے تھے۔ اور نشے میں مست ہوکر ان دیوتاؤں کو بچشم خود دیکھتے تھے۔ لیکن قبول قربانی کے لئے برہمن کی موجودگی ضروری تھی کیونکہ برہمن کے "منتر" کی بدولت دیوتا قربانی قبول کرتے تھے۔ یہ منتر جادو کی سی قوت رکھتا تھا۔

اس جادو کی وجہ سے ہی دیوتا آسمان سے اترتے تھے۔ اس لئے برہمنوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری تھی۔ اگر قربانی چڑھانے والے

سے برہمن ناراض ہوتا تھا تو قربانی سے اُلٹا اثر ہوتا تھا۔ برہمنوں نے ایک حمد گڑھی جس میں تخلیقِ انسان کا ذکر اس طرح سے ہے۔

"برہمن انسان کا مُنہ بنا۔
اس کے ہاتھ سے سپاہی پیدا ہوا
اس کی جانگھوں سے ویش نکلا
اس کے پیروں سے شُدر پیدا ہوا"

لیکن ابھی تک آریا قوم کا دماغ تصوّرِ عاقبت سے محروم تھا۔ جب آریا گنگا کی وادیوں میں پہنچے تو عاقبت کا تصور بھی پیدا ہوا۔ ویدوں کے بعد "اُپانشاد" کا درجہ ہے جس میں عاقبت کا ذکر نظر آتا ہے۔ ویدوں میں عاقبت کی صرف دو صورتیں تھیں۔ مرنے کے بعد انسان یا تو اپنے "اجداد کی دُنیا میں" چلا جاتا تھا یا "مٹّی کے گھر" میں پہنچ کر ہمیشہ کے لئے مقیم ہو جاتا تھا۔

لیکن اُپانشاد میں دیگر صورتوں کا بھی ذکر ہے۔ جو انسان موت کے بعد اختیار کر سکتا تھا۔ یعنی مسئلہ تناسخ اپانشاد کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اصولِ تناسخ کی رُو سے صرف وہی لوگ اجداد کی دُنیا میں پہنچ سکتے تھے جنہوں نے اس دُنیا میں نیک اعمال کئے تھے۔ اجداد کی دُنیا کے بعد نیک اعمال لوگوں کا مقام "یاما کی جنّت" میں ہوتا تھا۔ بداعمال لوگ کیڑے مکوڑوں یا پرندوں کی صورت میں پھر پیدا کئے جاتے تھے۔

انسانوں کی طرح آریوں کے خدا بھی مرتے تھے۔ ایک اندرا کی جگہ دوسرا اندرا پیدا ہوتا تھا۔ گویا زندگی کے معاملے میں خداؤں اور انسانوں کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ خدائے لایزال کا تصوّر تک نہ تھا۔ آریوں کا دماغ

انسانی اور حیوانی زندگی کے مراحل سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ایسی ذہنیت کے لئے توحید کا تصوّر ناممکن تھا۔

ویدوں میں انسان کے ایک طبقے کا ذکر ہے۔ جو "منی" کے نام سے موسوم ہے۔ منی باد و باراں پر قادر ہوتا ہے۔ اور پرندوں اور دیوتاؤں کی طرح ہوا میں اُڑتا ہے۔ رہبانیت کا تصوّر منی کے تصوّر سے پیدا ہوا۔ عقیدہ یہ تھا کہ انسان میں طلسمی قوت اس وقت پیدا ہوسکتی جب وہ دُنیا کو ترک کر کے رہبان ہو جائے۔ برہمنوں کو تو طلسمی قوت شروع سے حاصل تھی لیکن غیر برہمن بھی یہ قوت دنیا کو ترک کر کے حاصل کر سکتے تھے۔ رہبانیت کا زور ۱۰۰۰ء قبل مسیح کے بعد شروع ہوا۔ جب قبیلوں کا خاتمہ ہوا۔ اور راجہ نمودار ہوئے یہ ایک قسم کا انقلاب تھا۔ جس سے بہت سے لوگ بددل اور مایوس ہو کر رہبانیت کی طرف راغب ہوئے۔

جب اُپانشادوں کی بدولت عاقبت کا تصوّر پیدا ہوا تو نجات کا مسئلہ بھی اُٹھا۔ نجات کا دار و مدار اعمال پر نہیں بلکہ خیال پر تھا۔ اچھے خیال سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے ہر وہ چیز جو خیال میں رخنہ پیدا کرے نجات سے انسان کو محروم کرتی ہے۔ اصل رخنہ نفس کے تقاضوں سے پیدا ہوتا ہے۔

آریوں کے دماغ میں عاقبت کا تصوّر تو آیا لیکن توحید کے تصوّر تک ان کا ذہن نہ پہنچ سکا۔ کثرتِ سامان میں وہ ایسے غرق ہو گئے کہ وحدت سے محروم ہو گئے۔ قدیم ہندو مذہب کو جس نے توحید سے محروم رکھا وہ برہمن تھے۔ توحید اور پجاری میں دشمنی ہوتی ہے۔ خدائے واحد کا ماننے والا پوجاریوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ جب برہمنوں کا تصرف حد سے گزر گیا

تو ہندو مذہب برہمنوں کا آلہ بن کر رہ گیا۔

ہر وید دو حصوں میں منقسم تھا۔ پہلا حصہ رسومات سے متعلق تھا۔ دوسرا حصہ علم سے متعلق تھا اور اُپانشاد کے نام سے موسوم تھا۔ جب برہمنوں کا زور ہوا تو انہوں نے اُپانشاد کا سہارا لیا اور اپنے حق میں اُپانشاد کی تاویلیں کر کے اپنی برتری ثابت کی، برہمنوں نے لفظ اُپانشاد کے معنی "مخفی تعلیم" بتائے۔ اس تاویل کی بدولت ویدوں اور اُپانشاد کا پڑھنا برہمنوں کے لئے مخصوص ہو گیا۔

برہمنوں نے اپنا سارا زور قربانی پر لگا دیا۔ یہ قربانی ہی اصل عبادت قرار دی گئی۔ برہمنوں نے اس قربانی کو دانستہ پیچیدہ بنایا تاکہ بجز اُن کے اور کوئی اس فرض کو نہ ادا کر سکے۔ جو مذہب رگ وید میں ہے۔ اس میں صلاحیت تھی کہ آگے چل کر وہ ہندوؤں کو توحید کے راستے پر ڈال دیتا۔ لیکن برہمنوں نے اس راستے کو مسدود کر دیا اور یہ مذہب توحید سے محروم ہو گیا۔ البیرونی جب ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ ہندوستان پہنچا تو اس کو قدیم ہندو مذہب میں اصل خدا کے چند نشانات نظر آئے جن کو برہمنوں نے ملیامیٹ کر دیا تھا۔ لیکن ہندوؤں کا دماغ تین خداؤں یعنی برہما اور شو میں ایسا پھنس گیا کہ توحید تک نہ پہنچ سکا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندو مذہب میں دیوتا ایسی کثرت سے پیدا ہو گئے کہ ان کے بوجھ سے ہندوؤں کا ذہن دب کر رہ گیا۔ اس صدی میں ہندوستان میں ایک قسم کی طوائف الملوکی تھی اور دیوتاؤں کی طرح راجہ بھی بکثرت تھے۔ ان میں سے ایک راجہ سدھودنا نامی کے گھر میں ایک فرزند ۵۶۰ء قبل مسیح تولد ہوا۔ جس نے بڑے ہو کر ان دیوتاؤں کے ہجوم پر غور د

خوض کرنا شروع کیا۔ راجہ سدھودنا کی ریاست علاقہ کپی لوستو میں تھی جو اب صوبہ بہار کا جزو ہے۔

بدھ مذہب بھی ذہنِ انسانی کو آزاد نہ کرسکا

گوتم بدھ ان معدودے چند اہلِ دل میں سے ہے جو سرزمین ہند سے ایک خاص مقصد لے کر اٹھے۔ یہ ایک راجہ کے گھر پیدا ہوا تھا۔ عیش و آرام میں بچپن گذرا۔ اس برگزیدہ ہستی کے جو حالات ہم تک پہنچے ہیں وہ اس کے عقیدت مندوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس عیش و آرام کے باوجود اس کا حساس دل انسان کی ضعیفی۔ بیماری اور موت سے اس حد تک متاثر ہوا کہ اس نے عیش و آرام ترک کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی اور اس کا ایک بچہ بھی تھا۔ اکیس سال کی عمر میں اس نے دنیا کو ترک کیا اور رات میں گھر سے چل پڑا پہلے وہ راج گیر پہنچا جہاں ایک اور راجہ کا راج تھا۔ وہاں سے وہ گیا شہر کے لئے روانہ ہوا۔

(حوالہ نمبر ۱۰) گیا میں اس نے پانچ چیلوں کے ساتھ رہبانیت اختیار کی اور ریاضت میں مصروف ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس کا بدن لاغر ہو گیا۔ اور ایک دن بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ یہ ریاضت چھ سال تک جاری رہی لیکن پھر بھی وہ حقیقت سے محروم رہا۔ بالآخر اس نے فقیری اختیار کی۔ اور بھیک پر گذارا کیا۔ اس کے پانچوں چیلوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ گوتم رہبانیت کو اب بے کار اور بے معنی سمجھتا تھا لیکن ہندو عقیدوں کے مطابق ترک دنیا نہایت اعلیٰ چیز سمجھی جاتی تھی۔ گوتم اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی چھ سالہ ریاضت اور رہبانیت" ایسی

بیکار سعی جیسا کہ ہوا میں گرہ لگانا ہوتا ہے۔"

اب وہ اُس برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا جو بدھوں کے عقیدے کے مطابق آج تک موجود ہے۔ اور جس کی پوُجا کی جاتی ہے۔ "یہاں مارا" یعنی ابلیس بمعہ اپنی فوج کے پہنچا اور گوتما کو ہر قسم کے لالچ دئے اور آخر میں اس ابلیس نے پتھروں کی بارش کی مگر یہ جویائے حقیقت ٹس سے مس نہ ہوا اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ "میں اس جگہ سے نہیں ہلوں گا جب تک مجھے حکمتِ کلّی حاصل نہ ہو جائے" دوسری رات اس کو یہ حکمت کلّی حاصل ہو گئی وہ اس طرح کہ "پہلی رات اس کو گذشتہ جنم کا پتہ چلا۔ دوسری رات اس کو اپنی موجودہ ہستی نظر آئی۔ تیسری رات اس کو علت و معلول کا سلسلہ نظر آیا اور صبح ہوتے ہی اس کو ہر چیز کا علم حاصل ہو گیا۔"

وہ حقیقتِ کُلّی جو اس کو نظر آئی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہستی مصیبتوں سے پُر ہے اور یہ مصیبتیں خواہشات نفس سے آتی ہیں اور خصوصاً زندہ رہنے کی خواہش سے۔ لہذا خواہشات پر قابو پانے سے مصیبت دُور ہو سکتی ہے۔ اور قابو پانے کے آٹھ راستے ہیں۔ جو چار صورتوں میں نظر آتے ہیں یعنی (۱) دُکھ (۲) سبب (۳) انسداد یعنی روک تھام (۴) طریقت یعنی راستہ"

(حوالہ نمبر ۱۱) ان چار صورتوں میں جو مصیبتیں نظر آتی ہیں ان پر آٹھ طریقوں سے قابو پایا جا سکتا ہے۔ وہ آٹھ طریقے یہ ہیں۔

(۱) صحیح نظر جس کو اختیار کر کے انسان معلوم کر سکتا ہے کہ بُرائی کیا چیز ہے۔ کس طرح بُرائی پیدا ہوتی ہے۔ کس طرح بُرائی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ اور ختم کرنے کا راستہ کون سا ہے۔

(۲) صحیح مقصد جس کو معلوم کر کے انسان خواہشات کو ترک کر سکتا ہے اور وہ دوسروں کے لئے بے ضرر بن جاتا ہے۔

(۳) صحیح گفتگو جس کو اختیار کر کے دروغ گوئی۔ غیبت اور بیکار گپ شپ سے انسان بری ہو جاتا ہے۔

(۴) صحیح عمل جس سے جیو ہتیا یعنی قتل، غصب اور شہوت سے انسان کو چھٹکارا مل جاتا ہے۔

(۵) صحیح زندگی بسر کرنا یعنی نامناسب چیزوں سے گریز کرنا اور مناسب طریقوں سے روزی حاصل کرنا۔

(۶) صحیح جہد و کوشش جس سے انسان فسق و فجور سے محفوظ ہو جاتا ہے اور جد و جہد کرتا ہے۔ اور فسق و فجور کو دُور کرتا ہے۔

(۷) صحیح فکر و نظر جس سے انسان اپنے جسم پر قابو پاتا ہے اور اپنے میں صحیح جذبات پیدا کرتا ہے اور حرص و ہوس اور نا اُمیدی پر فتح پاتا ہے۔

(۸) صحیح مراقبہ جو انسان کو خواہشاتِ نفسانی سے چھٹکارا دیتا ہے۔ قوتِ ارادی پیدا ہوتی ہے۔ دماغ میں توازن پیدا ہوتا ہے اور رنج و راحت سے انسان مستغنی ہو جاتا ہے۔

گوتم بُدھ کی تعلیمات جو ہم تک پہنچی ہیں ان میں دیوتاؤں کا ذکر مطلق نظر نہیں آتا جس سے ظاہر ہے کہ وہ بُتوں اور ان کی پرستش کے خلاف تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس کی تعلیمات میں کسی خدا کا ذکر نہیں جس سے اکثر لوگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ وہ توحید سے بھی نا آشنا رہا بلکہ وہ خدا کا منکر تھا۔ اور عاقبت کا صرف اس حد تک قائل تھا کہ انسان بعد موت مختلف صورتوں میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔ یعنی اس کا عقیدہ عاقبت

صرف تناسخ تک محدود تھا۔ اس معاملے میں حامیان اور مخالفین بدھ مت میں سخت اختلاف ہے۔ بعض اہلِ مغرب اس مذہب کے شائق محض اس لئے ہیں کہ یہ خدا کے تصور سے مبرّا ہے۔ حامی یہ کہتے ہیں کہ خدا کا تصور گوتم کے زمانے میں موجود تھا۔ اس لئے اس نے خدا کا تذکرہ نہیں کیا بقول مسز رہیس ڈیوس " بدھا کے زمانے میں تعلیم یافتہ لوگ خدا کے قائل تھے اور مانتے تھے کہ خدا انسانی ذہن میں موجود ہے " لیکن یہ دلیل قابل قبول نہیں۔

بیشک گوتم بت پرستی اور معبودوں کی کثرت کے خلاف تھا لیکن اس کا دماغ توحید تک نہ پہنچ سکا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے حامیوں نے اس کو خود خدا بنا دیا اور اس کی پرستش شروع ہو گئی۔ لیکن اہل ہند جو متعدد معبودوں کو مانتے تھے اس نئے معبود کے خلاف ہو گئے۔ شہنشاہ اشوک گوتم کا اس درجے معتقد تھا کہ اس نے بدھ مت کی اشاعت کے لئے مصر تک مبلغ بھیجے۔ اور اس کو سرکاری مذہب قرار دیا۔ جو بالآخر ہندوستان سے اس مذہب کے اخراج کا باعث ہوا۔ جنوبی ہند سے اس کے خلاف تحریک اٹھی جس کا سربراہ ایک شخص تھا جو اپنے آپ کو "شنکر اچاریہ" کہتا تھا۔

شہنشاہ اشوک (عہد از ۲۷۳ء تا ۲۳۲ء قبل مسیح) کے زمانے میں یہ مذہب پورے ہندوستان پر چھا گیا۔ لیکن اس کی وفات کے بعد اور موریہ خاندان کی تباہی کے بعد اس مذہب کی مخالفت بڑھتی گئی۔ اس عرصے میں ہندو مذہب کی بھی اصلاح ہوئی اور نویں صدی عیسوی میں بدھ مت ہندوستان سے بالکل جلا وطن ہو گیا۔ لیکن ہندو مذہب کی اصلاح برائے نام تھی۔ دیوتاؤں کا راج برابر قائم رہا۔ بلکہ بدھ مت کی صورت بھی اثر صحبت سے مسخ ہو گئی۔

اس مسخ شدہ بدھ مت نے چین میں پہنچ کر اہلِ چین کو جو فہم و فراست میں مشہور تھے بُت پرست بنا دیا۔ یہ اہلِ ہند کی "برکت" تھی جس سے بدھ مت میں اصنام پرستی داخل ہوئی۔ یہ مذہب آج تک بُت پرستی میں مُبتلا ہے۔ اور توحید سے نا آشنا ہے۔ ہندوستان سے جلا وطن ہونے کے بعد بدھ مت نے علاقہ ماوراالنہر میں پناہ لی جہاں شہر بلخ میں ایک دیر اور مندر قائم ہوا۔ جس کا مہا پوجاری کا عہدہ خاندان برمک میں موروثی ہو چکا تھا۔ یہ شہر اس زمانے میں "نوبہار" کہلاتا تھا۔

ماوراالنہر میں پہنچ کر گوتم کے متعدد بت تراشے گئے جو گندھاری فن کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس فن کا مرکز گندھارا تھا جو اب قندھار کے نام سے موسوم ہے۔ جب مسلمان شروع دورِ بنی اُمیہ میں اس علاقے میں پہنچے تو اُن کو بھی مسخ شدہ بدھ مت ملا۔ یہ پہلا موقع تھا جب مسلمان اس مذہب سے دوچار ہوئے۔ اسی زمانے میں اس علاقے میں مذہب اسلام کی اشاعت شروع ہوئی اور چند عرب قبیلے یہاں بس گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایران کا علاقہ خراسان بھی بدھ مذہب سے متاثر تھا۔ جہاں تصوّف شروع ہوا۔ اور بالآخر مسلمان بھی اس تصوف سے متاثر ہوئے۔ لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ تصوف میں جو مسئلہ "وحدت الوجود" کے نام سے ہے وہ بقول مغربی محققین اسی بدھ مذہب کا شاخسانہ ہے۔

بہرکیف بوقت آمدِ اسلام پوری مہذّب دُنیا اصل توحید سے محروم ہو چکی تھی۔ جو مذاہب یعنی یہودیت اور عیسائیت جو پیغام توحید لے کر ذہنِ انسانی کو آزاد کرنے آئے تھے وہ مسخ ہو چکے تھے اور

دُنیا کے ہر گوشے میں بُتوں کا راج تھا اور ذہنِ انسانی بُری طرح مقید تھا۔

غیر الہامی مذاہب اب تک میں نے صرف الہامی مذاہب کا تذکرہ کیا ہے۔ کیا میں غیر الہامی مذاہب کو قابلِ تذکرہ نہیں سمجھتی؟ میں مذہب کے معاملے میں صرف تذکرہ نگار ہوں۔ مذاہب کے برحق یا باطل ہونے کا فیصلہ میرے بس کا روگ نہیں کیونکہ اس قسم کا فیصلہ صرف قیاس پر مبنی ہوتا ہے اور قیاس آرائی فلسفیوں کے سپرد ہے۔ میری نظر میں الہامی اور غیر الہامی مذاہب دونوں انسانی ذہن کے کارنامے ہیں اور ہر چیز جو انسان سے تعلق رکھتی ہے اس کا تذکرہ کرنا میرے فرائض میں داخل ہے۔

میں نے اپنے تذکرے کے لئے الہامی مذاہب کو اس لئے منتخب کیا کہ جو انقلاب اس قسم کے مذاہب نے پیدا کئے وہ بڑے دُور رس تھے ان کے نتائج آج تک کارفرما ہیں۔ برعکس اس کے غیر الہامی مذاہب اصولِ توحید سے نہیں بلکہ ارتقائی صورت میں آہستہ آہستہ نمودار ہوئے۔ اس قسم کے مذاہب اصولِ توحید سے محروم رہے۔ اہلِ عقیدہ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ الہامی مذاہب خدا کے فرستادہ ہیں۔ اور دوسرے قسم کے مذاہب انسانی ذہن سے نکلے۔ اور اس لئے منزلِ توحید تک نہ پہنچ سکے۔ اور اسی لئے الہامی مذاہب کے مقابلے کی تاب نہ لا سکے۔

گویا الہامی مذاہب تمدن و تہذیب کے حامل ہیں۔ اور غیر الہامی مذاہب انسان کے ایامِ وحشت کا مظہر ہیں۔ میرا تعلق چونکہ بیشتر تہذیب و تمدّن سے ہے جس سے میرے صحیفے پُر ہیں۔ اس لئے میں ایسے مذاہب کا تذکرہ مقدم سمجھتی ہوں۔ اس کے علاوہ جو جوش و خروش الہامی مذاہب میں

پایا جاتا ہے اس سے غیر الہامی مذاہب خالی نظر آتے ہیں۔ جن کا کوئی مخصوص بانی نہ تھا۔ انسان ہمیشہ اپنے ہم جنس کی "شخصیت" سے جتنا متاثر ہوتا ہے اتنا وہ اشیا سے متاثر نہیں ہوتا۔ الہامی مذاہب ایسی ہستی کا ذکر کرتے ہیں۔ جس سے انسان سوچ بچار میں پڑ جاتا ہے اور اپنے نفس کو بھول جاتا ہے۔ غیر الہامی مذاہب صرف اشیاء کا ذکر کرتے ہیں جن کی وقعت انسان کی نظر میں کچھ نہیں ۔ انسان جتنا رمز سے متاثر ہو جاتا ہے اتنا کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتا۔ رموز کو حل کرنے کی کوشش سے انسان میں تحقیق کا مادہ پیدا ہوا۔

توحید بھی ایک قسم کا رمز ہے لیکن اس رمز میں حکمت بھی شامل ہے۔ توحید کا قائل جستجو پسند ہوتا ہے۔ یونانیوں کا فلسفہ اس وقت پختہ ہوا جب سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے حکماء اُٹھے اور اپنی قوم کو رموزِ توحید سے آشنا کیا۔ اس طرح یونان میں فلسفہ رائج ہوا جو آگے چل کر سائنس میں تبدیل ہو گیا۔ مسلمانوں میں بھی بو علی سینا (سنہ ۹۸۰ تا سنہ ۱۰۷۳) جیسے فلسفی توحید کی بدولت پیدا ہوئے۔ پرستار توحید کا ذہن توہمات سے مبرّا ہوتا ہے۔ اور اس لئے وہ تحقیق کر سکتا ہے۔

مغرب میں بھی جب انسانی ذہن دورِ نشاۃ ثانیہ میں فلسفۂ یونان کی بدولت آزاد ہوا تو وہ دورِ تحقیق شروع ہوا جس کی بدولت اہلِ مغرب نے نئی نئی ایجادیں کیں۔ قرونِ وسطیٰ میں انھیں اہلِ مغرب کا ذہن مذہبِ عیسوی کے مسخ ہو جانے سے مقید ہو گیا تھا۔ اس عہد میں جدّت اور تحقیق مسلمانوں کا قدم چومتی تھی۔ کیونکہ ان کا ذہن توحید کی بدولت توہمات سے آزاد تھا۔ جب انسان رمزِ توحید کی

تحقیقات کرتا ہے تو اس کے ذہن کے سامنے نئے نئے دروازے کھل جاتے ہیں ایک دروازے سے نکل کر محقق دوسرا دروازہ کھولتا ہے۔

الغرض توحید کی بدولت انسان محقق ہو جاتا ہے۔ ذہن انسانی جملہ قیود سے آزاد رہتا ہے۔ بت پرستی انسانی ذہن کو مقلد بنا دیتی ہے۔ توحید اسی ذہن کو محقق کر دیتی ہے۔ بقول مولانا روم :۔

نوحہ گر باشد مقلد در حدیث جز طمع نبود مراد آں خبیث

از مقلد تا محقق فرقہا ست کایں چو داؤد است واں دیگر صدا ست

(مقلد کی باتوں سے نوحہ گری ٹپکتی ہے۔ مقلد کی مراد صرف طمع اور لالچ ہوتی ہے)

(مقلد اور محقق میں بڑا فرق ہے۔ محقق کے دل میں داؤد کی سی لگن ہوتی ہے۔ مقلد صرف آواز پر چلتا ہے۔)

محقق اہلِ دل ہوتا ہے اور اس کی نظرِ تحقیق ہر چیز پر پڑتی ہے :۔

نطقِ آب و نطقِ خاک و نطقِ گِل ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

(محقق کا دل ایسا حساس ہو جاتا ہے کہ وہ پانی، خاک اور مٹی کی صدا بھی سنتا ہے)

توحید اور اس کی نوعیت

میری نظر میں انبیاء کی تعلیمات کا سب سے روشن پہلو ان کا پیغامِ آزادی ہے جو انہوں نے ذہنِ انسانی کو آزاد کرنے کی خاطر دیا۔ ہر الہامی مذہب نے توحید کی تلقین کی۔ توحید کیا کرتی ہے؟ وہ انسان کے ذہن کی تمام بیڑیوں کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے۔ بغیر توحید انسانی ذہن سینکڑوں معبودوں کی بیڑیوں میں گرفتار رہتا ہے۔ توحید صرف ایک بڑی

قائم رکھتی ہے۔ اور وہ بھی ایسے خدا کی جو (بقول مولانا روم) کہتا ہے کہ

من نہ کردم خلق تا سُودے کُنم — بلکہ تا بر بندگان جُودے کنم

(میں نے مخلوق کو اس لئے نہیں پیدا کیا کہ میں اس سے کوئی فائدہ اٹھاؤں بلکہ میں نے اس کو اس لئے پیدا کیا کہ میں اس پر جود و کرم کی بارش کروں)

من نہ گردم پاک از تسبیح شاں — پاک ہم ایشاں شوند و دُر فشاں

(میں اپنی مخلوق کی عبادت سے پاک نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ خود پاک ہو کر ایک دوسرے کے لئے دُر فشاں یعنی کارآمد ہو جاتے ہیں۔)

اصنام پرستوں کے معبود انسان کو بیڑیوں میں گرفتار کر کے خوش ہوتے ہیں کیونکہ ان کو قربانی ملتی ہے۔ جو دراصل پوجاریوں کے پیٹ میں جاتی ہے۔ لیکن توحید پر مبنی مذاہب خدا کو "بے نیاز" قرار دیتے ہیں۔ اس لئے ایسا خدا کسی کی آزادی کو سلب کرنا کس طرح پسند کر سکتا ہے۔ ایسے مذاہب کے مقرر کردہ فرائض سب اس طرح کے ہیں جن سے بالآخر انسان ہی مستفید ہوتا ہے۔ انسان اپنے ہم جنسوں کی خدمت پر لگ جاتا ہے۔ اس خدمت کا بہترین نمونہ انبیاء کی خدمات ہیں۔

موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی خدمات کا جو حشر ہوا اس کا حال آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس طرح زرتشت اور گوتم بدھ کی خدمات بھی انسان کی ہٹ دھرمی کے نذر ہوئیں۔ اور انسان پھر اسی جگہ واپس لوٹ آیا جہاں اس نے اپنا "ذہنی سفر" شروع کیا تھا۔ علاقۂ حجاز باوجود علاقۂ فلسطین سے نزدیک ہونے کے ان ذہنی مسافروں کے سفر سے باہر رہا۔ حتیٰ کہ بقول حالیؔ:۔

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت — بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت

ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت — چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

آمدِ اسلام اسلام کی یکایک آمد اور اس کی فوری کامیابی ایسا مسئلہ ہے جس کو انسانی عقل حل نہیں کر سکتی۔ اہلِ عقل اسلام کی کامیابی کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ عربوں کی تمام قوتیں صدیوں سے معطل مگر محفوظ تھیں۔ اور ان کی صلاحیتیں سو رہی تھیں کہ یکایک یہ لوگ محض ایک آواز پر بیدار ہوئے۔ لیکن کیا یہ دلیل از روئے عقل قابلِ قبول ہے؟ اگر وہ محض ایک آواز سے بیدار ہوئے تو یہ آواز کیا تھی اور آواز دینے والا کس قسم کا انسان تھا کہ یکایک یہ لوگ جن کو قوم کا لقب بھی نہیں دیا جا سکتا اپنے خوابِ گراں سے بیدار ہوئے اور ایسے بیدار ہوئے کہ میرا رُخ ہی بدل دیا۔

میں تقدیر کی مخالف رہی ہوں لیکن میری مخالفت مصلحت پر مبنی رہی ہے اصلیت پر نہیں۔ تقدیر و تدبیر کے مسئلے کو میں بالتفصیل بیان کر چکی ہوں۔ اور یہ بھی بتا چکی ہوں کہ میں تقدیر کی مخالفت اس لئے کرتی رہی ہوں کہ تقدیر کا قائل ہو کر انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ جب انسان تقدیر کا قائل ہو کر بیٹھ جاتا ہے تو میرے صحیفوں کے لئے واقعات بھی محدود اور مسدود ہو جاتے ہیں اس لئے میری خواہش ہے کہ انسان برابر تدبیر کا قائل رہے تاکہ اس کی جد و جہد سے میرے صحیفوں کے لئے واقعات دستیاب ہوتے رہیں۔

مگر تقدیر سے منکر ہو کر میں اسلام کی کامیابی کا راز نہیں بتا سکتی۔ یہاں مجھے تقدیر کا قائل ہونا پڑتا ہے اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلام کی کامیابی کا راز اس کے پیغام اور اس کے پیغام بر میں مضمر ہے۔ اور یہ دونوں اسی ذاتِ واحد کے پیدا کردہ ہیں جس کی توحید کی تلقین کے لئے پیغام اور پیغام بر دونوں آئے۔ گویا ان دونوں کی آمد نوشتۂ تقدیر

میں تھی ورنہ وہ عرب جس پر بقول حالی صدیوں سے جہل چھایا ہوا تھا کس طرح یکایک بیدار ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں حالی نے جو نقشہ عرب کا پیش کیا ہے وہ قابلِ نقل ہے لیکن یہ نقل پیش کرنے سے پہلے میں اس الزام کا ذکر کرتی ہوں جو مجھ پر لگایا جاتا ہے کہ میں اس سرزمین کو بالکل بھلا بیٹھی۔ یہ الزام بے شک صحیح ہے۔ لیکن میں وہاں آخر کیوں جاتی؟ جہاں:۔

آمدِ اسلام سے پہلے عرب کی حالت

زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں
لوؤں کی لپٹ بادِ صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیاباں!
کھجوروں کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں!
نہ کھیتوں میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کل کائنات اس کی یہ تھی

کیا میں محض عرب قبیلوں کی جنگوں کا حال لکھنے کے لئے جاتی؟ اس قسم کی قبائلانہ جنگوں کے حال سے میرے صحیفے یونانیوں کے زمانے ہی میں پُر ہو چکے تھے۔ ہومر کی رزمیہ نظمیں ایسی دلکش تھیں کہ ان کے سامنے عرب وحشیوں کی رجزیہ شاعری ٹھہر نہیں سکتی تھی۔ میں نے باوجود فراعنہ کے دعوائے خدائی کے صدیوں مصر میں قیام کیا۔ اگرچہ میرے صحیفے بیشتر خالی رہے۔ یہاں میں نے اپنے دورانِ قیام ساز و سامان جمع کیا۔ یہ ساز و سامان میری خاطر فرعونوں کی قبروں میں دفن کر کے محفوظ کر دیا گیا۔ اس ساز و سامان کا ذکر باب بعنوان "میرا ساز و سامان اور اس کی تباہی" کے تحت میں کر چکی ہوں۔

اہلِ عرب باوجود قربت مصر کی روشنی فنون سے بھی ناآشنا تھے بقول حالی عرب ملک کا یہ حال تھا کہ

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی | نہ یونان کے علم وفن کی خبر تھی!
وہی اپنی فطرت پر طبع بشر تھی | خدا کی زمیں بن جتے سر بسر تھی

پہاڑ اور صحرا میں ڈیرا تھا اُن کا
تلے آسمان کے بسیرا تھا اُن کا!

ایسی قوم رمز توحید کو کس طرح سمجھ سکتی تھی جب اس کا ذہن عناصر پرستی میں مقید تھا۔

کہیں آگ بجتی تھی واں بے محابا | کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا
بہت سے تھے تثلیث پر دل سے شیدا | بتوں کا عمل سُو بہ سُو جا بجا تھا۔

کرشموں کا راہب کے تھا صید کوئی
طلسموں میں کاہن کے تھا قید کوئی

حالی نے جس طرح عرب اور اس کے باشندوں کی ذہنی حالت کو بیان کیا ہے اس طرح کوئی مورخ بھی بیان نہیں کر سکتا۔ حالی کا یہ بیان مبالغے سے مبرا ہے :۔

قبیلے قبیلے کا بُت اِک جدا تھا | کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عُزا پہ وہ نائلہ پر فدا تھا | اسی طرح گھر گھر نیا ایک خدا تھا

نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہرِ انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ | ہر ایک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ | نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ !

وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے | سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے | تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے

بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

عربوں کے ماضی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ قوم اپنے ماضی کے فخر و مباہات پر جان دیتی تھی۔ ہر قبیلہ اپنے آپ کو افضل سمجھتا تھا۔

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی | صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی | تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی

نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا | کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لبِ جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا | کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یوں ہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یوں ہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

ابوجہل اور ابوجہلیت کا راج

مسلمان ابوجہل کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن ابوجہلیت کے معنی پر زور نہیں دیتے۔ سب سے زیادہ سبق آموز یہی ابوجہلیت ہے۔ اگر مسلمانانِ ہند ابوجہلیت کے راز سے واقف ہوتے تو وہ سرسیّد کو کافر نہ ٹھہراتے۔ ہر نبی کو اپنے زمانے میں ابوجہل کا مقابلہ کرنا پڑا۔ حضرت ابراہیمؑ کے لئے نمرود ابوجہل تھا۔

حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں فرعون نے ابوجہل کا کام کیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں یہودی فقیہہ اور فریسی ابوجہل کے لباس میں نمودار ہوئے۔ بانیٔ اسلام کو جس ابوجہل سے دوچار ہونا پڑا وہ عربوں کے اعتقادات کا نمونہ اور عربوں کے سماج کا آئینہ تھا۔ اس سماج کی نوعیت کیا تھی؟ وہ صرف بُتوں ہی کی پرستش نہیں بلکہ بادوباراں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ سب سے وحشیانہ رسم اس سماج کی جو تھی اس کا حال حالی کی زبانی سنئے:۔

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر — تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور — کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جاکر

وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جُوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی — شراب اُن کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا غفلت تھی دیوانگی تھی — غرض ہر طرح ان کی حالت بُری تھی

بہت اس طرح ان کی گذری تھیں صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پہ تھیں بدیاں

عربوں کی یہ ذہنیت میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ دُنیا کی ہر قوم آمدِ توحید سے پہلے اس ذہنیت کا شکار رہی ہے۔ ایسی قوم اپنے اعتقادات کو عقلِ کُل سمجھتی ہے کیونکہ ان کے ذہن میں تبدیلیٔ زمانے کا تصوّر بالکل نہیں ہوتا۔ نبی تبدیلی کا پیغام لے کر آتا ہے۔ اس کی دُور بین نظر دیکھ لیتی ہے کہ

ہر زماں مبدل شود چوں نقشِ جاں — نو بہ نو بنید جہانے در عیاں
(مولانا روم)

(جس کی نظر بلند ہو جاتی ہے اس کو ہر چیز ہر وقت بدلتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے سامنے ہر وقت ایک نئی دُنیا رہتی ہے)۔

مسئلہ تجدید عالم کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو رائج الوقت عقیدوں اور تعصبات سے بری ہو۔ لیکن خالی الذہن ہونا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ عوام ہمیشہ رائج الوقت عقائد کے حق میں ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہر نبی کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ عوام کی تادیب قہر سلطانی سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ مجدد کو قدم قدم پر لعن طعن سُننی پڑتی ہے۔ عوام میں مقبولیت عزت و شہرت کا باعث ہوتی ہے۔ لیکن نبی اس بات کا قائل ہوتا ہے کہ

پیشِ خلقاں خوار و زار و ریش خند　　پیشِ حق محبوب و مطلوب و پسند

(میں اس دُنیا کے لوگوں کے سامنے ذلیل و خوار سہی لیکن اللہ کے سامنے میں مطلوب اور پسندیدہ ہوں۔)

دُنیا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو حال کی مقبولیت کو آئندہ کی پسندیدگی کی خاطر قربان کر دیں عقل تو یہ مشورہ دیتی ہے کہ "جو بن جائے وہی موتی ہے"۔ لیکن انبیاء کی عقل دوسرے قسم کی ہوتی ہے۔ جو توحید کی بدولت ان کے ہاتھ آتی ہے وہ عقل آئندہ کی بہتری پر نظر رکھتی ہے۔ آج کل کی اصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ "ضمیر" انسان کو حق بینی اور حق گوئی پر آمادہ کرتی ہے لیکن ابوجہل کے پاس بھی ضمیر تھا مگر اس کا ضمیر حق بینی سے محروم تھا اور اس کی نظر اس کو بتاتی تھی کہ رائج الوقت عقائد ہی حق ہیں اور ہر نئی بات کفر ہے۔

ابوجہل کو یہ مغالطہ کیوں ہوا؟ کیونکہ وہ اور اس کی قوم بجائے حق کے میری پرستش کرتی تھی اور اس لئے اس کی نظر مستقبل کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے اپنی پرستش کے بُرے نتائج باب بعنوان "میری وصیت"

کے تحت بتائے ہیں اور اپنے شیدائیوں کو آگاہ کیا ہے کہ ماضی کی پرستش انسان کو مستقبل سے غافل کر دیتی ہے۔ ہندو کس طرح مستقبل سے غافل تھے۔ اور ماضی کی پوجا یعنی میری پرستش کرتے تھے۔ اس کا ذکر میں نے تفصیل کے ساتھ اپنی وصیت کے تحت کیا ہے۔

ہر الہامی مذہب نے کوشش کی کہ انسان ماضی کے پنجوں سے آزاد ہو تاکہ مستقبل پر غور کر سکے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ماضی کو جلانے کی خاطر آگ میں کودنا پسند کیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے یہودیوں کی قدیم یعنی ماضی کی رسومات پر لعن طعن کی اور فقیہوں اور فریسیوں کو اس لئے بُرا کہا کہ وہ ماضی کے پنجوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

بانیٔ اسلامؐ نے زمانۂ قبل از اسلام یعنی عربوں کے ماضی کو "زمانۂ جاہلیت" کا لقب دیا۔ اور اس کی رسومات کے متعلق کہا کہ "یہ میرے پیروں کے نیچے ہیں"۔ بانیٔ اسلام نے جس طرح صاف صاف عربوں کا تعلق ماضی سے توڑا اس کی مثال کم ملتی ہے۔ خطبہ جو "حجۃ الوداع" کے نام سے موسوم ہے اس کا موضوع یہی تھا۔ حضرت عیسیٰ کے تمام خطبات کا خلاصہ بھی یہی تھا۔ آئندہ زمانے کے بہتر ہونے کی بشارت ہر نبی دیتا ہے۔

جن صاف لفظوں میں بانیٔ اسلام نے مستقبل کے بہتر ہونے کی بشارت دی ہے اس کی مثال بھی کم ملتی ہے۔ بقول شاہ ولی اللہؒ اس دوربین نبی نے کہا:۔ (حوالہ نمبر ۱۲)

> "میری اُمّت کی صفت بارش کی سی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ پہلی بارش اچھی ہے یا آخر کی"۔ اس کی وضاحت ایک اور حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپؐ نے صحابہؓ سے

مخاطب ہو کر فرمایا :—

"تم میرے صحابہ ہو اور میرے بھائی وہ ہیں جو میرے بعد آئیں گے" اس سے زیادہ مستقبل کے متعلق بشارت اور کیا ہو سکتی ہے۔

الغرض توحید پر مبنی مذاہب آئندہ کو دیکھتے ہیں اور پیچھے مڑ کر ماضی کو نہیں دیکھتے۔ غیر الہامی مذاہب توحید سے محروم تھے اس لئے پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتے تھے اور ماضی پرستی کی تلقین کرتے تھے۔ الہامی مذاہب کے بانی جانتے تھے کہ وہ ایک نئے زمانے کی ابتدا کر رہے ہیں۔ وہ زمانے کی تبدیلی کے فلسفے سے خوب واقف ہوتے تھے۔ تبدیلیٔ زمانہ کے متعلق شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ "اس کی وجہ یہی ہے کہ مختلف اعتبارات اور مختلف وجہیں ہر زمانے میں موجود ہوا کرتی ہیں"

ہر نبی کو تعصّب سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ابو جہل تعصّب کا نمونہ تھا اور تعصّب میں اس بُری طرح غرق تھا۔ یعنی ماضی کے پھندوں میں اس طرح پھنسا ہوا تھا کہ وہ مشاہدۂ حق سے محروم رہا۔ چونکہ بانیٔ اسلام کی پیش کردہ حقیقت اس کے لئے نئی تھی۔ اس لئے وہ اس حقیقت سے محروم رہا اور بالآخر اسلام نے اس کے سماج کو روند ڈالا۔ یہی حشر ہندوؤں کا ہوا۔ وہ وہ بھی ماضی کے جال میں اس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ وہ مستقبل کو نہ دیکھ سکے۔ اور بالآخر تازہ دم مسلمانوں کے ہاتھوں یہ پرستارانِ ماضی سرنگوں ہو گئے۔ اور کم از کم پانچ سو سال تک اسی طرح سرنگوں رہے۔ اقبال نے اسی خیال کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے

سرزمین یورپ میں سب سے زیادہ ماضی پرست قوم انگریز ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزوں کا سامراج اسی لئے ختم ہوا۔ یورپ میں صرف روس ہے جس نے اپنے ماضی سے رشتہ توڑنے کی کوشش کی۔ روسیوں کے لئے ایام سرمایہ داری ایام جاہلیہ ہیں۔ چنانچہ اس قوم نے ماضی کے پھندوں سے رہا ہو کر جو ترقی کی وہ حیرت انگیز ہے۔ دُوسری مثال چین کی ہے۔ یہ قوم "غلام تاریخ" سمجھی جاتی تھی۔ اس قوم نے بھی اس غلامی سے ۱۹۴۹ء میں رہا ہو کر گذشتہ پندرہ سال میں جو ترقی کی ہے وہ بے نظیر ہے اب اس ماضی پرست ملک نے ایٹم بمب بھی بنا لیا۔

البتہ فلسفیوں کا ایک ایسا طبقہ بھی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ "ماضی کو مٹایا نہیں جا سکتا"، یعنی ماضی کے اثرات کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتے ہیں لیکن ماضی کے اثرات باقی رہنے اور ماضی کی غلامی میں بہت بڑا فرق ہے۔ اثرات رفتہ رفتہ مٹائے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ نئے پیغام کے متعلق لوگوں کو یقین ہو جائے کہ اس کے پیغام بر میں وہ صلاحیتیں ہیں جن سے وہ ماضی پر غالب ہو سکتا ہے۔ اب آپ اس نئے پیغام بر کی شخصیت بھی دیکھئے اور وہ ماحول بھی دیکھئے جو اس بانیٔ اسلامؐ نے قائم کیا۔

اب تک میں نے آپ کو صرف عربوں کے سماج کا حال بتایا ہے کہ کس طرح اس قوم پر ابوجہل اور اس کی ابوجہلیت غالب تھی جس سے اس قوم کا دماغ معطل ہو گیا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں بتا چکی ہوں کہ کسی نئے پیغام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ

اوّل۔ وہ پیغام ایسا روح افزا ہو کہ وہ صدیوں کی غفلت پر غالب آجائے۔

دوم۔ پیغام بر ایسی شخصیت رکھتا ہو کہ اس پیغام میں جان ڈال دے۔
بعض فلسفی تو یہ کہتے ہیں کہ :۔

بادہ از ما ست شد نے ما از و   قالب از ما ہست شد نے ما از و

(شراب میں نشہ نہیں ہوتا بلکہ نشے کا مادّہ پینے والے میں ہوتا ہے۔ قالب خود بخود نہیں بنتا بلکہ قالب کے ڈھالنے کی قابلیت انسان کی مرضی میں مضمر ہے)۔

پیغام توحید کوئی نئی چیز نہ تھی۔ ہر الہامی مذہب کا بانی یہی پیغام لے کر آیا لیکن آپ دیکھ چکے ہیں کہ یہ توحید بعد وفاتِ بانی کس طرح مسخ ہوتی رہی۔ لیکن توحید اسلام باوجود تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال گزر جانے کے آج تک زندہ ہے۔ اگر صرف توحید بذاتِ خود کارگر ہوتی تو وہ اس طرح مسخ نہ ہوتی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہیں کہ توحیدِ اسلام میں بانئِ اسلام کی شخصیت بھی شامل تھی۔ عیسائیت کا پیش کردہ پیغام توحید اس لئے مسخ ہوا کہ حضرت عیسیٰ اپنے زمانے کے ماحول کو پوری طرح نہ بدل سکے۔ حضرت مذکور رومیوں کے عہد میں پیدا ہوئے اور اسی عہد میں انہوں نے وفات پائی۔ بعد وفات تقریباً تین سو سال تک رومی حکومت قائم رہی اور مذہب عیسوی پوشیدہ رہا۔ اسی دوران "پوشیدگی" میں اس مذہب کی پیش کردہ توحید مسخ ہوئی۔ شہنشاہ قسطنطین اول (۳۰۶ء تا ۳۳۷ء) کے عہد میں یہ مذہب برسرِ بام آیا جب اس شہنشاہ نے اس مذہب کو برملا سرکاری مذہب بنایا لیکن تب بھی مذہب عیسوی کو محض ایک ایسی حکومت حاصل ہوئی جو رومیوں کی اصنام پرستی سے مغلوب تھی۔ رومی قوانین رائج تھے جو بت پرستی کے ماحول میں بنائے گئے تھے۔

ایسے قانونِ توحید کی حفاظت کس طرح کر سکتے۔

اس کے برعکس توحیدِ اسلام نے ایسے ماحول میں پرورش پائی جو خود بانیِ توحید کا پیدا کردہ تھا۔ کیونکہ اس بانی نے صرف نیا مذہب ہی قائم نہ کیا بلکہ نئی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ یہ نئی حکومت صرف توحید ہی کی خاطر قائم کی گئی۔ اس لئے یہ حکومت توحید کے لئے سازگار ثابت ہوئی خلفائے راشدہ کے زمانے میں توحید ایسی پختہ ہوگئی کہ آج تک قائم ہے۔ خوش نصیبی سے اسلام کو یکے بعد دیگرے ایسے علمبردار ملتے رہے کہ انہوں نے توحید کو ختم نہ ہونے دیا۔ بقول شاعر۔

"پاسباں مل گئے کعبہ کو کلیساؤں سے"

بانیٔ اسلامؐ کی شخصیت

اب اس بانیٔ اسلامؐ کی شخصیت کا حال بھی سُنیئے۔ یہ پیغمبرِ توحید ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب میرے صحیفے نوشتہ کی صورت میں رونما ہو چکے تھے۔ انبیائے یہود کے کارنامے عرصۂ دراز تک صرف سینہ بہ سینہ چلے لیکن پیغمبر اسلام کے افعال واقوال قلم بند کئے گئے جو آج تک محفوظ ہیں۔ گویا بانیٔ اسلامؐ کے اعمال وافعال مخفی نہیں اور ہر تاریخ میں درج ہیں۔

ان کے اقوال وافعال سے جو چیز خاص طور سے نمایاں ہے وہ ان کی انکساری ہے۔ ہمیشہ انہوں نے اپنے آپ کو پہلے انسان کہا اور اس کے بعد رسول بحیثیت انسان انہوں نے خدمتِ انسانی کی تلقین کی۔ یتیموں اور بیواؤں کی خاص طور سے خدمت کی۔ جب کفّار مغلوب ہوئے تو ان میں سے بیشتر کو معاف کر دیا۔ خدمت اور قناعت کی مثال خود قائم کی۔ نبوت سے پہلے اپنی دیانت داری سے اپنے ہم وطنوں سے

"امین" کا لقب حاصل کیا۔ بعد وفات ان کی شان میں بے شمار نعتیں لکھی گئیں جن میں بیشتر ان کے نبوت کے پہلو پر زور دیا گیا۔ ان کے پہلوئے انسانیت کو نظر انداز کیا گیا۔ حالانکہ انسانوں کے لئے یہ پہلوئے انسانیت ہی سبق آموز ہوتا ہے۔ حالیؔ پہلا اردو شاعر ہے جس نے اپنے نبی کو بحیثیت انسان پیش کیا۔ مبالغے سے گریز کیا۔ اس نے جو کچھ اپنے نبی کی بابت کہا وہ اس نبی کے افعال و اعمال سے ثابت ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہے کہ بہ نسبت اور انبیاء کے اس نبی سے سب سے کم معجزے منسوب کئے گئے۔ ان کا سب سے بڑا معجزہ یہ تھا کہ عرب جیسی ضدی اور ہٹ دھرم قوم کے لوگوں کو چند سالوں میں اپنا ہم خیال بنا لیا۔ جو لوگ فطرتِ انسانی سے واقف ہیں اور نفسیات کے ماہر ہیں ان کے نزدیک یہ سب سے بڑا معجزہ تھا۔ حضرت عیسٰی کے معتقدین کو ضرورت محسوس ہوئی کہ اس مبلّغ خدا کو خدا کا بیٹا یعنی خدا بنا کر پیش کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن اس نبی کے پیروؤں کو یہ ضرورت کبھی لاحق نہ ہوئی۔ اسی لئے آج تک کسی مسلمان کو جراُت نہ ہوئی کہ وہ اپنے نبی کو خدا کا لقب دے۔ یہ اس نبی کا دوسرا معجزہ ہے جس کو عقل بھی تسلیم کرتی ہے۔ الغرض اس نبی کے دونوں معجزے عقل کے لئے قابلِ قبول ہیں۔

حالیؔ نے بھی انہیں دونوں معجزوں کو بیان کیا کیونکہ انہیں معجزوں کی بدولت اس نبی نے عربوں کو اپنا ہم خیال بنایا۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا ۔۔۔ مُرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا ۔۔۔ وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماوا
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا　　بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا　　قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

اس نسخہ کیمیا کا ذکر بھی حالی نے اس طرح کیا ہے کہ عقل اس نسخے کو تسلیم کر لے۔

مس خام کو جس نے کندن بنایا　　کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا!
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا　　پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا

حالی نے "ہوا کے رُخ پھرنے" کے متعلق جو کہا ہے اسی میں اسلام کی کامیابی اور اس سے بھی زیادہ بانئ اسلام کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ گویا بانئ اسلام نے میرا رُخ پھیر دیا۔ اور انبیاء نے بھی میرا رُخ پھیرا مگر ان کے پیرو توحید کو مسخ کر کے پھر اپنے پرانے مقام پر لوٹ آئے۔ اس کے برعکس جو توحید بانئ اسلام نے قائم کی وہ آج بھی سلامت ہے۔

اسلام کی تمہید

اسی طرح حالی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس نبی نے اشاعت اسلام کی تمہید کس طرح کی۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ بانئ اسلام نے پہلے اپنے آپ کو اس کام کا اہل بنایا اور اپنی دیانت داری سے اپنے مخالفوں سے "امین" کا لقب حاصل کیا۔

وہ فخرِ عرب زیبِ محراب و منبر | تمام اہلِ مکّہ کو ہمراہ لے کر
گیا ایک دن حسبِ فرمانِ داور | سوئے دشت اور چڑھ کے کوہِ صفا پر

یہ فرمایا سب سے کہ اہلِ غالب
سمجھتے ہو تم مجھ کو صادق کہ کاذب

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا | کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا
کہا گر سمجھتے ہو تم مجھ کو ایسا! | تو باور کرو گے اگر میں کہوں گا

کہ فوجِ گراں پشتِ کوہِ صفا پر!
پڑی ہے کہ لوٹیں تمہیں گھات پا کر

کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے | کہ بچپن سے صادق ہے اور تو امیں ہے
کہا گر مری بات یہ دل نشیں ہے | تو سن لو خلاف اس میں اصلا نہیں ہے

کہ سب قافلہ ہے یہاں سے جانیوالا
ڈرو اس سے جو وقت ہے آنیوالا

اسی نبی نے جو پیغام سنایا اور جو اس کا اثر ہوا اس کو حالیؔ نے کیا خوب بیان کیا ہے:۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی | عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی | اک آواز میں سوتی بستی جگا دی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغامِ حق ہے
کہ گونج اٹھے دشت و جبل نامِ حق سے

حالیؔ کی "لگن" کو اقبالؔ نے "زندہ تمنّا" کا نام دیا۔ یہ زندہ تمنّا بانئ اسلام کے دل سے نکلی تھی۔ اس لئے ان کے صحابہ کے دل میں بھی گھر کر گئی۔ تمام صحابی سر بکف ہو گئے۔ دوسری طرف کفارِ مکّہ میں غلغلہ پیدا

ہوا۔ کیونکہ ان کو صرف اپنے عقائد ہی خطرے میں نظر نہ آئے بلکہ ان کے تمام سماج کے لئے خطرہ پیدا ہوا۔ ان کا سماج قبیلہ بندی اور فخر و مباہات پر تھا لیکن پیغام اسلام کی بنیاد مساوات پر تھی۔ اس پیغام کو قبول کر کے ہر کس و ناکس اہلِ عرب کی برابری کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ اس نبی نے اپنے کو بھی بیچارگی میں سب انسانوں کے برابر سمجھا:۔

تم اوروں کی مانند دھوکا نہ کھانا کسی کو خدا کا نہ بیٹا بنانا!
مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انسان ہیں واں جس طرح سرفگندہ
اسی طرح ہوں میں بھی اک اس کا بندہ
بنانا نہ تربت کو میری صنم تم! نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم!
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ میں بندہ بھی ہوں اور ایلچی بھی

اسلام کا پیغامِ مساوات

اہلِ عرب کی اصل تشویش کا باعث بھی پیغامِ مساوات تھا جس سے ان کی فخر و مباہات کو سخت خطرہ نظر آیا۔ ایک عام خیال یہ ہے کہ قبیلوں کا سماج مساوات پر مبنی ہوتا ہے لیکن یہ سراسر خام خیالی ہے۔ پورا قبیلہ سردار کے ماتحت ہوتا ہے جس کا حکم خدا کے حکم سے بھی زیادہ مقدم سمجھا جاتا ہے۔ سردار کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہیں۔ ان سرداروں کو بھی اس طرح تنبیہہ کی:۔

امیروں کو تنبیہہ کی اس طرح پر کہ ہیں تم میں جو اغنیا اور تونگر

اگر اپنے طبقے میں ہوں سب سے بہتر بنی نوع کے ہوں وہ مددگار یاور
نہ کرتے ہوں بے مشورت کام ہرگز
اٹھاتے نہ ہوں بے دھڑک گام ہرگز

اس پیغام مساوات سے سرداران قبیلہ ایسے گھبرائے کہ وہ جمع ہو کر اس بانئ مساوات کے چچا ابوطالب کے گھر پہنچے اور ان کے بھتیجے کے خلاف شکایت کی اور ہر قسم کے لالچ دیئے لیکن یہ پیغام بر مساوات لالچ میں کیونکر آسکتا تھا۔ آنحضرت نے جو جواب دیا وہ قابلِ نقل ہے۔ فرمایا کہ

(حوالہ نمبر ۱۳)

"چچا۔ اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر رکھ دیں
اور چاند کو بائیں ہاتھ پر تب بھی میں اپنے کام سے نہ ہٹوں گا۔
اور خدا کے حکم میں سے ایک حرف بھی کم و بیش نہ کروں گا۔
اس کام میں میری جان بھی جاتی رہے۔"

پیغام اسلام اصلاح سماج پر مبنی تھا۔ وہ ذہن انسانی کو بتوں کی بیڑیوں سے رہا کرنا چاہتا تھا۔ ابتدائی دور کے مسلمان اس پیغام کے جو معنی سمجھے وہ جعفر طیار کی زبانی سنئے۔ یہ بزرگ سب سے پہلی جماعت مہاجرین کے سرغنہ تھے جس کو کفار مکہ کے ظلم و ستم کی وجہ سے ملک حبش جانا پڑا۔ جب کفار نے اس جماعت کا پیچھا کیا اور حبش پہنچ کر حکمران حبش سے مطالبہ کیا کہ ان مہاجرین کو وہ اپنے علاقے سے نکال کر کفار کے سپرد کر دے۔ یہ حکمران جو نجاشی کہلاتا تھا مذہباً عیسائی تھا۔ اس نے مہاجرین کو اپنے دربار میں طلب کیا اور اسلام کی تعلیمات کے متعلق سوالات کیے۔ مہاجرین کی طرف سے جعفر طیار نے ایک مختصر تقریر کی۔

"اے بادشاہ! ہم جہالت میں مبتلا تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے نجاست میں آلودہ تھے۔ مُردار کھاتے تھے۔ بیہودہ بکا کرتے تھے۔ ہم میں انسانیت اور سچی مہمانداری کا نشان نہ تھا۔ ہمسایہ کی رعایت نہ تھی۔ کوئی قاعدہ وقانون نہ تھا۔ ایسی حالت میں خدا نے ہم میں سے ایک بزرگ کو مبعوث کیا۔ جس کے حسب نسب، سچائی، دیانت داری، تقویٰ پاکیزگی سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہم کو توحید کی دعوت دی۔ اور سمجھایا کہ اس اکیلے خدا کے ساتھ ہم کسی کو شریک نہ جانیں اس نے ہم کو پتھروں کی پوجا سے روکا اس نے فرمایا کہ ہم سچ بولا کریں، وعدہ پورا کیا کریں، گناہوں سے دُور رہا کریں، بُرائیوں سے بچیں۔ اس نے حکم دیا کہ ہم نماز پڑھا کریں۔ صدقہ دیا کریں۔ روزے رکھا کریں۔ ہماری قوم ان باتوں پر بگڑ بیٹھی ہے۔ قوم نے جہاں تک ہو سکا ہم کو ستایا کہ ہم وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنا چھوڑ دیں اور لکڑی اور پتھر کی مورتوں کی پوجا کرنے لگ جائیں۔ ہم نے ان کے ہاتھوں بہت ظلم اور تکلیفیں اُٹھائی ہیں اور جب مجبور ہو گئے تب تیرے ملک میں پناہ لینے کے لئے آئے ہیں" (حوالہ)

کفار مکہ نے بانی اسلام کی دعوت کو کس طرح سمجھا وہ ایک سردار عتبہ نامی کی تقریر سے ظاہر ہے جس نے اس نبی کے پاس آکر کہا:۔

"میرے بھتیجے محمد! اگر تم اس کارروائی سے مال جمع کرنا چاہتے ہو تو ہم خود ہی تیرے پاس اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ

تو مالا مال ہو جائے۔ اگر تو عزت کا بھوکا ہے تو اچھا
ہم سب تجھ کو اپنا رئیس مان لیتے ہیں۔ اگر حکومت کی
خواہش ہے تو ہم تجھ کو بادشاہِ عرب بنا دیتے ہیں۔ جو
چاہے سو کرنے کو حاضر ہیں مگر تو اپنا یہ طریق چھوڑ دے
اور اگر تیرے دماغ میں کچھ خلل آگیا ہے تو بتا کہ ہم تیرا علاج
کرائیں۔"

اس پر آنحضرتؐ کا جواب سُنئے :۔

"جو کچھ تم نے میری بابت کہا وہ ذرا بھی صحیح نہیں۔ مجھے
مال، عزت، دولت، حکومت کچھ درکار نہیں اور میرے
دماغ میں خلل بھی نہیں۔ حقیقت تم کو قرآن کے اس کلام
سے معلوم ہو گی۔"

یہ کہہ کر آنحضرتؐ نے قرآن کی مشہور آیات سُنائیں جن کا ترجمہ
درج ذیل ہے :۔

"یہ فرمان خدا کے حضور سے آیا ہے۔ وہ بڑا رحمٰن و رحیم ہے
یہ برابر پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ سمجھ دار لوگوں کے
لئے عربی زبان میں۔ اس میں سب باتیں کھُلی کھُلی درج ہیں۔
جو لوگ حکم خدا مانتے ہیں ان کے لئے اس فرمان میں بشارت
ہے اور جو انکار کرتے ہیں ان کو (یہ قرآن خدا کے عذاب
سے ڈراتا ہے) تاہم بہت سے لوگوں نے اس فرمان سے
مُنہ موڑ لیا ہے۔ وہ اسے سُنتے ہی نہیں اور کہتے ہیں کہ
اس کا ہمارے دل پر کوئی اثر نہیں اور ہمارے کان اس

کے شنوا نہیں۔ اور ہم میں اور تم میں ایک طرح کا پردہ پڑا ہے۔ تم اپنی تدبیر کرو۔ ہم اپنی تدبیر کر رہے ہیں۔ اے نبی ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں بھی (یعنی نبی) تم ہی جیسا بشر ہوں مگر مجھ پر وحی آئی ہے۔ اور خدا کے فرشتے نے یہ بتا دیا ہے کہ سب لوگوں کا معبود صرف ایک ہے۔ اسی کی طرف متوجہ ہونا اور اسی سے گناہوں کی معافی مانگنا لازم ہے۔ ان لوگوں پر افسوس ہے جو شرک کرتے ہیں۔ اور صدقہ نہیں دیتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ خدا پر ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کے لئے آخرت میں بڑا درجہ ہے۔"

بانی اسلام کی سیرت

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ نبی اسلام سے سب سے کم معجزے منسوب کئے جاتے ہیں

انسان کے لئے سب سے مشکل کام اپنے ہم جنسوں کو اپنا ہم خیال بنانا ہے۔ ہم خیال بنانے کے لئے صرف لسانی سے کام نہیں چلتا۔ اس کے لئے نہایت اعلیٰ سیرت کی ضرورت ہوتی ہے جس میں تحمّل، بردباری، صاف گوئی۔ اور بدرجۂ اتم جرأت اور ہمت بھی شامل ہے۔ باوجود ابتدائی ناکامیوں کے نبی کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ یہ سب کمالات سیرت نبویؐ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔

ان کی صاف گوئی کا اندازہ مندرجہ ذیل مکالمہ سے ہوتا ہے:۔

(حوالہ نمبر ۱۵)

قریش۔ اچھا محمدؐ! اگر تم ہماری باتوں کو نہیں مانتے تو ایک

اور بات سنو۔ تم کو معلوم ہے کہ ہم کس قدر سختی اور تنگی سے دن کاٹ رہے ہیں پانی ہمارے پاس سب سے کم ہے اور گزران ہماری سب سے تنگ ہے۔ اب تم خدا سے یہ سوال کرو کہ ان پہاڑوں کو ہمارے سامنے سے ہٹا دے۔ تاکہ ہمارے شہر کا میدان کھل جائے۔ نیز ہمارے لئے ایسی نہریں جاری کر دے جیسی شام و عراق میں جاری ہیں۔ نیز ہمارے باپ دادوں کو زندہ کر دے ان زندہ ہونے والوں میں قصیٰ بن کلاب (یعنی آنحضرت کا پردادا) ہو کیونکہ وہ ہمارا سردار تھا اور سچ بولا کرتا تھا۔ ہم اس سے تیری بابت بھی پوچھ لیں گے۔ اگر اس نے تیری باتوں کو سچ مان لیا اور تو نے ہمارے دوسرے سوالوں کو پورا کر دیا تب بھی ہم تجھے سچا جان لیں گے اور مان لیں گے کہ ہاں خدا کے ہاں تیرا بھی کوئی درجہ ہے اور اس نے فی الحقیقت تجھے رسول بنا کر بھیجا ہے جیسا کہ تو کہہ رہا ہے۔

آنحضرتؐ۔ میں ان کاموں کے لئے رسول بنا کر نہیں بھیجا گیا میں تو اس تعلیم کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میں نے خدا کے پیغامات تمہیں سُنا دیئے ہیں۔ اگر تم اس تعلیم کو قبول کرو گے تو یہ تمہاری دُنیا و آخرت کے لئے سرمایہ ہے اور اگر رد کرو گے تو میں خدا کے حکم کا انتظار کروں گا۔ جو کچھ اُسے میرا اور تمہارا فیصلہ کرنا ہو گا وہ کر لے گا۔

آنحضرتؐ کے اس جواب سے صرف صاف گوئی ہی نہیں بلکہ ہمّت اور جرأت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ خصوصاً ایسے حالات میں جب ان کے

حامیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف چند لوگ ان کو مانتے ہیں۔ ان کا اپنا قبیلہ قریش ان کا دشمن ہے، حتیٰ کہ ان کے اپنے رشتہ دار بھی ان کے خلاف ہیں لیکن پھر بھی وہ مایوس نہ ہوئے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے ظاہر ہے۔ اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ آپ کے کسی صحابی نے کفار سے تنگ آکر کہا کہ آپ ان کی تباہی کے لئے دعا کریں۔ آپ نے جواب دیا:۔

"میں ان لوگوں کی تباہی کے لئے کیوں دعا کروں؟ اگر یہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے تو کیا ہوا۔ اُمید ہے کہ ان کی آئندہ نسلیں ضرور ایک خدا پر ایمان لانے والی ہوں گی"

جب جنگِ بدر میں آنحضرت بھی خود زخمی ہوئے تو بعض صحابہ نے کہا کہ کاش آپ ان مشرکین کے حق میں بد دعا کرتے۔ اس پر آپؐ نے جواب دیا:۔

"میں لعنت کرنے کے لئے نبی نہیں بنایا گیا۔ مجھے تو خُدا کی طرف بلانے والا اور سراپا رحمت بنایا گیا ہے۔ اے خدا میری قوم کو ہدایت فرما کیونکہ وہ مجھے نہیں جانتے"

جنگِ بدر میں کفار کا سردار ابوجہل تھا جس کی ابوجہلیت کا تذکرہ میں پہلے کر چکی ہوں۔ ابوجہل کی نفرت کی وجہ صرف یہ نہ تھی کہ توحید سے بتوں کو خطرہ تھا بلکہ یہ وجہ بھی تھی کہ کفّار کو اندیشہ تھا کہ ان کی ملکیت بھی معرضِ خطر ہو جائے گی۔ بعض سرداران کفار کی طائف میں بھی جائداد تھی۔ عوام ان سرداروں کے قابو میں بُری طرح تھے ان سرداروں کو خوف پیدا ہوا کہ یہ عوام پیغامِ مساوات سے متاثر ہو کر

سرداروں کے مقابلے پر کہیں کھڑے نہ ہو جائیں۔ اور ان کی سرمایہ داری خاک میں نہ مل جائے۔ عرب جیسی مادہ پرست قوم کو سرمایہ عقائد سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ کفار کی مخالفت میں عقائد اور ان سے زیادہ تقاضۂ شکم کارفرما تھا۔

آج کل کے مؤرخ اس تقاضۂ شکم کو ہر واقعہ کا سبب قرار دیتے ہیں۔ مؤرخوں میں یہ نظریہ اشتراکیت کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ کفار کی مخالفت صرف ان کے خطرۂ جائداد پر محمول کی جائے۔ خطرۂ جائداد کے ساتھ ان کے قدیم معیارِ اخلاق بھی خطرے میں تھے۔ کیونکہ قرآن کی تعلیمِ اخلاق ہر شخص کے ذاتی تقوے پر مبنی تھی۔ از روئے قرآن خاندانی وجاہت کوئی چیز نہیں۔ حتیٰ کہ بانیٔ اسلام نے خود اپنے آپ کو ناچیز بندہ قرار دیا۔ اس تعلیم سے کفار کو اندیشہ پیدا ہوا کہ پامال لوگ اب زور پکڑیں گے اور زیردست لوگ بالادست ہو جائیں گے اور اس طرح ان کا رائج الوقت سماج تہ و بالا ہو جائے گا۔

عرب فطرتاً "تاریخ کے غلام" تھے۔ یعنی وہ ماضی کی پرستش میں اس بری طرح منہمک تھے کہ ان کی قدامت پرست طبیعت ہر نئی چیز سے خائف رہتی تھی۔ چنانچہ ان کی زبان میں ایک خاص لفظ "بدعت" تھا جس سے ان کے خوف کا اظہار ہوتا ہے۔ ہر نئی چیز کو خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو وہ بدعت کا نام دیتے تھے۔ یہ لفظ آج تک مسلمانوں کی ترقی میں روڑے اٹکاتا رہا ہے۔ اسلام بھی ان کی نظر میں "بدعت" تھا۔

کیونکہ از روئے تعلیماتِ اسلام ان عربوں کے اجداد مستحق جہنم

تھے۔ عربوں کے لئے یہ بات گالی سے بھی بدتر تھی کیونکہ وہ میری پرستش کی طرح اپنے اجداد کی بھی پرستش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کو یہ خطرہ بھی نظر آیا کہ اسلام کی وجہ سے ان کے خاندانوں میں نزعہ پیدا ہو جائے گا۔ باپ بیٹے ایک دوسرے کے مخالف ہو جائیں گے۔ غرضکہ ہر پہلو سے عربوں کے ذہن پر میری پرستش حاوی تھی۔ میری پرستش کرنے والے لازمی طور سے اپنی قدیم روایات کی بھی پُوجا کرتے ہیں۔

جس چیز نے عربوں کی قدامت پرستی کو پاش پاش کر دیا وہ بانیٔ اسلامؐ کا وہ معرکۃ الآرا خطبہ تھا جو "حجۃ الوداع" کے نام سے آج تک مشہور ہے۔ اسی خطبہ پر اسلام کے تمام سماجی تصوّرات مبنی ہیں۔ آنحضرتؐ نے یہ خطبہ وفات سے چند ہفتوں پہلے سنہ ۱۰ ہجری مطابق سنہ ۶۳۲ء میں دیا۔ یہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(حوالہ نمبر ۱۶)

بانیٔ اسلامؐ کا خطبۂ حجۃ الوداع"

لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اور تم پھر کبھی اس مجلس میں جمع نہ ہوں گے لوگو۔ تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزّتیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں جیسا کہ آج کے دن کی، اس شہر کی، اس مہینے کی تم حُرمت کرتے ہو تمہیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی بابت سوال کرے گا۔

خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں

کاٹنے لگو۔ لوگو! جاہلیت کی ہر بات میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔ جاہلیت کے قتلوں کے تمام جھگڑے ملیا میٹ کرتا ہوں۔ پہلا خون جو میرے خاندان کا ہے یعنی ابن ربیعہ بن الحارث جو بنی سعد میں دودھ پیتا تھا اور ہذیل نے اُسے مار ڈالا۔ میں معاف کرتا ہوں جاہلیہ زمانے کا سود ملیا میٹ کر دیا گیا۔ پہلا سُود اپنے خاندان کا جو میں مٹاتا ہوں وہ عباس بن عبد المطلب کا سُود ہے وہ سارے کا سارا چھوڑ دیا گیا۔

لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لئے حلال بنایا ہے۔ تمہارا حق عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی غیر کو نہ آنے دیں۔ لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسی مار مارو جو نمودار نہ ہو۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کو اچھی طرح کھلاؤ اور اچھی طرح پہناؤ۔

لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے مضبوط پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ قرآن (اللہ کی کتاب) ہے۔

لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی نبی ہے اور نہ کوئی جدید اُمت پیدا ہونے والی ہے۔ خوب سُن لو کہ پروردگار کی عبادت کرو اور پنج گانہ نماز ادا کرو۔ سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو۔ مالوں پر زکوٰۃ نہایت دلی

خوشی کے ساتھ دیا کرو۔ خانۂ خدا کا حج بجا لاؤ اور اپنے
اولیائے امور و حکام کی اطاعت کرو جس کی جزا یہ ہے
کہ تم پروردگار کے فردوسِ بریں میں داخل ہو گے۔
لوگو! بروزِ قیامت تم سے میری بابت بھی دریافت کیا
جائے گا۔ مجھے ذرا بتا دو کہ تم کیا جواب دو گے۔؟
(اس پر سامعین نے کہا "ہم اس کی شہادت دیتے ہیں
کہ آپ نے رسالت و نبوت کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے ہم کو
کھوٹے کھرے کی بابت اچھی طرح بتا دیا" اس پر آنحضرتؐ
نے انگشتِ شہادت کو اٹھایا اور کئی مرتبہ ایسا کیا اور پھر کہا)
اے خدا! سُن لے۔ اے خدا گواہ رہنا۔ اے خدا شاہد رہنا
دیکھو! جو لوگ موجود ہیں۔ وہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں
ہیں ان باتوں کی تبلیغ کرتے رہو۔ ممکن ہے کہ بعض سامعین
سے وہ لوگ زیادہ تر اس کلام کو یاد رکھنے اور حفاظت
کرنے والے ہوں جن پر تبلیغ کی جائے۔

جب عقائدِ اسلام "راسخ" ہو کر پختہ ہو گئے تو یہ نیا دین بھی
پُرانا ہو گیا۔ اور اب مسلمانوں میں بھی "بدعت" اور "راسخ الاعتقادی"
کا وہ چکر شروع ہوا جو میرے روحانی پہلو کی سب سے نمایاں خصوصیت
ہے۔ میں نے اپنے اس پہلو کا تذکرہ کئی جگہ اس سرگذشت میں کیا ہے
زمانہ برابر بدلتا رہتا ہے۔ اس تبدیلیٔ زمانہ سے بدعت بھی مقبولِ عام
ہو کر راسخ ہو جاتی ہے۔ گویا نئی چیز ایک دن پُرانی
ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں میں اولیا کی آمد

مسلمانوں کو ایک اور دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا دین آخری تھا۔ اس لئے اب اس میں کسی بدعت کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن عباسیوں کے دور میں جس کا آغاز ۷۴۹ء میں ہوا زمانے نے حسب دستور کروٹ لی لاکھوں کی تعداد میں غیر مسلم اس دین میں داخل ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ ذہین ایرانی تھے۔ دورِ عباسی میں ان کا زور شروع ہوا۔ انہوں نے تقاضۂ زمانے کو پورا کرنے کے لئے ایک ترکیب نکالی جو اب "تصوف" کہلاتی ہے۔ ولی نمودار ہوئے جنہوں نے "وارثِ انبیاء" ہونے کا دعویٰ کیا۔ تصوف ایران کے اس علاقۂ خراسان میں شروع ہوا جہاں کے لوگ ہمیشہ سے تحریکات پیدا کرنے کے لئے مشہور تھے۔

تصوف کی کہانی بڑی طویل ہے۔ یہاں میں اس تحریک کی کہانی صرف مختصراً سناتی ہوں۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ بیشتر صاحبِ سیرت مسلمان تصوف میں رنگ گئے۔ اور اب مسلمانوں میں بھی باوجود توحید سینکڑوں فرقے پیدا ہو گئے۔ اس زمانے میں فرقوں کی اتنی کثرت تھی کہ مؤرخوں کو فرقوں کو "مذاہب" کا نام دینا پڑا۔ ان مذاہب پر مسلمانوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں ابن حزم (۹۹۴ء تا ۱۰۶۴ء) کی کتاب الملل" اور شہرستانی کی اسی نام کی کتاب آج تک مشہور ہے۔

تصوف نے جب دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی میں زور پکڑا تو مسلمانوں میں وہ تنازعہ شروع ہوا جو "تنازعۂ ملّا و صوفی" کے

نام سے آج تک موجود ہے۔ صوفیوں نے اپنی تاویلوں سے اسلام کو اتنا کشادہ کر دیا کہ ہندوستان پہنچ کر اسلام نے لاکھوں ہندوؤں کو اپنے حلقے میں داخل کیا۔

تصوف سلجوقی ترکوں کے زمانے میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ ترک صوفیوں کے ہی ہاتھ پر اسلام لائے۔ ترکوں کی بدولت مسلمانوں میں دوبارہ جان پڑی۔ اور مسلمانوں نے چنگیزیوں کی لائی ہوئی بربادی کے باوجود سنبھالا لیا۔ بلادِ روم میں ایک ایسا صوفی پیدا ہوا جس نے تصوف کو ملّاؤں میں بھی مقبول کر دیا۔ اس غیر معمولی ہستی کا نام جلال الدین (۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۳ء) تھا۔ جو "رومی" کے لقب سے اپنی "مثنوی" کی بدولت آج تک مشہور ہے۔ میری اس سرگزشت میں مثنوی مذکور کے متعدد اشعار پیش کیے گئے ہیں جن سے ظاہر ہے کہ یہ مثنوی اس قدر جامع ہے کہ اس کے اشعار میرے فلسفے میں بھی قابلِ اطلاق ہیں۔

صوفیوں نے کشف و کرامات کے معاملے میں انبیاء کی ہمسری کا دعویٰ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوفیوں میں متعدد شعبدہ گر نمودار ہوئے اور بالآخر یہ تحریک بھی نذرِ زوال ہوئی۔ اب صوفیوں کی قبریں باقی ہیں جن پر جا کر اہلِ عقیدہ اپنی پیاس بجھاتے ہیں لیکن تصوف کے عروج کے زمانے میں صوفیوں نے میرے روحانی پہلو کو روشن رکھا جس کے لئے میں ان کی ممنون ہوں۔

مغرب میں میرا روحانی پہلو ایک عرصے سے تاریکی کی نذر ہو چکا ہے اور اب تو مشرق میں بھی مغربی اثرات کی وجہ سے روحانیت دن بدن کم ہو رہی ہے۔ بجائے خدا کے اب وطن پوجا جاتا ہے اور انسان کی رہی سہی روحانی توتیں نذرِ وطن پرستی ہو رہی ہیں یہ دور کب تک قائم رہے گا؟ اس کا جواب میں نہیں دے سکتی کیونکہ پیشین گوئی میرا شعار نہیں۔

نواں باب

میرے متعلق اغیار کے فیصلے

گو میں اب اپنے قدیم لباس میں نہیں ہوں اور نہ میری پرانی شکل و صورت باقی ہے۔ لیکن پھر بھی میرے پرستاروں کے حلقے کے باہر میرے سینکڑوں مداح ہیں۔ گو میرے پرستاروں نے مجھ پر دست درازیاں کیں۔ اور مجھ پر اس حد تک تصرف کیا کہ میری صورت تک مسخ کر دی۔ لیکن آخر یہ میرے پرستار ہی ہیں۔ پرستاروں کا فیصلہ تو لازمی طور پر میرے حق میں ہو گا اس لئے میں ان فیصلوں کو نظرانداز کرتی ہوں کیونکہ ایسے فیصلوں کا پیش کرنا خودستائی کے برابر ہے۔ جب میں بادشاہوں تک کی مدح سرائی کی مخالف ہوں تو میں اپنے آپ کو کس طرح میاں مٹھو کہہ سکتی ہوں۔ لیکن چونکہ میں اپنی سرگذشت لکھ رہی ہوں اس لئے ضروری ہے کہ میں اپنے متعلق اغیار کا فیصلہ بھی پیش کروں۔

اغیار کے دو زمرے

یہ اغیار دو زمروں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں اول وہ جو باوجود غیر ہونے کے میری تعریفیں کرتے ہیں اور میرے مقصد کا بھی تعین کرتے ہیں۔ دویم وہ جو میرے مخالف ہیں۔ اور میری کوششوں اور کاوشوں کو محض بکواس سمجھتے ہیں اور میرے مقصد کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ مجھے پہلے اپنے مداحوں کا فیصلہ پیش کرنا چاہیئے لیکن اس سے میری خود پسندی ظاہر ہو گی۔ اس لئے میں پہلے

اپنے مخالفوں کا فیصلہ پیش کرتی ہوں. ان اغیار میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے بغیر میرے مشورے کے میرے مقصد کا بھی تعیین کر دیا۔ اس لئے میں سب سے پہلے ان باغیوں کا ذکر کروں گی جنہوں نے بغیر پوچھے میرے مقصد بھی قائم کر دیئے۔ بعد کو میں مخالفوں کے اقوال پیش کروں گی۔

اغیار کے قائم کردہ مقاصدِ تاریخ

میں برابر روتی رہی ہوں کہ میرے پرستاروں نے میری ذمے وہ کام لگا دیئے جن کی میں اہل نہ تھی۔ حتیٰ کہ فال گوئی اور پیشین گوئی بھی میرے سر تھوپی۔ جیسا کہ میں بار بار بتا چکی ہوں۔ میرا اصل مقصد صرف واقعہ نگاری تھا۔ اس معاملے میں فرانسس بیکن (۱۵۶۱ء تا ۱۶۲۶ء) نے ہزاروں سال کے بعد میری تائید کی اور مجھے ان ذمہ داریوں سے رہائی دلانے کی تجویز کی۔ اس نے میری تائید بایں الفاظ کی :-

"تاریخ کا اصل کام یہ ہے کہ وہ صرف واقعات تحریر کرے اور ان واقعات کے ساتھ مشورہ بھی دے۔ لیکن ان (واقعات) پر تبصرہ کرنا اور ان سے نتیجے نکالنا لوگوں کی قابلیت پر چھوڑ دے تاکہ لوگ آزادانہ طور پر خود فیصلہ کر سکیں۔"

یہ کیسا اچھا مشورہ تھا لیکن کسی نے اس کو نہ مانا اور مؤرخوں سے تقاضا کیا کہ وہ خود واقعات سے نتائج بھی نکالیں۔ چنانچہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے مؤرخوں نے بے لگام ہو کر تاویل بازی شروع کر دی جو آج تک جاری ہے۔ بعد کے اغیار مفکرین نے مجھ سے پیشین گوئی کا بھی مطالبہ کیا۔ بلکہ پیشین گوئی میرے لئے لازمی کر دی۔ ایک مفکر نے میری حدود پر ایک کتاب بھی لکھ ماری جس میں اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ

تاریخ پیشین گوئیوں کا بھی کھاتہ ہے۔ فرانسیسی مشہور شاعر لامرتین نے میری طرف سے دعویٰ کیا کہ میں ہر قسم کا سبق دیتی ہوں حتیٰ کہ مستقبل کو بھی روشن کر دیتی ہوں۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہر انسان گذشتہ واقعات کو بھی اپنے زمانے کی عینک سے دیکھتا ہے۔ اس لئے اُس کو ماضی میں بھی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ لوگ آج کل حصولِ زر میں مستغرق ہیں اور روزی کو مقصدِ زندگی سمجھتے ہیں۔ یورپ اس جال میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک یوروپین مفکر کہتا ہے کہ (حوالہ نمبر ۱)

"تاریخ محض روزی کے لئے جدوجہد کی کہانی ہے"۔ گویا میں محض پیٹ کی لونڈی ہوں۔ یہ زمانہ اشتراکیت (کمیونزم) کا ہے۔ اشتراکی تو یہاں تک دعویٰ کرتے ہیں کہ تاریخ گری میں خدا کو بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

جب خدا کے متعلق اشتراکیوں کا نظریہ یہ ہے تو مجھ جیسی حقیر دیوی کس شمار میں ہے۔

ان نئے موّرخوں سے تو پُرانے مسلمان تاریخ نگار بہتر ثابت ہوئے۔ انہوں نے انسان کو بندۂ شکم کی بجائے بندۂ خدا ثابت کیا اور اس طرح انہوں نے مجھے قوتِ پرواز عطا کی۔ جس کی بدولت میں مقامِ علوی پر پہنچی۔ ان مسلمان تاریخ نگاروں کا ذکر میں پوری تفصیل سے کر چکی ہوں۔ لیکن مسلمان موّرخوں نے مجھے قوتِ پرواز تو دی لیکن اس کے ساتھ میرا محیط البیاد وسیع کر دیا کہ میں مشکل میں پھنس گئی۔

موّرخ السخاوی (۱۴۲۷ء تا ۱۴۹۷ء) نے تو تمام دنیا کے

انسانوں اور ہر زمانے کو مجھے سونپ دیا اور ہر حرکتِ انسانی کو تاریخ میں شامل کر دیا۔ اس نے لکھا کہ

"تاریخ کا مقصد بنی نوع انسان اور زمانہ ہے"۔ اب مجھے چوروں اور بدمعاشوں پر بھی نظر رکھنی پڑی۔ مگر ساتھ ہی نیک لوگ بھی میرے سپرد کیے گئے۔ اس کے علاوہ ان مسلم تاریخ نگاروں نے رشد و ہدایت کا کام بھی میرے سپرد کیا۔ جس کو وہ اپنی زبان میں "عبرت" آموزی سمجھتے تھے۔

ان مسلم تاریخ نگاروں نے میرے سپرد ایک کام کیا۔ جس سے میں بالکل ناآشنا تھی۔ یعنی میرے سپرد انبیاء کی سوانح نگاری بھی کی۔ اس سے پیشتر میرے محرر صرف دیوتاؤں اور دیویوں کے تذکرے کرتے تھے کیونکہ یہ محرر خدائے واحد سے قطعاً ناواقف تھے۔ ان انبیاء کی سوانح نگاری کی خاطر مجھے مقاماتِ علوی کا بھی سفر کرنا پڑا۔ گو یہ میرے لئے بڑا مشکل کام تھا۔ لیکن ان مسلمانوں کی بدولت مجھے یہ اعلیٰ مقام بھی حاصل ہوا اور اب میری رسائی خدائے واحد تک ہو گئی۔

تاریخ کی مذمت جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے میں سب سے پہلے اپنے مخالف اغیار کے نظریے پیش کرنا چاہتی ہوں۔ افسوس ہے کہ ان مخالفوں میں میرا ایک نامور پرستار ایڈورڈ گبن بھی تھا جس کی نظر نے صرف انسان کی حرکاتِ ذمیمہ دیکھیں اور تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھ کر تصویر پر رائے زنی کر ماری۔ اس کی تصنیف "زوال روما الکبریٰ" بلاشبہ بڑی معرکۃ الآرا کتاب تھی لیکن اس نے

اسی کتاب میں یہ بھی لکھ مارا کہ :۔

"تاریخ بلاشبہ محض انسانی جرائم۔ (حوالہ نمبر ۲)
حماقتوں اور مصیبتوں کا رجسٹر ہے" جرمن مشہور شاعر گوئٹے نے گبن کو بھی مات کر دیا۔ اس نے تو صاف صاف لکھا کہ :۔ "گنہگار تاریخ نگاری کرتے ہیں۔ نیکو کار خاموش رہتے ہیں۔" (حوالہ نمبر ۲)

گویا میں گنہگار کی مربی ہوں لیکن ایڈمنڈ برک نے میری حمایت کی۔ اور میرے محرروں کی شرافت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا :۔ (حوالہ نمبر ۲)

"شریف مؤرخوں کی سیاہی صرف شیر انسانیت ہے"

یعنی اچھا مورخ انسان کا اچھا پہلو دکھاتا ہے۔

میں کس کس کا رونا روؤں۔ والٹیر کو جو اپنے آپ کو آزاد خیالی کا علمبردار سمجھتا تھا میرا صرف ایک پہلو نظر آیا جو تاریک تھا۔ اگر اس نے میرا صرف ایک رُخ دیکھا تو یہ اس کی نظر کا قصور تھا نہ کہ میرا۔ بقول شاعر :۔

زُلف دیکھی تیری جن قوموں نے وہ کافر بنیں
رُخ نظر آیا جنہیں وہ سب مسلمان ہو گئیں

جب خدا بھی قہاری اور جباری سے بری نہیں تو میں ایک حقیر دیوی کس شمار و قطار میں ہوں۔ اس والٹیر کو جو نظر آیا اسی کے مطابق اس نے لکھا کہ :۔

"دُنیا کے بڑے بڑے واقعات کی تاریخ محض تاریخ جرائم ہے" ایک اور جگہ اس نے لکھا کہ "تاریخ محض جرائم اور

مصیبتوں کی تصویر ہے"

بیشک تصویر کے دونوں رُخ دکھلانا میرا فرض ہے۔ میں انسان کے مظالم۔ اس کی حماقتوں اور اس کے جرائم کا بھی تذکرہ کرتی ہوں لیکن ساتھ ہی میں اسی انسان کے روشن پہلو بھی نمایاں کرتی ہوں۔ اگر میں نے عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھانے والے ظالم یہودیوں اور رومیوں کا تذکرہ کیا تو ساتھ ہی عیسیٰؑ کی مسیحائی کا ذکر بھی کیا۔ فراعنۂ مصر کی فرعونیت کے ذکر کے ساتھ ساتھ میں نے موسیٰؑ کے صبر و استقلال کا تذکرہ بھی پیش کیا۔

اسی نظریہ کے تحت کہ میں صرف مجرموں اور گنہگاروں کی مرتی ہوں بعض اغیار نے میرا عدم وجود قوموں کے لئے باعثِ رحمت قرار دیا۔ گویا جہاں میں جاتی ہوں وہاں میں صرف شر کی تلقین کرتی ہوں۔ خیر سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ اس فیصلے میں صحیفہ نگاری کی بُو آتی ہے۔ کیونکہ بعض اخباروں میں جرائم کا ذکر بڑی موٹی موٹی سرخیوں سے کیا جاتا ہے تاکہ اخبار کی فروخت بڑھے۔ عوام اور خصوصاً پانچویں جماعت پاس" لوگ جرائم سے متعلق خبروں سے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تجسس صرف سنسنی خیز خبروں تک محدود ہے۔ چنانچہ میرے بعض شہرت طلب محرروں نے بھی سنسنی خیزی اپنا شعار بنایا۔ انگلستان کے ایک آوارہ مؤرخ جی۔ ڈبلو۔ رینلڈ نے اسی سنسنی خیزی کی خاطر ایک گندی کتاب لکھی۔ جس میں اپنے زمانے کے انگریز بادشاہوں کی زنا کاری کا حال بڑی تفصیل سے لکھا۔ (حوالہ نمبر ۵)

بیشک ایسی تاریخ نگاری سے تو عدم تاریخ کہیں بہتر ہے۔ چنانچہ ایک دل جلے فلسفی نے کیا خوب کہا کہ :-

"وہ قوم کیسی خوش نصیب ہے۔ جس کی تاریخ کے صفحات بالکل کورے ہیں"۔ (حوالہ نمبر ۶)

اس فیصلے کی تائید میں ایک انگریز مؤرخ "انقلاب فرانس" میں لکھتا ہے کہ:-

"خاموشی الوہیت کا نشان ہے۔ اور آسمانی نعمت ہے دنیاوی چیزوں میں خاموشی گفتگو سے بہتر ہے.... ذرا سوچو کہ ہر واقعہ سے جو قابلِ نگارش ہوتا ہے کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے ...... شاہ بلوط کا درخت خاموشی سے ہزار سال تک بڑھتا رہتا ہے حتیٰ کہ کوئی کاٹنے والا وہاں پہنچ کر اس کو کاٹتا ہے جس سے خاموشی ختم ہو جاتی ہے۔ (حوالہ ۷)

اس تمثیل سے کارلائل یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ دنیا میں شر میری آمد سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ گویا میری غیر موجودگی دنیا کے لئے باعثِ رحمت ہے۔ لیکن یہ سراسر تہمت ہے میں شاہ بلوط کی نشو ونما کا بھی ذکر کرتی ہوں اور اس کی بربادی سے میں ہرگز خوش نہیں ہوتی۔ اسی لئے میں اپنے محرروں سے تاکید کرتی رہتی ہوں کہ انسان کی نیک بختی اور بدبختی دونوں کا ذکر کرو تصویر کا صرف ایک رخ دکھلانا میرے محرروں نے صحیفہ نگاروں سے سیکھا۔ جس کی ہرگز میں ذمہ دار نہیں ہوں۔

صدر امریکہ تھامس جافرسن (۱۷۴۳ء تا ۱۸۲۶ء) نے تو حد کر دی۔ اس نے میری عدم موجودگی کو قوموں کے لئے باعث برکت قرار دیا۔ اس نے اپنی تحریروں میں لکھا:- (حوالہ نمبر ۸)

"وہ قوم کیسی خوش نصیب ہے جس کی خوش نصیبی کے باعث تاریخ کو کوئی مواد نہیں ملتا"۔ اسی طرح میری عدم موجودگی

افراد کے لئے بھی باعثِ رحمت قرار دی۔ چنانچہ اس نے اپنے ایک خط میں لکھا کہ "دُنیا میں سب سے خوش نصیب وہ ہے جس کی برائیوں اور بھلائیوں کا چرچا دُنیا بالکل نہیں کرتی"۔

مجھے مجبور ہو کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اگر میرا وجود نہ ہوتا تو یہ حضرت خود قعرِ گمنامی میں پڑے رہتے۔ ان کو حیاتِ جاودان میری ہی بدولت نصیب ہوئی۔ مشہور انگریز ادیب جارج ایلیٹ نے میری عدم موجودگی صرف قوموں کے لئے ہی نہیں بلکہ عورتوں کے لئے بھی باعثِ رحمت ثابت کی۔ اس نے لکھا کہ:۔

"خوش نصیب قوموں کی طرح خوش نصیب عورتیں بھی تاریخ کی زد میں نہیں آتیں"۔ یہ عجیب تشبیہ ہے۔ بے شک عورتوں کے چرچے ان کی بدچلنی کی دلیل ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے ایسی عورتیں بھی دیکھی ہیں جو صرف اپنے حسن و جمال کی بنا پر مشہور ہوئیں۔

مجھ پر گپّی ہونے کا الزام

(حوالہ نمبر ۹) جن اہلِ فکر نے مجھے گپّی ٹھہرایا ان کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔

اسی کارلائل نے جو میرے پرستاروں میں تھا میرے خلاف بڑی بکواس کی۔ اس نے یہاں تک لکھ دیا کہ "تاریخ محض افواہوں کا نچوڑ ہوتا ہے"۔ میرا دوسرا باغی پرستار مشہور امریکی اہلِ قلم واشنگٹن ارونگ تھا جس کے بقول میں افسانوں میں گم ہو جاتی ہوں۔ اس نے لکھا کہ:۔ (حوالہ نمبر ۱۰)

"تاریخ افسانوں میں گم ہو جاتی ہے۔ واقعات پر شکوک اور مباحث کے بادل چھا جاتے ہیں تختیوں کے کتبوں میں کاہی

لگ جاتی ہے مجسمے گر پڑتے ہیں۔ ستون۔ طاق۔ اہرام مصری کیا ہوئے؟
سب خاک میں دفن ہو گئے۔ ان کے کتبے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ گویا
وہ خاک پر لکھے گئے تھے۔

اس امریکی سے پوچھئے کہ اس میں میری کیا خطا ہے؟ اگر ماضی کے نشانات کو زمانہ مٹا دے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ آج جو کاوشیں مصر میں ان فرعونی عمارات کو قائم رکھنے کے لئے کی جا رہی ہیں وہ سب میری ہی بدولت ہیں۔ میرے پرستار ان عمارتوں کی حفاظت کے لئے دور دور سے چندہ جمع کر رہے ہیں انجینئر لوگ میری خاطر ان عمارتوں کو اٹھا اٹھا کر محفوظ مقامات پر نصب کر رہے ہیں تاکہ مصری صدر ناصر کی جاری کردہ نہروں کی زد سے یہ عمارتیں بچ جائیں۔

شاعروں کی طرف سے میری مخالفت

شاعروں نے بھی میری مخالفت کی۔ گو اکثر شاعروں نے میری ہی بدولت شہرت دوام حاصل کی۔ اگر میں نہ ہوتی تو مغرب میں ہومر اور مشرق میں فردوسی اور مصنف مہابھارت کس طرح مشہور ہوتے۔ انگریز شاعر ملٹن نے تو مجھ پر کس کس کر چوٹیں کیں۔ یہ آخر شاعر تھا۔ تشبیہوں سے باز نہ رہ سکا۔ چنانچہ اس نے میرے پرستاروں کی کاوشوں کو محض چیل کوؤں کی اڑان قرار دیا۔ اسی لئے میں اپنے محرروں کو برابر تاکید کرتی رہتی ہوں کہ خدارا تشبیہوں سے کبھی کام نہ لو کیونکہ یہ تشبیہ زمانۂ حال سے متعلق ہوتی ہیں ان کا اطلاق ماضی پر کس طرح ہو سکتا ہے۔ ملٹن دراصل شاعر تھا لیکن اس نے میرے حدود میں بھی مداخلت کی اور "تاریخ برطانیہ" لکھ ماری جو بجا طور سے قعر گمنامی

میں جا پڑی۔ اس نام نہاد تاریخ میں اس نے لکھا کہ :۔

"ہماری تاریخ رات کے مسافر کی طرح جس نے خوابوں کی مسافت طے کی ہو اب ان حدود میں داخل ہوتی ہے۔ جہاں ہم دن کی روشنی اور حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمیں باوجود فاصلے کے اصلی رنگ وصورت نظر آنے لگتا ہے۔"

اسی تاریخ میں دوسری جگہ اس نے چیل وکوؤں کے ذکر سے میری ہنسی اس طرح اڑائی :۔ (حوالہ نمبر ۱۰)

"ان جھگڑوں کے ذکر سے جن میں ہمارے مصنف (مورخ) پڑ گئے کیا حاصل ہے؟ ان کی قدر وقیمت کل اتنی ہے جتنی کہ چیل کوؤں کی اڑان اور ان کی لڑائی کی ہوتی ہے۔"

ایک اور انگریز شاعر ولیم کوپر نے میرے مورخوں کے متعلق لکھا کہ :۔ (حوالہ نمبر ۱۱)

"بعض لوگ غیر معروف لوگوں کی جنگوں اور ان کے کارناموں کو بیان کرتے ہیں اور اس بیان کو تاریخ کا نام دے دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان سورماؤں کے نام سے ان کے ہم عصر بھی ناآشنا تھے۔ لیکن بیان کرنے والے ان سورماؤں کا حال اور ان کے سیرت اور ان کے تصورات اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا وہ ان سورماؤں کو بطن مادر سے جانتے ہیں۔"

ایک اور انگریز شاعر لارڈ بائرن لکھتا ہے کہ :۔

"جب تاریخ کسی کی تعریف یا مذمت کرتی ہے تو جھوٹ کو

سچ بنا کر جھوٹ میں اضافہ کر دیتی ہے۔" بقول اس شاعر گویا میں جھوٹوں کی بادشاہ ہوں۔ ایک اور شاعر میتھو آرنلڈ نے مجھے جھوٹ کا دریا قرار دیا۔ اور دریا بھی کون سا؟ دریائے مسی سیپی جو اپنی ذخاری کے لئے مشہور ہے۔

شاعروں کے علاوہ نثاروں نے بھی مجھ پر چوٹیں کیں۔ ایک ادیب نے لکھا کہ:-

"اگر گپ ضبطِ تحریر میں آجائے تب بھی وہ زبانی گپوں کی طرح گپ ہی رہتی ہے۔ خواہ وہ عہد قدیم سے متعلق ہو"

نکولس بردیاف میرے متعلق لکھتا ہے کہ:- (حوالہ نمبر ۱۲)

"انسان کو جو تجربہ از روئے تاریخ حاصل ہوا ہے وہ ناکامیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ (یہ تلخ تجربہ) برابر جاری رہے گا۔ کسی تاریخی عہد کے مسائل ابھی تک حل نہیں ہوئے نہ کوئی مقصد پورا ہوا۔ نہ کوئی اُمید پوری ہوئی۔"

دسواں باب

تین (۳) پیشین گو قسم کے مؤرخ

میں نے اپنی اس سرگذشت میں پیشین گوئی کی برابر مذمت کی ہے لیکن حضرت انسان نے اکثر مجھے پیشین گوئی کا آلہ سمجھا۔ نیم تعلیم یافتہ لوگ تو صاف صاف کہتے ہیں کہ اگر میں ان کو مستقبل کا حال نہ بتاؤں تو میرے صحیفے پڑھنا محض تضیع اوقات ہے۔ ایک فرانسیسی فلسفی لامرٹین نے تو فتویٰ دیا کہ "تاریخ ہر قسم کی تعلیم دیتی ہے۔ حتیٰ کہ مستقبل کا راز بھی بتاتی ہے۔" ایک امریکی مؤرخ گارفیلڈ نامی نے لکھ مارا کہ "تاریخ پیشین گوئیوں کا چھتا ہے جو ابھی تک کھولا نہیں گیا۔"

دورِ حاضر میں بھی تین شخص پیدا ہوئے جن کو مجھ میں مستقبل کا حال نظر آیا:-

(۱) ان میں ایک انگریز ایچ۔ جی۔ ویلز (سنہ ۱۸۶۶ تا سنہ ۱۹۴۶ء) نامی تھا۔ جس کی تصنیف "خاکہ تاریخ" نے اس مادہ پرست دور میں مجھے دوبارہ مقبول کردیا اور مجھے حیات ثانیہ نصیب ہوئی۔

(۲) دوسرا ایک جرمن او سوولڈ اسپینگلر (سنہ ۱۸۸۰ تا سنہ ۱۹۳۶ء) نامی تھا۔ جس نے میرے فلسفے پر ایک سنسنی خیز کتاب لکھی جس کا انگریزی ترجمہ "زوالِ مغرب" کے نام سے موسوم ہے۔

(۳) تیسرا پیشین گو مؤرخ آرنلڈ ٹوئن بی (ولادت سنہ ۱۸۸۹ء) بھی

انگریز ہے جو بقید حیات ہے۔ اس کی تصنیف "مطالعۂ تاریخ" کے نام سے دس جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

ان تینوں کے زمانے میں مختلف ملکوں کے درمیان فاصلہ برائے نام رہ گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب پوری دنیا ایک تمدن کے تحت آنے والی ہے۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں جب پہلی عالمگیر جنگ یکایک شروع ہوئی تو اتحاد عالم کا تصور خواب کی طرح غائب ہو گیا۔ سب سے پہلے اس خواب گراں سے ویلز جاگا۔ پہلی جنگ ۱۹۱۸ء میں اس منزل پر پہونچ گئی تھی کہ پورا مغرب تھک کر چور ہو گیا تھا۔ لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ اس کے علاوہ لاکھوں زخم خوردہ بستر مرگ پر تڑپ رہے تھے۔ ویلز کا حساس دل اس منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھا اور اس نے محسوس کیا اس آفت کا باعث مغرب کی قوم پرستی ہے اصل مغرب اس بری طرح قوم پرستی کے جال میں گرفتار ہو چکا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ جنگ بربادیٔ تمدن کا پیش خیمہ ہے یا ایک نئے دور کی بشارت ہے

(۱) ایچ۔ جی۔ ویلز اور اس کی تاریخ

مگر ویلز کو یقین ہو گیا کہ اس آفت کا اصل سبب اہل مغرب کی قوم پرستی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی "خاکۂ تاریخ" کے دیباچہ میں لکھا:۔ (حوالہ نمبر ۱)

"لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کو جو تاریخ پڑھائی گئی تھی وہ قومیت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی جس میں بجز ان کے اپنے ملک کے کسی اور ملک کا ذکر نہ تھا اور اب یہ لوگ آگ کی بھٹی میں پڑے جل رہے ہیں۔"

ویلز اس "خاکۂ تاریخ" سے پہلے کئی کتابیں لکھ چکا تھا جن کا موضوع مستقبل سے متعلق تھا۔ اس کی دوربین نظر نے پہلے ہی سے مغرب کی بربادی کا نظارہ

کر دیا تھا۔ لیکن ویلز کے ہم عصر پیشہ ور مورخ اپنے محدود دائرہ تاریخ میں اس بری طرح منہمک تھے کہ کسی ایک واقعہ کی صحیح تاریخ معلوم کرنے میں اپنا سارا وقت برباد کرتے تھے۔ انہیں کچھ پرواہ نہ تھی کہ ان کی دنیا آگ میں گرنے والی ہے۔ وہ تو تاریخ کی پوجا میں گرفتار تھے اور دنیا کی آنے والی بربادی سے بالکل بے خبر تھے۔

ان پیشہ ور مورخوں کی تنگ نظری سے تنگ آ کر ویلز نے اپنا "خاکہ تاریخ" ۱۹۲۰ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب تمام دنیا میں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئی اور تاریخ عالم کا ایک نیا معیار قائم ہوا۔ امریکن مورخوں نے بھی ویلز کی تقلید میں سینکڑوں تاریخ عالم لکھیں اور مجھے اس طرح حیات ثانی نصیب ہوئی۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ اس نو آموز مورخ نے میرا صحیفہ ایک خاص "مقصد" کے تحت لکھا لیکن اس کا مقصد ان متعدد "مورخوں" سے کہیں بہتر تھا جنہوں نے جنگ کا جواز حاصل کرنے کے لئے میری صورت مسخ کر کے اپنی "تاریخیں" لکھیں۔ ان نام نہاد مورخوں کی وجہ سے مجھے لوگ جنگجو کہنے لگے۔

ویلز کا کوئی تعلق تاریخ نگاری سے نہ تھا۔ وہ تو دراصل ناول نگار تھا۔ لیکن کسی اور ناول نگار کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ وہ دنیا کو بیدار کرنے کے لئے ایسا صحیفہ لکھے۔ گو ویلز کا طرز تحریر صحافی نما تھا لیکن اس کا مقصد بلاشبہ دنیا میں امن و امان قائم کرنا تھا۔ میں بھی امن و امان کی حامی ہمیشہ سے رہی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں کہ میری سلامتی انسان کی سلامتی پر منحصر ہے اسی لئے میں اس کی تاریخ کو سراہتی ہوں گو اس میں چند خامیاں بھی ہیں۔ مثلاً اس نے واقعات سے جو نتیجے دکھائے ہیں وہ بعض اوقات بھونڈے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کے نظریے محض جذبات کی بناء پر رد کرتا ہے۔ اس کے ماخذ بھی مستند نہیں۔ زمانہ قدیم کے حالات اس نے قدیم ماخذوں سے نہیں لئے بلکہ جدید مورخوں کی کتابوں

سے اخذ کئے۔

(۲) (حوالہ نمبر ۲) ابن خلدون نے انسان کو دو زمروں میں تقسیم کیا تھا یعنی شہری اور خانہ بدوش۔ ابن خلدون کے نزدیک تاریخ انہیں دو قسم کے انسانوں کے تصادم کی کہانی ہے۔ ویلز نے بھی یہی نظریہ تاریخ اختیار کیا اور ان تصادم کی کہانی لکھی۔

(حوالہ نمبر ۳) ابن خلدون کی طرح ویلز نے بھی اس تصادم کی وجہ یہ بتائی کہ شہریوں کا سامان عیش و آرام دیکھ کر خانہ بدوشوں کے منہ میں پانی آتا ہے۔ اور شہروں پر یورش کرتے ہیں۔ لیکن شہروں پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد خانہ بدوش بھی اس عیش و آرام میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور تصادم کی کہانی از سرِ نو شروع ہوتی ہے۔

ویلز دورِ حاضر کی جنگوں کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ بعض قوموں میں شہروں میں بس جانے کے بعد بھی جنگجوئی کا مادہ باقی رہتا ہے اور یہ قومیں اپنی حدودِ سلطنت بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ گویا قومی سلطنت بھی ایک قسم کی قبائلی حکومت ہے جس کے حکمران قبائلی سرداروں کی طرح جنگ کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں کیونکہ وحشت اور جنگجوئی انسان کی فطرت میں قائم رہتی ہے۔ قوم پرستی اس جنگجوئی کو ہوا دیتی ہے۔

ویلز کے نظریئے کے مطابق دولت رومتہ الکبریٰ کی بنیاد بھی جنگجوئی اور قوم پرستی پر تھی۔ مغرب کی قومی حکومتیں بھی رومی طرز پر قائم ہوئیں۔ دو ہزار سال بعد امریکن اور فرانسیسی انقلاب برپا ہوا جس کا باعث خواہش آزادی تھی۔ لیکن یہ خواہش آزادی بہت جلد خواہش توسیع حکومت میں غرق ہو گئی۔ تاریخ ویلز کے اس نظریئے کی تائید کرتی ہے۔ فرانس نے

اپنے بادشاہوں کی مطلق العنانی سے "آزادی" حاصل کر کے نپولین کی قیادت میں دوسرے مغربی ممالک کی آزادی کو صلب کیا۔ نپولین کے خاتمے کے بعد مغربی ممالک تو فرانس کے پنجے سے رہا ہو گئے لیکن یہی آزادی پسند فرانسیسی قوم شمالی افریقہ کے کمزور ملکوں پر ٹوٹ پڑی اور مراکش سے لیکر تونس اور الجزائر تک کے لوگوں کو اپنا غلام بنالیا۔ فرانسیسی قوم کا نعرۂ آزادی افریقہ کے باشندوں کے لئے نعرۂ غلامی بن گیا۔

نعرے میں یہ انقلاب کیونکر ہوا؟ ویلز اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ مغرب کے گرُو رومی تھے جو مذہب اور اخلاق سے ناآشنا تھے۔ ایسی لامذہب اور اخلاق سے مبرّا قوم دنیا کو اصلی پیغام آزادی کس طرح دے سکتی تھی۔ ایسی آزادی کا پیغام تو صرف کوئی عالمگیر مذہب مثل عیسائیت یا اسلام دے سکتا تھا۔ ان مذاہب نے دنیا کو اصل آزادی کا پیغام سنایا اور ذہن انسانی کو توہمات سے آزاد کیا۔ قوم پرستی بھی توہمات کا جزو ہے لہٰذا بقول ویلز اصل آزادی دنیا کو صرف اُسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب دنیا میں روحانی قسم کی حکومت ہو۔ (حوالہ نمبر ۴)

"جو انسان کے ذہن میں انسان کی مشترکہ تاریخ اور مشترکہ انجام کا تصور پیدا کرے۔"

لیکن بقول ویلز "حکومت الٰہی جس کی یسوع ناصری (حضرت عیسٰی) نے تلقین کی تھی تقریباً شروع ہی سے پرانے زمانے کے عقائد اور رسومات کے نذر ہو گئی۔ ذہنی اعتبار سے یہ (عقائد و رسومات) بہت گھٹیا تھے۔"

لہٰذا ویلز نے عیسائیت کی بجائے نئی تعلیم سائنس کا سہارا ڈھونڈھا جو

گذشتہ دو صدیوں میں رائج ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ نئی تعلیم و تربیت عالمی حکومت قائم نہ کر سکی۔ عالمی حکومت کی بجائے دنیا قومی سلطنتوں میں تقسیم ہو گئی۔ ویلز کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ عالمی ترقی عالمی بربادی کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ اور دنیا قومی تعصبات کا شکار نہ ہو جائے۔ چنانچہ اپنی تاریخ لکھنے سے پہلے وہ ناولوں میں اس آنے والی بربادی کی پیشین گوئی کر چکا تھا ایک ناول موسومہ "ہوائی جنگ" میں وہ ہوائی حملوں کے خطروں سے بھی دنیا کو آگاہ کر چکا تھا۔

(حوالہ نمبر ۵) ویلز نے اپنی تاریخ کے اختتام پر ایک باب موسومہ "انسان کا مستقبل" شامل کیا جس میں اس نے دنیا کو بہتر زمانے کی بشارت دی مگر اس شرط کے ساتھ کہ مغرب اپنی قوم پرستی ترک کر کے عالمی حکومت میں مدغم ہو جائے۔ لیکن مغربی قوم پرستوں نے باوجود اس تنبیہہ کے دوسری عالمگیر جنگ شروع کی اور دنیا پر دوبارہ مصیبت نازل کی۔

ویلز کی تاریخ "تاریخ گروں" کی مذمت سے پُر ہے۔ اسکو یقین تھا کہ ان تاریخ گروں ہی نے ہمیشہ دنیا کو مصیبت میں مبتلا کیا۔ اس نے رومیوں پر بھی لعن طعن کی حالانکہ رومی حکومت کا مدعا "عالمگیر امن و امان" تھا۔ اس معاملے میں وہ اصول تحقیق سے منحرف ہو گیا اور رومیوں کی تعریف کی بجائے رومیوں کے برباد کرنے والی قوموں یعنی چنگیزیوں کی تعریف کی۔

ویلز کا خیال تھا کہ اصل واقعہ گر اہل فکر و نظر ہوتے ہیں سیاست داں نہیں اور بقول اس کے "وزرائے خارجہ۔ مدبرین۔ اہل سیاست ان فکر و نظر والوں کا شریر بچوں کی طرح محض ساتھ دیتے ہیں" (حوالہ نمبر ۶)

ویلز کی خامیاں | ویلز کی نوشتہ تاریخ کو باوجود مندرجہ بالا خامیوں کے میں صدق دل سے سراہتی ہوں لیکن میرے میدان میں وہ نو آموز کھلاڑی تھا۔ اس کو خیال نہ آیا کہ مورخ کی حیثیت جج کی سی ہوتی ہے۔ مگر جج کا بھی اگر کوئی مدعا ہو تو وہ جج نہیں رہتا بلکہ مدعی بن جاتا ہے اور اس کا فیصلہ قابل وقعت نہیں رہتا۔ ویلز نے جیسا کہ وہ خود اپنے دیباچہ میں کہتا ہے ایک مدعا کے تحت اپنی مقبول عام تاریخ لکھی۔ اس کا یہ مدعا اس کے پر آشوب زمانہ کا آئینہ تھا۔ اسی مدعا کے تحت اس نے چند کلیئے بھی قائم کئے۔ لیکن ہر کلیئے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا اطلاق ہر زمانے میں ہو سکے۔ ابن خلدون کے قائم کردہ کلیئے آج بھی قابل اطلاق ہیں۔ لیکن ویلز کے قائم کردہ کلیئے صرف اس کے زمانے میں قابل اطلاق تھے۔

اسی طرح ویلز نے میرے کورے صفحوں کو خود ساختہ واقعات سے بھرا جو اس کے ذہن کے پیدا کردہ تھے کیونکہ ان زمانوں کے متعلق کوئی تحریری شہادت دستیاب نہیں۔ اس کے چند کلیئے انہیں خود ساختہ "واقعات" پر مبنی ہیں۔ اس لئے یہ ناقابل قبول ہیں۔

ویلز کا دوسرا جرم اس کی پیشین گوئیاں ہیں۔ بلکہ اس نے اپنی تاریخ نہیں پیشین گوئیوں کی خاطر لکھی۔ اس جرم کو میں معاف نہیں کر سکتی۔ لیکن ساتھ ہی میں تسلیم کرتی ہوں کہ اس کا مدعا قابل ستائش ہے جس کا مقصد دنیا کو آفات جنگ سے چھڑانا تھا۔ گو اس کو اپنے آخری ایام میں دوسری عالمگیر جنگ سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ اور اس کی تنبیہہ بیکار ثابت ہوئی لیکن وہ اپنے خالق کے سامنے یہ کہہ سکتا ہے کہ "اے خدا میں نے

تیرے انسانوں کو بہت کچھ سمجھایا بجھایا لیکن تیرے انسانوں کی نادانی میری دانش سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی ''۔

دوسری جنگ کی حمایت سے اُن فلسفیان تاریخ کے ہاتھ ایک بڑا ثبوت لگا جو میرے فلسفے میں تقدیر کو شامل کرتے ہیں۔ اس دوسری جنگ کے پیش نظر ان قائلین تقدیر کے دعوے کو رد کرنا مشکل ہے اس لئے بعض اوقات مجھے بھی ماننا پڑتا ہے کہ میرے واقعات میں تقدیر و تدبیر دونوں کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن ازراہ مصلحت جیسا کہ میں پہلے کہہ چکی ہوں میں تقدیر کو تسلیم نہیں کرتی تاکہ انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھ جائے اور کوششوں میں لگا رہے لیکن بعض فلسفیان تاریخ نے میری مصلحت کے پردے چیر کر میری مصلحت کا راز افشا کر دیا۔ اسی لئے قائلین تقدیر کی تعداد پر آشوب زمانے میں بڑھ جاتی ہے۔ اور یہ لوگ آفات کو بھی مصلحت خداوندی سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی لئے ایسے پر آشوب زمانہ میں مذہب کا زور بھی بڑھ جاتا ہے اور لوگ ایسے فلسفے کے جویا ہو جاتے ہیں جو تقدیر کی تائید کرے۔

جب تقدیر کا زور بڑھتا ہے تو تقدیر کے حامی قلم اٹھاتے ہیں اور بجائے شر کے خلاف شمشیر زنی کرنے کے تقدیر کے حق میں قلم زنی شروع کر دیتے ہیں۔ دور حاضر میں صرف ولیز نے تقدیر کے خلاف قلم اٹھایا۔ لیکن انسان کی بد نصیبی سے اس کی قلم زنی کارگر نہیں ثابت ہوئی چنانچہ حامیان تقدیر مورخوں کے ہاتھ ایک بیش بہا موقع آیا اور انہوں نے اپنی نام نہاد ''تاریخیں'' لکھیں۔ ان میں سے میں صرف دو مورخوں کا تذکرہ کرتی ہوں یعنی اسپنگلر اور ٹوئن بی کا۔

اسپنگلر اور اس کی پیشین گوئیاں

(حوالہ نمبر ۷) اسپینگلر کی کتاب "زوال مغرب" ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی جب جرمنی تقریباً شکست کھا چکی تھی۔ شکست خوردہ لوگ بشارت اور پیشین گوئی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اسپینگلر خود جرمن تھا اور اپنی قوم کی ذہنیت سے خوب واقف تھا۔ اس نے اپنی قوم کو عین حالت ناامیدی میں بشارت دی کہ باوجود اس شکست کے یہ قوم پھر ابھرے گی۔ اسی لئے اس کی کتاب جرمن قوم میں بہت مقبول ہوئی۔

مگر ساتھ ہی یہ کتاب جرمن قوم کے دشمنوں میں بھی ایک حد تک مقبول ہوئی۔ اس کا ترجمہ کئی مغربی زبانوں میں ہوا۔ اس کا انگریزی ترجمہ اب بھی فروخت ہوتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ جو نظریہ اسپینگلر نے پیش کیا وہ نظریہ اطالوی مورخ ویکو (۱۶۶۸ء تا ۱۷۴۴ء) نامی دو سو سال پہلے پیش کر چکا تھا۔ میں نے باب بعنوان "میرا اپنا فلسفہ" کے تحت اس نظریئے کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ اس نظریئے کو میں نے اپنایا۔ اس نظریئے کے مطابق قومیں باری باری سے اٹھتی ہیں اور اپنا وقت پورا کر کے دوسری قوموں کو جگہ دیتی ہیں۔ قوموں کو کون اٹھاتا ہے اور کون گراتا ہے اس کے جواب میں اختلاف ہے۔ قائلین خدا اس عروج وزوال کو خدا سے منسوب کرتے ہیں۔ قائلین "فطرت" تقاضۂ فطرت پر محمول کرتے ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اس دنیا میں متعدد قومیں اٹھیں اور گریں۔ ہمارے سامنے انگریزی سامراج کا خاتمہ ہوا اور روس امریکہ نے زور پکڑا۔

فلسفۂ اسپینگلر کے مفروضے

اسپینگلر کے "باری باری" والے فلسفہ کی بنیاد ان مفروضوں پر ہے۔

اول ۔ دنیا بظاہر مثل طبیعات غیر ذی روح نظر آتی ہے۔ یعنی دنیا کا قالب تو ہے لیکن روح سے محروم معلوم ہوتی ہے ۔ گویا قانون فطرت بے جان معلوم ہوتا ہے۔

دوئم ۔ لیکن تاریخ عالم بجائے خود "دوسری کائنات" ہے۔ اس دوسری کائنات کے اپنے خود قوانین ہیں جو پہلی کائنات یعنی فطرت کے قوانین سے مختلف ہیں۔

سوئم ۔ اس دوسری کائنات یعنی تاریخ عالم کے قوانین پر تقدیر کا راج ہے۔ قوانین فطرت اسباب پر مبنی ہیں لیکن قوانین تاریخ تقدیر کے تحت ہیں۔

چہارم ۔ قوانین فطرت کے مطابق زمانہ ایک بے جان چیز ہے۔ جو خود بخود بدلتا رہتا ہے لیکن قوانین تاریخ کے مطابق زمانے کا تعلق زندگی سے ہے۔ یعنی زمانے کے ہر دور میں کوئی نہ کوئی قوم یا جماعت اٹھتی ہے یا گرتی ہے جس طرح انسانوں میں کوئی جوان ہوتا ہے اور کوئی بڈھا ہو جاتا ہے۔

پنجم ۔ تاریخ عالم کے ہر دور میں کوئی مخصوص تمدن یا جماعت دنیا پر غالب ہوتی ہے ۔ اگر ہم مخصوص تمدن کا غلبہ تسلیم کر کے دنیا کو دیکھیں تو تاریخ عالم ہم کو سیڑھیوں کی طرح نظر آتی ہے۔ ان سیڑھیوں پر چڑھتی ہوئی قومیں بھی ہم کو نظر آتی ہیں۔

اسپنگلر کا فلسفہ تاریخ ان مفروضوں کی بنا پر اسپنگلر جو نتائج نکالتا ہے ان کو وہ اصل فلسفہ تاریخ کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ وہ نتائج یہ ہیں :۔

اوّل۔ ہر تہذیب اپنے مخصوص زمانے میں کارگر ہوتی ہے۔ ہر زمانے کے عقائد اور خیالات صرف اسی زمانے کے لئے موزوں ہوتے ہیں. اپنے زمانے کے بعد وہ فرسودہ ہوکر بیکار ہو جاتے ہیں یعنی انسان کے ہاتھ حقیقت صرف جزوی صورت میں لگتی ہے کلّی صورت میں نہیں لگ سکتی۔ تصوف کا بھی یہی اصول رہا ہے۔ صوفیوں کے نزدیک حق کلی انسان کی قسمت میں نہیں ہے۔ اصلی اور دائمی حقیقت تک انسان کی رسائی ناممکن ہے۔

دوم۔ زمانہ ماضی کی دیگر تہذیبوں کی طرح مغربی تمدن کی زندگی بھی محدود ہے۔ جو اہل مغرب اپنے تمدن کو ابدی سمجھتے ہیں وہ اسپینگلر کے نزدیک گمراہ ہیں۔ یہ گمراہ اہل مغرب نہیں جانتے کہ ان کے تمدن کے علاوہ دیگر تمدن بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اہل مغرب اس مغالطے میں ہیں کہ صرف ان کا اپنا تمدن اصلی تمدن ہے اور یہ تمدن لازوال ہے اور انہوں نے یہ تمدن "ترقی" کے ذریعہ حاصل کیا ہے۔

سوم۔ ہر زمانہ کا اپنا علیحدہ تمدن ہوتا ہے اور ہر تمدن کے اپنے مخصوص قوانین ہوتے ہیں جو صرف اپنے زمانے میں کارگر ہوتے ہیں۔ اس طرح ہر تمدن کی اپنی علیحدہ سرگذشت ہوتی ہے۔ ایک سرگذشت کا دوسری سرگذشت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے مورخوں کو ہر تمدن کی علیحدہ علیحدہ سرگذشت لکھنی چاہیئے۔

چہارم۔ باوجود علیحدگی کے ان مختلف تمدنوں میں ایک بات مشترک ہے وہ یہ کہ ہر تمدن کمال اور زوال کے دور سے گذرتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات ان تمدنوں میں مشترک نہیں پائی جاتی۔

پنجم ۔ اسپینگلر کے نزدیک دنیا نے اب تک آٹھ تمدن دیکھے ہیں۔ وہ یہ ہیں:۔
(۱) تمدن مصر در زمانۂ فراعنۂ (۲) تہذیب بابل (۳) ہندی تمدن مسلمانوں کی آمد سے پہلے (۴) تمدن چین اشتراکیت کی آمد سے پہلے۔ (۵) وسطی امریکہ کی مایا تہذیب (۶) یونان قدیم کا تمدن جس کو اہل مغرب "کلاسیکی" کہتے ہیں (۷) تمدن اسلام جو عرب سے نمودار ہوا (۸) مغربی یورپ کا رائج الوقت تمدن۔

ششم ۔ انسانوں کی طرح تہذیبوں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ جس کو اسپینگلر موسم سے تشبیہ دیتا ہے۔ عہد شباب کو وہ موسم بہار کہتا ہے۔ ادھیڑ عمر موسم خزاں ہے۔ بڑھاپا موسم سرما کی مانند ہے۔

موسم بہار کی خصوصیات

ہر قوم کا عہد شباب موسم بہار کی مانند ہے۔ موسم بہار کا آغاز ایک نئے خیال سے ہوتا ہے۔ نئے خیال کی شکلیں مختلف قوموں میں مختلف تھیں۔ یونانیوں اور ہندوستانیوں میں یہ خیال راگ مالا اور دیو مالا کی صورت میں آیا۔ اسی طرح مصر میں اس خیال کے تحت فرعون کو خدا قرار دیا گیا۔ بابل میں حکمران اس خیال کے تحت دیوتا بن گئے۔ عیسائیوں میں اس خیال نے انجیل کی صورت اختیار کی۔ مسلمانوں میں یہ خیال قرآن کی شکل میں آیا۔ مغربی یورپ میں یہ خیال پاپائیت اور پروٹسٹنٹ عقیدے کی صورت میں نمودار ہوا۔ موسم بہار کے بعد جب موسم گرما آتا ہے تو تمدن بام عروج پر پہنچتا ہے۔ اور اپنے احساس وجود میں غرق ہو کر مست ہو جاتا ہے۔ اسی عہد شباب میں اس تمدن کا مخصوص فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے وہ تمدن پہچانا جاتا ہے۔ یونان کے عہد شباب میں فیثا غورث جیسا فلسفی پیدا ہوا۔ مغرب کے شباب میں گلیلیو جیسا ماہر تحقیق نمودار ہوا

موسم خزاں کی خصوصیات

ہر قوم کی ادھیڑ عمر موسم خزاں کی مانند ہے۔ ادھیڑ عمر میں سماج کا شیرازہ ڈھیلا ہونے لگتا ہے۔ انفرادیت اور استدلالی کا آغاز ہوتا ہے یعنی ہر شخص اپنی عقل کے مطابق تاویلیں کرتا ہے یعنی ہر شخص اپنے اپنے راگ سناتا ہے جس سے یک جہتی میں خلل پڑتا ہے۔ اس زمانے میں قوم کی تعمیری قوت سے اس کے فلسفہ و حکمت کی تکمیل ہوتی ہے۔ یونان میں اسی زمانے میں افلاطون اور ارسطو نمودار ہوئے۔ جرمن قوم میں گوئٹے جیسا شاعر (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) اور کانٹ (۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء) جیسا فلسفی پیدا ہوا۔

موسم سرما کی خصوصیات

یورپ میں موسم سرما موت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ بقول اسپینگلر سرما قوم کی موت کا پیش خیمہ ہوتا ہے یعنی قوم بوڑھی ہو جاتی ہے۔ اس ضعیفی میں قوم کے ابتدائی تمدن کی تکمیل ہوتی ہے۔ مذہب کا زور کم ہو جاتا ہے اور مادہ پرستی روحانیت کی جگہ لے لیتی ہے۔ اس دور میں تمدن خشک ہو جاتا ہے اور تمدن اپنی قومی خصوصیات سے رہا ہو کر اپنے حدود سے باہر نکلتا ہے تمدن کا روحانی پہلو خشک مذہب اور خشک اخلاق کی صورت اختیار کرتا ہے۔ ہندوؤں میں اسی دور ضعیفی میں بدھ مذہب پیدا ہوا۔ مغرب میں اس دور میں اشتراکیت نے سر اٹھایا۔ اسی طرح زوال پذیر قوم کے فنون۔ اس کی سیاست، اس کا معاشرہ منجمد ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی روح حرکت سے محروم ہو جاتی ہے اپنی شخصیت کھو کر ایسی قوم دریا کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگتی ہے۔

نیز ہر تمدن یکساں دوروں سے گذرتا ہے۔ اس نظریے میں اسپینگلر ابن خلدون کا مقلد ہے جس نے قوموں کی ابتدا۔ عروج اور زوال کے لئے یکساں

دور متعین کیے۔ اس نظریے سے اسپینگلر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اگر کسی قوم کے کسی ایک دَور کا حال معلوم ہے تو اس کے دوسرے دوروں کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ اسی بنا پر اس نے مغربی تمدن کے آنے والے دور کے متعلق پیشین گوئی کی اور یہاں تک کہہ دیا کہ مغربی تہذیب کی قیادت اب جرمن قوم کے ہاتھ آنے والی ہے کیونکہ اب دورِ قیصریت شروع ہونے والا ہے۔

اسپینگلر کو مشرق میں "شفق کی سُرخی" نظر آئی جس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اب روس اور اشتراکیت کی باری آرہی ہے۔ روس کی جدید تہذیب اشتراکیت پر ہی مبنی ہے اور یہ تہذیب مغرب پہ چھا جائے گی۔ اسپینگلر کے نزدیک جمہوریت اور پارلیمانی قسم کی حکومت زوال کی نشانی ہے ترقی کی نہیں۔ اسپینگلر سے پہلے مورخوں کو جو بیں ترقی نظر آتی تھی اور یہ مورخ دعویٰ کرتے تھے کہ دُنیا مائل بہ ترقی ہے۔ لیکن اس جرمن مفکر نے دعویٰ کیا کہ نظریۂ ترقی محض خیال خام ہے۔ اور واقعات تاریخ کی بنا پر کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی کلیہ قائم کیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ہم پابند تقدیر ہوں لیکن تقدیر کی کارفرمائی دیکھنے اور سمجھنے کے لئے دماغ کی نہیں بلکہ دل کی ضرورت ہے۔ یعنی میرا فلسفہ صرف اہلِ دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بقول شاعر:-

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

اسپینگلر کے نزدیک قومیں بہ اشارۂ تقدیر یعنی حکم خدا سے

اُبھرتی ہیں اور عقل کے ذریعہ سے نہیں بلکہ عقیدے کے زور سے ترقی کرتی ہیں۔ اور اپنے حدود میں رہ کر وہ بام ترقی پر پہنچتی ہیں۔ جن قوموں نے اس طرح ترقی حاصل کی ان کی تعداد بقول اسپینگلر صرف آٹھ ہے۔ ان آٹھ تہذیبوں نے صرف اپنے زور سے اور بلا امداد غیری اپنے اپنے تمدن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اسپینگلر کا فلسفۂ تاریخ اسی نظرئیے پر مبنی ہے۔ وہ اس بات کا قائل نہیں کہ ایک قوم دوسری قوم سے سیکھتی ہے۔ بلکہ اس کے نزدیک جب کوئی قوم اپنے حدود سے باہر نکل کر دوسری قوم کی دریوزہ گری کرتی ہے تو یہ اس کی زوال کی نشانی ہے۔

جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ اس کا مقصد اس تصنیف سے یہ تھا کہ وہ مغرب کو اس کے آنے والے زوال سے آگاہ کرے چنانچہ وہ اپنی اس کتاب کے آغاز میں لکھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۸)

"اس کتاب میں پہلی مرتبہ کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ کے آئندہ مرحلوں کا اندازہ لگایا جائے جو مغربی یوروپین امریکن کے نام سے موسوم ہے اور یہی تمدن اب منتظر تکمیل ہے۔" بالفاظ دیگر اب یہ مغربی تمدن منتظر زوال ہے۔

اس تمہید کے بعد اسپینگلر لکھتا ہے:۔

"کیا تاریخ کی اپنی کوئی منطق ہے؟ متفرق اور علیحدہ علیحدہ واقعات کے ورے کیا کوئی چیز ہے جس کو ہم تاریخ کا فلسفیانہ ڈھانچہ کہہ سکتے ہیں۔ اگر ایسا ڈھانچہ ہے تو کیا یہ ڈھانچہ انسانی روح، سماج اور انسانی سیاست سے

صاف اور علیحدہ نظر آتا ہے۔ جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے
کیا وہ خود اپنی کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ کیا ہمیں تاریخ عالم
میں برابر اور یکساں کوئی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ جن سے
ہم کوئی کلیہ اخذ کر سکیں۔؟ اگر واقعی یہ خصوصیات نظر
آتی ہیں تو ہم ان کی بنا پر کس حد تک دلائل قائم کر سکتے
ہیں؟ ..... کیا قوموں کی زندگی بھی افراد کی زندگی
کی طرح ہے؟

ان سوالات کے بعد اسپینگلر کہتا ہے کہ دورِ حاضر کا تمدن اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کے آئندہ انجام کا ذکر کیا جائے گویا اسپینگلر کے فلسفۂ تاریخ کا تعلق آئندہ زمانے سے ہے۔ صاف لفظوں میں یوں کہئے یہ فلسفی آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کر رہا ہے۔

اسپینگلر نے اپنی پیشین گوئیاں ان کُلیوں کی بنا پر کیں جو اس نے واقعاتِ تاریخ سے اخذ کئے۔ لیکن یہ کلیئے انہیں واقعات سے رد بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً اسپینگلر کہتا ہے کہ ہر قوم اپنے حدود ہی میں رہ کر بامِ ترقی تک پہنچتی ہے۔ اور دورِ ترقی میں۔ وہ قوم کسی اور قوم سے کچھ نہیں سیکھتی۔ لیکن تاریخ اسلام کے واقعات اسپینگلر کے اس کلیئے کو رد کرتے ہیں۔ اسلام کے قائم کردہ معاشرے سے تُرک اور حبشی قومیں بھی متاثر ہوئیں اور ایسی متاثر ہوئیں کہ ترکوں نے ایک عالی شان سامراج قائم کر دیا۔ اسپینگلر کا یہ دعویٰ ہے کہ واقعات تاریخ کے اسباب عقل یا منطق نہیں بتا سکتی کیونکہ یہ واقعات تقدیر کے اشارے سے رونما ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں نے جو اپنی تہذیب

پھیلائی اس کی اشاعت کے اسباب صاف نظر آتے ہیں جن کو عقل و منطق بھی تسلیم کرتی ہے۔ مسلمانوں نے خود سابقہ تہذیبوں سے استفادہ کیا۔ اسی طرح دورِ عباسی میں ایرانی اثرات مسلمانوں کے سماج میں داخل ہوئے۔

اسپنگلر کے فلسفے میں تقدیر کا زور

اسپنگلر کے فلسفۂ تاریخ کا جزوِ اعظم تقدیر ہے اس سلسلے میں وہ کہتا ہے :۔

"بنی نوعِ انسان کا نہ کوئی مقصد ہے نہ کوئی خیال ہے اور نہ کوئی منصوبہ ہے (اس معاملے میں انسان تتلی یا پھول کی طرح ہے۔ لفظ "انسان" علم حیوانیات سے متعلق محض ایک محاورہ ہے یا خالی خولی لفظ ہے۔۔۔۔"

آگے چل کر اسپنگلر مغربی تمدن کے متعلق کہتا ہے کہ یورپ اس تمدن کا مرکز نہیں "آج کل ہمارے ذہن پر کئی برّاعظم مسلّط ہیں لیکن ہمارے مؤرخ اور فلسفی اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اس لئے ان کے جملہ تصورات عالمگیر اطلاق کے حامل نہیں"۔

اسپنگلر نوشتۂ تقدیر کا اس درجہ قائل ہے کہ اس کے نزدیک جب کوئی تمدن انحطاط پذیر ہو جاتا ہے تو اس کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں یعنی قوموں کو توبہ کا موقع نہیں دیا جاتا۔ وہ کہتا ہے کہ :۔

"ہر تمدن کو اپنے اظہار کے لئے نئے نئے مواقع دئے جاتے ہیں۔ یہ مواقع امکانات کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور پختہ ہو کر رُو بہ زوال ہوتے ہیں۔ اور پھر دوبارہ یہ مواقع ہاتھ نہیں آتے ... مجھے تو تاریخِ عالم میں جو نقشہ

نظر آتا ہے اس میں لا انتہا بناوٹیں اور تبدیلیاں ہیں
اس کے برعکس پیشہ ور مؤرخ کو اس نقشے میں محض ایک کیڑا
نظر آتا ہے۔ جو بڑی مشقت سے ایک عہد کے بعد دوسرا
عہد جوڑتا چلا جا رہا ہے۔"

گویا انسان ایک کیڑے کی مانند ہے جو زمانہ اور اس کی تبدیلیوں سے ناآشنا ہے۔

انسان کو ایک سرے پر فطرت کے تماشے نظر آتے ہیں دوسرے سرے پر اس کو واقعاتِ تاریخ نظر آتے ہیں اور وہ یہ نہیں معلوم کر سکتا کہ اس کو کس کا ساتھ دینا چاہیئے۔ صرف اہلِ دل ہی اپنے قوتِ مکاشفہ سے اس معمہ کو حل کر سکتے ہیں۔ اس معمّہ کا حل پیشہ ور مؤرخ کے بس کا روگ نہیں۔ فطرت تو اپنے قوانین میں جکڑی ہوئی ہے۔ تاریخ اپنے قوانین تقدیر میں گرفتار ہے۔ انسان بیچارہ ان کے درمیان پھنس کر بے بس ہے۔ لیکن صرف چند اہل دل کے پاس علاوہ قوت باصرہ کے قوت مکاشفہ بھی ہوتی ہے۔ جس کے ذریعہ وہ تاریخ کا آیندہ راستہ بھی معلوم کر لیتے ہیں بالفاظ دیگر یہ اہلِ دل آیندہ کے متعلق پیشین گوئیاں بھی کر سکتے ہیں۔

گو اسپینگلر صاف صاف کاشف ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا لیکن اس کے نفس مضمون سے یہ دعویٰ ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کو مطالعۂ فطرت کے لئے بذریعہ تعلیم تیار کیا جا سکتا ہے لیکن تاریخ نگاری کی قابلیت اکتسابی نہیں بلکہ پیدائشی ہوتی ہے۔ پیدائشی مؤرخ میں وہ اہلیت ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ ایک نظر میں انسان اور واقعات کی نوعیت کو بھانپ لیتا ہے واقعات کو مناسب طریقے سے اور نمبروار درج کرنا معمولی بات ہے جس

کو انسان سیکھ لیتا ہے۔ لیکن مکاشفے سے واقعات کی نوعیت معلوم کرنا
دوسری چیز ہے۔ اس کے لئے قوت اختراع و ایجاد کی ضرورت ہے۔
اس کے لئے قوت مکاشفہ کی ضرورت ہے جو پیشہ ور مؤرخ میں نہیں ہوتی۔

الغرض اسپنگلر کے فلسفۂ تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ واقعات تاریخ
کی نوعیت کو صرف اہل دل ہی بذریعہ مکاشفہ سمجھ سکتے ہیں اور مکاشفہ
کے ذریعہ وہ غیب کا حال بھی بتا سکتے ہیں۔ یعنی بقول اسپنگلر پیشین گوئی
تاریخ نگاری کا جزو اعظم ہے۔ لیکن کیا اسپنگلر کی پیشین گوئیاں صحیح ثابت
ہوئیں؟ اس کی مخصوص پیشین گوئی یہ تھی کہ جرمن قوم باوجود اپنی شکست
کے پھر اٹھے گی اور مغرب پر غالب ہو جائے گی۔ اس نے اپنی کتاب میں
یہ ایسے زمانے میں لکھا جب اس کی قوم فرانس کے زیردست ہو کر شکست
کی سختیاں جھیل رہی تھی۔ اس وقت اس قوم کو بشارت کی سخت ضرورت
تھی۔ اسپنگلر نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ اور اس لئے وہ اور اس کی
کتاب فوراً اس کی قوم میں مقبول ہو گئی۔ اس کی پیشین گوئی کے مطابق
جرمن قوم نے ہٹلر کی قیادت میں بیشک پھر سر اٹھایا لیکن دوسری
عالمگیر جنگ میں اس قوم نے پھر منہ کی کھائی اور مغرب پر غلبہ حاصل
کرنے کی بجائے اس کے ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے اور جرمنی کا قدیم
دشمن روس مشرقی جرمنی کو دبا بیٹھا۔

اسپنگلر کی کتاب میں علاوہ غلط پیشین گوئیوں کے ایک اور خامی
بھی ہے۔ ایک طرف تو وہ کہتا ہے کہ ہر تمدن خود ساختہ ہوتا ہے۔
جس کو اصل تمدن گر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ان تمدن گروں کا اب نشان
تک باقی نہیں۔ لیکن باوجود اس کے اسپنگلر خود ان قدیم تمدنوں کا

ذکر ہی نہیں کرتا بلکہ ان تمدنوں کا دورِ حاضر کے مغربی تمدن سے مقابلہ بھی کرتا ہے۔ جب یہ قدیم تمدن اغیار کے سمجھ میں نہیں آسکتے اور ساتھ ہی وہ مفقود بھی ہو چکے ہیں تو اسپینگلر نے ان مفقود تمدنوں کا کس طرح مطالعہ کیا اور ان کا مغربی تمدن سے کیونکر مقابلہ کیا؟

اب میں تیسرے پیشین گو قسم کے مؤرخ پروفیسر ٹوئن بی کا تذکرہ شروع کرتی ہوں جو اسپینگلر سے بھی پیشین گوئیوں کے معاملے میں ایک قدم آگے بڑھ گیا۔ اسپینگلر نے تو صرف ایک کتاب تین جلدوں میں لکھی لیکن ٹوئن بی نے دس ضخیم جلدیں لکھ ڈالیں۔ ان جلدوں کا خلاصہ پروفیسر سومرویل نے دو جلدوں میں کیا ہے۔ لیکن یہ "خلاصہ" بھی (۶۱۷ + ۴۱۴) ۱۰۳۱ صفحوں میں ہے۔ اس باب میں اصل کتاب کی دس جلدوں سے اور "خلاصہ" دونوں سے کام لیا گیا ہے۔

پروفیسر ٹوئن بی اور اس کا ماحول

اساتذۂ تاریخ اپنے شاگردوں کو برابر تاکید کرتے رہتے ہیں کہ کسی مؤرخ کی تاریخ پڑھنے سے پہلے اس مورخ کے حالاتِ زندگی معلوم کر لو۔ میں بھی اس مشورے پر عمل کر کے پہلے اس مؤرخ کے حالاتِ زندگی اور اس کے ماحول کا حال بتاتی ہوں۔ جن لوگوں کو اس استاد کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا ہے (ان میں میری سرگذشت کا مصنف بھی شامل ہے) وہ اس کی جلد باز طبیعت سے خوب واقف ہیں جس طرح اس کا حافظہ تیز ہے اسی طرح اس کی طبیعت بھی تیز ہے۔ یہ فاضل استادِ تاریخ دو واقعات سے چار نتائج اخذ کرتا ہے۔ انگلستان کے

تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ عادت اچھی نہیں سمجھی جاتی۔ انگریز اساتذہ چار واقعات سے بہ مشکل تمام ایک نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور وہ ایک نتیجہ بھی بدقت تمام لفظ "شاید" یا لفظ "غالباً" لگا کر پیش کرتے ہیں۔

اس کے برعکس امریکہ میں ایک واقعہ کی بنا پر کئی نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اور ان نتائج کو بڑے وثوق کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اسی لئے ٹوئن بی کی کتاب امریکہ میں بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ ٹوئن بی نے دو عالمگیر جنگوں کا زمانہ بچشم خود دیکھا بلکہ پہلی جنگ میں تو اس کو حصہ لینا پڑا۔ ۱۹۱۹ء میں وہ بحیثیت مشیر ورسائی کے صلحنامہ کے موقع پر موجود تھا۔ غالباً ترکی سامراج کے خاتمہ کا مشورہ بھی فاتحین کو اسی نے دیا۔

دوسری جنگ کے بعد ٹوئن بی نے اپنے سامراج کو برباد ہوتے ہی دیکھا۔ اس کی طبیعت پر شروع ہی سے مذہب عیسوی کا غلبہ تھا۔ اپنے سامراج کی بربادی کو دیکھ کر یہ غلبہ خبط بن گیا۔ چنانچہ اس نے ۱۹۴۸ء میں اپنی کتاب "آزمائش تہذیب" شائع کی۔ جس کے دیباچہ میں اس نے صاف صاف لکھا کہ "اب تاریخ دینیات میں مدغم ہو رہی ہے"

اس قسم کے بیانات سے ٹوئن بی کی انتہا پسند طبیعت کا صاف پتہ چلتا ہے۔ مؤرخ کو انتہا پسندی گمراہ کر دیتی ہے۔ بیشتر مورخوں کو میں سیدھے سادے راستے پر چلتی نظر آتی ہوں لیکن ٹوئن بی کو میں سائیکل کی طرح چکر کھاتی معلوم ہوتی ہوں۔ یہ میرا قصور ہے یا اس کی نظر کا؟ چکر کا نظریہ اس نے اسپینگلر سے لیا۔

ٹوئن بی کا نظریہ للکار اور جواب للکار

البتہ ٹوئن بی کا نظریہ "للکار دجواب

للکار" اس کا اپنا قائم کردہ ہے۔ اس نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ جب آفت
کسی قوم کو گھیر لیتی ہے تو یہ آفت ایک قسم کی للکار ہے۔ اگر قوم میں
کوئی بل بوتا نہیں تو وہ اس آفت کا شکار ہو کر ختم ہو جاتی ہے لیکن
اگر دم باقی ہے تو وہ اس آفت پر غالب ہی نہیں ہوتی بلکہ آفت میں
پھنس کر وہ پہلے سے زیادہ چاق چوبند ہو جاتی ہے اور پہلے سے
زیادہ ترقی کرتی ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ اس قسم کی للکاروں (یعنی چیلنجوں)
سے بھری پڑی ہے۔ پہلا چیلنج ابو جہلیت کی طرف سے تھا جس کے
جواب سے اسلام میں وہ جان پیدا ہوئی کہ سو سال کے اندر ہی اس
کے سامنے قیصر و کسریٰ سرنگون ہو گئے۔

ابو جہلیت کے بعد اسلام کو چھوٹے موٹے کئی چیلنج ملے لیکن
سب سے بڑا چیلنج وہ تھا جو چنگیزیوں نے مسلمانوں کو دیا۔ بغداد ۱۲۵۸ء
میں انھیں چنگیزیوں کے ہاتھ تباہ ہوا لیکن شاباش ہے ترکوں کو کہ
ان کی بدولت اسلام کو وہ نگہبان مل گئے جنہوں نے دو صدی کے
اندر قسطنطینیہ پر ہاتھ مارا۔ تیسرا بڑا چیلنج وہ تھا جو اٹھارویں صدی
عیسوی میں اقوام مغرب نے دینا شروع کیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں
تمام عالم اسلام مغرب سے مغلوب ہو گیا لیکن مسلمانوں میں بل بوتا
باقی تھا۔ چنانچہ موجودہ صدی کے وسط میں یہ عالم اسلام پھر رہا ہو گیا۔

ٹوئن بی کے نظریہ "للکار د جواب للکار" کا اطلاق اور قوموں
پر بھی ہوتا ہے اسی نظریے کے مطابق اس کو مغربی تمدن معرض خطر نظر
آتا ہے۔ جب پہلی عالمگیر جنگ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تو وہ اپنے
شاگردوں کو مشہور یونانی مورخ توقیدائیدیس (۴۷۱ء تا ۴۰۰ء قبل مسیح)

کی نوشتۂ تاریخ موسومہ "جنگ پولوپینس" پڑھ رہا تھا۔ یونانیوں کے لئے یہ جنگ ویسی ہی قیامت خیز تھی جیسی کہ یہ عالمگیر جنگ مغرب کے لئے تھی۔ اس یونانی تاریخ نے ٹوئن بی کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ کہتا ہے کہ :۔ (حوالہ نمبر ۹)

"اب مجھے (اس یونانی مؤرخ) کے الفاظ کے معانی روشن ہو گئے اور اس کے احساسات کا پتہ چلا جن پر اس کے جملے مبنی تھے۔ لیکن جن کے معانی سے میں بے خبر تھا حتیٰ کہ میں خود اس تاریخی بحران میں گرفتار ہو گیا۔ جس کے تحت (اس یونانی مورخ نے) اپنی کتاب لکھی تھی۔"

ٹوئن بی کے اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس بات کا قائل ہے کہ میں ہمیشہ اپنے آپ کو دُہراتی رہتی ہوں حالانکہ میں نے کئی مرتبہ اس سرگذشت میں بتایا ہے کہ میرے لئے یہ تواتر ممکن نہیں۔ کیونکہ زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ اور ایک ہی حالت پر دنیا قائم نہیں رہتی۔ اسی غلط معروضے کی بنا پر وہ کہتا ہے کہ :۔

"توقی دائیدیس اور اس کا زمانہ بہ نسبت میرے اور میرے زمانے کے تاریخی تجربات کے معاملے میں مجھ سے بہت آگے تھا۔ فی الحقیقت اس کا زمانہ حال میرے لئے زمانۂ مستقبل بن گیا۔ اسی طرح جنتری بیکار ہو گئی جس کی رُو سے میری دنیا جدید اور اس کی دنیا قدیم کہلاتی ہے۔ جنتری خواہ کچھ بھی کہے لیکن باعتبار خیالات ہم دونوں ہم عصر نظر آئے۔"

یہ بیان اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ زمانہ متحرک نہیں بلکہ ساکن ہے اس دلیل کی بنا پر وہ یونانی رومی تمدن اور مغربی تمدن کے درمیان رشتہ

قائم کرتا ہے اور دیگر تمدنوں کے درمیان بھی ناتا جوڑتا ہے۔ یہاں اسپینگلر اور اس کے درمیان صریحاً اختلاف نظر آتا ہے کیونکہ اسپینگلر کے بموجب ہر تمدن اپنے حدود کے اندر رہتا ہے اور غیر علاقوں کے تمدن سے اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ٹوئن بی کا مفروضہ زمانے کے ساکن ہونے کے متعلق غلط ہے۔ گویا اس نے اپنے فلسفۂ تاریخ کی بسم اللہ ہی غلط کی۔ اور اس غلط مفروضے پر اس نے اپنے فلسفے کی عمارت تعمیر کی۔ بقول مولانا روم :-

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

اس غلط مفروضے کی بنا پر وہ عجیب عجیب نتائج اخذ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بہ نسبت کائنات کی عمر کے بنی نوع انسان کی عمر اور خصوصاً مہذب انسان کی عمر بہت ہی کم ہے۔ اسی کم عمری کے دوران میں دنیا میں انسان نے متعدد تمدن قائم کئے لیکن یہ انسانی تمدن کل پانچ یا چھ ہزار پرانا ہے۔ لہٰذا بقول ٹوئن بی یہ سب تمدن ایک طرح سے ایک دوسرے کے ہم عصر تھے۔

لیکن ٹوئن بی کا اخذ کردہ یہ نتیجہ اسپینگلر کے نظریے کے خلاف تھا۔ لہٰذا اس انگریز نے اس جرمن فلسفی کی غلطی معلوم کرنے کی کوشش شروع کی۔ بقول اسپینگلر ہر تمدن اپنے علاقے میں پیدا ہوا یہیں بڑھا اور بالآخر ختم ہوا۔ وہ قومیں متمدن ہوئیں جو نسلاً مضبوط تھیں۔ اور جن کا ماحول ترقی کے لئے سازگار تھا۔ یورپ کے لوگ مضبوط تھے۔ اور ان کے علاقے کی آب و ہوا بھی سازگار تھی لیکن روحانیت کے

کے لحاظ سے اہل مغرب اہل مشرق کی ہمسری نہ کر سکے۔ البتہ سیاہ فام قومیں ترقی کے معاملے میں پسماندہ رہیں۔ لیکن اقوام مشرق کی تاریخ بتاتی ہے کہ مشرق کا ایک تمدن دوسرے سے منسلک تھا۔ یعنی تمدن کا چراغ ایک دوسرے سے روشن ہوتا رہا۔ مگر یہ نظریہ اسپینگلر کے نظریے کے متضاد ہے جس کے مطابق ہر تمدن ایک ہی علاقے میں محدود رہا۔ لہذا ٹوئن بی نے اسپینگلر کے نظریہ "ماحول سازگار" کو خارج کیا۔ اور اب یہ انگریز محقق قدیم قوموں کی دیو مالا (مائی تھولوجی) کی طرف متوجہ ہوا جس کے ذریعہ قوموں کی ذہنی رسائی کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ ٹوئن بی نے گوئٹے کے مشہور ڈرامہ موسومہ "فاؤسٹ" کا مطالعہ کیا۔ اس ڈرامہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ بعد تخلیق آدم فرشتے خدا کی حمد شروع کرتے ہیں کہ یکایک ابلیس نمودار ہوتا ہے اور کہتا ہے:۔

"اے خدا! میں تیرے لطف و کرم کے آگے سر جھکاتا ہوں لیکن مجھے تو (تیرا پیدا کردہ آدم) ایک جھینگر کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ جو ہر طرف اچھلتا کودتا ہے اور اُچھل کر گھاس پر گر پڑتا ہے اور پُرانا گیت گاتا ہے لیکن یہ اس پر قناعت نہ کرے گا۔ بلکہ کیچڑ میں اپنی ناک دے گا..... اے خدا میں صاف صاف اس کی اصلیت بتاتا ہوں۔ یہ بُرا ہے اور یہ بُرائیوں میں ڈوبے گا۔"

لیکن خدا ابلیس کی باتوں میں نہ آیا اور اپنے کار تخلیق کو جاری رکھا یہاں تک کہ بنی آدم اور ابلیس میں ٹکر ہوئی۔ ابلیس نے انسان کو للکارا لیکن انسان اس للکار (یعنی چیلنج) سے خائف ہونے کی بجائے بیدار ہوا۔

اور اس طرح ٹوئن بی کے نظریہ "للکار و جواب للکار" کی بنیاد قائم ہوئی۔ گویا شر کی للکار سے خیر جاگتا ہے۔ اور شر کا مقابلہ کرتا ہے۔ اگر کسی قوم میں کافی بل بوتا ہے تو وہ قوم شر سے مغلوب ہونے کی بجائے اس پر غالب ہو کر آگے ترقی کرتی ہے۔ گویا ٹوئن بی نے اپنا نظریہ "للکار و جواب للکار" دیو مالا (مائی تھولوجی) سے لیا لیکن اس کا اطلاق ہر جگہ ہو سکتا ہے۔

ٹوئن بی اسی نظریہ کے تحت اس بات کا سبب بتاتا ہے کہ بعض قومیں تو ترقی کر کے بام عروج پر پہنچ گئیں۔ لیکن افریقہ کے جنگلوں کی قومیں اپنے ابتدائی دور سے آگے نہ بڑھ سکیں یعنی افریقہ کا ماحول ایسا نہ تھا کہ للکار کر ان قوموں کو جگاتا یا ان قوموں میں اتنا بل بوتا نہ تھا کہ وہ اس للکار پر جاگ اٹھتیں۔ افریقہ کے ان علاقوں میں گویا شر کی فتح ہوئی لیکن بقول ٹوئن بی ایشیا میں اور بعد کو یورپ میں شر کی للکار سے خیر بیدار ہوا۔ یورپ اور ایشیا کی ترقی کا راز بقول ٹوئن بی یہی ہے۔

علاوہ ٹوئن بی کے نظریہ "للکار و جواب للکار" اس کے فلسفۂ تاریخ میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا فلسفہ صرف مغرب کی تاریخ پر نہیں بلکہ تمام عالم کی تاریخ پر مبنی ہے۔ جرمن فلسفی ہیگل نے بھی اپنے فلسفۂ تاریخ میں مشرقی ممالک کو شامل کیا لیکن یہ محض بطور تذکرہ تھا۔ اس کے فلسفے کی اصل بنیاد صرف جرمنی کی تاریخ پر تھی۔ لیکن ٹوئن بی کا فلسفۂ تاریخ مشرقی ممالک سے شروع ہوتا ہے جہاں سے تمدن کی ابتدا ہوئی۔ اس لحاظ سے ٹوئن بی کے فلسفۂ تاریخ کا محیط باوجود اس کی غلطیوں کے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

ٹوئن بی کے مقرر کردہ اکیس [۲۱] تمدن	اسپینگلر کا فلسفۂ تاریخ صرف آٹھ

تہذیبوں پر مبنی تھا لیکن ٹوئن بی نے اپنے فلسفے میں اکیس[۲۱] تمدن شامل کیے۔ ان اکیس تمدنوں کی کئی شاخیں بھی ہیں شاخوں کو چھوڑ کر ان اکیس تمدنوں کے نام یہ ہیں۔ لیکن ان کی ترتیب بہ لحاظ زمانہ اُلٹی ہے۔ یعنی سب سے پہلے دورِ حاضر کے تمدن ہیں اور اس کے بعد دورِ قدیم کے تمدن علی الترتیب آتے ہیں۔ (حوالہ نمبر ۱۰)

(۱) مغربی تہذیب جو آج کل مغربی یورپ اور امریکہ پر مسلط ہے۔

(۲) مشرقی عیسوی کلیسا جو بیشتر مشرقی یورپ پر مسلط ہے۔

(۳) قدیم ایرانی تہذیب جس کا آخری زور ساسانیوں کے عہد میں ہوا۔

(۴) عربی یعنی اسلامی تہذیب جو بعد خروج اسلام ایران پر بھی چھا گئی۔

(۵) ہندو تہذیب جس کا مخرج ہڑپہ اور مہنجو دارو کی تہذیب تھی۔

(۶) چینی تہذیب جس کے محیط میں جاپان اور تمام بعید مشرق کا علاقہ تھا۔

(۷) یونانی تہذیب جو بعد توسیع "ہیلینی" تہذیب کے نام سے موسوم ہوئی۔

(۸) شامی تہذیب جس کی مڈبھیڑ اسلام سے ہوئی۔

(۹) ہڑپہ اور مہنجو دارو کی تہذیب جو آریا قوم کے ہاتھوں برباد ہوئی لیکن جس سے ہندو تہذیب متاثر ہوئی۔

(۱۰) قدیم چینی تہذیب جو بدھ مذہب کی آمد سے پہلے چین میں رائج تھی۔

(۱۱) منوئی تہذیب جو جزیرہ قریطہ میں رائج تھی اس کے آثار کھود کر نکالے گئے۔

(۱۲) سمیری تہذیب جو اس علاقے میں رائج تھی جو آج عراق کہلاتا ہے۔
(۱۳) حطّی تہذیب جو بلادِ روم میں یعنی ایشیائے کوچک میں رائج تھی یہ علاقہ آج کل ترکی کہلاتا ہے۔
(۱۴) بابلی تہذیب جس کے زمانے میں "فردوسِ نمرود" بنائی گئی حضرت ابراہیمؑ اسی عہد میں پیدا ہوئے اور توحید کی تلقین کی۔
(۱۵) انڈانی تہذیب جو خود بخود جنوبی امریکہ میں پیدا ہوئی۔
(۱۶) میکزیکو کی تہذیب جو وسطی امریکہ میں رائج تھی۔
(۱۷) یوکاٹن تہذیب جو جنوبی امریکہ کے علاقۂ پیرو میں رائج تھی۔ یہ تہذیب فنِ تحریر سے ناآشنا تھی۔
(۱۸) مایا تہذیب جس کے آثار امریکہ کے مختلف علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔
(۱۹) فراعنۂ مصر کے زمانے کی تہذیب جس کے سامان اور آثار فراعنہ کی قبروں میں مدفون ہیں۔

ان انیس تہذیبوں کے سلسلے میں ٹوئن بی دو اور تہذیبوں کا ذکر کرتا ہے جو اب اس کے بقول "خشک ہو کر" رہ گئی ہیں۔ وہ یہ ہیں:- (حوالہ نمبر ۱۱)

(۲۰) یعقوبی عیسوی فرقے کی تہذیب جو مذہب عیسوی کے ٹکڑے ہونے کے بعد عراق۔ مصر اور ملک حبش میں قائم ہوئی۔ نسطوری فرقہ بھی اسی زمرے میں ہے۔
(۲۱) بدھوی تہذیب جو علاقہ تبت میں لامائی تہذیب کے نام سے موسوم ہوئی۔

پروفیسر مذکور نے اپنی ضخیم کتاب میں ان تمام تہذیبوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ ان اکیس تمدنوں کی شاخیں بھی قائم کیں۔ ان تمدنوں کے آغاز عروج اور زوال کا حال معلوم کرنے کے بعد اس نے اپنا فلسفۂ تاریخ قائم کیا۔ اور اس مطالعہ سے اس نے جو نتائج اخذ کیے ان پر اس نے اپنے فلسفے کی عمارت تعمیر کی۔ اس وسیع مطالعہ کے بعد پروفیسر مذکور کی آنکھیں ایسی کھلیں کہ اس کو دورِ جدید کی قومی حکومتیں ہیچ نظر آئیں اور اسی لئے اس نے یہ دس جلدیں لکھیں۔

سببِ تالیف ٹوئن بی اپنی پہلی جلد میں سببِ تالیف بھی اس طرح بیان کرتا ہے۔ (حوالہ نمبر ۱۲)

(۱) یہ اکیس تہذیبیں اتنی وسیع اور بااثر تھیں کہ ان کے آگے آج کل کی قومی حکومتیں یا یونان کی شہری حکومتیں بلحاظ زماں و مکاں ہیچ معلوم ہوتی ہیں۔

(۲) آج کل کی قومی حکومتیں بلحاظ زماں و مکاں نہایت محدود ہیں۔ یہ حکومتیں محض سیاست سے متعلق ہیں۔ سماج سے نہیں اور اس لئے بذاتِ خود ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

(۳) یہ تمام قومی مغربی حکومتیں دراصل قدیم یونانی شہری حکومتوں کا شاخسانہ ہیں۔ اور اس لئے ان مختلف مغربی قومی حکومتوں کا مخرج ایک ہی ہے۔ بلحاظ نوعیت ان مختلف قومی حکومتوں میں کوئی فرق نہیں۔

(۴) یہ قومی مغربی حکومتیں جملہ بنی نوع انسان پر حاوی نہیں ہیں۔ نہ بلحاظ سیاست نہ بلحاظ تمدن۔ بلکہ یہ تو محض "ہیلینی" تمدن کا

تناخسانہ نہیں۔

(۵) لہٰذا ان مغربی حکومتوں کی تاریخ کے مطالعے سے ہمیں تاریخ کا صرف ایک رُخ نظر آتا ہے کیونکہ یہ مغربی حکومتیں صرف ایک ہیلینی تہذیب کی دریوزہ گر ہیں۔

(۶) لیکن تاریخ تو ایسا علم ہے جس میں تمام دُنیا کے انسانوں کی تاریخ شامل ہونی چاہیئے۔

ٹوئن بی نے اپنی تاریخ میں مشرق کو اس لیئے شامل کیا کہ آج کل کے تصوّرِ تاریخ کے مطابق تاریخ انسانی تہذیب کی کہانی ہے نہ کہ محض قومی حکومتوں کی۔ اسی لئے اس نے اپنی کتاب میں اسپینگلر کی آٹھ تہذیبوں کی جگہ اکیس تمدن شامل کیئے۔

تمدنوں کی تقسیم بلحاظ انجام

اس نے دنیا کے تمدنوں کو بلحاظ انجام ان زمروں میں تقسیم کیا:۔

اوّل۔ وہ گروہ یا جماعتیں جن کو ترقی کا موقع ہی نہ ملا۔ یعنی وہ اپنے ماحول کے چیلنج کا جواب نہ دے سکیں۔ سائبیریا کی سخت سردی نے اس علاقے کے باشندوں کو ایسا دبا لیا کہ وہ ترقی سے محروم رہ گئے۔ اسی طرح افریقہ کے گھنّے جنگلوں میں اس علاقے کے سیاہ فام باشندے دب کر رہ گئے۔

دوئم۔ وہ گروہ یا جماعتیں جنہوں نے ایک حد تک اپنے ماحول کے للکار یعنی چیلنج کا جواب دیا اور قومیت کی منزل تک بھی پہنچ گئیں لیکن اس سے آگے قدم نہ بڑھا سکیں۔ بقول ٹوئن بی ان زمرے میں یہ قومیں شامل ہیں:۔

(۱) پولی نیشی قومیں جو آسٹریلیا کے ارد گرد کے جزیروں میں آباد تھیں۔

(۲) ایس کیمو جو شمالی امریکہ کے برفانی علاقے میں آباد تھے اور اب بھی ہیں۔

(۳) خانہ بدوش جماعتیں جو صحرائی علاقوں میں گھومتی پھرتی رہتی تھیں۔

(۴) عثمانی ترک جنہوں نے اپنے دشت و بیابان کے چیلنج کا جواب تو دیا لیکن یورپ میں پہنچنے کے بعد یہ قوم اہل مغرب کے چیلنج کا جواب نہ دے سکی۔ یعنی یورپ کے لوگوں کو مفتوح تو کر لیا لیکن ان کو روحانی طور سے مفتوح نہ کر سکے۔ اور بالآخر ان کو یورپ سے نکلنا پڑا۔ لیکن ٹوئن بی یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ایک عرصے تک عثمانی ترک اپنے مفتوحوں کے چیلنج کا جواب بھی دیتے رہے وہ اس طرح کہ انہوں نے "ینی چری" فوج کی ترکیب نکال کر عیسائیوں کے بچّوں سے کام لیا اور خوب لیا جس کی بدولت یہ قوم تین سو سال تک اہلِ مغرب پر حکمران رہی۔

(۵) قوم اسپارٹا جس نے اپنے سخت ماحول کے چیلنج کا جواب اس طرح دیا کہ وہ اپنے معذور اور نکموں کو بچپن ہی میں پہاڑی پر سے گرا کر مار ڈالتے تھے لیکن یہ ترکیب بہت دن تک نہ چل سکی اور بالآخر قوم اسپارٹا کو عثمانیوں کی طرح اس کے مفتوحوں نے ختم کر دیا۔

قوموں کی ترقی کا راز جو قومیں اپنے ماحول کے چیلنج کا جواب دے کر بام عروج پر پہنچیں ان کی ترقی کا کیا راز تھا؟ ٹوئن بی اس سوال کا جواب اس طرح دیتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۱۳)

(۱) ان قوموں کے ہاتھ کوئی "نعرہ" آگیا جس کی بدولت ان میں جوش وخروش - یقین محکم - صبر واستقلال - پختہ اتحاد غرضکہ وہ سب کچھ حاصل ہوگیا جو ترقی کے لئے لازم وملزوم ہوتا ہے۔

(۲) ان قوموں کے ہاتھ یہ نعرہ کس طرح آیا؟ اپنے قائدوں کے ذریعہ یہ نعرہ قوموں کے ہاتھ لگا۔ موسیٰؑ نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو نعرۂ توحید دیا۔ جس کی بدولت وہ فرعونوں کا مقابلہ کر سکی اور بالآخر مصر سے رہا ہو کر بنی اسرائیل قوم اپنی حکومت قائم کر سکی ایسے نعرے سے خود اعتمادی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور قوم اپنی مرضی کے مطابق اپنی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسی طرح عیسیٰ نے اپنے ہم عصروں کو ذہنی آزادی کا پیغام سنایا۔

(۳) لیکن جب نعرے کا اثر معدوم ہو جاتا ہے اور حضرت انسان پھر اپنی حماقتیں اختیار کر لیتے ہیں تو پھر کوئی نبی یا ولی اٹھتا ہے اور نیا نعرہ دے کر مردوں میں جان ڈالتا ہے۔ عیسیٰؑ کے حواری اولیا کی صورت میں یہ کام کرتے رہے۔

نعرے کے اثرات کس طرح معدوم ہوتے ہیں اس کے متعلق ٹوئن بی ابن خلدون کی رائے پیش کرتا ہے۔ جو اس نے ابن خلدون کے "مقدمے" سے اخذ کی۔ ٹوئن بی ابن خلدون کا اس درجے مدّاح ہے کہ وہ اپنی کتاب "مطالعۂ تاریخ" میں کئی جگہ اس مسلم فلسفیٔ تاریخ کے اقوال بطور سند پیش کرتا ہے۔ نعرہ کے معدوم ہونے کے متعلق ابن خلدون نے جو کہا ہے اس کا ترجمہ ٹوئن بی ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:۔

" روح انسان کی عادت ہے کہ وہ اپنی انسانی فطرت کو

ترک کر کے فرشتوں کا لباس اختیار کر لیتی ہے اور ایک لمحے کے لئے درحقیقت فرشتہ بن جاتی ہے۔ یہ لمحہ ایک پلک میں غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ روح پھر انسانی قالب اختیار کر لیتی ہے مگر اس پلک میں فرشتوں کی دنیا سے کوئی پیغام حاصل کر لیتی جو اپنے بنی نوع کو پہنچاتی ہے۔"

(۴) اسی نعرۂ تکبیر اور پیغام توحید کو لے کر بانی اسلام ایسے وقت میں نمودار ہوئے جب رومیوں کے اثرات ملک عرب کو چیلنج دے رہے تھے۔ اس چیلنج کا جواب دینے کے لئے یہ نبی آیا۔ یہ جواب اسلام کی صورت میں تھا۔ اس سلسلے میں ٹوئن بی ایک نظریہ پیش کرتا ہے جس کو وہ "کنارہ کشی اور واپسی" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ پیغمبر کنارہ کش ہو کر پہلے اپنی روحانیت کو قوی بناتا ہے اور اس کے بعد وہ روحانی طور سے تیار ہو کر اپنا پیغام دنیا کو سناتا ہے۔ موسیٰ کو اسی کنارہ کشی کے دوران میں نبوت ملی۔ وہ طور سینا سے خدا کا پیغام لے کر اترے جس کا ذکر "کتاب خروج" میں اس طرح ہے:- حوالہ نمبر (۱۴۳)

"اور موسیٰ اس پر (یعنی طور سینا پر) چڑھ کر خدا کے پاس گیا اور خداوند نے اسے پہاڑ پر سے پکار کر کہا کہ تو یعقوب کے خاندان سے یوں کہہ اور بنی اسرائیل کو یہ سنا دے۔"

موسیٰ خدا کا پیغام کس شکل میں لائے اس کا بھی ذکر "کتاب خروج" میں ہے:-

"اور جب وہ خداوند کوہ سینا پر موسیٰ سے باتیں کر چکا تو اس نے اسے شہادت کی دو لوحیں دیں۔ وہ لوحیں پتھر کی اور خدا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔"

لیکن حسب دستور حضرت انسان نے موسیٰ کے پیغام توحید کو مسخ کر دیا توحید کو خالص صورت میں پھر پیش کرنے کے لئے عیسیٰ آئے۔ اعلیٰ قسم کے انسان یعنی انبیاء بنی نوع انسان کو کس طرح مصفا کرتے رہے ہیں اس کا ذکر سینٹ پال کے اس خط میں ہے جو اس مبلغ دین عیسوی نے کرنتھیوں کے نام لکھا۔ سینٹ پال کہتا ہے :- (حوالہ نمبر ۱۵)

"آسمانی (لوگ) بھی جسم ہیں اور زمینی بھی مگر آسمانیوں کا جلال اور ہے اور زمینیوں کا اور۔ آفتاب کا جلال اور ہے اور مہتاب کا جلال اور"

اسی طرح حضرت عیسیٰ بھی اپنے سوتیلے باپ ابراہیم نجارؑ کی حفاظت میں ایک عرصے تک کنارہ کش رہے اور اسی کنارہ کشی کے دوران میں ان کو نبوت ملی۔

بانیٔ اسلام کو غار حرا میں کنارہ کش ہونا پڑا اور "واپسی" پر تبلیغ شروع کی یہ نظریہ "کنارہ کشی اور واپسی" بھی ٹوئن بی کا ایجاد کردہ ہے۔

ٹوئن بی اس نظریہ کا اطلاق قوموں اور ملکوں پر بھی کرتا ہے۔ بہت سے ملک اور بہت سی قومیں ایک عرصے تک گمنام رہتی ہیں اور اس گمنامی کے دوران میں یہ ملک اور قومیں اپنی قوتوں کو یکجا کرتی ہیں۔ اور یکایک اپنی ہستی سے دنیا کو آگاہ کرتی ہیں۔ ٹوئن بی امریکہ اور روس کی گمنامی اور ان کی یکایک آمد بطور مثال پیش کرتا ہے۔

مگر اصل ترقی کی بنیاد ہر قوم کی اسی وقت پڑتی ہے جب یہ قوم اپنے ماحول کے چیلنج کا جواب اپنے بل بوتے سے دیتی ہے۔ جس قوم میں چیلنج کا جواب دینے کی قوت نہیں ہوتی وہ کسی قوی قوم کی زیردست ہو کر

یا تو مٹ جاتی ہے یا اپنے دن پورے کرتی ہے۔ لیکن جو قوم چیلنج کا جواب دے کر بچ جاتی ہے وہ راہِ ترقی پر گامزن ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ پہلے چیلنج کا جواب دے کر وہ بچ جاتی ہے لیکن بعد کو وہ سخت تر چیلنج کا جواب نہیں دے سکتی اور اس طرح وہ مزید ترقی سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسی قوم جو مزید ترقی سے محروم ہو جاتی ہے اس کا شمار ان قوموں میں ہوتا ہے جن کی زندگی مسدود ہو چکی ہے اور اب وہ اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ اور آئندہ کے لئے اسے کوئی امید نہیں۔ لیکن جو قوم ہر چیلنج کا جواب برابر دیتی رہتی ہے اس کے لئے ترقی کا راستہ صاف رہتا ہے۔

خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ ترقی پذیر قوم برابر چیلنجوں کو جواب دیتی رہتی ہے۔ ان کی ترقی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ان میں کوئی مرد کامل نمودار ہوتا ہے جو کچھ دن کے لئے کنارہ کش ہو کر واپس آتا ہے اور اپنی قوم کو مزید چیلنجوں کے جواب کے لئے تیار کرتا ہے۔

لیکن بالآخر ایسا وقت آتا ہے جب طاقتور سے طاقتور قوم بھی نذرِ زوال ہوتی ہے۔

علامات زوال زوال اپنی آمد سے پہلے اپنی علامتیں ظاہر کرتا ہے جن علامتوں سے قوم کی ترقی کا اظہار ہوتا ہے ان علامتوں کے مفقود ہونے سے قوم کا زوال ظاہر ہوتا ہے۔ راز ترقی کے ضمن میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوئی قائد اٹھ کر قوم کو ایک نعرہ عطا کرتا ہے اس نعرے کے زور پر قوم ماحول کے چیلنج کا جواب دیتی ہے۔ ساتھ ہی یہ قائد چند ایسے ساتھی بھی پیدا کر لیتا ہے جو دامے درمے اس

کا ساتھ ہر قدم پر دیتے ہیں۔ عیسیٰ کے ساتھی حواری کہلائے۔ بانیٔ اسلام کے ہم نشین اصحاب کے نام سے موسوم ہوئے۔ یہ لوگ محض چند ہوتے ہیں لیکن ہزاروں پر بھاری پڑتے ہیں۔ بعد وفات بانیٔ قوم یہ پیغام الفت کو جاری رکھتے ہیں اور مزید چیلنجوں کا جواب دیتے رہتے ہیں۔

پہلی علامت۔ جب قوم پر زوال آنا شروع ہوتا ہے تو ان ساتھیوں کا اثر زائل ہونا شروع ہوتا ہے۔ یہ ساتھی دنیا سے اٹھ جاتے ہیں ان کی جگہ کوئی نہیں لیتا۔ نعرے کا جادو بھی وہ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایام زوال میں مسلمانوں میں ایک مثل رائج ہوئی کہ "مسلمانان در گور۔ مسلمانی در کتاب"۔

دوسری علامت۔ ان ساتھیوں کی جگہ جو لیتے ہیں وہ تکبر اور نخوت میں گرفتار ہو کر محض اپنی قوت اور جھوٹے دعوؤں سے قوم پر اپنا تسلط قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں خود کوئی جوہر نہیں ہوتا۔ چنانچہ قوم بے لگام ہو جاتی ہے اور قومی شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ ہر ایک اپنی من مانی کرتا ہے اور ان متکبر قائدوں کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ اتحاد و تقلید خاک میں مل جاتی ہے۔

تیسری علامت خاتمے سے پہلے تیسری علامت ظاہر ہوتی ہے وہ اس صورت میں کہ کوئی بڑی حکومت اس انحطاط پذیر قوم پر ہاتھ مارتی ہے اور اپنی وسیع حکومت میں اس قوم کو مدغم کر لیتی ہے رومیوں نے یونانی سماج کو اپنے میں مدغم کیا۔ ہندو تہذیب پہلے مسلمانوں کی زیر نگین ہوئی بعد کو انگریزوں کی۔ اسی طرح مسلمان

قوموں پر مغربی اقوام نے قبضہ کیا۔

(حوالہ نمبر ۱۶) علاماتِ زوال کے سلسلے میں ٹوئن بی اپنا تراشیدہ ایک اور نظریہ بھی پیش کرتا ہے۔ یہ نظریہ اس نے اپنی کتاب "مطالعۂ تاریخ" کی چوتھی جلد میں "دورِ طلاطم" کے نام سے باین الفاظ پیش کیا:۔

"(کسی قوم کے) عالمگیر حکومت میں مدغم ہونے سے ایک دورِ طلاطم آتا ہے جو کئی صدیوں تک جاری رہتا ہے۔ اگر ہم اپنے احساسات سے متاثر ہو کر اپنے زمانے کو دیکھیں تو ہم میں سے بہترین مبصر متفق ہو کر کہیں گے کہ اس دور نے ہماری مغربی دنیا کو آن دبوچا ہے"

اس دورِ طلاطم کے سلسلے میں ٹوئن بی کہتا ہے کہ مغرب میں اس دور کے آنے کا باعث یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی توسیع بے تحاشہ ہو گئی ہے اور یہ توسیع مغرب کی موت کا پیش خیمہ ہے۔ اگر یہ علامت موت نہیں تو ساتھ ہی یہ بھی عیاں ہے کہ اب ہم موسمِ بہار میں نہیں ہیں"

بقول ٹوئن بی زوال کی بڑی علامت یہ ہوتی ہے کہ قوم فنا ہونے سے پہلے چیلنجوں کا جواب دینے سے معذور ہو جاتی ہے۔ کیا اب مغربی تہذیب بھی چیلنجوں کے جواب سے قاصر ہو گئی ہے یہ واضح رہے کہ ٹوئن بی نے یہ چوتھی جلد دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے لکھی جب مغرب کی زیرِ نگین قوموں نے اپنے حکمرانوں کو چیلنج کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ بقیہ چار جلدیں (ساتویں سے لے کر دسویں تک) اس نے سنہ ۱۹۵۰ء میں مکمل کیں۔ لیکن اس وقت تک صرف ہندوستان انگریزوں کے ہاتھ سے سنہ ۱۹۴۷ء میں نکلا تھا۔ افریقہ کی قوموں پر اہلِ مغرب کا

تسلط قائم تھا۔ لیکن اب جب کہ اہل مغرب کو افریقہ سے بھی دست بردار ہونا پڑا کوئی اس پیشین گو سے پوچھے کہ "کیا اب اہل مغرب حبشیوں کے چیلنج کا بھی جواب نہیں دے سکتے؟"

اسی بنا پر ٹوئن بی کو مغرب کا زوال بھی نظر آرہا ہے۔ چنانچہ اس کے ہم قوم ٹوئن بی کو "پیغمبر قیامت" کے نام سے پکارتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کی ناراضگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ قوم خودرائی اور ہٹ دھرمی کو فطرتاً پسند نہیں کرتی۔ ٹوئن بی کی فطرت میں خودرائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ٹوئن بی کی پیش کردہ علامات زوال آپ نے دیکھ لیں۔ اب اس کے معلوم کردہ اسباب زوال بھی سنئے :۔

کیا قوموں کے زوال کا باعث تقدیر ہے؟

قوموں کے اسباب زوال بتانے سے پہلے ٹوئن بی مسئلہ تقدیر کو لیتا ہے تقدیر کے معاملے میں وہ کہتا ہے :۔

(حوالہ نمبر ۱۷)

"بنی نوع انسان کی دائمی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی ناکامیوں کو ایسی قوت پر محمول کرتا ہے جس پر اس کو کوئی قابو نہیں اور جس کا احاطۂ عمل انسان کے احاطۂ عمل سے بہت وسیع ہے"

انسان کی اس ذہنیت کی وجہ ٹوئن بی یہ بتاتا ہے کہ جب انسان کو کسی کام میں ناکامی ہوتی ہے تو وہ اپنی شرم مٹانے کے لئے اور اپنی بڑائی جتانے کے لئے تقدیر کو اپنا مدِمقابل قرار دیتا ہے۔ گویا ایک فرد واحد کو ناکام کرنے کے لئے قدرت اپنی تمام قوتوں کو جمع کرکے اس کا مقابلہ کرتی ہے اور اس کو ناکام بناتی ہے۔ ٹوئن بی اس کو

"فلسفے کی جھوٹی تسلی" کہتا ہے۔ اس کے بقول اس قسم کی ذہنیت انحطاط اور زوال کے زمانے میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے یونانی ڈرامہ نگاروں نے اپنے ڈراموں میں تقدیر کا گانا گایا۔ ابتدائی دور کے پادریوں نے تقدیر کو خدا کے ہر کام میں مسلط کر دیا۔ جرمنی فلسفی اسپنگلر کو بھی دستِ تقدیر ہر جگہ نظر آیا جیسا کہ اسپنگلر کے تذکرے میں بتا چکی ہوں۔ لیکن ٹوئن بی تقدیر کا بالکل قائل نہیں بلکہ وہ تو قائلین تقدیر کی ہنسی اڑاتا ہے (حوالہ نمبر ۱۸) افلاطون قوموں کے زوال کا سبب یہ بتاتا ہے کہ بعد عروج قوموں کی نسلیں جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے نکمی اور پست ہو جاتی ہیں۔ یعنی دولت رنگ لاتی ہے۔ ابن خلدون نے بھی افلاطون کے نظریہ کو مانا۔ لیکن افلاطون ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ یہ نکما پن تقدیر نہیں پیدا کرتی بلکہ قائدین ملت کی غلطیوں کی وجہ سے قوم نکمی ہو جاتی ہے۔ ٹوئن بی اسباب زوال کو اسی نکمے پن سے منسوب کرتا ہے مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ نکما پن کس طرح پیدا ہوتا ہے

اسباب زوال بقول ٹوئن بی

ٹوئن بی افلاطون کے نظریہ کو قبول کرتا ہے۔ یعنی وہ اس بات کا قائل ہے کہ کچھ دنوں بعد افرادِ قوم نکمے ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ اس بات کو اپنے مخصوص الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ وہ شروع سے ہی ماحول اور ماحول کے چیلنج کا قائل ہے۔ چنانچہ ٹوئن بی سبب زوال بھی اپنی اصطلاح میں بتاتا ہے۔ زوال کے معاملے میں وہ ماحول کے اثرات کا قائل نہیں اس کے نزدیک ہر قوم اپنے مخصوص طریق کار کی بدولت ترقی کرتی ہے لیکن ایک ایسا وقت آتا ہے جب یہ مخصوص طریقہ کار اس قوم کے لئے بلا بن

جاتا ہے اور قوم کو گرا دیتا ہے ۔ گویا قوم اس طریق کار کی غلام بن جاتی ہے۔ بالآخر وہ قوم اپنے مخصوص طریقۂ کار کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ اختیار کرتی ہے۔ لیکن ٹوئن بی کے نزدیک دوسرا طریقہ اختیار کرنا زوال کی علامت ہے۔ زوال کا سبب نہیں۔

اب تک آپ نے دیکھا ہے کہ اُن باتوں کو جن کو دیگر مورخ سبب زوال بتاتے ہیں ٹوئن بی ان کو محض علامت زوال قرار دیتا ہے۔ آخر زوال کا سبب بھی کوئی ہے یا ہر چیز محض علامتِ زوال ہے ؟

ٹوئن بی کے نزدیک ہر قوم کی بڑھن بند ہو جاتی ہے۔ افراد کی عمر دیگر جانوروں کی طرح معین ہے لیکن کسی جماعت اور اس کے تمدن کے لئے کوئی عمر معین نہیں۔ تمدن افراد کی طرح بیمار نہیں پڑتا اور نہ افراد کی طرح تمدن مرتا ہے بلکہ جماعت اور اس کے تمدن کی موت کا سبب یا تو خودکشی ہوتی ہے یا "قتل" ؟

قوم خودکشی سے مرتی ہے

بقول ٹوئن بی اب تک ۲۱ تہذیبیں دریافت ہوئی ہیں جن میں سے تیرہ مفقود و معدوم ہو چکیں۔ بقیہ ۸ میں سے سات مغربی تمدن سے مغلوب ہو چکی ہیں۔ ان تیرہ معدوم تہذیبوں کے متعلق ٹوئن بی کا فیصلہ ہے کہ ان میں سے بعض نے خودکشی کی اور بقیہ "قتل" کی گئیں۔

قومیں کس طرح خودکشی کرتی ہیں۔ ٹوئن بی کے نزدیک خودکشی کے طریقے یہ ہیں :۔

(۱) قائد ملت کا کام تلقین و تبلیغ ہے لیکن ایک ایسا وقت آتا ہے جب لوگ اپنے قائد کی پُر خلوص تقلید کو چھوڑ کر مشین کی سی

حرکتیں کرنے لگتے ہیں اور اس طرح یہ پیرو خود مشین بن جاتے ہیں۔ چنانچہ پیرووں کی روح مردہ ہو جاتی ہے۔ مشین ہمیشہ اپنے طریقے پر چلتی ہے جس کی وہ عادی ہو جاتی ہے۔

(۲) جب تبدیلیٔ زمانے کے تقاضے سے مشین کو نئے طریقے پر چلنا پڑتا ہے تو یہ نیا طریقہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ یعنی لوگ دستور پرست ہو جاتے ہیں بالفاظ دیگر وہ میری پرستش کرنے لگتے ہیں۔ پرستش کے خطرے باب "میری وصیت" کے تحت بیان کر چکی ہوں۔ میں پرستش کے معاملے میں ٹوئن بی کی تائید کرتی ہوں۔

(۳) ایک طریقے کے عادی ہو جانے سے قوم میں وہ "لچک" باقی نہیں رہتی اور وہ قوم نئے حالات سے مطابقت نہیں پیدا کر سکتی۔ مسلمانانِ ہند و پاکستان کے لئے بہترین مثال سرسید کا زمانہ پیش کرتا ہے۔ سرسیّد کی جو مخالفت ہوئی اس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمانانِ ہند میں لچک باقی نہ رہی تھی۔ اور وہ نئے زمانے سے مطابقت پیدا کرنے سے معذور تھے۔

(۴) جب قوم میں لچک کا مادّہ معدوم ہو جاتا ہے تو قائد خود بھی دستور پرست ہو جاتے ہیں۔ سرسیّد کے زمانے کے علمائے دین دستور پرست ہو گئے تھے۔ اور ہر نئی چیز کو "بدعت" قرار دیتے تھے۔

(۵) ان حالات میں جب بے لچک قوم کے قائد سختی سے کام لیتے ہیں تو لوگ بغاوت کر بیٹھتے ہیں۔ قوم میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور قیادت غنڈوں کے ہاتھ آجاتی ہے۔

(۶) لیکن قوم میں ایک ایسا طبقہ بھی ہوتا ہے جو پرانے دستور سے

تنگ آکر نئی باتوں کا طلب گار ہوتا ہے۔ لیکن قوم کا سماج تو پرانی باتوں پر مبنی ہوتا ہے اور نئی باتوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ نئی باتوں کے داخل ہونے سے انتشار اور بڑھتا ہے۔ شیرازہ بکھرنے لگتا ہے

(۷) ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ نئی روح کے لئے نیا قالب بھی ضروری ہے۔ اگر نئی روح کو پرانے قالب میں ڈالا جائے تو پرانا قالب پھٹ جاتا ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں ٹوئن بی کہتا ہے کہ اگر نئی شراب پرانی بوتل میں ڈالی جائے تو بوتل کے پھٹنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹوئن بی اپنی تائید میں حضرت عیسیٰ کا یہ قول بھی پیش کرتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۹)

"کورے کپڑے کا پیوند پرانی پوشاک میں کوئی نہیں لگاتا۔ کیونکہ وہ پیوند پوشاک میں سے کچھ کھینچ لیتا ہے اور وہ اور زیادہ پھٹ جاتی ہے اور نئی شراب پرانی مشکوں میں نہیں بھرتے ورنہ مشکیں پھٹ جاتی ہیں اور شراب بہہ جاتی ہے اور مشکیں برباد ہو جاتی ہیں بلکہ نئی شراب نئی مشکوں میں بھرتے ہیں اور وہ دونوں بچی رہتی ہیں۔"

(۸) نئی شراب کو پرانی بوتل میں بھرنے سے جو خطرہ پیدا ہوتا ہے یہ محض تمثیل ہے۔ لیکن ٹوئن بی اس تمثیل کا اطلاق تاریخی واقعات پر کرتا ہے۔ اور انقلاب فرانس کی مثال پیش کرتا ہے۔ یہ انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء میں شروع ہوا لیکن فرانس نے اس معاملے امریکہ کی نقل کی گویا امریکی جمہوریت کی نئی شراب کو فرانس کی پرانی بوتل میں بھرا۔ مندرجہ بالا دلائل سے ٹوئن بی ثابت کرتا ہے کہ بیشتر قوموں کا

خاتمہ خودکشی کی صورت میں ہوتا ہے۔ بعض قوموں کا خاتمہ بذریعہ قتل بھی ہوا۔ لیکن یہ قومیں مقتول بھی اس لئے ہوئیں کہ وہ اپنی حماقتوں سے اپنی قوت زائل کر چکی تھیں کمزوری کی حالت میں آسانی سے گلا دبوچا جا سکتا ہے۔ گویا قومیں جو "قتل" ہوئیں وہ بھی خودکشی کے راستے پر چل رہی تھیں۔

لیکن یہ سب زمانۂ ماضی کی باتیں ہیں۔ مگر ٹوئن بی صرف ماضی پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ مستقبل کے متعلق بھی پیشین گوئیاں کرتا ہے۔ جو میرے شعار کے خلاف ہے۔ انسان ہمیشہ سے غیب دانی کا شائق رہا ہے اس لئے ٹوئن بی نیم پختہ ذہن والوں میں مقبول ہوا۔ بہرکیف میں اس کی غیب دانی کا تذکرہ بھی ضروری سمجھتی ہوں۔

ٹوئن بی کی پیشین گوئیاں

ٹوئن بی کا دعویٰ ہے کہ اس کی معلوم کردہ ۲۱ تہذیبوں میں سے تیرہ تو بالکل مفقود ہو چکیں۔ یہ بالکل صحیح ہے بقیہ آٹھ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ان میں سے سات مغربی تمدن کے زیر نگیں ہیں اور یہ سات تہذیبیں بھی دم توڑ رہی ہیں۔ یعنی اب باقی ماندہ آٹھ تہذیبوں میں صرف آٹھویں تہذیب یعنی مغربی تمدن کا دنیا پر راج ہوگا لیکن جو کچھ اس کی آنکھوں نے دو عالمگیر جنگوں میں دیکھا اس کی بنا پر اس کو یقین کامل نہیں کہ یہ مغربی تہذیب بھی میرے ہاتھوں سلامت رہے گی۔

اس نے پیشین گوئی کا کام اپنے سر کیوں لیا؟ اس نے اپنی کتاب کی دسویں جلد نومبر ۱۹۵۰ء میں مکمل کی۔ اس وقت اس کو احساس تھا کہ:-

(حوالہ نمبر ۲۰)

"میں جو یہ پیشین گوئیاں مغربی تہذیب کے متعلق قلم بند

کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ کہیں یہ پیشین گوئیاں میرے قلم
کی سیاہی خشک ہونے سے پیشتر ہی غلط ثابت نہ ہو جائیں۔
لیکن اگر میں لوگوں کے تمسخر سے گھبرا جاتا تو میں اس کتاب کو
شروع ہی نہ کرتا......"

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ٹوئن بی نے یہ ضخیم جلدیں صرف پیشین گوئیوں کی خاطر لکھیں تاکہ اہل مغرب مایوس نہ ہوں کیونکہ ۱۹۵۰ء تک مغرب کے حالات مایوس کن نہ تھے۔ وہ کہتا ہے:۔

"اس روز تک (یعنی ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء تک) یہ سوچ کر میری
ہمت بندھی رہی کہ مغربی تہذیب کا مستقبل آج ایسا تاریک
نہیں نظر آتا جیسا کہ وہ ۱۹۲۹ء کے آخری مہینوں میں نظر آتا تھا"

ٹوئن بی کے نزدیک ۱۹۲۵ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان صرف مغربی تہذیب ہی تھی جس کے شیرازہ بکھرنے کے آثار نہ تھے۔ بلکہ یہ تہذیب بڑھن کی منزل ہی میں تھی اور باقی ماندہ روبہ زوال تہذیبوں پر غالب ہوتی نظر آتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی بنی نوع انسان کی تمام کامرانی اور دنیا کا کل اثاثہ سمٹ کر اہل مغرب کے پاس جمع ہو گیا تھا۔ بقول ٹوئن بی "دنیا کے تمام انڈے ایک ہی ٹوکری میں رکھے ہوئے ہیں" اگر یہ ٹوکری ایٹم بمب کے نذر ہو گئی تو دنیا کی تمام کامرانی اور اثاثہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگا۔ لیکن جب امریکہ نے ۱۹۴۷ء میں دنیا سے اپنی علیحدگی چھوڑ کر روس کے خلاف ترکی کی امداد کا اعلان کیا تو ٹوئن بی کی ہمت بڑھی لیکن ساتھ ہی ٹوئن بی کو یہ بھی نظر آیا کہ بنی نوع انسان کی قسمت کا فیصلہ اب صرف دو آدمیوں کے ہاتھ میں ہے جس میں ایک ماسکو (روس) میں بیٹھا ہے۔

دوسرا واشنگٹن (امریکہ) میں۔ (حوالہ نمبر ۲۱)

پروفیسر سومرویل نے ٹوئن بی کی آخری چار جلدوں کا خلاصہ ۱۹۵۷ء میں شائع کیا اس خلاصہ کی تیاری میں مصنف کا بھی ہاتھ تھا۔ اصل کتاب میں ٹوئن بی پوچھتا ہے کہ مغرب کا سنہ ۱۹۵۰ یا سنہ ۱۹۵۲ء میں کیا حال ہوگا؟ لیکن اس خلاصہ میں مصنف سوال کرتا ہے کہ سنہ ۱۹۵۵ء میں مغرب کس حال میں ہوگا۔ وہ یہ سوال ان لفظوں میں پوچھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۲۲)

"سنہ ۱۹۵۵ء میں مغربی تہذیب کی زندگی کی اُمید کتنے سال ہے؟

تاریخ داں پہلے اس سوال کا جواب یہ دے گا کہ اسراف فطرت کے حساب سے (اس تہذیب کے) صرف چند سال اب باقی ہیں"

لیکن ٹوئن بی اس مایوس کن جواب کو قبول نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ سنہ ۱۹۵۵ء میں جنگ اور جنگجوئی کو یکسر ختم کر دیا جائے اور ایک عالمگیر حکومت قائم کی جائے۔ ایسی عالمگیر حکومت کا مرکز یا تو ماسکو (روس) میں ہوگا یا واشنگٹن میں۔ لیکن نہ امریکہ اور نہ روس اس بات کے لئے تیار ہے کہ ایک دوسرے کا زیرنگیں ہو۔ اگر ان دونوں میں تصادم ہوا تو فاتح اور مفتوح دونوں ختم ہو جائیں گے۔ لہٰذا ان دونوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کی ہستی کو تسلیم کر کے دنیا کے لئے باعثِ امن ہوں اور دونوں ایک دوسرے کے نظم کو برداشت کریں۔

ٹوئن بی کے خیال میں اقوام متحدہ واحد عالمگیر حکومت قائم کرنے کی اہل نہیں۔ اگر کبھی اس قسم کی حکومت قائم ہوئی تو وہ یا تو روس کے یا امریکہ کے ہاتھ سے قائم ہوگی۔ جس وقت ٹوئن بی نے پیشین گوئیاں کیں

اس زمانے میں چین میں اشتراکیت قائم ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود یہ پشین گو چین کے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہتا کیونکہ اس کے خیال کے مطابق چین کی تہذیب ان سات تہذیبوں میں ہے جو فنا ہونے کی منتظر ہیں۔

لہذا ٹوئن بی کہتا ہے کہ باقی دنیا کو یا تو امریکہ کی یا روس کی غلامی اختیار کرنی پڑے گی۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ امریکہ کی غلامی روس کی غلامی سے کہیں بہتر ہے۔ غالباً اسی لئے ٹوئن بی کی کتاب امریکہ میں مقبول ہوئی مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ امریکہ بارِ عالمگیر اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔

اس مشکل سے رہائی دنیا کو اسی حالت میں مِل سکتی ہے جب دُنیا اور خصوصاً مغرب مذہب کی طرف واپس آئے۔ اگر اہلِ مغرب زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں مذہب کی طرف واپس آنا پڑے گا اور اپنی قوتوں کو روحانیت میں لگانا پڑے گا۔ کیونکہ مذہب ہی ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ دنیا متحد ہو سکتی ہے۔ سیاست اتحاد قائم کرنے کی اہل نہیں۔ سیاست نے تو ہمیشہ دنیا کو منقسم رکھا اور تفرقے کے راستہ پر چلایا۔ اب سوال یہ ہے کہ دنیا کون سا مذہب اختیار کرے؟

اس کے نزدیک صرف چار مذہب یعنی عیسوی۔ اسلام۔ ہندو اور بدھ یہ کام کر سکتے ہیں۔ ٹوئن بی یہودی مذہب کو اس کام کا اہل نہیں سمجھتا۔ لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ عیسوی اور مذہب اسلام ایک دوسرے کے مخالف ہیں اس لئے وہ بدھ مذہب کو ترجیح دیتا ہے ٹوئن بی کے نزدیک تہذیب مذہب کی خاطر پیدا ہوئی۔ مذہب تہذیب

کی خاطر نہیں آیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مذہب تہذیب پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ٹوئن بی اس سوال کا جواب نہیں دیتا۔ الغرض ٹوئن بی میرا جامہ "تاریخ" اتار کر مجھ کو علمائے دین کا چغہ پہنانا چاہتا ہے۔

اگر ٹوئن بی کے ارشاد کے بموجب میں اپنی ہستی کو ترک کر کے علم دین بن جاؤں تو میں کون سا دین اختیار کر دں۔ اگر میں ہندو یا بدھ مذہب کا سادھو لباس اختیار کر دں تو مجھ کو واقعات کے صاف ستھرے بیانات کو چھوڑ کر رموز کے سمندر میں غرق ہونا پڑے گا۔ دیو مالا (مائی تھولوجی) میرے واقعات کی جگہ لے لے گی۔ الہامی مذاہب یعنی یہودی۔ عیسوی اور اسلام تو توحید کے علم بردار رہے ہیں اور باوجود عیسوی مذہب کے تثلیث پسند ہونے کے اس مذہب میں اب بھی توحید کی خوشبو موجود ہے۔ خدا خدا کر کے انسانوں نے بتوں کے جال سے اپنے آپ کو رہا کیا۔ ان تینوں مذاہب کے بانیوں کے احوال میرے صحیفے میں صاف صاف درج ہیں۔ جن کے نام اور جن کے کارنامے میرے صحیفوں کو جگمگاتے ہیں ان کو میں کس طرح ترک کر سکتی ہوں۔

ٹوئن بی تو چاہتا ہے کہ میں خدائے واحد کا دامن چھوڑ کر دیو اور بھوت پریتوں کا دامن پکڑ دں۔ یہ تینوں مذاہب تو الہامی اور خدائے واحد کے نازل کردہ ہیں۔ برعکس اس کے ہندو اور بدھ مذہب انسانی دماغ کی پیداوار ہیں۔ یہ نازل نہیں ہوئے بلکہ ان کا تصور رفتہ رفتہ انسان کے دماغ میں آیا۔ اس لئے ان دونوں مذہب میں سے ہر ایک کے اصولوں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ برعکس اس کے الہامی مذاہب مکمل صورت میں نازل ہوئے۔ اگر بالفرض الہامی مذاہب کو بھی انسانی دماغ کی

پیداوار مان لیا جائے تب بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ توحید انسانی دماغ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ گویا بانیٔ توحید یعنی حضرت ابراہیمؑ نے یکایک دیو۔ بھوت۔ پریت اور دیوتاؤں کی پہنائی ہوئی بیڑیوں کو کاٹ کر پھینک دیا اور ذہنِ انسانی کو وہ آزادی بخشی جس کی بدولت اب انسان ہوا میں اڑ رہا ہے اور چاند سے باتیں کر رہا ہے۔

ٹوئن بی نے ابتدائی تہذیبوں پر توجہ نہیں کی

ٹوئن بی کی کتاب میں صرف ان تہذیبوں کا ذکر ہے۔ جن کو وہ پختہ تمدن سمجھتا ہے۔ لیکن ہر تمدن پہلے ایک سادہ اور ابتدائی دور سے گزرتا ہے۔ اس دور کو انگریزی اصطلاح میں "کلچر" کہتے ہیں اس نے کلچروں کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا کہ اس کے خیال میں کلچر تمدن کے مقابلے میں ایسی ہے جیسی کہ "ہاتھی کے مقابلے میں خرگوش" لیکن یہ خرگوش ہی بڑا ہو کر ہاتھی بن جاتا ہے۔ ساتھ ہی خرگوش کی چند خصوصیات ہاتھی میں بھی قائم رہتی ہیں۔ (حوالہ نمبر ۲۳)

ٹوئن بی سے یہ خطا اس لئے سرزد ہوئی کہ اس نے مجھے خوردبین کی جگہ دوربین سے دیکھا۔ دوربین سے تو دور کی چیز نظر آتی ہے لیکن خوردبین سے وہ میرے ہر پہلو کو دیکھ سکتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹوئن بی کے پاس صرف دُوربین ہے خوردبین ہے ہی نہیں۔

گو اس نے تاریخ عالم کو دوربین سے دیکھا لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسی دوربین سے وہ تہذیبیں بھی نہ بچ سکیں جو اس کے لئے بالکل غیر مانوس تھیں۔ غیر مانوس تہذیبوں کو سمجھنے کے لئے اس نے بڑا وسیع مطالعہ کیا۔ اس کی قوت حافظہ تو بالخصوص قابلِ تحسین ہے۔

مگر اس کا جرم پیشین گوئی میری نظر میں قابلِ معافی نہیں چلیں پرتو اس نے اس بنا پر کوئی توجہ نہ کی کہ یہ تہذیب مشرق بعید اب دم توڑ رہی ہے لیکن یہ تہذیب سنبھالا لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ میں پیشین گوئی کو سخت عیب سمجھتی ہوں۔

ٹوئن بی کی خامیاں

گو پروفیسر سومرویل نے ٹوئن بی کی دس جلدوں کا خلاصہ دو جلدوں میں کر دیا ہے لیکن اس خلاصے سے انسان کی تسلی نہیں ہوتی اور اس کی دسوں جلدیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ اگر ان دس جلدوں کے لئے عمرِ نوحؑ درکار ہے تو اس کی پیشین گوئیوں کی صداقت معلوم کرنے کے لئے عمرِ خضرؑ کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی عمرِ خضر بھی کسی طرح حاصل کر لے تب بھی وہ ٹوئن بی کو قائل نہ کر سکے گا۔ کیونکہ وہ جب تک مر چکا ہو گا۔ لیکن یہ فال گو اس بات کو بھول گیا کہ مورخ کی شہرت کا فیصلہ آخر کار میرے ہی ہاتھ میں ہے۔

اس کی کتاب تاریخ ہے یا عمرانیات ہے

فیصلہ کرنے سے پہلے مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ اس کی یہ کتاب تاریخ سے متعلق ہے یا عمرانیات سے۔ اس کتاب میں بے شک واقعات تو بے شمار ہیں جن سے اس کے غیر معمولی حافظہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ واقعات تاریخ کی طرح علی الترتیب نہیں اس نے ان بیشمار واقعات کو نتائج اخذ کرنے کی خاطر درج کیا ہے۔ ماہر عمرانیات بھی یہی کرتا ہے اس لئے فیصلہ کرنے میں دقت ہوتی ہے کہ اس کتاب کی نوعیت کیا ہے۔ میرا تو فیصلہ ہے کہ یہ کتاب دراصل عمرانیات پر ہے۔ میرے فیصلہ کی تائید اس کتاب کے نام سے بھی ہوتی ہے۔ تاریخ

کا مطالعہ بعض اس لئے کرتے ہیں کہ اس کے واقعات سے نتائج اخذ کریں۔ جو لوگ صرف تلاش اسباب کی خاطر تاریخ پڑھتے ہیں وہ تاریخ کے فلسفی کہلاتے ہیں لیکن جو لوگ صرف نتائج اخذ کرنے کی خاطر تاریخ کو پڑھتے ہیں ان کو صرف ماہر عمرانیات کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ابن خلدون نے تین کام کئے۔ وہ مورخ بھی تھا اور ساتھ ہی وہ فلسفی اور ماہر عمرانیات بھی تھا۔ بحیثیت ماہر عمرانیات میں اس کے متعلق فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔

میں نے اس کا تذکرہ محض اس لئے کیا کہ اس نے میرے نام سے پیشین گوئیاں کر کے مجھے بدنام کیا اور اس طرح اس نے میرے حدود میں دخل اندازی کی۔ میں ابن خلدون کی شیدا اس لئے ہوں کہ اس نے سب سے پہلے تاریخ نگاری کا حق ادا کیا اور اس کے بعد اس نے اپنا مقدمہ لکھا جس میں میرے فلسفہ کے ساتھ ساتھ عمرانیات بھی ہے۔

ٹوئن بی رجعت پسند ہے ترقی پسند نہیں

ٹوئن بی کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ صاف ستھری تاریخ کو مجذوبوں کی داستان بنانا چاہتا ہے۔ خدا خدا کر کے میں نے دیو مالا قسم کے افسانوں سے رہائی پائی تھی اور واقعہ نگاری میں نے اپنا شیوہ بنایا تھا۔ لیکن ٹوئن بی مجھے پھر ان جالوں میں پھنسانا چاہتا ہے لیکن توحید کی بدولت اب بیشتر انسان لغو افسانوں سے گریز کرتے ہیں۔ بیشک آج بھی ایک ایسا طبقہ ہے جو ناولوں کا طلبگار ہے لیکن یہ لوگ ناول کو ناول سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ ناول بھی اس حالت میں مقبول ہوتا جب اس کے واقعات باوجود فرضی ہونے کے خلاف عقل نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں میرے

نام سے لغو افسانوں کو کون پڑھے گا۔

اس کے علاوہ انسانی ذہن ایک مرتبہ وحدت کا مزہ چکھ کر کثرت کو پسند نہیں کر سکتا۔ خود سائنس جس کا اس وقت بڑا زور ہے وحدت کی طرف جا رہی ہے۔ سائنس والوں نے معلوم کر لیا کہ جو کثرت ان کو نظر آتی ہے اس کی تہہ میں دراصل وحدت ہے یعنی جملہ مادّی چیزیں صرف ایک ہی ذرے یعنی ایٹم سے بنی ہیں۔ انسانی دماغ جو وحدت تک پہنچ چکا ہو اب کثرت کی طرف کس طرح لوٹ سکتا ہے؟ توحید کی تلقین کرنے والے مذاہب یعنی عیسائیت اور اسلام روز افزوں ترقی کر رہے ہیں یعنی وحدت کثرت پر غالب ہو رہی ہے۔

اشتراکیت تو خدا کی بھی منکر ہے۔ اشتراکیت کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ اہل مغرب کے غلبے سے رہائی کی بشارت دیتی ہے۔ لیکن ٹوئن بی اشتراکیت کا سخت مخالف ہے۔ اس لئے اہل مشرق ٹوئن بی کے "پیغام" کو کس طرح پسند کر لیتے ہیں۔ جب وہ امریکہ کی غلامی کو پسند کرتا ہے۔ بیشک اہل مشرق مغربی تہذیب کو اختیار کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ مغربی تہذیب آزادی کی تلقین بھی کرتی ہے۔

ٹوئن بی کا پائے لنگ

اس نے اپنی کتاب میں تمام دنیا کی تہذیبوں کا ذکر ہی نہیں کیا صرف ان کے عیب صواب پر ہی رائے زنی کی ہے۔ حالانکہ میں بار بار بتا چکی ہوں کہ کسی مؤرخ میں ایسی اہلیت نہیں کہ وہ اپنے ماحول سے علیحدہ ہو کر زمانۂ ماضی کے ماحول کا مشاہدہ کر سکے۔ جب وہ زمانۂ ماضی کے ماحول کو سمجھ ہی نہیں سکتا تو اس ماضی کے عیب صواب پر وہ کس طرح رائے زنی کر سکتا ہے۔ انسان جیسا

لنگڑا اور اپاہج پوری دنیا کے میدان میں کس طرح دوڑ لگا سکتا ہے؟
اکثر پرانی تہذیبوں کے متعلق انسان کی معلومات نہایت محدود ہیں۔اس معاملے میں ٹوئن بی نے محض قیاس سے کام لیا۔اور میرے کورے ورقوں کو محض قیاس آرائی سے پُر کیا۔اس لئے میں اس کو شاعر کہتی ہوں مؤرخ نہیں۔بیشک کچھ لوگ کہتے ہیں کہ "ملک خدا تنگ نیست پائے مرا لنگ نیست" لیکن یہ شاعروں کا قول ہے مؤرخ کا نہیں۔اپنے دعوؤں کی صداقت ثابت کرنے کے لئے وہ صرف ایسے واقعات پیش کرتا ہے جو اس کے نظرئے کے حق میں ہیں۔جو واقعات اس کے خلاف ہیں ان کا وہ ذکر تک نہیں کرتا۔اس سلسلے میں سکندر کے متعلق ایک افسانہ مشہور ہے جو قابل نقل ہے۔

سکندر فتح ایران کے لئے جارہا تھا کہ راستے میں اُسے ایک مندر ملا جس کے پُجاری اس فاتح کے پاس آئے اور اس کو ترغیب دی کہ وہ ان کے مندر میں جاکر فتح کے لئے منّت مانے۔ساتھ ہی سکندر سے اُن پُجاریوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے مندر میں ایسے بہت سے بادشاہوں کی تصویریں ہیں جنہوں نے ہمارے مندر میں منّت مانی اور وہ فتح یاب ہوگئے۔یہ واضح رہے کہ سکندر ارسطو کا شاگرد تھا۔چنانچہ اس نے ان پجاریوں سے پوچھا کہ کیا تمہارے مندر میں ان بادشاہوں کی بھی تصویریں ہیں جنہوں نے منّت مانگی مگر ناکام رہے؟اس پر پجاری لاجواب ہوکر ناکام لوٹ گئے۔

اسپنگلر کی بیشتر پیشین گوئیاں غلط ثابت ہوچکی ہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ٹوئن بی پیشین گوئیوں کا کیا انجام ہونا ہے۔لیکن اس انتظار کے لئے عمرِ نوحؑ درکار ہے۔البتہ ایچ۔جی۔ویلز کی باوجود اس کی پیشین گوئیوں کے میں بڑی قدر کرتی ہوں۔حالانکہ وہ پیشہ ور مؤرخ نہ تھا۔میں اس

کی قدر اس لئے کرتی ہوں کہ اس نے اس سائنس کے زمانے میں مجھ میں دوبارہ جان ڈال دی اور پھر مجھے مقبول کر دیا۔ ساتھ ہی اس کی نیت بھی بڑی اچھی تھی۔ وہ اہلِ مغرب کو خاص طور سے آگاہ کرنا چاہتا تھا کہ ان کی تہذیب کے کھلونے ہی کسی دن ان کی جان لیں گے۔ اس نے جو راستہ دکھایا وہ راستہ قوم پرستی کے خطروں سے محفوظ اور رنگ و روپ کے جھگڑوں سے بری ہے۔

میں اس باب کے آخر میں دعا مانگتی ہوں کہ "اے خدا! تو انسان میں اتنی عقل دے دے کہ وہ مجھ سے پیشین گوئی کی توقع نہ کرے کیونکہ صرف تو ہی عالم الغیب ہے۔" اگر میں پیشین گو بن گئی تو کراچی کی سڑکوں کے سینکڑوں "منجم" اور فال گو بھوکے مرنے لگیں گے۔

ان تینوں پیشین گو مؤرخوں میں میں نے سب سے زیادہ صفحے ٹوئن بی پر رنگے ہیں کیونکہ اس کی کتاب بھی سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ کاش اپنی غیر معمولی قوتِ حافظہ سے کام لے کر وہ کوئی میرا باضابطہ صحیفہ میرے اصل نام سے یعنی تاریخ کے نام سے تیار کرتا۔ ایسا صحیفہ تیار کرنے کے لئے دوربین کی ضرورت نہیں بلکہ خوردبین درکار ہے جو ٹوئن بی کے پاس نہیں ہے۔

گیارھواں باب

میرے چند مشہور صحیفے

گو میں دیوی کہلاتی ہوں لیکن میرا واسطہ ہمیشہ انسان سے رہا ہے اس لئے مجھ میں انسان کی خصلتیں بھی داخل ہو گئی ہیں۔ انسان کی سب سے نمایاں خصلت یہ ہے کہ ہر فرد کی "پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی" ہوتی ہے لیکن میری نظر کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ میں ہر چیز کے دونوں پہلو یعنی روشن اور تاریک دونوں دیکھتی ہوں۔ میں نے ہی یہ تنقیدی نظر حکمائے یونان کو دی۔ حتیٰ کہ اعتقاد پرست ہندوؤں نے بھی ظالم اور رحمٰن ورحیم قسم کے بت تراشے۔

مسلمانوں کا قرآن بھی خدا کو رحمٰن ورحیم کے ساتھ ساتھ قہّار اور جبّار مانتا ہے لیکن اہل مشرق میرے صحیفے لکھتے وقت واقعات کے دونوں پہلو دیکھنے سے قاصر رہے۔ ہندوؤں نے تو مجھ کو اپنے ملک میں گھسنے تک نہ دیا۔ اس لئے ہندؤں کے زمانے میں میرے اوراق کورے رہے۔ البتہ مسلمانوں نے مجھے سر آنکھوں پہ بٹھایا اور انہوں نے میرے لئے بڑے بڑے نامی صحیفے تیار کئے جن کا ذکر میں کر چکی ہوں۔

اسلام کی آمد سے بہت پہلے میں قدیم یونان میں اور بعد کو رومۃ الکبریٰ میں قدم جما چکی تھی۔ یہودیوں کے زمانے میں میرے صحیفے آسمانی کتابوں

ہیں شمار کئے جاتے تھے۔ ان کی کتاب "پیدائش" میرا صحیفہ نہیں ہے تو کیا ہے؟ یہودیوں کی جو آسمانی کتاب آج کل "پرانے عہد نامہ" کے نام سے مشہور ہے وہ میرے ہی صحیفوں پر مشتمل ہے۔ ان کی کتاب "خروج" جس میں موسیٰ اور ان کی قوم بنی اسرائیل کی روح افزا کہانی ہے سراسر میرا صحیفہ ہے۔ پرانے عہد نامے میں کتاب "پیدائش" سے لے کر کتاب "ملاکی" تک انتالیس کتابیں مختلف ناموں سے ہیں۔ ان میں دو کتابیں "سلاطین" کے نام سے موسوم ہیں۔ اور دو کتابوں کا نام بھی "تواریخ" ہے۔ بظاہر یہودیوں نے میرے صحیفوں کو ہی آسمانی قرار دینے پر اکتفا کیا۔ گویا یہودیوں نے مجھ کو آسمانی صحیفوں کا لقب دیا۔ کئی صدیوں بعد یہودیوں میں ایک مورخ پیدا ہوا۔ جس نے اپنی کتاب کو آسمانی صحیفہ نہیں قرار دیا۔ یہ یہودی مورخ یوسف تھا۔ جس کے نام کو رومیوں نے توڑ مروڑ کر "یوسفوس" کر دیا

یہودی یوسف کی نوشتہ تاریخ

میں اپنے مشہور صحیفوں کا تذکرہ اسی یوسف کی نوشتہ تاریخ سے شروع کرتی ہوں۔ یہ یہودی مورخ رومیوں کے اس زمانے میں تھا جب رومیوں نے یہودیوں پر ۶۶ء عیسوی میں حملہ کیا۔ گو یوسف سے صدیوں پہلے یونانی اور رومی اپنے بیش بہا صحیفے تیار کر چکے تھے لیکن ان صحیفوں میں یہودیوں کی حالت زار کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ حالانکہ یہودیوں کی حکومت بہت کافی پرانی تھی۔ باعتبار زمانہ یہودیوں کو سبقت حاصل ہے۔ اسی لئے میں اس یہودی مورخ کی تاریخ سے اپنے مشہور صحیفوں کا تذکرہ شروع کر رہی ہوں۔ جو لوگ یہودیوں کے آسمانی صحیفوں کا تاریخی مقام نہیں جانتے ان کے لئے۔ یوسف کی نوشتہ تاریخ پہلی کتاب ہے جس میں یہودیوں کی

بربادی کا حال ملتا ہے اور وہ بھی ایسے مورخ کے قلم سے جس نے خود ان جنگوں میں حصہ لیا۔ مگر اس یہودی نے اپنی قوم کے مخالفوں یعنی رومیوں کا ساتھ دیا اور اپنی قوم کے خلاف لڑا۔

یوسف نے اپنی تاریخ بھی رومیوں کی خاطر لکھی۔ اس کا انگریزی ترجمہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ "یہودیوں کی قدامت" کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرا "یہودیوں کی جنگیں" کہلاتا ہے۔ اس یہودی مورخ نے اپنی سرگذشت بھی اپنی تاریخ کے شروع میں شامل کی۔ اس کی سرگذشت کا تذکرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تاریخ کی اہمیت بتائی جائے۔ عیسائی پادری اس تاریخ کی خوبیاں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :- (حوالہ نجرا)

"بڑے بڑے عالم اور صائب الرائے لوگوں نے اس تاریخ کی تعریف کی ہے۔ سب لوگ .... اس کی دیانت داری اس کی صداقت اور اس کی تحقیق کو تسلیم کرتے ہیں اور خاص طور سے اسکالگر تو کہتا ہے کہ صرف یہودیوں کے معاملے میں ہی نہیں بلکہ غیر اقوام کے معاملے میں بھی تمام یونانی اور رومی مؤرخوں کو ایک طرف رکھا جائے اور (یوسف کو دوسری طرف) تب بھی (یوسف ہی کا) پلہ بھاری رہے گا۔ بلاشبہ اس میں مورخ کی تمام خوبیاں تھیں۔ یعنی اسے ان تمام معاملات کا علم تھا جن کو وہ بیان کرتا ہے ...."

اپنی زندگی کے متعلق وہ کہتا ہے کہ میں نے یہودیوں کے تینوں فرقوں یعنی فریسی۔ صدوقی اور اسینی کے حالات معلوم کئے۔ چھبیس سال کی عمر میں وہ رومتہ الکبریٰ پہنچا۔ چند یہودی علمائے دین جو یوسف

کی نظر میں بڑے متقی تھے اس وقت وہ رومیوں کے دارالخلافت میں مقید تھے۔ اس وقت روم کا شہنشاہ نیرو (۵۴ء تا ۶۸ء) تھا۔ نیرو کی بیوی پوپیا اپنے شوہر پر حاوی تھی چنانچہ یوسف نے پوپیا کو خوشامد درآمد سے اپنے موافق کر لیا۔ اور مقید یہودی علماء کو چھڑا لیا۔

جب وہ اپنے ملک واپس آیا تو اس کی قوم رومیوں کے خلاف بغاوت کرنے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ لکھتا ہے :۔ (حوالہ نمبر ۲)

> "میں نے ان شوریدہ سر لوگوں کو منع کیا اور ان کو سمجھایا بجھایا کہ وہ اس ارادے سے باز آئیں۔ میں نے بتایا کہ تم لوگ رومیوں کے خلاف اُٹھ رہے ہو جن کے مقابلے میں تم صرف سپہ گری ہی نہیں بلکہ قسمت کے معاملے میں بھی کمزور اور حقیر ہو .... کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ بغاوت ہمارے لئے باعث مصیبت ہو گی"

لیکن ساتھ ہی یوسف خائف بھی تھا کہ اس کے ہم قوم اس کو غدار سمجھینگے اس خوف سے اس نے بیت المقدس میں پناہ لی لیکن وہ بغاوت کو نہ روک سکا۔ بالآخر بُری طرح شکست کھائی مگر ساتھ ہی وہ اپنے مذہب کو برحق مانتا ہے اور اپنی قوم کی عظمت ظاہر کرنے کی خاطر ہی اس نے اپنی تاریخ لکھی۔

یونانی مؤرخ ہرودوتس

اب میں یونان کے عہد قدیم میں واپس جاتی ہوں اور ایسے یونانی مورخ کا تذکرہ کرتی ہوں جس کو آج کل کے مورخ "پدر تاریخ" کہتے ہیں لیکن میں اس گپّی مورخ کو اپنا باپ نہیں مان سکتی۔ اس کا زمانہ پانچویں صدی

قبل مسیح ہے۔ غالباً اس نے اپنی تاریخ کا ایک حصہ سنہ ۴۳۰ قبل مسیح لکھا۔ غالباً وہ ۴۸۴ قبل مسیح پیدا ہوا۔ اس کی جائے پیدائش شہر ھلی قرناسوس تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں سے کسریٰ ایران کے ہاتھوں اپنے وطن کی بربادی دیکھی۔ اس بربادی سے پہلے وہ مصر کی سیاحت کر چکا تھا۔ جب اس نے تاریخ لکھ کر ایتھنز کے باشندوں کو سنائی تو اس شہر کی مجلس شوریٰ نے اس کو انعام دیا۔ اس کی تاریخ صرف یونان تک ہی محدود نہیں بلکہ اس نے اپنے زمانے کی دنیا کا نقشہ بھی پیش کیا۔ گویا اس کی تاریخ ایک طرح سے سیاحت نامہ بھی ہے۔

ہیرودوتس ایک تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے مطلق العنان حکمران کی مذمت اس طرح کرتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۲)

”ایک فرد واحد کو پورے اختیارات دے کر دیکھو کہ کس طرح اس کی خوبیاں یکایک نخوت میں بدل جاتی ہیں کیونکہ رشک و حسد کا مادہ انسانی فطرت میں داخل ہے۔ جب نخوت میں رشک و حسد بھی شامل ہو جاتا ہے تو فسق و فجور رونما ہو جاتا ہے اور نخوت و حسد سے وحشیانہ تشدد پیدا ہوتا ہے“

اس تقریر کے متعلق ہیرودوتس کہتا ہے کہ وہ ایرانی بادشاہ دارا کے دربار میں کی گئی۔ یہ تقریر ایک مباحثے کے دوران کی گئی جس کا موضوع یہ تھا کہ تین قسم کی حکومتوں (یعنی خود اختیاری۔ امیرانہ اور جمہوری) میں کون سی قسم کی حکومت بہترین ہے۔ اس مباحثے میں تینوں قسم کی حکومتوں کے حامی اپنی اپنی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ بالآخر اس مباحثے

کے بعد ایرانی یہ طے کرتے ہیں کہ خود اختیاری حکومت ہی سب سے اعلیٰ ہے اور مباحثے کے اختتام پر دارا اوّل کو تخت نشین کیا جاتا ہے۔

مگر یہ واضح رہے کہ اس گپّی مورخ کی عادت ہے کہ وہ اس قسم کی تقریریں اپنی طرف سے گڑھ کر اپنی تاریخ میں درج کرتا ہے۔ گو ہرودوتس کی پیدائش کے وقت اس کا وطن ایرانی کسراؤں کے زیرنگین تھا۔ لیکن اس کے مرنے سے پہلے اس کا شہر ایتھنز کی جمہوریت میں شامل ہوگیا۔ اس تبدیلی کی وجہ اس نے معلوم کرنی چاہی۔ چنانچہ ہرودوتس نے صرف اسی تبدیلی کی وجہ معلوم نہ کی بلکہ اپنی تاریخ کے جملہ مندرجہ واقعات کی وجہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کی۔

گویا مغربی مورخوں میں ہرودوتس پہلا مورخ ہے جو واقعات کے اسباب بھی تلاش کرتا ہے۔ گو یہ اسباب اکثر اوقات محض گپ شپ پہ مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ تلاش اسباب کی کوشش کرتا ہے تلاش اسباب اور خصوصاً ایرانیوں کی شکست کے اسباب کی تلاش میں اس کو یونانی اور ایرانی تہذیبوں کا موازنہ بھی کرنا پڑا کیونکہ اس کی عقل نے معلوم کر لیا تھا کہ دو حکومتوں کی جنگ دراصل دو تہذیبوں کی جنگ ہوتی ہے۔ اور جنگ میں فتح اور شکست ان تہذیبوں کی قوت اور کمزوری پر منحصر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ہرودوتس کو یہ بھی معلوم کرنا پڑا کہ اعلیٰ قسم کی تہذیب میں کیا کیا خصوصیات ہوتی ہیں۔ لیکن تہذیبوں کی خصوصیات معلوم کرنا دراصل علم عمرانیات سے متعلق ہے۔ اس لئے ہرودوتس کو علم عمرانیات میں بھی دخل دینا پڑا۔ اور اس طرح اس یونانی مورخ کی نوشتہ تاریخ کا دائرہ بڑھ گیا۔

اس سلسلے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ہرودوتس کے زمانے میں علم

عمرانیات کی علیحدہ کوئی ہستی نہ تھی بلکہ یہ علم میرے تحت تھا۔ علم عمرانیات کی اپنی علیحدہ ہستی ابن خلدون نے قائم کی۔ اس زمانے میں تو اس علم کا زور دنیا میں اور خصوصاً امریکہ میں اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کے حامی اس کو سائنس کہتے ہیں لیکن اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ علم میرے بطن سے پیدا ہوا۔ گویا ابن خلدون نے دائی بن کر اس کو میرے بطن سے نکالا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مجھ کو بذات خود اب تک بعض مفکروں نے سائنس ہونے کی عزت نہیں بخشی۔ لیکن میرا پیدا کردہ علم عمرانیات آج کل مکمل سائنس کہلاتا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ علم عمرانیات کو سائنس ہونے کی عزت نیم پخت امریکنوں کے ہاتھوں ملی ہے۔ اہل مغرب اور خصوصاً انگریز اس علم کو سائنس نہیں مانتے۔ (حوالہ نمبر ۴)

ہرودوٹس نے اپنی تاریخ میں بعض ایسی عجیب باتیں لکھی ہیں جو آج کل صرف عجیب ہی نہیں معلوم ہوتیں بلکہ آج کل کے حالات سے بالکل متضاد نظر آتی ہیں۔ مغربی تہذیب میں عورتیں مردوں کے ہر کام میں دوش بدوش ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس مشرق میں عورتیں مردوں کی سوسائٹی سے الگ تھلگ رہتی ہیں لیکن ہرودوٹس جو واقعات قدیم زمانے کے متعلق بیان کرتا ہے ان میں یہ سب برعکس نظر آتا ہے۔ وہ ایک موقع کے واقعات کے سلسلے میں کہتا ہے کہ ایرانیوں کی ایک جماعت دارا اوّل کے زمانے میں ایک یونانی باجگذار حکمران کے پاس بغرض وصول یابی خراج پہنچی۔ یونانی محکوم حکمران نے ایرانیوں کی بڑی خاطر مدارات کی۔ اور دعوت کے بعد جب شراب نوشی شروع ہوئی تو ایرانیوں نے کہا :۔ (حوالہ نمبر ۵)

"عزیز مقدونیو! ہم ایرانیوں کا دستور ہے کہ جب جشن ضیافت کرتے ہیں تو ہماری بیویاں اور آشنائیں بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر

دعوت کھاتی ہیں ...."

اس پر یونانیوں کا جواب سنیئے جو یونانیوں کی طرف سے اس حکمران نے دیا۔

"اے ایرانیو! ہمارے ہاں اس قسم کا دستور نہیں۔ ہمارے ہاں عورت اور مرد علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔"

لیکن ہرودوتس کا اصل مقصد اس من گھڑت قصہ بیان کرنے سے یہ ہے کہ وہ ایرانیوں یعنی اہل مشرق کو اور یونانیوں یعنی اہل مغرب کو مہذب ثابت کرے۔ کیونکہ وہ اس قصے کے اختتام پر کہتا ہے کہ جب بے چارے یونانی باجگزار حکمران نے مجبور ہو کر اپنی عورتوں کو بلایا تو ایرانیوں نے ان عورتوں کو اپنے بغل میں بٹھانے پر مجبور کیا - اور بالآخر ان عورتوں پر ہاتھ ڈالا۔

اس قسم کے من گھڑت قصے لکھ کر ہرودوتس نے مغرب اور مشرق کے درمیان اس مخاصمت کی بنیاد ڈالی جو آج تک کسی نہ کسی صورت میں قائم ہے۔ اب یہی مخاصمت امتیاز رنگ کی صورت میں ہے۔

پولی بیوس اور اس کی تاریخ

رومیوں کے زمانے کے صحیفوں میں مجھے پولی بیوس (سنہ ۲۰۶ تا سنہ ۱۲۸ قبل مسیح) کی نوشتہ تاریخ خاص طور سے پسند ہے۔ اس کے زمانے میں رومیوں نے تمام مغرب کی حکومتوں کا خاتمہ کیا۔ اور مغرب میں صرف رومی سامراج تھا جس کے ہاتھ میں تمام مغرب کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ اس مفکر مورخ نے رومیوں کی عالمگیر فتح کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی۔ وہ کہتا ہے:- (حوالہ نمبر)

"ہر انسانی دماغ کو خواہ وہ کتنا ہی بے خبر یا حقیر ہو جستجو ہوتی ہے کہ تقریباً تمام دنیا ترپن ۵۳ سال کے اندر ہی روم کے زیر نگین کس طرح ہو گئی اور (انسانی دماغ) رومیوں کی سیاسی تنظیم معلوم کرنے

کا خواہاں ہوتا ہے۔ جس کی بدولت ایسی فتح حاصل ہوئی جس کی نظر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی ....."

پولی بیوس کے دماغ میں ایک اور سوال پیدا ہوا یعنی یہ کہ "یہ رومی کون لوگ ہیں جنہوں نے میری زندگی ہی میں دُنیا پر غلبہ حاصل کرلیا۔" اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ رومیوں نے جس طاقت پر غلبہ حاصل کرکے دُنیا کو سرنگوں کیا وہ دولت قرطاجنہ تھی جس کا ایک سردار "ہنی بال" نامی رومیوں کے سر پر ۲۱۸ قبل مسیح آپہنچا لیکن اسی دولت قرطاجنہ کو رومیوں نے بالآخر خاک میں ملادیا۔

اس مورخ پولی بیوس کو اپنے ہم قوم مورخ یوسف کی طرح رومیوں کا دست نگر ہونا پڑا تھا۔ دل میں وہ بلاشبہ رومیوں کا دشمن تھا مگر اس نے اپنے دماغ کو اپنے دل سے مغلوب نہیں ہونے دیا۔ رومیوں نے اس کو مقید کردیا لیکن اس نے رومیوں پر جادو کرکے ان سے آزادی حاصل کی۔ اور ایک رومی سردار اس کو اپنے ہمراہ جنگوں میں لے گیا۔ قرطاجنہ کی بربادی پولی بیوس نے بچشم خود دیکھی۔ جب یہ رومی سردار بعد فتح واپس آیا تو پولی بیوس کو شہر روم میں رہنے کی اجازت دی گئی۔

پولی بیوس کی نوشتہ تاریخ کو میں اس لئے پسند کرتی ہوں کہ اس میں فن تاریخ نگاری پر مورخین کے لئے چند اہم ہدایات اور مشورے ہیں یہ پہلا مغربی مورخ ہے جس نے میرے فن پر تبصرہ کیا۔ رومیوں کی فتوحات بچشم خود دیکھ کر اس کو خیال پیدا ہوا کہ تاریخ کے واقعات ایک ہی راستے پر چلتے ہیں۔ گویا میں ایک ہی راستہ اختیار کرتی ہوں۔ وہ کہتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۵)

"واقعات کی مماثلت کے پیش نظر مورخ کے لئے ضروری ہے

کہ وہ بھی ایک راستہ اختیار کر کے اپنے ناظرین کو بتائے کہ قوانین
تقدیر کس طرح کار فرما ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر مجھ کو رغبت ہوئی
کہ میں اس کتاب کو لکھوں۔"

گویا پولی بیوس کو مجھ میں تسلسل۔ عالمگیریت اور یگانگت نظر آئی۔ اس سلسلے میں وہ مورخوں کو مشورہ دیتا ہے۔ (حوالہ نمبر ۶)

"تاریخ نگاروں اور ناظرین تاریخ کو بیان واقعات سے
زیادہ واقعات کے اسباب اور ان کے لازم ملزوم ہونے
پر توجہ مبذول کرنی چاہیئے۔ اگر تاریخ سے "کیوں" "کیسے" اور
"کس طرح" جیسے سوال خارج کر دیئے جائیں تو تاریخ میں جو کچھ باقی
رہ جائے گا۔ اس کی بنا پر تاریخ سائنس نہیں رہے گی بلکہ حکایت
سیاح بن جائے گی۔ جس کو پڑھ کر لوگ صرف محظوظ ہو سکیں
گے۔ لیکن حالات مستقبل کو حل کرنے سے قاصر رہیں گے۔"

یہاں پولی بیوس کی مراد یہ ہے کہ میں ہمیشہ دنیا میں یگانگت اور مماثلت پیدا کرنے کی جستجو میں رہتی ہوں اور اسی لئے ہر زمانے میں میری طرف سے یکساں واقعات نمودار ہوتے ہیں۔ کاش میں پولی بیوس کی امیدیں مستقبل کے معاملے میں بھی پورا کر سکتی۔ لیکن میں تو یہ دیکھتی ہوں کہ ہر دفعہ نئے اسباب سے نئے واقعات پیدا ہوتے ہیں کیونکہ میرے ترکش میں سینکڑوں تیر ہیں۔ ہر نئے زمانے میں کوئی نیا تیر چلاتی ہوں۔ اگر میں ہر زمانے میں پرانا تیر چلاتی رہوں تو لوگ اپنی حفاظت کے لئے کوئی نیا سپر بنا لیں گے اور میری تیر اندازی بے کار ہو جائے گی۔ اور ساتھ ہی میں ایک راستے کی غلام ہو جاؤں گی۔

پولی بیوس کا مقولہ تھا کہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"۔ وہ یونانی مورخوں پر نکتہ چینی کرتا ہے کہ انہوں نے سُنی سنائی باتوں کو بغیر تحقیق اپنی تاریخوں میں درج کیا۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ بہترین تاریخ صرف وہ لکھ سکتے ہیں جو تاریخ گر بھی ہوں یعنی جن واقعات کو وہ درج کر رہے ہیں ان کے پیدا کرنے میں انہوں نے حصہ بھی لیا ہو۔ اس سلسلے میں وہ کہتا ہے:۔

(حوالہ نمبر ۷)

"میں کہتا ہوں کہ تاریخ ٹھیک طریقے سے نہیں لکھی جا سکتی۔ جب تک یا تو وہ لوگ تاریخ نگاری کریں جو عملی تجربہ رکھتے ہوں ....." یا مورخوں کو یقین کامل ہو کہ تاریخ نگاری کے لئے عملی تجربہ ضروری ہے۔ جب تک یہ نہ ہو گا تب تک تاریخ نگاری میں فحش غلطیاں ہوتی رہیں گی"۔

پولی بیوس ایک یونانی مؤرخ کے حوالے سے ان مورخوں پر نکتہ چینی کرتا ہے جو تاریخ نگاری میں لفاظی اور عبارت آرائی سے کام لیتے ہیں۔ گویا ایسے مؤرخ اصل عمارت کی جگہ عمارت کی مرصّع تصویر پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۸)

"تاریخانہ تحقیق کے معاملے میں جن مورخوں کو عملی تجربہ نہیں ہوتا وہ غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے ناتجربہ کار مؤرخ کس طرح بتا سکتے ہیں کہ فوجیں کس طرح چالیں چلتی ہیں شہروں کا محاصرہ کس طرح کیا جاتا ہے اور بحری لڑائیاں کس طرح لڑی جاتی ہیں۔ اگر ان کو یہ باتیں بتائی جائیں تو ان کی تفصیلات کو یہ لوگ کسی طرح سمجھ سکتے ہیں"۔

لیکن پولی بیوس کی عائد کردہ یہ شرط بڑی سخت ہے۔ اگر اس شرط کے تحت تاریخ نگاری کی جائے تو پرانے زمانے کی تاریخ کس طرح لکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ سپاہی منش لوگ جو لڑائیاں لڑتے ہیں۔ اہل سیف ہوتے ہیں اہل قلم نہیں ہوتے جو خود لڑتے ہیں وہ تو اپنے راگ گائیں گے۔ وہ بے غرض ہو کر نہیں لکھ سکتے۔

مسلمان مؤرخ طبری اور اس کی تاریخ

روم الکبریٰ کی جگہ بازنطیوں نے لی۔ جو جو اپنے آپ کو "وارثان روم" کہتے تھے لیکن یہ وراثت محض برائے نام تھی۔ چنانچہ بازنطینی دور میں جو تاریخیں لکھی گئیں۔ وہ بیشتر پادریوں کی لکھی ہوئی تھیں اور پادری بھی وہ جو مشرقی کلیسا کے پیرو تھے۔ چنانچہ بازنطینی دور میں طاقی توس اور لوی جیسے پائے کے مؤرخ نہ پیدا ہو سکے چنانچہ میں نے قسطنطنیہ کی سکونت ترک کی اور میں عالمِ اسلام میں پہنچی جہاں عباسیوں کے دار الخلافت بغداد کو دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ یہاں میں نے ایک مورخ ابی جعفر محمد بن جریر الطبری کو خاص طور سے منتخب کیا اور میں نے اس کی سرپرستی کی۔ یہ مسلمان مؤرخ واقعات کے انتخاب کے معاملے میں بڑا محتاط تھا اور محدثوں کی طرح واقعات ہی کی نہیں بلکہ اسناد کی بھی تحقیق کرتا تھا اور خاص طریقے سے ان واقعات کو درج کرتا تھا وہ خود فقیہہ تھا اور سیاست سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ ان خوبیوں کی بدولت اس کے ہم عصر اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔

اپنے زمانے کے بعد طبری متاخرین کے لئے بھی نمونہ بنا اور اس کی

"تاریخ الرسل والملوک" کی تقلید کی گئی۔ طبری کی یہ تاریخ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ زمانہ قبل از اسلام سے متعلق ہے۔ اس میں بانیٔ اسلام سے پہلے کے انبیاء کا تذکرہ ہے جو سن وار نہیں ہے۔ دوسرا حصہ بانیٔ اسلام کے تذکرے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ تذکرہ سیرت ابن اسحاق کے نہج پر ہے۔ زمانہ ہجرت سے طبری واقعات کو سن وار درج کرتا ہے۔ یہاں سے اس کی تاریخ روزنامچہ نما صورت اختیار کرتی ہے۔

طبری کا زمانہ زندگی ۸۳۸ء سے لے کر ۹۲۳ء تک ہے جب دولت عباسیہ اپنی ثقافت کے لئے مشہور ہو چکی تھی لیکن طبری نے اپنا طریقہ اندراج سن وار قائم رکھا۔ ہر سال کے واقعات سن وار درج کیے۔ واقعات "خبر" کی صورت میں لکھے جاتے تھے۔ ایسے واقعات کو بھی جن سے دورِ عباسیہ کی ثقافت کا پتہ چلتا ہے۔ طبری نے محض خبر درج   ۔ ان خبروں کو اس نے روایت کی صورت میں درج کیا۔ اگر کسی ایک واقعہ کے متعلق طبری کو مختلف روایات ملیں تو اس نے ان مختلف روایات کو بھی بمعہ اسناد درج کر دیا۔ اس کا قول تھا کہ "جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس کو ہم دوسروں تک پہنچائیں۔" چنانچہ وہ ہر روایت کو راویوں کے سلسلے کے ساتھ درج کرتا ہے۔

اگر کسی راوی نے اپنی روایت کے ساتھ کوئی شعر پڑھا ہے تو طبری نے وہ شعر بھی اپنی تاریخ میں درج کر دیا۔ چنانچہ اس کی تاریخ میں سینکڑوں اشعار ہیں حتیٰ کہ فارسی کے اشعار بھی اس کی تاریخ میں پائے جاتے ہیں۔ اگر کسی کی موت پر کسی شاعر نے مرثیہ کہا تو وہ بھی طبری نے درج کر دیا۔ واقعۂ کربلا کے سلسلے میں کئی عورتوں نے بھی مرثیے کہے۔ طبری نے ان مرثیوں کو بھی درج کیا۔

واقعات کے ساتھ طبری ان خطوط اور دستاویزات کی نقل بھی دیتا ہے جو اس کے ہاتھ لگ سکے۔ ہر سن کے تحت جو واقعات وہ درج کرتا ہے۔ ان میں اہم واقعہ کو سب سے پہلے لکھتا ہے۔ جب کوئی خلیفہ مرتا ہے تو اس کے سالِ وفات کے تحت اس خلیفہ کی سوانح عمری بھی لکھتا ہے دیگر مورخوں کی طرح طبری حکام وقت کے نام نہیں لکھتا۔ صوبائی گورنروں کے متعلق بھی وہ تفصیل نہیں لکھتا۔ اس کا سروکار تو بس دارالخلافت بغداد سے ہے۔ حکام اور گورنروں کی وفات کا ذکر بھی وہ نہیں کرتا۔ البتہ وہ ان لوگوں کی وفات کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے کوئی کارنمایاں کیا۔ وفات کے تذکرے کی خاطر طبری نے ایک علیحدہ کتاب "ذیل المذیل" کے نام سے لکھی۔

طبری نے تاویلوں سے قطعاً گریز کیا۔ اسباب واقعات کی تلاش میں مورخ کو تاویل کرنی پڑتی ہے لیکن طبری اس قدر محتاط تھا کہ اس نے واقعات کے اسباب بھی معلوم کرنے کی کوشش نہ کی۔ میں اس کی محتاطی کی داد دیتی ہوں۔ کیونکہ میری صورت تاویل بازی کی وجہ ہی سے مسخ ہوئی اس نے کسی معاملے میں رائے زنی بھی نہ کی کیونکہ رائے زنی سے مورخ کی جانب داری کا اظہار ہوتا ہے۔ طبری نے صحیح احادیث کی جستجو میں ایران عراق۔ شام اور مصر کے سفر کئے۔ ایک مرتبہ اس کو روٹی خریدنے کے لئے اپنی قمیص تک فروخت کرنی پڑی۔

شیعہ سنی جھگڑوں سے طبری نے ہمیشہ گریز کیا۔ جو روایات اس کو علیؓ یا معاویہؓ کے متعلق ملیں ان کو اس نے من وعن لکھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ اس کو سخت متعصب سنی کہتے تھے۔ سُنّی اس کو متعصب شیعہ سمجھتے تھے۔ مرنے کے بعد اس کا جنازہ نہیں نکالا گیا اور اس کو اسی حُجرے

میں دفن کر دیا گیا جہاں اس کی دم نکلی تھی۔

باوجود اس کے اس کی تاریخ تحقیق اور صحت کا نمونہ قرار دی گئی۔ طبری کے صدیوں بعد جب مورخوں نے روزنامچہ تاریخ لکھنا ترک کیا تو ماہرین تاریخ نگاری نے طبری جیسی تاریخ کو "تاریخ المستقیم" کا نام دیا۔ مورخ السخاوی (۱۴۲۷ء تا ۱۴۹۷ء) نے اپنی مشہور کتاب "الاعلان" فنِ تاریخ نگاری پہ لکھی جس میں طبری کے متعلق کہتا ہے:- (حوالہ نمبر۹)

"اسی قسم (یعنی تاریخ المستقیم) کی قائد بن ابو جعفر الطبری کی نوشتہ تاریخ ہے جس کو متاخرین مستند مانتے ہیں۔ الطبری صائب الرائے قسم کا عالمِ دین تھا۔ جس کا علم اپنے ہم عصروں سے زیادہ وسیع تھا۔ اس نے احادیث کے سلسلے میں اسمار اور دنیاوی معلومات کا بڑا ذخیرہ جمع کیا۔ لیکن اس نے اپنی تصنیف اپنے مقصد تک محدود رکھی۔ یعنی تاریخ فتوحات اور جنگوں تک۔ اس نے اشخاص وغیرہ کا تذکرہ نہیں کیا اس لئے اس کی تصنیف میں کسی خاص عالمِ دین کا تذکرہ نہیں ملتا۔ وہ ہر بات کو بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ لڑائیوں کا ذکر مختصراً نہیں کرتا۔ وہ سالقہ قوموں اور نسلوں کا تذکرہ حوالوں اور اسناد کے ساتھ کرتا ہے۔ اور اپنی اسناد کا سلسلہ بھی بتاتا ہے۔ ان چیزوں کے متعلق اس کا علم لامتناہی تھا۔ اشخاص کے تذکرے کے معاملے میں اس نے اسمار الرجال پر اکتفار کیا۔ اس نے اپنی تاریخ کا ایک ضمیمہ اور ضمیمہ کا بھی ایک ضمیمہ لکھا۔ محمد عبدالملک ہمدانی نے طبری کی تاریخ کا ضمیمہ لکھا جس میں (خلیفہ) المقتدر باللہ سے لے کر عضد الدولہ ابو شجاع کا حال تا شروع سنہ ۳۶۰ ہجری (مطابق ۹۷۰ء) ہے......"

تاریخ طبری کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ لفاظی اور عبارت آرائی سے پاک ہے۔ وہ معرکوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کرتا ہے۔ دیگر مسلمان مورخین معرکوں کا ذکر مختصراً کرتے ہیں۔ بطور نمونہ طبری ذکر معرکۂ یرموک پیش کیا جاتا ہے :-

(معرکۂ یرموک کی تفصیل طبری کی تاریخ اُردو ترجمے میں گیارہ صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہاں ان صفحوں کے صرف ایک دو اقتباس پیش کئے جاتے ہیں)۔

(حوالہ نمبر ۱۰) مسلمانوں کو رومیوں کے میدان کی طرف آنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے آزادانہ لڑنے کا فیصلہ کیا۔ مگر خالد نے سب امرا کو جمع کیا اور حمد و ثنا کے بعد حسب ذیل تقریر کی :-

" آج کا دن خدا نے اہم ترین دنوں میں مقرر کیا ہے۔ آج کسی کو فخر اور خود رائی نہ کرنی چاہیئے۔ خلوص نیت سے جہاد کرو۔ عمل صرف خدا کے لئے کرو۔ آج کی کامیابی ہمیشہ کی کامیابی ہے .....

خالد نے اپنی فوج کو بہت سے دستوں میں منقسم کر دیا جن کی تعداد چھتیس تا چالیس بیان کی جاتی ہے .....

ایک شخص نے خالد سے کہا کہ دیکھو رومی کتنے زیادہ ہیں اور مسلمان کتنے کم ہیں۔ خالد نے کہا ادھر رومی کتنے کم اور مسلمان کتنے زیادہ ہیں۔ اس کے بعد آپ نے کہا فوجیں نصرت سے کثیر اور ناکامی سے قلیل ہوتی ہیں نہ کہ آدمیوں کی تعداد

سے ..... تمام انتظامات سے فارغ ہو کر خالد نے عکرمہ اور قعقاع کو جو قلب کے دونوں بازوؤں پر متعین تھے جنگ شروع کرنے کا حکم دیا ......

(عین اس وقت ایک قاصد مدینہ سے حضرت ابوبکرؓ کی موت کی خبر لایا۔ لیکن خالد نے اس خبر کو خفیہ رکھا۔ اس وقت رومی فوج کا ایک سردار جرجہ نامی مسلمان ہو کر خالد کا ساتھی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر رومیوں نے حملہ کر دیا)

"رومیوں نے اس حملے سے مسلمانوں کو ان کی جگہ سے ہٹایا... مگر چند مددگار دستے اپنی جگہ جمے رہے ... اس وقت رومی مسلمانوں کی فوج میں گھسے ہوئے تھے۔ خالد نے مسلمانوں کو للکارا جس سے ان کے قدم جم گئے ....

(طبری اصل لڑائی کا حال بڑی تفصیل سے اور معرکے کے فوراً بعد کا منظر پیش کرتا ہے)

"جنگ یرموک میں تین ہزار مسلمان زخمی اور شہید ہوئے (جن میں ابوجہل کا بیٹا عکرمہ بھی شامل تھا)"

طبری نے بازنطینی (رومی) شہنشاہ ہرقل کا تذکرہ بھی شکست یرموک کے سلسلے میں کیا ہے کہ جب اس شہنشاہ کو رومیوں کی شکست کی خبر پہنچی تو اس کے منہ سے نکلا "مگر شام! کاش اے شام تو برباد نہ ہو"۔ البلاذری نے اسی جملے کو اس طرح پیش کیا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۱۱)

"الوداع اے شام۔ دشمن کے لئے یہ ملک کیسا سازگار ہو گا"

طبری صرف مسلمان حملہ آوروں کا حال ہی نہیں بیان کرتا بلکہ رومی فوج اور اس کی شکست کا تذکرہ بھی تفصیل سے کرتا ہے۔ معرکۂ یرموک سے

پہلے شہنشاہ ہرقل بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ یہاں اس کو اطلاع ملی کہ مسلمانوں کا لشکر شام کی فتح کے لئے آرہا ہے۔ اس خبر کو سن کر ہرقل نے جو کچھ کہا اس کو طبری اس طرح بیان کرتا ہے :۔ (حوالہ نمبر ۱۲)

"اس (یعنی ہرقل) نے رومی سرداروں کو جمع کر کے کہا کہ میری رائے میں تم ان لوگوں سے جنگ نہ کرو بلکہ مصالحت کر لو کیونکہ خدا کی قسم اگر شام کی نصف آمدنی ان کو دے دو اور نصف تم رکھو اور اس کے معاوضے میں روم کے تمام پہاڑ تمہارے قبضے میں رہ جائیں تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ لوگ (یعنی مسلمان) روم کے پہاڑوں میں تمہارے حصہ دار بن جائیں۔ ہرقل کی یہ بات سُن کر اس کے بھائی اور داماد نے بہت ناک چڑھائی اور دوسرے حاضرین نے بھی اس کی رائے کو ناپسند کیا۔"

ہرقل نے یہ دیکھ کر کہ یہ لوگ اس کے مشورے کے مخالف اور اس پر معترض ہیں اپنے بھائی کو مقابلے کے لئے بھیجا اور افسرانِ فوج کا تعین کیا اور مسلمانوں کے ہر لشکر کے مقابلے کے لئے الگ لشکر روانہ کیا ۔۔۔۔"

الغرض طبری کی تاریخ جملہ معلومات کا کامل خزانہ ہے اور اسی لئے بعد کے مسلمان مورخین نے اس کی تاریخ کو اپنا ماخذ قرار دیا۔ مغربی مورخ بھی تاریخ طبری کو مستند اور معتبر مانتے ہیں۔

ایک اور نامی مورخ البلاذری اور اس کی تاریخ

دوسرا مسلمان مورخ جو قابل ذکر ہے وہ ابن خلدون ہے لیکن اس نے بھی تاریخ طبری سے استفادہ کیا۔ میں نے اپنے اس نامور محرر کی خاطر ایک علیحدہ باب مخصوص

کیا ہے جس کو آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس لئے میں اب ایک اور مسلمان مؤرخ موسومہ احمد بن یحیی مشہور بالبلاذری (متوفی ۸۹۲ء) کی مشہور تاریخ "فتوح البلدان" کا تذکرہ کرتی ہوں اس نے میری خدمت اس طرح کی اس نے گذشتہ تمام تاریخوں کی معلومات کو یکجا کر کے مسلمانوں کی کہانی کو مسلسل بنا دیا۔ بلاذری سے پہلے مسلمانوں نے جو میرے صحیفے تیار کئے تھے ان کا موضوع الگ الگ تھا۔ مثلاً واقدی (متوفی ۸۲۲ء) کی کتاب موسومہ "مغازی" ان غزوات پر تھی جو بانی اسلام کے زمانے میں واقع ہوئے تھے۔ اسی طرح ابن سعد (متوفی ۸۴۵ء) کی "طبقات کبیر" اصحاب رسولؐ کے حالات زندگی پر مشتمل تھی۔ ابن عبدالحکم کی "فتوح المصر" فتح مصر سے متعلق تھی۔ بلاذری نے ان تاریخوں سے استفادہ کر کے مسلمانوں کی تاریخ کو اپنے زمانے تک سلسلہ وار بنا دیا۔

اپنی تاریخ کی خاطر بلاذری نے بحری سفر بھی کئے۔ اس کے متعلق ابن الندیم اپنی مشہور تصنیف "فہرست" میں لکھتا ہے :- (حوالہ نمبر ۱۳)

"وہ (یعنی بلاذری) شمالی شام کے تمام شہروں میں پھرا اور وہاں سے مابین النہرین (یعنی الجزائر) کے شہروں کی طرف گیا۔ اور تکریت کی سیاحت کی۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ ان مقامات کے باشندوں میں جو روایات محفوظ ہیں انہیں جمع کر کے ان روایات سے ان کا مقابلہ کرے جو اس نے علمائے بغداد سے معلوم کی تھیں"

اس نے اپنی اس تحقیق کی بنا پر جو مواد حاصل کیا اس کے متعلق ابن الندیم جو بلاذری کا شاگرد تھا کہتا ہے :-

"البلاذری نے مرنے سے پہلے بڑی کتاب کے لئے بہت

مواد جمع کیا تھا جس سے چالیس جلدوں کی ایک عظیم الشان
تالیف مرتب ہوتی"۔

بلاذری طبری کا ہم عصر تھا۔ اس لئے بلاذری کے طبری سے مستفید ہونے کا امکان نہیں۔ دونوں کے دونوں اوّل درجے کے محقق تھے۔ مورخ مقریزی نے کئی علماء کے نام لکھے ہیں۔ جن سے بلاذری نے تاریخی معلومات حاصل کیں۔ المرزبانی کا بیان ہے کہ اس قابل فخر مؤرخ کی موت اس طرح نے نادانستہ ایک بوٹی کے بیج کھالئے جس کے اثر سے وہ پاگل ہو اور اسی دیوانگی میں اس نے وفات پائی۔

ہم تک جو کتاب "فتوح البلدان" کے نام سے پہنچی ہے وہ محض خلاصہ ہے لیکن اس خلاصہ سے بھی اس تاریخ کی وسعت اور اس کے مصنف کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔ یہ پہلا مسلمان مورخ ہے جس نے عربوں کے کارناموں کو بحیثیت عرب قوم نہیں دیکھا بلکہ اس نے بنی امیہ جیسے قوم پرست عربوں کو بھی اُمتِ محمدیہ کا جزو سمجھا لیکن ساتھ ہی اس نے بنی امیہ حکمرانوں میں سے صرف عمر بن عبدالعزیز کو خلیفہ کا لقب دیا۔ اس مورخ کا مقصدِ تالیف یہ تھا کہ اسلام ایک خاص مقصد (مشن) لے کر دنیا میں آیا اور حکمرانان بنی اُمیہ اور بنو عباس نے اس مقصد کو پورا کیا۔ گویا ان حکمران خاندانوں کی تاریخ دراصل تاریخ اسلام ہے۔

بلاذری کی نوشتہ تاریخ کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنی تاریخ میں کسی حکمرانِ وقت کی قصیدہ گوئی نہیں کی۔ اس مؤرخ نے دولتِ عباسیہ کے عہد میں پرورش پائی اور متوکل باللہ (۸۴۷ء تا ۸۶۶ء) اور مستعین باللہ (۸۶۲ء تا ۸۶۶ء) جیسے مطلق العنان حکمرانوں سے

مقربوں میں رہا جنہوں نے اس پر بڑے احسانات کئے لیکن اس کے باوجود اس نے اس کی حکومتوں کے متعلق صرف حقائق ہی لکھے اور بیجا ثنا و صفت سے قطعاً گریز کیا۔ اس نے اپنی تاریخ کے ساتھ کوئی دیباچہ یا مقدمہ نہیں لکھا۔ جس میں اس زمانے کے دستور کے مطابق مورخ اپنے محسن حکمران کی قصیدہ گوئی کرتے تھے۔

ایک جرمن مستشرق دی خویہ اس کی بابت لکھتا ہے :- (حوالہ نمبر ۱۴)

"البلاذری ان مورخوں میں سے ہے جو اپنے جمع کردہ مواد میں سے قابل بیان روایات منتخب کرنے ذوق سلیم کے لئے ممتاز ہیں۔"

وہ ان دونوں خاندانوں کے حکمرانوں کے اُن پہلوؤں کو خاص طور سے روشن کرتا ہے جن سے ان کے مقصد جید یعنی نشر و اشاعت اسلام پر روشنی پڑتی ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں شہر بغداد کا حال ابتدا سے لے کر اپنے زمانے تک کا لکھا۔ معرکۂ یرموک کے تذکرے میں بلاذری مسلمان عورتوں کے متعلق لکھتا ہے۔ (حوالہ نمبر ۱۵)

"الیرموک کے دن مسلمان عورتوں نے خوب جنگ کی۔ ہند بنت عتبہ ام معاویہ بن ابی سفیان پکارتی تھی کہ بغیر ختنہ والوں (یعنی عیسائیوں) اپنی تلواروں کاٹ پھینکو۔ اس کا شوہر ابوسفیان بحیثیت "مطوع الشام" (یعنی والینٹر) آیا تھا اور اس نے چاہا تھا کہ ننگے ہاتھوں اپنی اولاد کو بھی دیکھ لے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بیوی ہند کو بھی لایا تھا۔۔۔۔"

طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے (جس کی نقل طبری کی تاریخ میں پیش کی جا چکی ہے) کہ ہرقل نے بعد شکست یرموک علاقۂ شام کو کس طرح الوداع کہا۔

اسی واقعہ کو بلاذری اس طرح بیان کرتا ہے :- (حوالہ نمبر ۱۶)

"کہتے ہیں جب ہرقل کو اہل الیرموک کی خبر ہوئی اور اس کی فوج پر مسلمانوں کے ہاتھوں جو کچھ گذری تھی اس کا احوال اس نے سنا تو وہ انطاکیہ سے قسطنطنیہ بھاگ گیا۔ اور (مقام) الدرب سے گذرتے ہوئے اس نے (ارض شام سے یوں) خطاب کیا: اے سوریہ تجھ پر سلام۔ دشمن کے لئے یہ کیسا اچھا ملک ہے۔ اس سے اس کی مراد مرغزاروں کی کثرت کی وجہ سے ارض الشام تھی۔"

گو یہاں بلاذری کی "فتوح البلدان" سے محض ایک دو اقتباس پیش کئے گئے لیکن ان مختصر اقتباس سے بھی اس تاریخ کے مستند ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اکثر واقعات کو بیان کرنے سے پہلے وہ لکھتا ہے "کہتے ہیں..." لیکن جو واقعات اس کو معتبر لوگوں سے ہاتھ لگے ان کا نام اور ان کے ذرائعوں اور ماخذوں کے نام بھی یہ مورخ لکھتا ہے۔ اس کی مثال ذیل میں منقول ہے :- (حوالہ نمبر ۱۷)

"مجھ سے ابوحفص الدمشقی نے کہا۔ ان سے سعید بن عبدالعزیز نے۔ ان سے ان کے بڑے بوڑھوں نے۔ ان سے بقیہ بن الولید نے اور ان سے مشائخ اہل اسلام نے" ان اسناد کے بعد وہ واقعہ کو بیان کرتا ہے۔

مسلمانوں کے زمانے کے اور بھی مورخ ہیں جن کی تصانیف مجھے پسند ہیں ان مورخوں کا تذکرہ مختصراً میں اپنے باب موسومہ "عالم اسلام میں میری آمد اور قیام" کے تحت کر چکی ہوں اسلئے بلاذری کے تذکرہ کے بعد

مسلمان مورخوں کا ذکر ختم کرتی ہوں۔ صرف ایک فارسی تاریخ کا تذکرہ باقی ہے۔

فارسی زبان میں ایک عجیب و غریب تاریخ

یہ فارسی تاریخ آج کل "تاریخ بیہقی" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے صرف چند حصے آج دستیاب ہیں۔ اس کا مصنف ابوالفضل بیہقی نامی تھا جس نے اپنی مکمل تاریخ "جامع التواریخ" کے نام سے محمود غزنوی کے جانشین مسعود اول (۱۰۳۱ء تا ۱۰۴۱ء) کے زمانے میں لکھی۔ بیہقی کا مقصد تالیف یہ تھا کہ وہ اس کتاب کے ذریعہ آل سبکتگین کے کارنامے بیان کرے۔

بیہقی کی اس تاریخ کی خصوصیت میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس مؤرخ نے ابن خلدون سے ساڑھے تین سو سال پہلے مورخ کے لئے چند شرائط قائم کئے۔ اس لئے میں اس کو اپنے فلسفیوں میں شمار کرتی ہوں۔ وہ میرے فلسفے کو اس طرح پیش کرتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۱۸)

"انسان کو قلب انسانی ہی سمجھ سکتا ہے۔ دل جو کچھ سنتا ہے یا دیکھتا ہے اس کے مطابق وہ قوی ہوتا ہے یا کمزور۔ جب تک وہ خیر و شر کو دیکھتا سنتا نہیں تب تک اس کو دنیا میں نہ غم ہوتا ہے نہ خوشی۔ پس واضح رہے کہ آنکھیں اور کان دل کے پاسبان اور مخبر ہیں جو دل کو شنیدہ اور دیدہ کی خبریں دیتے ہیں تاکہ یہ (یعنی دل) ان سے مستفید ہو اور عقل کے سامنے پیش کرے۔ عقل انصاف پسند اور عادل ہے اور حق اور باطل میں تمیز کرتی ہے اور کارآمد سے کام لیتی ہے اور غیر کارآمد کو خارج کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی مخفی کو جو نامعلوم اور

ناشنیدہ ہے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ یعنی زمانہ ماضی میں کیا واقع ہوا اور کیا نہیں ہوا لیکن یہ تاریخی معلومات بصد مشکل حاصل کی جا سکتی ہے یا بذریعہ سفر عالم یا مستند کتب جن سے اصل واقعات کا پتہ چلتا ہے.....

تاریخ ماضی دو قسم کی ہیں اور تیسری قسم کا پتہ نہیں یعنی وہ جو دوسروں سے سنی جائے یا بذریعہ کتب پڑھی جائے۔ یہ شرط لازم ہے کہ تمہارا مخبر قابل اعتماد اور سچا ہو۔ اور عقلی کہانی کی صداقت کی تصدیق کرے اور بذات خود بیان کو تسلیم کرے اور کتاب ایسی ہو جس کو ناظر یا سامع خارج نہ کرے بلکہ فوراً اس کے دعوؤں کو مان لے۔ بیشتر لوگوں کی طبیعتیں ایسی ہیں کہ وہ لغو قصوں کو سچے قصوں سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مثلاً پریوں۔ پہاڑوں اور صحرائی اور بحری بھوت پریت کے قصے جن کو سن کر نادان محظوظ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک قصہ گو کہتا ہے کہ ایک سمندر میں ہمیں ایک جزیرہ نظر آیا جس پر پہنچ کر آدمی اترے اور ہم نے روٹی پکائی اور برتنوں میں پانی گرم کیا۔ لیکن جب آگ تیزی سے جلنے لگی تو آگ کی گرمی زمین میں غائب ہو گئی اور ہم نے کیا دیکھا کہ وہ (جزیرہ) محض ایک مچھلی تھا......

بیہقی یہ نصیحتیں دوسروں کے لئے تو کرتا ہے لیکن خود اس نے ان پر عمل نہ کیا۔ اس کی تاریخ میں گپ شپ بھی ہے اسی لئے یہ اپنے زمانے کی سازشوں اور سیاست کا آئینہ ہے۔ اس قسم کی معلومات اور تاریخوں میں نہیں پائی جاتیں۔ دور حاضر کا تقاضا ہے کہ میں اس قسم کی معلومات بھی فراہم کر دوں۔ چنانچہ میری طرف سے بیہقی نے یہ کام کیا جس کے لئے میں اس کی ممنون احسان ہوں۔ اس کی تاریخ ایک طرح سے

اس کی اپنی سرگذشت ہے۔ وہ اپنے زمانے کے امرا کے حرکات و سکنات بڑی تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ اسی طرح وہ سلطان مسعود کے دربار کے بھی حالات بیان کرتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ اس نے صرف پچاس سال کے واقعات بیان کئے ہیں لیکن کئی ہزار صفحے رنگے ہیں۔ اس نے کئی تاریخوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں ایک تاریخ موسومہ "مقامات محمودی" بھی شامل ہے لیکن یہ تاریخیں تلف ہوگئیں۔

بیہقی کی تاریخ کے جو حصے آج دستیاب ہیں ان کو پروفیسر سعید نفیسی نے "در پیرامون تاریخ بیہقی" کے نام سے دو جلدوں میں تہران سے شائع کیا ہے۔

مشہور انگریز مؤرخ ایڈورڈ گبن اور اس کی تاریخ

یہ انگریز مؤرخ گبن (۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۴ء) ایسے زمانے میں گذرا ہے جب فرانسیسی فلسفی والٹیر کے اثر سے مغربی یورپ میں مذہب اور خدا سے منکر ہونا فیشن میں داخل تھا۔ گبن علاوہ مؤرخ ہونے کے انگریزی پارلیمنٹ کا رکن بھی تھا اور اس طرح وہ عملی سیاست کی پیچیدگیوں سے بھی بخوبی واقف تھا۔ کس خیال کے تحت اس نے اپنی مشہور تاریخ موسومہ "زوال و خاتمہ دولت روم" لکھی اس کو معلوم کرنے کے لئے اس کی نوشتہ سرگذشت بھی لازم ہے۔ اپنی اس خودنوشتہ سرگذشت میں وہ کہتا ہے کہ "مصنف کا طرز نگارش اس کی سیرت کا آئینہ ہوتا ہے۔"

(حوالہ نمبر ۱۵)

"(اس کتاب کی تکمیل کے بعد) اپنی آزادی دوبارہ حاصل کرنے سے جو خوشی مجھے ہوئی اس کو میں پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا اور نہ اس بات کو (کہ یہ خوشی مجھے اس لئے بھی ہوئی) کہ اب میری شہرت قائم ہوگئی۔"

اسی سرگذشت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کی شہرت طلبی صرف اس کتاب تک ہی محدود نہ تھی بلکہ وہ اپنی حکومت میں کوئی بڑا عہدہ بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسی شہرت کی خاطر گبن نے اپنی اس مشہور تصنیف میں عبارت آرائی سے بھی کام لیا۔ عبارت کے حساب سے اس کی یہ کتاب بلاشبہ کامیاب ہوئی۔ باوجود اس کی خامیوں کے یہ آج تک مشہور ہے۔ گو ہر ہر کس و ناکس اسکو نہیں پڑھتا لیکن شہرت طلب لوگوں کے ڈرائنگ روم میں آج بھی یہ کتاب پائی جاتی ہے۔

لیکن صرف عبارت آرائی اس کتاب کی شہرت کا باعث نہیں ہوئی۔ اس کی اصل شہرت مصنف کی چھان بین پر مبنی ہے۔ گبن نے علاوہ لاطینی زبان کی تاریخوں کے قران سے بھی استفادہ کیا۔ گبن عربی زبان نہیں جانتا تھا لیکن اس کے زمانے میں قرآن کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں موجود تھا۔ علاوہ قران کے گبن نے طبری، واقدی، ابن قتیبہ ابن عبد الحکم کی نوشتہ سوانح حیات پیغمبر اسلام سے بھی استفادہ کیا۔

(حوالہ نمبر ۱۶)

"چونکہ مذہب کا مقصد عاقبت سنبھالنا ہوتا ہے اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مذہب عیسوی کی آمد یا اس مذہب کے بیجا استعمال سے رومی سامراج زوال اور بربادی کے معاملے میں متاثر ہوا۔ عیسائی پادریوں نے توکل اور بزدلی کی تلقین کی مستعدی کی مذمت کی گئی۔ سپہ گری کی آخری نشانیوں کو خانقاہوں میں دفن کیا گیا۔ سرکاری اور غیر سرکاری روپیہ زہد اور صدقوں پر برباد کیا گیا۔ سپاہیوں کی تنخواہوں کو بیکار عورتوں اور مردوں

پر صرف کیا گیا جن کی صفت صرف پارسائی اور پرہیزگاری تھی۔ مذہبی جوش وخروش، شوق اور نفسانی حسد وتمنا نے مذہبی جھگڑوں کی آگ روشن کی۔ ان جھگڑوں سے حکومت اور کلیسا دونوں میں تفرقہ پیدا ہوا جس سے خون ریزی پیدا ہوئی۔ رومی شہنشاہوں کی توجہ بجائے فوج کے کلیسا پر مبذول ہوئی۔ اب رومی دنیا میں ایک نئے قسم کا جور وستم نمودار ہوا۔ مظلوم فرقے (یعنی عیسائی) اپنے ملک کے مخفی دشمن ہو گئے ......"

اکثر اوقات گبن بجائے بیانِ واقعات کے لفاظی اور عبارت آرائی سے کام لیتا ہے اور اپنے ناظرین کو موہ لیتا ہے۔ یہ تاریخ انگریزی ادب کا نمونہ بن گئی ہے اور اسی لئے ابھی تک مقبول ہے حالانکہ جدید تحقیقات سے نئے مواد حاصل ہوئے ہیں لیکن گبن کا جادو اب بھی باقی ہے۔

مسلمان گبن کی تاریخ کو اس لئے پسند کرتے ہیں کہ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی تعریف ہے۔ لیکن اس تعریف کی وجہ "بغضِ معاویہ ہے حُبّ علی نہیں"۔ گبن کو عیسائیت سے سخت نفرت ہے۔ چونکہ اسلام نے عیسائیت کو زک دی اس لئے گبن اسلام کی تعریف کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ صاف صاف کہتا ہے۔

"چونکہ اس باب میں اور اگلے باب میں اپنے عربی علم کا میں اظہار کروں گا اس لئے (میں صاف صاف کہتا ہوں) کہ میں مشرقی زبانوں سے قطعاً ناآشنا ہوں اور میں اُن فاضل مترجمین کا ممنون ہوں جنہوں نے ان (مشرقی زبانوں کے علوم) کا انگریزی لاطینی فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ کیا ہے"

گبن نے اپنی پانچویں جلد میں تین ابواب یعنی ۵۰۔ ۵۱ اور ۵۲ مسلمانوں

کے لئے مخصوص کئے۔ اسی طرح اس نے اپنی چھٹی جلد میں کئی ابواب مسلمان سلجوقی اور عثمانی ترکوں کے لئے مخصوص کئے۔ مغرب میں اسلام کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ مذہب بزور شمشیر پھیلا۔ اس خیال کے پھیلانے میں گبن کو بڑا دخل ہے۔ اس سلسلے میں گبن پیغمبر اسلام کے متعلق کہتا ہے:۔

(حوالہ نمبر ۱۷)

"تلقین کے طریقے کو آزمایا گیا۔ زمانۂ صبر و حلم بھی ختم ہوا اور اب ان کو (یعنی پیغمبر اسلام کو) حکم دیا گیا کہ وہ اپنا مذہب بزور شمشیر پھیلائے۔ بت پرستی کی نشانیوں کو مٹانے اور بلا لحاظ تقدیسِ ایام و ماہ دنیا کی کافر قوموں کے درپے ہو......"

لیکن ساتھ ہی اس پیغمبر کی سیرت کو گبن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

(حوالہ نمبر ۱۸)

"محمدؐ کی نیک سیرت نے شاہانہ افتخار کو حقیر سمجھا۔ یہ رسول خدا اپنے خاندان کی خدمت کرتا تھا۔ وہ آگ جلاتا تھا۔ جھاڑو دیتا تھا بھیڑوں کا دودھ دوہتا تھا اور اپنے ہاتھ سے اپنے جوتے اور اپنی گدڑی میں پیوند لگاتا تھا۔ باوجود اس کے کہ وہ رہبانوں کی حرکات کو ناپسند کرتا تھا لیکن (غذا کے معاملے میں) وہ صرف عربی اور سپاہیانہ کھانا کھاتا تھا......"

گبن اسلام اور عیسائیت کا موازنہ اس طرح کرتا ہے:۔

"جس بات پر ہمیں حیرت ہوتی ہے وہ ان کے (یعنی پیغمبر اسلام کے) مذہب کی اشاعت نہیں بلکہ اُن کے مذہب کا استقلال ہے۔ بارہ صدیوں کے انقلابات کے باوجود ہندی افریقی اور

ترک معتقدین قرآن کے ذہنوں میں آج بھی (اسلام کا) وہی خالص اور مکمل تصور ہے جو اس نے مکہ اور مدینہ میں (ان کے ذہنوں پر) کندہ کیا تھا۔ (اس کے برعکس) اگر آج مبلغین عیسائیت سینٹ پیٹر یا سینٹ پال یا پائے روم کے مرکز میں واپس آکر دیکھیں تو ان کو پوچھنا پڑے گا کہ اس خدا کا کیا نام ہے جس کی عبادت اس عبادت گاہ میں ایسے پُراسرار طریقے سے کی جا رہی ہے.... لیکن مسجد ایا صوفیہ باوجود اس کی شان و شوکت میں اضافہ ہونے کے آج بھی ویسی ہی سیدھی سادھی مسجد ہے جس کو محمدؐ نے مدینہ میں تعمیر کیا تھا۔ مسلمانوں نے دھوکے میں آکر کبھی اپنے مذہب کو انسانی حواس سے آلودہ نہیں کیا (یعنی بت نہیں قائم کئے) اسلام کا کلمہ آج بھی سیدھا سادہ لا الٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ (مسلمانوں نے) اپنے خدا کو بُت بنا کر ذلیل نہیں کیا اپنے پیغمبر کے احترام کو انہوں نے انسانی خوبیوں کے حدود میں رکھا اور (اس پیغمبر کی رائج کردہ تعلیمات) عقل اور مذہب کے حدود کے اندر ہی رہیں......"

بارہواں باب

لوگ مجھے کیوں پڑھتے ہیں؟

میں اپنی اس سرگذشت میں بتا چکی ہوں کہ مختلف زمانوں میں مجھے مختلف بھیس اختیار کرنے پڑے۔ "جیسا دیس ویسا بھیس" کے مقولے پر مجھے چلنا پڑا۔ میں نے جو مختلف بھیس اختیار کئے اُن کو چار زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

میرے چار بھیس

اول ۔ سائنسی جس کے تحت میں واقعات جمع کرتی ہوں اور واقعات کا جائزہ اسناد کی روشنی میں لیتی ہوں اور چھان بین کے بعد ان واقعات کو اپنے صحیفوں میں درج کرتی ہوں

دویم ۔ تخیلاتی بھیس جس کے تحت میں واقعات سے "کھیلتی" ہوں یعنی واقعات جمع کرنے کے بعد میں اِن کو زمروں میں تقسیم کرتی ہوں اور اس کے بعد تخیل سے کام لے کر ان سے کلیئے اخذ کرتی ہوں ۔ اس کو میں "فلسفیانہ" بھیس بھی کہتی ہوں۔

سویم ۔ ادبی بھیس جس کے تحت میں سائنس اور تخیل دونوں سے کام لیتی ہوں اور انہیں واقعات کو ایسے سانچے میں ڈھالتی ہوں کہ یہ واقعات دلکش ہو کر میرے ناظرین کے لئے سبق آموز بن جائیں ۔ اس طرح مجھے صحیفے ادبی زمرے میں اپنا مقام پیدا کر لیتے ہیں ۔ یہ کام میرا وہی مورّخ کر سکتا ہے جو "زیب داستان" اور عبارت آرائی کے فن میں مشّاق ہو۔ میرے اس ادبی بھیس کی بہترین مثال فارسی تاریخوں میں عطا ملک

جوینی کی نوشتہ تاریخ جہاں گشا ہے۔ انگریزی زبان میں اس کی بہترین مثال ایڈورڈ گبن کی "زوال و خاتمہ رومتہ الکبریٰ" ہے۔

چہارم روحانی بھیس جس کے تحت مجھے الہام ہوتا ہے۔ اس بھیس کا تذکرہ میں باب موسومہ "میرا روحانی پہلو" کے تحت کر چکی ہوں۔ یہاں میں اپنے روحانی پہلو کا وہ پہلو دکھانا چاہتی ہوں جس کو دیکھ کر انسان کے دماغ میں اسرار خودی پیدا ہوتے ہیں۔ جب کسی اہل دل کے دل میں اپنی جگہ بنا لیتی ہوں تو وہ بظاہر دیوانہ نظر آتا ہے لیکن خدا کی نظر میں وہ دیوانہ نہیں بلکہ فرزانہ ہو جاتا ہے۔ انبیا اور اولیا اسی زمرے میں آتے ہیں۔ وہ اپنے کشف کے ذریعہ میرے تمام اسرار معلوم کر لیتے ہیں گویا میرا روحانی پہلو ان پر منکشف ہو جاتا ہے اور وہ ان اسرار سے متاثر ہو کر اپنے میں وہ قوت حاصل کر لیتے ہیں جس سے بقول اقبال:۔

(حوالہ نمبر ۱)

غنچہ ہا از شاخسار او شکست　　　پیر گردوں کز کواکب نقش بست

ماہ از انگشتِ او شق می شود　　　پنجۂ او پنجۂ حق می شود

در خصومات جہاں گردد حکم

تابع فرمانِ او دارا و جم

(پیر گردوں جو ستاروں کا نقش بناتے ہوتے ہے اس کا خوشہ چیں ہو جاتا ہے اس کا ہاتھ دست خدا بن جاتا ہے۔ اس کی انگلی سے چاند کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ دنیا کی تمام مخالفتوں پر قابو حاصل کر لیتا ہے اور دارا اور جمشید جیسے بادشاہ اس کے تابع ہو جاتے ہیں)

تاریخ سے سب فیضیاب ہوتے ہیں

اس دنیا میں کئی قسم کے انسان ہیں چنانچہ ہر قسم کے انسان میرے ان بھیسوں سے اپنی طبیعت کے مطابق فیض یاب ہوتے ہیں۔ سائنس داں میرے سائنسی بھیس کے شیدا ہوتے ہیں۔ فلسفی میرے قیاسی بھیس کو پسند کرتے ہیں۔ شاعر اور ادیب میرے ادبی بھیس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اہل دل میرا روحانی بھیس دیکھ کر مجھ پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ آسمانی صحیفے میرے تذکرے سے پُر ہیں۔ توریت، زبور، انجیل اور قرآن میرے تذکروں سے پُر ہیں مگر غیر الہامی مذاہب کے پیرو میرے نام سے ناآشنا رہے۔

ان چاروں بھیسوں کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ کرنے سے پہلے میں یہ بتانا چاہتی ہوں خواہ میرا بھیس کسی قسم کا ہو میرا اصلی مدعا ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ وہ مدعا تلاشِ حقیقت ہے۔ میں نے یہ مختلف بھیس اس لئے اختیار کئے کہ ہر طبیعت کا انسان میرا گرویدہ ہو کر تلاش حقیقت کا شیدا ہو جائے کیونکہ حقیقت ایک ہی ہے گو اس کے مختلف بھیس ہیں۔ سائنس پسند لوگوں کو یہ حقیقت مجازی صورت میں نظر آتی ہے۔ فلسفی اس کو عالم خیال کہتے ہیں۔ شاعروں کو حقیقت اشعار میں نظر آتی ہے۔ اہل دل کو یہی حقیقت ہر چیز میں نظر آتی ہے اور وحدت الوجود کو دیکھ کر یہ اہل دل انا الحق کا نعرہ لگاتے ہیں۔ میں بھی ہمیشہ اسی حقیقت کی متلاشی رہی۔

اب میں اپنے چاروں بھیسوں کا علیحدہ علیحدہ ذکر کرتی ہوں اور بتاتی ہوں کہ اہل نظر کو میں ہر ہر بھیس میں کارآمد نظر آتی ہوں۔ بقول شاعر

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

باوجود ان مختلف بھیسوں کے اہل نظر میرے قد و قامت کو پہچان

لیتے ہیں کیونکہ میں جملہ علوم میں سب سے زیادہ سرفراز ہوں۔ اسی لئے ہر زمانے میں ہر مذاق کے لوگ میرے شیدا رہے ہیں۔ باوجود سائنس کے رواج کے اہل نظر آج بھی میرے شیدا ہیں۔

میرے سائنٹفک بھیس سے استفادہ کرنے والے

بجز چند امیروں کے ہر شخص روزی تلاش کرتا ہے۔ بے شک اس زمانے میں سائنسدانوں کو ملازمت آسانی سے مل جاتی ہے لیکن ہر ملازمت میں سائنس کارآمد نہیں۔ بعض ملازمتیں ایسی ہیں جن میں میرا علم درکار ہوتا ہے۔ مثلاً معلم تاریخ کو تو میرا مطالعہ لازم ہے۔ اس زمانے میں ہر معلم اپنے علم کا ماہر ہوتا ہے اور ایک مخصوص علم کا ہی درس دیتا ہے چنانچہ معلم تاریخ کو میرا ماہر ہونا پڑتا ہے۔

ایک ایسی ملازمت بھی ہے جس کے لئے میرا علم قطعاً لازم ہے۔ یعنی سفارت خانوں کی ملازمت۔ گذشتہ دس سال کے اندر کئی ملکوں کو آزادی ملی ہے۔ ہر آزاد ملک کو غیر ممالک میں سفارت خانے قائم کرنے پڑتے ہیں۔ سفارت خانے کے ہر ملازم کے لئے معمولی منشی سے لے کر سفیر تک میرا مطالعہ لازم ہے۔ سفارت خانے کے ملازمین کا سب سے اہم کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ملک کو اپنی جائے قیام سے ہر قسم کی خبریں بھیجتے ہیں۔ خبروں میں سے ان خبروں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جن سے اس ملک کے رویہ پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ ملک کس راستے پر چل رہا ہے اور اس ملک کا منزلِ مقصود کیا ہے۔ لیکن ملکوں کی منزلِ مقصود میں مقرر کرتی ہوں۔ کسی ملک کی مجال نہیں کہ وہ میری مقرر کردہ منزلِ مقصود کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرے۔ مثلاً فرانس کی منزلِ مقصود یہ ہے کہ وہ جرمنی کے راستے میں حائل ہو کر اس جنگجو قوم کو آگے نہ بڑھنے دے لیکن جرمن قوم ہمیشہ

سے فرانس کو سرنگوں کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کی آپس میں مخاصمت قدیمی ہے۔ یہ مخاصمت میری قائم کردہ ہے۔ آئندہ جب کبھی یہ دونوں ملک اپنی اپنی پالیسی قائم کریں گے تو یہ پالیسی میری قائم کردہ مخاصمت پر مبنی ہوگی کیونکہ بیشتر انسان میری پرستش اختیار کرتے ہیں اور میرے غلام ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے بیشتر ملک "غلام تاریخ" کہلاتے ہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی ملک میں کوئی نئی تحریک شروع ہوتی ہے۔ لیکن یہ نئی تحریک بھی چند سال کے اندر وہی راستہ اختیار کر لیتی ہے جو میرا مقرر کردہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ نئی تحریک بھی میرے اشارے سے اٹھتی ہے۔ اس کی بہترین مثال روس مہیا کرتا ہے۔ تحریک اشتراکیت بالکل نئی تحریک تھی۔ اس کے بانی یعنی لینن نے اس تحریک کے ابتدائی نشے میں مست ہو کر اعلان کیا کہ آج سے وسط ایشیا کے زیر نگیں مسلمان قومیں روس کی حکومت سے آزاد ہیں چنانچہ ترکوں کے قائد انور پاشا فوراً بخارا پہونچے تاکہ اس آزادی کی تکمیل کریں۔ گویا لینن نے چند دنوں کے لئے مجھے پس پشت ڈال دیا۔ لیکن میں کس طرح چین سے بیٹھ سکتی تھی۔ چنانچہ میرے ایک اشارے پر لینن نے اپنی پالیسی بدل دی۔ انور پاشا مقتول ہوئے اور وسط ایشیا کے مسلمان پھر روس کے غلام ہو گئے۔

سفیروں کے لئے تاریخ لازمی ہے

اگر کوئی سفیر مجھ سے ناواقف ہوتا ہے تو وہ اپنے سفارت خانے سے جو خبریں اپنے ملک کو بھیجتا ہے وہ سب بے بنیاد ہوتی ہیں کیونکہ مجھ سے ناواقف ہونے کی وجہ سے وہ میرا مقرر کردہ راستہ نہیں معلوم کر سکتا۔ جب ایسا جاہل سفیر کسی پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے تو اپنی جہالت کی وجہ سے مسئلہ کی اصل وجہ ہی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی بہترین مثال انگریزی سفیر سر نیول ہینڈرسن

ہے جو ۱۹۳۷ء سے کر ۱۹۳۹ء تک انگریزوں کی طرف سے جرمنی میں سفیر متعین رہا۔ لیکن یہ بدنصیب انگریز سفیر جرمن قوم کی تاریخ سے ناواقف تھا اس لئے وہ جرمن قوم کی ذہنیت کو نہ سمجھ سکا۔ قوموں کی ذہنیت بھی میری مقرر کردہ ہوتی ہے کیونکہ ہر قوم میرے مقرر کردہ راستے پر چلتی ہے۔

(حوالہ نمبر ۲)

یہ انگریز سفیر اپنی کتاب موسومہ "ایک سیاسی مہم کی ناکامی" میں تسلیم کرتا ہے کہ اس کی واقفیت جرمنی کی تاریخ سے صرف ہٹلر کی نوشتہ سرگذشت "مائن کیفم" تک محدود تھی۔ چنانچہ جب یہ سفیر ۱۹۳۷ء میں برلن میں وارد ہوا تو وہ ہٹلر کی پالیسی کو نہ سمجھ سکا ہٹلر کی تحریک "نازی" بھی میری قائم کردہ تھی کیونکہ وہ پہلی عالمگیر جنگ کی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا پہلی عالمگیر جنگ بھی قیصر ولیم کی برپا کردہ نہ تھی بلکہ اس جنگ کی بنیاد فریڈرک اعظم اور بسمارک جیسے مدبر ڈال گئے تھے۔ جرمن قوم کی تاریخ کو پڑھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ قوم نہ خود چین سے بیٹھ سکتی ہے اور نہ دوسروں کو فرصت دے سکتی ہے۔ اس قوم کی ذہنیت میں بجز جارحیت کے کچھ نہیں پایا جاتا۔ یہ قوم فریڈرک اور بسمارک کی صورت میں میری ہی پرستش کرتی ہے۔

مطالعۂ تاریخ عوام کے لئے بھی ضروری ہے

الغرض میرا علم صرف سفیروں کے لئے نہیں بلکہ عوام کے لئے بھی لازم ہے جو شخص مجھے نہیں پڑھتا وہ زمانہ حال کو بھی پوری طرح نہیں سمجھتا اور اس لاعلمی سے وہ زمانے کے ہاتھ میں کھلونا بن جاتا ہے۔ زمانہ حال اگر میرا پیدا کردہ نہیں تو مجھ سے متاثر ضرور ہے۔ آج جو درخت نظر آتا ہے وہ زمانہ ماضی میں بویا گیا تھا۔ جو شخص زمانہ ماضی کو نہیں سمجھ سکتا وہ زمانہ حال کو سمجھنے سے بھی قاصر رہتا ہے اور اس طرح وہ زمانہ کا کھلونا ہی نہیں بنتا بلکہ زمانے کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح

ہے کہ ہر کس و ناکس مجھ سے وہ سبق نہیں سیکھ سکتا جو میں سکھانا چاہتی ہوں لیکن ذہین لوگ اور خصوصاً اکابرین حکومت مجھ سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ وِنسٹن چرچل نے میرے صحیفے ہی پڑھ کر صدر امریکہ روزویلٹ کو یقین دلا دیا کہ جرمن قوم اپنا ماضی نہیں بھول سکتی اور یہ قوم ہمیشہ شورش پیدا کرے گی۔ الغرض میں انسان کو ماضی کے متعلق ایسے سبق پڑھاتی ہوں کہ وہ حال کے خطروں سے بھی آگاہ ہو جاتا ہے۔ میرے مطالعہ سے انسان کو پتہ چلتا ہے کہ جب کوئی قوم بام عروج پر پہنچتی ہے تو وہ کن کن رکاوٹوں کو دور کر کے ترقی کرتی ہے۔ انسان یہ بھی معلوم کر لیتا ہے کہ ماضی کا نقش قوموں کے ذہن پر کندہ ہو جاتا ہے اور اس نقش کو اگر کوئی مٹا سکتا ہے تو وہ صرف انبیا کی ذات پاک ہے۔ میرے مطالعہ سے فطرت انسانی اور نیت انسان صاف عیاں ہو جاتی ہے انسانی فطرت کا پتہ خاص طور سے اکابرین کی سوانح عمریوں سے چلتا ہے چنانچہ یہ سوانح عمریاں میرے صحیفے کا جزو اعظم ہے۔

صرف اکابرین کی سوانح عمریاں ہی سبق آموز نہیں ہوتیں بلکہ ان سوانح عمریوں کو پڑھ کر پتہ چلتا ہے کہ عوام الناس اپنے اکابرین کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔ گویا میرے صحیفے عوام کے خون سے لکھے جاتے ہیں۔ ہٹلر کی خوں ریز داستانِ زندگی لاکھوں بے گناہ جرمنوں کے خون سے لکھی گئی۔ اگر حکومت کو ایک عمارت سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے تو اس عمارت کا گارا ہزاروں بے گناہ انسانوں کے خون سے بنایا جاتا ہے۔

بغیر میرے مطالعے کے بھی انسان اپنے ذاتی تجربے سے اپنی آگاہی کے لئے چند کلئے اخذ کر سکتا ہے لیکن مجھ کو پڑھ کر اس کی نظر زمانہ ماضی کی قوموں کے تجربے سے بھی مستفید ہو سکتی ہے۔ گویا صدیوں کا تجربہ جو قوموں نے خون بہا کر حاصل کیا وہ چند گھنٹوں کے اندر میرے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی اس مطالعہ سے انسان

محفوظ بھی ہوتا ہے اور اس کو غور و خوض کا بھی موقع ملتا ہے جو انسانی ذہن کی تربیت کے لئے اشد ضروری ہے۔ گویا میں انسانی ذہن کی تربیت بھی کرتی ہوں۔ میرا ذریعۂ تربیت انسان کی حرکات و سکنات ہوتی ہیں جن کو انسان خوب سمجھ سکتا ہے۔ سائنس کے ذریعہ جو ذہنی تربیت ہوتی ہے اس کی بنیاد باد و آب و آتش پر ہوتی ہے۔ بیشک انسان بھی انہیں عناصر کا مجموعہ ہے لیکن اس میں روح بھی ہے۔ جو اس کو جملہ حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اسی روح کی وجہ سے انسان میں قوت حافظ بھی ہے۔ جو جانوروں میں نہیں پایا جاتا۔ جانور زیادہ سے زیادہ گذشتہ دن کا واقعہ یاد رکھ سکتا ہے۔ لیکن میری بدولت انسان ہزاروں سال کے واقعات معلوم کر سکتا ہے۔

تاریخ قوموں میں دوبارہ جان ڈالتی ہے

میں یہ مانتی ہوں کہ انسان کا یہ قوتِ حافظہ اکثر اوقات بلائے بے درماں بھی ہو جاتا ہے۔ اور انسان "غلام تاریخ" ہو کر رہ جاتا ہے لیکن یہ عارضہ لا علاج نہیں۔ انبیاء نے اس غلامی کا علاج یہ کیا کہ اپنی اُمت کے لئے زمانۂ ماضی کو "دورِ جاہلیت" قرار دیا۔ اپنی اُمت کے لئے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ نبوّت ختم ہونے کے بعد یہ کام اولیاء نے کیا۔ اب جب کہ ولایت بھی ختم ہو چکی ہے اس کام کو قائدین قوم کر رہے ہیں۔ سر سید کی زندہ مثال آج بھی پاکستان کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس مردِ مومن نے ہندی مسلمانوں کے دل سے اپنی "عظمتِ رفتہ" کی یاد بھلائی اور ان کو انگریزوں کی "کافرانہ زبان" سیکھنے پر آمادہ کیا۔ بقول آغا خان (۱۸۷۷ء تا ۱۹۵۷ء) "پاکستان کی آزاد قوم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پیدا ہوئی"۔ (حوالہ نمبر ۳)

جب کوئی قوم مصیبت میں بُری طرح گرفتار ہو جاتی ہے تو میں وہاں پہنچ کر اس مصیبت زدہ قوم کو اپنے صحیفے سناتی ہوں جن میں متعدد قوموں کی مصیبت کا تذکرہ ہے۔ ایسی قوم کے لئے میں گویا بشیر بن کر بشارت رہائی دیتی ہوں۔ اس سے ناامید قوم میں امید پیدا ہوتی ہے۔ میں نے مسلمانوں کو اس قسم کی بشارت کئی مرتبہ دی ہے۔ ڈاکٹر اقبال اور ان سے پہلے الطاف حسین حالی نے مسلمانوں کو ان کے پرانے روح افزا افسانے سنا کر ہندی مسلمانوں کے مردہ دلوں میں دوبارہ جان ڈالی اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہو کر رہا۔ گویا میرے صحیفے مُردوں میں جان بھی ڈالتے ہیں اور مُردوں کو دوبارہ جد و جہد پر آمادہ کرتے ہیں۔

قائدین سیاست کے لئے تو میرا مطالعہ اشد ضروری ہے نظام الملک طوسی نے اپنے سلجوقی حکمرانوں کی ہدایت کے لئے ایک کتاب موسومہ "سیاست نامہ" لکھی جو میری کہانیوں سے پُر ہے کیونکہ بقول ایک مؤرخ سیلی نامی "تاریخ گذری ہوئی سیاست ہے۔ گویا سیاست تاریخ رواں ہے" ونسٹن چرچل نے انگلستان کی حکومت ۱۹۴۰ء میں عین اس وقت سنبھالی۔ جب اس کے ملک کو موت سامنے نظر آرہی تھی۔ یہ قائد سیاست صرف تاریخ دان نہ تھا بلکہ خود مؤرخ بھی تھا اس کی رہنمائی کی بدولت اس کے ملک کو جرمنی کے پنجوں سے رہائی ملی۔

جیسا زمانہ ویسا فسانہ

میں مؤرخ کی شخصیت سے ہمیشہ "آلودہ" رہی ہوں لیکن انہیں کی بدولت میں مقبول بھی ہوئی۔ فارسی مورخوں نے تو مجھے منظوم صورت بھی دی۔ گو اس صورت میں میں ردیف و قافیہ کی شکار ہوئی لیکن ساتھ ہی مجھے مقبولیت بھی

فردوسی نے اپنی دانست میں میرا صحیفہ لکھا۔ گو اس نے بہت سے افسانے بھی مجھ میں شامل کر دیئے لیکن اس کی بدولت میں ایران میں ایسی مقبول ہوئی کہ ایرانی مورخوں کو عثمانی ترکوں نے بھی طلب کیا۔

عثمانی فاتحین میرے "تاریخ گوؤں" کو اپنے ساتھ معرکوں میں لے جاتے تھے۔ یہ تاریخ گو اپنی جان پر کھیل کر حملوں میں فوج کے آگے آگے ہوتے تھے اور میرے افسانے سُنا کر سپاہیوں کو سر بکف بنا دیتے تھے۔ یونانی مورخ اور خصوصاً ہرودوٹس مجھے مقبول بنانے کے لئے اپنی طرف سے سورماؤں کی تقریریں گڑھ کر درج کرتا تھا۔ میں اس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتی جب تک میرے صحیفوں میں ادبی چاشنی نہ ہو اس چاشنی کو پیدا کرنے کے لئے مورخ کو دو متضاد چیزوں کو باہم کرنا پڑتا ہے۔ یعنی عقل اور قوت تخئیل کو جن کا باہم کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مشرق میں فارسی مورخوں نے اور مغرب میں ایڈورڈ گبن نے یہ مشکل کام کیا اور خوب کیا۔

تاریخ سوانح حیات کی صورت میں بھی کارآمد ہے

مشرق اور مغرب دونوں میں فن سوانح نگاری مجھے مقبول بنانے کی خاطر ایجاد ہوا۔ مسلمانوں میں ابن اسحاق نے "سیرت الرسول اللہ" لکھ کر اس فن کی بسم اللہ کی۔ انگریزوں میں اس فن کو ٹامس کارلائل نے پروان چڑھایا۔ میرے متعلق کارلائل لکھتا ہے:۔

(حوالہ نمبر ۴)

"تاریخ چونکہ تمام علوم کی بنیاد ہے اس لئے یہ روحِ انسانی کی پہلی پیداوار ہے۔ اسی کے ذریعہ سے انسان نے

اپنے تخیل کا اظہار کیا۔ تاریخ آگے اور پیچھے دونوں طرف دیکھتی ہی کیونکہ آئندہ زمانہ باوجود غیب میں پنہاں ہونے کے مکمل ہو چکا ہی اور یہ مستقبل اپنا راستہ پہلے ہی مقرر کر چکا ہے۔ ماضی کی کہانی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ماضی اور مستقبل کو باہم نہ کیا جائے۔"

تاریخ اکابرین سیاست کی مشیر ہے

یہاں کارلائل حد سے بڑھ جاتا ہے میری حد تو صرف زمانۂ ماضی تک ہے۔ مستقبل سے میرا کوئی سروکار نہیں۔ پیشین گوئی میرے خلاف شعار ہے۔ یہ کام فال گوؤں کا ہے میرا نہیں۔ اکابرین سیاست کے لئے میرا مطالعہ بے شک لازمی ہے لیکن اس لئے نہیں کہ وہ مجھ کو پڑھ کر غیب دان ہو جاتے ہیں۔ ان اکابرین کے لئے میرا مطالعہ اس لئے کارآمد ہے کہ وہ ماضی کی روشنی میں زمانۂ حال کی باریکیاں دیکھ سکتے ہیں۔ قانون بنانے سے پیشتر وہ میرے ذریعہ معلوم کر لیتے ہیں کہ ایسا قانون زمانہ ماضی میں بھی بنایا گیا یا نہیں۔ اگر بنایا گیا تو اس قانون نے اپنا مقصد پورا کیا یا نہیں۔ اگر پورا نہیں کیا تو اس ناکامی کی وجہ کیا تھی۔ چنانچہ اکابرین سیاست جب ماضی کے قسم کا کوئی قانون بناتے ہیں تو پچھلے قانون کے نقص دور کر کے بناتے ہیں۔ گویا میں ان اکابرین کو ماضی کی غلطیوں سے آگاہ کرتی ہوں۔ میرا سب سے اہم کام یہی ہے۔ غیر اقوام سے تعلقات قائم کرنے کے معاملے میں بھی ان اکابرین سیاست کو مشورہ دیتی ہوں۔ میں بتا دیتی ہوں کہ فلاں قوم نے کبھی کسی معاہدے کا لحاظ نہیں کیا۔ میں ان اکابرین کو ہر وقت بتاتی ہوں کہ ہر قوم سب سے پہلے اپنا مفاد دیکھتی ہے۔ قومیت مذہب سے

زیادہ کارگر ہوتی ہے۔ اہلِ مغرب سب کے سب عیسائی ہیں لیکن اس کے باوجود اپنے اپنے قومی مفاد کی خاطر یہ ایک دوسرے کی گردن پر سوار رہے ہیں۔ اُن کا مقولہ رہا ہے کہ "پہلے قوم باقی سب ڈھونگ"۔ اسلام کی کشتی بھی اسی قومیت کی چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹی۔

تاریخ صحیفہ نگاروں کی بازدی ہے

اس زمانے میں جتنا زور اخباروں کا ہے اتنا کسی کا نہیں۔ آج کل کے اخباروں میں انسانی زندگی سے متعلق ہر شعبہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ سیاست رواں پر اخباروں کے مدیر اپنی طرف سے اداریے لکھتے ہیں۔ جو ان کے نامہ نگاروں کی ارسال کردہ خبروں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس طرح صرف مدیر ہی نہیں بلکہ نامہ نگار بھی میرا مواد بہم پہنچاتے ہیں۔ جس طرح میری حدود میں اب پورا تمدن ہے اسی طرح اخباروں کے محیط میں اب پورا عالم اور اس کا تمدن ہے۔ اسی لئے اخباروں کا حجم دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔

طوالت سے بچنے کے لئے اب مدیرانِ اخبار خبروں کا انتخاب کرتے ہیں لیکن یہ انتخاب بڑا خطرناک بھی ہے۔ یہ انتخاب بعض اوقات حکومت کے ڈر کے تحت کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات اس ڈر کے تحت کیا جاتا ہے کہ ان کے ملک کا تاریک پہلو دنیا کے سامنے نہ آ جائے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض خبروں کو محض اس لئے حذف کر دیا جاتا ہے کہ مدیر اخبار کی نظر میں آج ایسی خبر کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کو کیا پتہ کہ آئندہ یہ غیر اہم خبریں میری جان بن جائیں گی اور مورخوں کو ان حذف شدہ خبروں کی جستجو کرنی پڑے گی۔

کسی خبر کی تاریخی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ مدیر اور نامہ نگار دونوں میرے علم کے ماہر ہوں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج کی سیاست کل کی تاریخ ہے؟ جو خبریں آج حکومت کے ڈر سے یا تاریک پہلو کو چھپانے کی نیت سے حذف کی گئی ہیں کل ان خبروں کی تلاش شروع ہو گی کیونکہ ہر دیانت دار مورخ کا فرض ہے کہ وہ روشن اور تاریک پہلو دونوں دکھائے۔ ہٹلر نے اپنے زمانے میں اپنی غیر موافق خبروں کو دبا دیا تھا۔ لیکن جرمنی کی شکست کے بعد ایسی خبروں کو بھی مؤرخوں نے ڈھونڈ نکالا۔ جب کوئی خبر دبا دی جاتی ہے تو دشمنوں کو اپنی طرف سے ان خبروں میں مرچ مسالہ لگانے کا موقع مل جاتا ہے۔ بہرکیف ہر لحاظ سے مدیروں اور نامہ نگاروں کے لئے میرا مطالعہ ضروری ہے۔ میرے صحیفے ہر مدیر کے دفتر میں بکثرت ہونے چاہئیں۔

تاریخ ہر خطرے سے آگاہ کرتی ہے

میں عوام اور خواص دونوں کو بتاتی ہوں کہ اکثر لوگ سیاسی قیادت اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ اپنی جیب بھریں۔ اہلِ ہند سے متعلق میرے صحیفے بتاتے ہیں کہ یہ بدنصیب مُلک صرف اغیار کی حکومت کے تحت متحد ہوا ہے۔ جب کبھی "آزاد" ہوا ہے تو اس نے آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کے ٹکڑے کئے ہیں۔ جتنے حملہ آور باہر سے آئے وہ سب کے سب اندرونِ ملک کے قائدین کی دعوت پر آئے ہیں۔

میں یہ بھی بتاتی ہوں کہ گھٹیا قسم کے "قائد" عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر دُور بینی سے کام نہیں لیتے بلکہ عوام کے ساتھ

ہاں میں ہاں ملا کر قیادت حاصل کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ملک اور قوم کے لئے باعث مصیبت ہوتے ہیں اس قسم کے قائد زمانے کے تقاضوں سے بے خبر ہوتے ہیں اور دانستہ اپنے پیروؤں کو غفلت میں ڈالتے ہیں۔ اسی قسم کے قائدین میں سے میر جعفر اور میر صادق اُٹھے اور اپنے ملک کو انگریزوں کے سپرد کر دیا۔

میں انقلاب کی آمد سے بھی قوموں کو آگاہ کرتی ہوں۔ گو میں ہر دفعہ اپنے آپ کو یکساں صورت میں نہیں دہراتی لیکن چند بنیادی باتیں ایسی ہیں جو بار بار رونما ہوتی ہیں۔ انقلاب اس وقت آتا ہے جب حاکموں اور محکوموں کے درمیان کوئی پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ جب بادشاہانِ مغلیہ اپنے محلوں میں پردہ نشین ہو گئے تو مرہٹہ لیڈروں کو لوٹ مار کا موقع ملا اور بالآخر مغلیہ سلطنت کا تختہ اُلٹ کر ہی رہا۔ جب شہنشاہ روس زار نکولس دوئم اپنی ملکہ کی وجہ سے راس پوٹین کے قبضے میں آگیا تو حاکم اور محکوموں کے درمیان ایسا پردہ حائل ہو گیا کہ یہ زار روس آنے والے انقلاب سے بالکل بے خبر ہو گیا۔ اس سے پہلے یہی تماشہ شہنشاہ فرانس لوئی شش دہم کے ساتھ ہو چکا تھا اور اس کو سولی پر لٹکایا گیا تھا۔ لیکن اس واقعہ سے زار روس نے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔

انقلاب کے سلسلے میں لوگوں کو میں یہ بھی بتاتی ہوں کہ کوئی انقلاب اس مقصد کو پورا نہیں کرتا جس کی خاطر انقلاب برپا کیا جاتا ہے۔ نپولین نے اُٹھ کر انقلاب فرانس کے مقصد کو ایسا پامال کیا کہ اس کی زد میں آکر دیگر ممالک یورپ کی آزادی بھی صلب ہو گئی۔ انقلاب کے سلسلے میں مجھے ایک بات اور یاد آئی۔ وہ یہ کہ محض انقلاب سے کسی قوم

کی ذہنیت نہیں بدل سکتی۔ فرانسیسی قوم کی ذہنیت پر صدیوں سے سامراجیت سوار تھی۔ چنانچہ نیپولین کی قیادت میں بھی فرانسیسی قوم جس کا نعرہ "آزادی۔ برادری۔ برابری" تھا دوسرے ملکوں کی گردن پر سوار ہو گئی بلکہ خود کو بھی نیپولین کی شاہانہ ہوس کے سپرد کر دیا اور نیپولین نے شہنشاہ فرانس لوئی کی جگہ لے لی۔ نیپولین کی قیادت میں اس سامراج پسند قوم کو وہ مواقع ملے جو بادشاہوں کی قیادت میں بھی اس قوم کو کبھی نہ ملے تھے۔

نیپولین کا عروج دنیا کے لئے ایک سانحہ سے کم نہ تھا۔ اس سانحہ کا اہل مغرب پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے میرے صحیفوں کو اب اس جستجو کے تحت پڑھا کہ وہ نیپولین سے رہائی حاصل کرنے لئے کوئی ترکیب نکالیں۔ اس طرح اہل مغرب میں اب میں پھر مرغوب ہو گئی حتیٰ کہ بعض انگریزی شاعر بھی میرے شیدا ہو گئے۔ انگریز شاعر کولرج تو میرے فلسفے کا عاشق ہو گیا۔ اب ان لوگوں نے حب الوطنی پر اشعار لکھنے شروع کئے اسی لئے میں کہا کرتی ہوں کہ برائی سے اکثر اوقات بھلائی پیدا ہوتی ہے۔ رنج راحت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ بقول مولانا روم:۔

در پسِ ہر گریہ آخر خندہ ایست
مرد آخر بین مبارک بندہ ایست

لیکن یہ شرط ضروری ہے کہ انسان آخر بین ہو تاکہ وہ رنج سے دب کر ہاتھ پیر نہ چھوڑ بیٹھے۔ چنانچہ میں غم زدہ افراد اور قوموں کی رہائی کی بشارت بھی دیتی ہوں۔

میں یہ بھی بتاتی ہوں کہ زمانہ ماضی کی زنجیر کی کڑی میں مستقبل بھی

شامل ہے۔ اس سے میری مُراد یہ نہیں کہ مستقبل بھی بالکل ماضی کی طرح ہوگا۔ مورخ اپنی تاریخ کی جب تکمیل کرتا ہے تو اس عرصے میں مستقبل بھی ماضی میں بدل جاتا ہے۔ اہل نظر ماضی اور حال کو دیکھ کر مستقبل کو معلوم تو نہیں کر سکتے مگر مستقبل کا رویہ ان کو ایک حد تک معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اکابرین سیاست کے لئے میرا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ بلکہ عوام کے لئے بھی لازمی ہے کیونکہ اس دورِ جمہوریت میں عوام کا باخبر ہونا بھی ضروری ہے۔

میرا تخیلاتی یعنی فلسفیانہ بھیس

اب تک میں نے اپنے صرف اس پہلو کا ذکر کیا ہے جس کو دیکھ کر اہل سیاست مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن میرا ایک فلسفیانہ پہلو بھی ہے جس سے اہل فکر و نظر متاثر ہوتے ہیں۔ مفکرین میرے اس پہلو کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان رُو بہ ترقی ہے۔ قومیں بے شک مٹتی رہتی ہیں لیکن بنی نوع انسان بحیثیت مجموعی ترقی پسند ہے۔ ڈاروِن کے نظریہ ارتقا نے تو مورخوں کے ذہن میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ اہل فکر مورخوں نے تو اسباب ارتقا بھی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ڈاروِن نے اپنے نظریہ میں اسباب ارتقا نہیں بتائے تھے ڈاروِن سے سات سو سال پہلے عارف رومی نے صرف ارتقا ہی کا ذکر نہ کیا تھا بلکہ سبب ارتقا بھی بتایا تھا۔ وہ سبب یہ ہے کہ ارتقا جس چیز سے رونما ہوتا ہے وہ حکم ایزدی ہے جس کے ذریعہ ہر جاندار آگے بڑھنا پسند کرتا ہے۔ خدا خود اپنے ہاتھ سے اس کام کو نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی مخلوق میں آرزوئے ترقی پیدا کر دیتا ہے۔ عارف رومی نے سبب ارتقاء کو ایک شعر میں بتا دیا:-

بادہ از ما مست شد نے ما ازو

قالب از ما ہست شد نے ما ازو

(شراب میں نشہ نہیں ہوتا۔ بلکہ پینے والے میں نشے کا مادہ ہوتا ہے۔ انسان کا قالب اس کی اپنی مرضی سے پیدا ہوا۔)

عارف رومی کے مرید ڈاکٹر اقبال نے بھی فلسفۂ ارتقا ایک شعر میں بیان کیا:۔

کبک از شوخیٔ پا رفتار یافت

بلبل از ذوقِ نوا منقار یافت

(چکور کی تیز رفتاری اس کے پیر کی شوخی سے پیدا ہوئی۔ بلبل نے اپنی چونچ ذوقِ نوا کی بدولت پیدا کی)

ڈارون کے بعد مغرب میں جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں ترقی ہی ترقی نظر آتی ہے۔ لیکن جب پہلی عالمگیر جنگ نے اہل مغرب کی آنکھیں کھولیں اور اس کے بعد جو تاریخیں لکھی گئیں ان میں ترقی کا ذکر نہیں۔ یہ مورخ اب بجائے ترقی کے صرف تبدیلیٔ زمانہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اب مورخین کو پوری دنیا ایک ملک نظر آتی ہے۔ اس لئے اب مورخوں کا رجحان قومیت کی بجائے عالمیت کی طرف ہے۔ چنانچہ عالمی تاریخ لکھنے کا رواج قائم ہو گیا ہے۔ میں خدا کا شکر کرتی ہوں کہ اب مجھے متعصب قوموں اور کم ظرف ملکوں سے رہائی ملی۔ اب میں کل بنی نوع انسان کی خدمت کر سکتی ہوں۔ میری اس رہائی سے انسان کی نظر بھی بلند ہو رہی ہے اور اب وہ چاند سے باتیں کر رہا ہے۔ انسان بھی قومی تعصب سے رہا ہونا چاہتا ہے۔ مذہبی تعصبات بھی کم ہونے جا رہے ہیں۔

مگر مشرق میں مجھے ایک خطرہ بھی نظر آرہا ہے جہاں نو آزاد قومیں صدیوں کی غلامی کے بعد پیر پھیلا رہی ہیں جس قوم پرستی سے مغرب تنگ آچکا ہے اسی قوم پرستی کا اب مشرق میں آغاز ہو رہا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ نو آزاد قومیں بھی اس راستے پر نہ چلنے لگیں جس کو مغرب نے تنگ آکر ترک کیا۔

لیکن ڈاروِن نے جو انقلاب تاریخ نگاری میں پیدا کیا اس کا سہرا بھی دراصل میرے ہی سر ہے۔ میرے صحیفوں کو پڑھ کر اس ماہرِ سائنس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ انسان کی ترقی قدیمی ہے۔ لہذا اس نے سوچا کہ انسان نے خود بھی کیڑوں مکوڑوں سے ترقی کی ہے۔ چنانچہ اس نے تاریخ کی ترقی کو ارتقا کا نام دیا۔ اگر میں انسانی ترقی کی کہانی نہ سناتی تو ڈاروِن کے ذہن میں ارتقار کا خیال نہ آتا۔

تاریخ پر اشتراکیت کا اثر

اسی ارتقا کا راگ کارل مارکس نے بھی گایا۔ ڈاروینی ارتقا کا تعلق سائنس سے تھا۔ انسانی سماج سے نہ تھا لیکن کارل مارکس نے اسی ارتقا کا اطلاق انسانی سماج پر کر کے ڈاروِن کی ہمسری کا دعویٰ کیا۔ کارل مارکس کے حامی اب اس مسئلہ ارتقار کا اطلاق ہر شعبۂ زندگی پر کر رہے ہیں۔ اس لئے میرا فلسفہ اب دن بدن پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب میرے فلسفے میں علم معیشت بھی شامل ہو گیا ہے۔ اشتراکیوں کے خیال کے مطابق اب مجھے صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو انسان کی حرکات کا سرچشمہ تقاضۂ شکم کو مانتے ہیں۔ اب گویا خدا مجھ سے بالکل علیحدہ ہو گیا ہے۔ اسی لئے میرے اشتراکیت سے آلودہ فلسفے کو اب اہلِ دل نہیں سمجھ سکتے۔ اہلِ

دل کی نظر میں میں خود انسانی شکم کی غلام ہوگئی ہوں گویا اب میرا نشیمن قلب نہیں بلکہ شکم انسان ہے۔ یعنی شکم پروری کے ساتھ ساتھ میری صورت بھی بدلتی ہے۔ اب مجھے شکم کی کہانی سنانی چاہیئے۔ جہاں میری وسعت تو وہ تھی کہ میں انبیاء اور اولیا تک پہنچتی تھی لیکن اب میری پرواز صرف شکم تک ہے۔ یہ میرے تنزل کی نشانی ہے میرے عروج کی نہیں۔ کارل مارکس کی وجہ سے اب میرا سوز یقین شکوک میں بدل گیا۔ اہل دل کے لئے اب میں بیکار ہوگئی کیونکہ یہ اہل دل مجھ پر اس لئے شیدا تھے کہ میں ان کے دل میں سوز یقین پیدا کرتی تھی۔ گو کارل مارکس نسلاً یہودی تھا لیکن جرمنوں کی صحبت میں رہ کر اس پر جرمن رنگ چڑھ گیا۔ اور وہ اس فلسفے کا شکار ہوگیا جس کی ابتدا جرمنی سے ہوئی تھی۔ جرمنوں کا رائج کردہ میرا فلسفہ ہمیشہ جنگجوئی کا تلقین کرتا تھا۔ چنانچہ اب کارل مارکس کے نظریہ اشتراکیت میں بھی جنگجوئی داخل ہوگئی۔

کارل مارکس نے اپنے فلسفے کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا :-

"انسان خود اپنا تاریخ گر ہے لیکن وہ یہ تاریخ گری خود اپنی مرضی سے نہیں کرتا بلکہ ان حالات کے تحت کرتا ہے جو اس کو زمانۂ سابق سے ملے ہیں۔ گویا انسان کے کندھوں پر پرانی پشتوں کی روایات اور دستور پہاڑ کی طرح لدے ہوئے ہیں"

یعنی انسان اپنے آپ کو موجد سمجھتا ہے لیکن دراصل وہ محض نقال ہے اور پرانے دستوروں پر چلتا ہے۔

تاریخ کی تاویل اور اس کے خطرے لیکن اگر انسان میرا مطالعہ صحیح

طور سے کرے تو وہ معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کس حد تک تاریخ گر رہی ہے اگر جرمن قوم میرے واقعات کی تاویل اپنی جنگجو طبیعت کے مطابق نہ کرتی تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ وہ پورے یورپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور یہ قوم دو مرتبہ دنیا کو آفت میں نہ ڈالتی۔ یعنی میرے مطالعہ سے انسان حقیقت بین ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ میرا مطالعہ کسی جذبے کے تحت نہ کرے۔ بیشک انسان ہمیشہ لڑائیوں میں مبتلا رہا ہے لیکن ان جنگوں کا باعث انسان خود ہے میں نہیں ہوں۔ میں تو ہمیشہ امن و امان کی حامی رہی ہوں لیکن بُرا ہو اس تاویل بازی کا جس کی بدولت جنگجو قوموں نے میری تاویل ہمیشہ جنگ کے حق میں کی۔

تاویل مجھ میں اس وقت داخل ہوئی جب مجھ پر فلسفہ لادا گیا۔ لیکن اس کے باوجود اہلِ دل نے اسی تاویل سے میرا رشتہ خدا سے بھی ملا دیا۔ اگر صرف اہلِ دل کے ہاتھ میں میری تاویل رہتی تو میں جنگجوئی کی تلقین کے الزام سے بری رہتی اور میں دنیا کے لئے باعثِ رحمت بن جاتی۔ لیکن جب تاویل بازی ایک دفعہ شروع ہو جاتی ہے تو ہر کس و ناکس یہ کھیل کھیلنے لگتا ہے۔ کاش مجھے یہ حق حاصل ہوتا کہ میں خود تاریخ نگاروں کا انتخاب کر سکتی۔ نیطشہ اور فان برن ہارڈی جیسے جرمن مورخوں کو میں اپنے پاس نہ آنے دیتی۔

لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی مانتی ہوں کہ اگر دنیا میں ہمیشہ کے لئے امن و امان قائم ہو جاتا تو میرے صفحے ویسے ہی کورے رہتے جیسے شروع میں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرے صحیفے انسان کے خون سے ہی رنگین ہوئے۔ میرے صحیفوں کا خلاصہ ڈاکٹر اقبال نے "سرگذشتِ آدم"

کے عنوان سے خوب کیا ہے۔ یہ دراصل سرگذشت آدم نہیں بلکہ میری اپنی سرگذشت ہے۔ انہیں صحیفوں کی خاطر میں ابلیس بن کر فردوس آدم میں پہنچی اور آدم و ہوا کو جنت سے نکلوایا۔ میری اس سرگذشت کو اب آپ اقبال کی زبان سے سنئے۔ یہ سرگذشت دراصل میرے روح کی ہے :-

لگی نہ میری طبیعت ریاض جنت میں ۔۔۔ پیا شعور کا جب جام آتشیں میں نے
رہی حقیقت عالم کی جستجو مجھ کو ۔۔۔ دکھایا اوج خیال فلک نشیں میں نے
ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا ۔۔۔ کیا قرار نہ زیر فلک کہیں میں نے
نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی ۔۔۔ کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے
کبھی میں ذوق تکلم میں طور پر پہنچی ۔۔۔ چھپایا نور ازل زیر آستیں میں نے
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا ۔۔۔ کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے
کبھی میں غار حرا میں چھپی رہی برسوں ۔۔۔ دیا جہاں کو کبھی جام آخریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرود ربانی ۔۔۔ پسند کی کبھی یونان کی سرزمیں میں نے
دیار ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی ۔۔۔ بسایا خطہ جاپان و ملک چیں میں نے

(یہاں تو اقبال نے بالکل میری کہانی سنادی۔ اہل ہند نے صرف توحید قبول کرنے ہی سے انکار نہ کیا بلکہ مجھے بھی گھسنے نہ دیا۔ اسی لئے قدیم ہند کے متعلق کوئی کتاب ایسی نہیں ملتی جس کو میرا نام دیا جاسکے یعنی جس کو تاریخ کہا جاسکے)

بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم ۔۔۔ خلاف معنی تعلیم اہل دل میں نے
لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو ۔۔۔ جہاں میں چھیڑ کے پیکار عقل و دیں میں نے

اس کے علاوہ اقبال نے مجھ کو ابلیس کا جامہ پہنا کر اور فرشتوں کا

مدِ مقابل کر کے مجھ سے کہلوایا :۔

قصّۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو — تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

بیشک میرے صحیفے انسان کے خون ہی سے رنگین ہوئے۔ اگر آدم جنّت ہی میں رہتے تو میں بھی دنیا میں نمودار نہ ہوتی۔ اسی لئے میرے صحیفوں کو وہ بہتر طریقے سے لکھ سکتے ہیں جن کی طبیعت شاعرانہ ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی نثر کو بھی شاعرانہ جامہ پہنا سکتے ہیں۔

میرا ادبی بھیس جب میں اپنے واقعات کو دلکش بنانا چاہتی ہوں تو میں مؤرخ کو ایسی نظر دیتی ہوں جس میں سائنس اور فلسفہ دونوں شامل ہوتے ہیں۔ جب مورخ تاج محل کو دیکھتا ہے تو اس کو لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے افسانے یاد آجاتے ہیں تاج محل کو دیکھ کر وہ صرف استاد عیسیٰ کے علم ہندسہ پر ہی عش عش نہیں کرتا بلکہ شاہ جہاں کے قلب کا بھی جائزہ لیتا ہے کہ کس طرح اس کے دل نے اس لافانی عمارت کی تعمیر پر اس کو مجبور کیا۔ ایسی دلکش عمارت کا افسانہ لکھنے کے لئے تو کسی شاعر کی ضرورت ہے جو شمعِ اُلفت روشن کر کے اس افسانے کو منظوم کرے۔

اُجڑے ہوئے شہروں کا افسانہ بھی شاعر دل مورخ ہی لکھ سکتا ہے فتح پور سیکری آج ایک اجڑا دیار ہے مگر اس شہر میں اکبر کا فلسفۂ دینِ الٰہی بھی مضمر ہے۔ لندن کی مشہور عمارت ویسٹ منسٹر ایبی میں صرف چند مُردے ہی دفن نہیں ہیں بلکہ یہ عمارت انگریزوں کے عروج کی کہانی بھی سناتی ہے۔ آج جب کہ انگریزوں کا سامراج معدوم ہو چکا ہے میرے انگریز پرستار یہاں جا کر اپنے زوال پر آنسو بہاتے ہیں۔ یہ عمارت

زبانِ حال سے "ہر کمالے را زوالے" کا فلسفہ بیان کرتی ہے اور اس طرح بیان کرتی ہے کہ قیاس آرائی کی ضرورت نہیں رہتی۔

جب میں اپنے سائنسی لباس پر فلسفیوں کا چغہ پہن لیتی ہوں تو میرا بھیس ادبی ہو جاتا ہے۔ اس بھیس میں میں شاعروں کی محفلوں میں جا سکتی ہوں۔ جب سے میرے حدود میں توسیع ہوئی ہے تب سے ادیبوں کے تذکرے کو میں اپنے صحیفوں میں خاص جگہ دیتی ہوں۔ چنانچہ اس توسیع کے بعد اہلِ طرب نے ہر فنِ لطیفہ کا افسانہ زندگی لکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ آج میرے نام پر ہر قسم کی تاریخیں لکھی جاتی ہیں: تاریخ ادب: تاریخ ڈرامہ: تاریخ فلسفہ۔ حتیٰ کہ "تاریخ عشق بازی" بھی نظر آتی ہے۔

"تاریخ لباس اور تاریخ فن تعمیر تو اب عام ہیں۔ عورتوں کے متعلق تاریخ عشوہ و انداز بھی لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح موسیقی بھی عام سے ہے تاریخ فن تحریر بھی لکھی جاتی ہے۔ چونکہ اس زمانے میں ذرائع رسل و رسائل نے بڑی ترقی کی ہے اس لئے ذرائع سفر پر بھی تاریخیں لکھی جاتی ہیں۔ تاریخ ادب۔ تاریخ ڈرامہ۔ تاریخ فلسفہ۔ حتیٰ کہ "تاریخ عشق بازی" بھی نظر آتی ہے۔ (حوالہ نمبر ۵)

"تاریخ لباس اور تاریخ فن تعمیر تو اب عام ہیں۔ عورتوں کے متعلق تاریخ عشوہ و انداز بھی لکھی جاتی ہے۔ اسی طرح تاریخ موسیقی بھی عام ہے۔ تاریخ فن تحریر بھی لکھی جاتی ہے۔ چونکہ اس زمانے میں ذرائع رسل و رسائل نے بڑی ترقی کی ہے اس لئے ذرائع سفر پر بھی تاریخیں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن اس قسم کی تاریخوں میں جس تاریخ کو میں سب سے زیادہ سراہتی ہوں وہ تاریخ ادب ہے کیونکہ ہر قوم اپنی ذہنیت کا

اظہار یا تو اپنے ادب کے ذریعہ کرتی ہے یا فنِ تعمیر کے ذریعہ۔ (حوالہ نمبر ۶)
ادب کے سلسلے میں اپنے زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کا تذکرہ تو میں ضرور اپنے صحیفوں میں کرتی ہوں کیونکہ بعض اوقات کسی مطرب سے کوئی غزل سن کر بڑے بڑے سفاک حملہ آور اپنے مفتوحین کی جاں بخشی کر دیتے ہیں۔ تیمور لنگ جیسے ظالم نے دہلی میں قتل عام بند کر دیا جب ایک مطربہ نے اس کو حافظ کی غزل سنائی جس کا مطلع یہ تھا:۔

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کُشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

تاریخ پیغامِ بیداری بھی دیتی ہے

اسی طرح بعض اوقات حالی، اقبال اور حکیم سنائی جیسے شاعر اپنی نظموں سے اپنی قوم کو بیدار کر کے میرا رُخ بدل دیتے ہیں۔ حالی کی مسدس میں سے کئی اقتباسات میں گذشتہ ابواب میں پیش کر چکی ہوں۔ ڈاکٹر اقبال نے حالی کے پیغامِ بیداری میں چار چاند لگائے۔ "شکوہ" اقبال نے علیگڈھ والوں کے دل میں ایک آگ روشن کر دی۔ اسی کی روشنی میں بقول آغا خان علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں پاکستان کی بنیاد پڑی۔ اقبال نے اپنے "شکوہ" میں سرسید کی طرح ہندی مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ وہ میری غلامی سے آزاد ہو کر "فکرِ فردا کریں اور محوِ غمِ دوش" نہ رہیں:۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں!
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں

طلبائے علی گڈھ کالج کو مخاطب کر کے سر سید کے پیغام کی اس طرح تجدید کی :۔

ادھر تو بھی کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے

طائر زیر دام کے نالے تو سُن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائر بام اور ہے

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے

شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غمکدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی!
رہنے دو خُم کے سر پہ تم خشت کلیسا ابھی

اقبال کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے دل میں ”احساس زیاں“ پیدا کریں۔ جس سے ان کے زمانے کی شاعری بالکل محروم تھی چنانچہ اس احساس زیاں کو پیدا کرنے کے لئے انہوں نے اپنی نظم ”شمع اور شاعر“ لکھی :۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا!
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اس کے بعد اسی نظم میں افسردہ دل ہندی مسلمانوں کو بشارت دی۔ یہ بشارت ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی صورت میں صحیح ثابت ہوئی :۔

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی
ظلمت شب میں نظر آئی کرن امید کی

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

نقد خودداری بہائے بادۂ اغیار تھی
پھر دکاں تیری ہے لبریز صدائے ناؤ نوش

ٹوٹنے کو ہے طلسم ماہ سیمایان ہند
پھر سلیمیٰ کو نظر دیتی ہے پیغام خروش

در غم دیگر بسوز و دیگران را ہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفل ملت کو پیغام سروش

میں نے شاعروں اور شاعری کو اس لئے اپنے صحیفوں میں جگہ دی کہ اقبال۔ حالی اور حکیم سنائی جیسے شاعر اپنی قوموں کو بیدار کر کے میرا راستہ بدل دیتے ہیں۔ گویا اس قسم کے شاعر بھی "تاریخ گر" ہیں۔ لغو گو اور مست شراب شاعروں کو میں اپنے صحیفوں میں جگہ نہیں دیتی۔ اگر اس قسم کے شاعر سبب زوال ہوتے تو میں ان کو بھی اپنے صحیفوں میں ضرور جگہ دیتی۔ کیونکہ میں ہمیشہ اسباب واقعات کی جستجو میں رہتی ہوں۔ آخر میں نے چنگیز اور ہٹلر کو بھی اپنے صحیفوں میں شامل کیا ہے۔

عالم اسلام پر جب کبھی کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو کوئی نہ کوئی رہبر اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ چنگیزی آفات کے بعد عالم اسلام کی قیادت ترکوں نے سنبھالی۔ عین اس وقت جب چنگیزیوں کے ہاتھوں بغداد ۱۲۵۸ء میں تباہ ہو رہا تھا۔ ہند کے کفرستان میں ترکی غلام وہ سلطنت قائم کر رہے تھے جو پانچ سو سال تک بڑے آب و تاب سے قائم رہی اور جس کا شاخسانہ ڈیڑھ سو سال بعد پاکستان کی صورت میں نمودار ہوا۔ ہند کے مغرب میں حکیم سنائی (۱۰۵۱ء تا ۱۱۳۰ء) جیسے صوفی شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے تصوّف میں دوبارہ جان ڈال کر اس مشرب کو زندہ کیا۔ ختم نبوّت کی وجہ سے کوئی نبی پیدا نہ ہو سکتا تھا لہٰذا تجدید ایمان کا کام صوفیوں نے بحیثیت اولیاء اپنے ذمّہ لیا۔ انہیں صوفیوں کی کاوشوں سے ترک لوگ مسلمان ہوئے جنہوں نے

مشرق و مغرب دونوں میں میرا رُخ بدل دیا لہذا میں نے حکیم سنائی کو اپنایا۔ اسی لئے ان کے کلام کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں:۔

حکیم سنائی نے معیارِ تصوف کس طرح بلند کیا اس کا پتہ مندرجہ ذیل اشعار دیتے ہیں:۔

هر خسے اندر نگ گفتاری بدین ره که رسد
درد باید عمر سوز و مرد باید گام زن

محض رنگین بیانی سے ہر کس و ناکس دین کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس کام کے لئے عمر سوز کی اور جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

کئی سال درکار ہیں کہ ایک اصلی پتھر سورج کی کرن سے بدخشاں میں لعل بنے یا یمن میں عقیق بنے۔

ماہ ہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل
شاہدے را حلہ گردد یا شہیدے را کفن

مہینوں درکار ہیں کہ ایک کپاس کی بونٹی پانی اور مٹی میں نشو و نما پائے اور اس سے کسی شاہد کا لباس بنے یا کسی شہید کا کفن تیار ہو۔

روزہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش
زاہدے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن

کئی دن درکار ہیں ایک بھیڑ کے اون سے کسی زاہد کا خرقہ یا کسی گدھے کی نکیل بنائی جائے۔

قرن ہا باید کہ تا یک مرد صاحب دل شود
بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

بیسیوں سال درکار ہیں کہ ایک صاحب دل انسان بایزید جیسا خراسان میں اور اویس جیسا قرن میں نمودار ہو۔

سنائی کے زمانے میں دولت غزنوی دم توڑ رہی تھی۔ اندیشہ تھا کہ مسلمان برباد نہ ہو جائیں۔ اپنے زمانے کے شاعروں میں صرف حکیم سنائی کے دل میں اقبال کا "احساسِ زیاں" تھا۔ چنانچہ سنائی نے اپنے زمانے

کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لئے ان کی بدحالی پر ایک نظم لکھی جس کو پڑھ کر مسدس حالی یاد آجاتی ہے چند اشعار اس نظم کے درج ذیل ہیں:-

اے مسلمانان خلایق حال دیگر کردہ اند
از سر بے حرمتی معروف منکر کردہ اند

اے مسلمانو لوگ بدحال ہو گئے ہیں۔ ان پہ بے حرمتی نے اس قدر قابو حاصل کر لیا ہے کہ وہ معروف کو منکر کر بیٹھے ہیں۔

در سماع و پند اندر دیدن آیات حق
چشم عبرت کور و گوش زیرکی کر کردہ اند

انہوں نے پند و نصیحت سننے کے لئے اور آیات قرآنی دیکھنے کے لئے اپنے کان اور آنکھیں بند کر لی ہیں۔

شرع را یک سو نہادستند اندر خیر و شر
قول بطلیموس و جالینوس باور کردہ اند

خیر و شر دونوں کے معاملے میں شرع محمدی کو پس پشت ڈال دیا ہے اس کی جگہ وہ بطلیموس اور جالینوس کے عقیدوں پر چلتے ہیں۔

عالمان بے عمل از غایت حرص و امل
خویشتن را سخرۂ اصحاب لشکر کردہ اند

عالم لوگ بے عمل ہو کر حرص و ہوا میں گرفتار ہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو بادشاہوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔

شاعران شہرہا از بہر فرزند و عیال
شخص خود را ہم چو کلکے زرد و لاغر کردہ اند

شہروں کے شاعر نے اپنے بال بچوں کی خاطر اپنی قلم کو زرد اور کمزور کر دیا ہے۔

تاریخ میں تقریریں بھی شامل ہیں

انہیں بیدار کرنے والے شاعروں کی خاطر میں نے شاعری کو اپنایا اور شاعروں کے حالات زندگی کو میں نے اپنے صحیفوں میں جگہ دی۔ شاعری کے علاوہ بعض اوقات نثر بھی قوموں میں روح پھونکتی ہے۔ امام غزالی

(۱۰۵۸ تا ۱۱۱۱ء) کی مشہور کتاب "احیاء العلوم الدین" نے بدحال مسلمانوں میں جان ڈال دی۔ جب کسی قوم کا حال نازک ہو جاتا ہے تو واعظین اور مقرر اپنی تقریروں سے بگڑی ہوئی کو بنا دیتے ہیں۔ ایسی تقریروں کو میں اپنے صحیفوں میں اعلیٰ مقام دیتی ہوں۔ تقریروں کے سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وہ تقریر قابل نقل ہے جو انہوں نے بانیٔ اسلامؐ کی وفات پر کی۔ اس تقریر کی اشد ضرورت تھی کیونکہ بانیٔ اسلام کا قائم کردہ شیرازہ بکھرتا معلوم ہو رہا تھا۔ لوگوں کے سمجھ میں آتا تھا کہ نبی بھی موت کی نذر ہو سکتا ہے۔ اس وقت اندیشہ تھا کہ مسلمان خدا پرست ہونے کی بجائے کہیں انسان پرست نہ ہو جائیں جیسا کہ عیسائی ہو چکے تھے۔ گویا توحید باری خطرے میں تھی جس کو قائم کرنے کے لئے اسلام آیا تھا۔

ابوبکرؓ کی تقریر کے اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

"واضح ہو کہ جو کوئی شخص تم میں سے محمدؐ کی عبادت کرتا تھا تو وہ تو مر گئے اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا تو بے شک اللہ تو زندہ ہے اسے موت نہیں۔ اللہ نے خود کہا ہے کہ محمدؐ تو ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بھی رسول ہو چکے ہیں۔ اگر وہ مر گیا یا شہید ہوا تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ ہاں جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا اور اللہ شاکروں کو اچھا بدلہ دینے والا ہے۔"

ابوبکرؓ صدیق کی اس تقریر سے وہ شیرازہ باقی رہا جس نے آگے چل کر قیصر و کسریٰ کو سرنگوں کیا۔ اس تقریر سے توحید اور استوار ہو گئی اور ایسی استوار ہوئی کہ آج تک بدستور قائم ہے۔ ایسی فیصلہ کن تقریروں کو میں اپنے

صحیفوں میں ضرور درج کرتی ہوں کیونکہ اس قسم کی تقریریں صرف ادب ہی کی جان نہیں ہیں۔ بلکہ میرے صحیفوں ہیں بھی جان ڈالتی ہیں۔

تاریخی ناول بھی میرا ادبی پہلو پیش کرتے ہیں۔ میرے واقعات کی بنا پر اہلِ قلم اپنی صنّاعی دکھاتے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کے ناولوں میں خرافات بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان کی وجہ سے لوگ میرے شیدا ہو جاتے ہیں۔ اور میرے اصل صحیفے بھی پڑھنے لگتے ہیں۔

تاریخ ڈراما کی صورت میں

میرے ادبی بھیس کا ایک بڑا پہلو ڈراما ہے۔ میں بذاتِ خود ایک ایسا ڈراما ہوں جو تا حیاتِ انسان برابر جاری رہے گا۔ میرے ناپیدا کنار ڈرامے میں تمام دنیا شامل ہے اس لئے میرے اداکار ہر قوم اور ملک کے لوگ ہوتے ہیں۔ ڈراما کی صورت میں عوام میں بھی میں مرغوب ہو جاتی ہوں۔ ڈراما کے ذریعہ میں اور بھی زیادہ سبق آموز اور عبرت آموز ہو جاتی ہوں چنانچہ اکثر ادیبوں نے ڈراما نویسی اختیار کی اور اس طرح ان کو میرے صحیفے پڑھنے پڑے۔ بعض شائقین ڈراما بھی مجھ کو پڑھنے لگتے ہیں۔ گویا ڈراما مجھے مقبولِ عام بنانے کا بہترین طریقہ ہے۔

گو مشرق میں بہت کم ڈراما لکھے گئے لیکن اہلِ مغرب نے اس کمی کو پورا کیا۔ ڈراما کی بنیاد مغرب میں یونانیوں نے قائم کی۔ لیکن یونانی ڈراموں میں مجھ کو حامئ تقدیر کی صورت میں پیش کیا جاتا تھا حقیقت یہ ہے کہ ڈراما رائج الوقت خیالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ قدیم یونانی تقدیر کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے تمام ڈراما نویسوں کا موضوع بھی تقدیر ہے۔

مغرب میں سب سے بڑا ڈراما نویس شکسپیئر (۱۵۶۴ء تا ۱۶۱۶ء) نامی تھا۔ اس کی نظر تقدیر سے آگے تو گئی لیکن یہ بھی تقدیر کی بیڑیوں کو پوری طرح نہ کاٹ سکا۔ اسی طرح وہ اپنے زمانے کے توہمات کا بھی ذکر کرتا ہے۔ جادو ٹونے کا تذکرہ بھی اس کے ڈراموں میں ملتا ہے۔ اس کے کل ڈرامے جو آج دستیاب ہیں ان کی تعداد سینتیس ہے ان میں سے بیشتر مجھ سے متعلق ہیں۔ تاریخی ڈراموں میں جو ڈرامہ سب سے زیادہ دلکش اور سبق آموز ہے وہ "جولی یوس سیزر" کے نام سے موسوم ہے یہ ڈراما دیگر روم سے متعلق ڈراموں کی طرح پلوٹارک کی نوشتہ "سوانح حیات" پر مبنی ہے۔

ڈراما جولی یوس سیزر" کا جو حصہ مورخوں کے لئے کارآمد ہے وہ اس ڈراما کا پس منظر ہے جس میں روم کے آثار انحطاط نظر آتے ہیں لیکن یہ انحطاط جمہوریت کا تھا۔ رومی سامراج کا نہ تھا۔ اس ڈراما میں شیکسپیئر نے دکھایا ہے کہ جمہوریت کے لئے سب سے زیادہ خطرناک وہ لوگ ہوتے ہیں جو آج کل "بازارو لیڈر" کہلاتے ہیں۔ اس قسم کے لیڈر عوام کی نادانی سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو مقبول عام بنا لیتے ہیں اور اصل مدبرین سیاست کی بیخ کنی کرتے ہیں۔

بازارو قسم کی لیڈری اور اس کے خطرے شیکسپیئر نے این ٹنی کی تقریر کی صورت میں پیش کئے ہیں۔ یہ ڈراما نویس عوام کی ذہنیت کو خوب سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے این ٹنی کی زبان سے جو تقریر کرائی ہے اس سے رومی عوام کی ذہنیت عیاں ہو جاتی ہے۔ قاتل سیزر بروٹس نامی ان لوگوں میں سے تھا جو بازارو لیڈروں کے دام میں پھنس جاتے ہیں۔

بروٹس جیسے لوگوں کی نیت تو اچھی ہوتی ہے لیکن ان کی نظر مستقبل کو نہیں دیکھ سکتی۔ اس قسم کے لوگ "غلام تاریخ" ہو کر رہ جاتے ہیں اور زمانۂ ماضی سے آئندہ کے لئے بھی فتوے حاصل کرتے ہیں۔ جولی یس سیزر کا زمانہ بادشاہت کا متقاضی تھا لیکن بروٹس تو ماضی کے خواب شیریں میں مبتلا تھا اور جمہوریت واپس لانا چاہتا تھا۔

شیکسپیئر کی گڑھی ہوئی تقریریں این ٹنی۔ بروٹس اور اس کے ہم نواؤں کی ذہنیت کا آئینہ ہے عوام تقریروں میں "تکرار" کو پسند کرتے ہیں۔ تکرار تلخ بھی ہوتی ہے۔ لیکن این ٹنی کی زبان یا شکسپیئر کے قلم نے تکرار کو شیریں بنا دیا۔ این ٹنی کی تقریر پیش نظر ہے :۔

(اقتباس)

شریف بروٹس نے آپ لوگوں کو بتایا ہے کہ سیزر بوالہوس تھا۔
اگر یہ صحیح ہے تو بلا شبہ یہ ایک بڑا عیب تھا۔
سیزر نے آخر کار اس کا خمیازہ بھگتا۔
اب میں بروٹس اور باقیوں کی اجازت سے کیونکہ بروٹس قابل تعظیم ہے
سیزر کی تدفین کے موقع پر کچھ کہنا چاہتا ہوں
وہ (یعنی سیزر) میرا وفادار اور انصاف پسند دوست تھا۔
لیکن بروٹس کہتا ہے کہ وہ بوالہوس تھا۔
اور بروٹس قابل تعظیم انسان ہے
(سیزر) قیدیوں کو پکڑ کر روم لاتا تھا جن کے فدیہ سے خزانہ بھر جاتا تھا۔
کیا اس کو سیزر کی بوالہوسی کہا جا سکتا ہے ؟

جب غریب روتے تھے تو سیزر بھی ان کے ساتھ روتا تھا۔
لیکن بوالہوسی سے تو سنگ دلی پیدا ہوتی ہے۔
لیکن برولٹس کا دعویٰ ہے کہ سیزر بوالہوس تھا۔
اور پھر بھی برولٹس قابل تعظیم ہے۔
تم دیکھ چکے ہو کہ یوم لوپرقال کے موقع پر میں نے تین دفعہ اس کو شاہی تاج پیش کیا لیکن تینوں مرتبہ اس نے تاج سے انکار کیا۔
کیا یہ بوالہوسی کی نشانی تھی؟
لیکن برولٹس کا دعوی ہے کہ سیزر بوالہوس تھا
اور برُولٹس بلاشبہ قابل تعظیم ہے۔
میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ برولٹس پر نفرین کے لئے نہیں ہے۔
بلکہ وہ میں اپنے ذاتی علم کی بناپر کہہ رہا ہوں
تم سب لوگ بھی ایک زمانے میں اس کے شیدا تھے۔
لیکن تمہاری شیدائی بلاوجہ نہ تھی۔
پھر تم لوگ کیوں اس کا ماتم نہیں کرتے؟
ہائے انصاف تو اب درندوں کے پاس پہنچ گیا۔
اور انسان اپنی عقل کھو بیٹھے۔ لوگو میرے گواہ رہو۔
کہ میرا دل تو اب سیزر کے تابوت میں ہے۔
اب میں خاموشی اختیار کرتا ہوں تاوقتیکہ میرا دل واپس نہ آئے۔
(اس خاموشی کے بعد اینٹنی سیزر کا فرضی وصیت نامہ جیب سے نکال کر سنانا چاہتا ہے۔ لیکن دانستہ توقف کرتا ہے تاکہ سامعین بے صبرے ہو جائیں لیکن سامعین کے اصرار پر وہ یہ فرضی وصیّت نامہ

پڑھ کر سناتا ہے جس کی رُو سے سیزر اپنی جملہ دولت لوگوں کو بخشتا ہے۔ اس تقریر نے جادو کا کام کیا اور تمام سامعین بروٹس کے دشمن ہو گئے۔ حالانکہ اس تقریر سے پہلے سب بروٹس کے حق میں تھے) الغرض شکسپیر نے جمہور کی بھیڑ چال کو خوب بیان کیا جو اصل مؤرخ بھی نہیں بیان کر سکتا کیونکہ شکسپیر کے قلم میں جادو تھا۔ کاش میری سرگذشت لکھنے کے لئے مجھے بھی کوئی شکسپیر مل جاتا۔!!!

حقیقت یہ ہے کہ میرا ادب سے بہت ہی قریب کا رشتہ ہے۔ بیشتر ادیب اپنا مواد مجھ ہی سے لیتے ہیں۔ میں بھی جب کسی صاحب قلم ادیب کے ہاتھ لگ جاتی ہوں تو مجھ میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ شکسپیر جیسے ادیب نے میری ہی بدولت ادب کو مزین کیا۔ اسی طرح ناول نگار مجھ کو مواد بہم پہنچاتا ہے خاص کر جب سے سماج کا تذکرہ بھی میرے حدود میں آگیا ہے۔ اچھا ناول نگار اپنے زمانے کے سماج کا نقشہ کھینچتا ہے لیکن اس دور میں سماج اس تیزی سے بدل رہا ہے کہ ناول کے شائع ہونے تک ناول نگار کا بیان کردہ سماج تاریخ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہٹلر کے زمانے سے متعلق ناول آج تاریخی ہیں۔

جب سے پورا تمدن میرے سپرد ہوا ہے تب سے تو ہر کتاب خواہ وہ کسی علم پر ہو۔ میرا مواد بن گئی ہے حتیٰ کہ بچوں کے نصاب کی کتابیں بھی میرے لئے کارآمد ہیں کیونکہ اس قسم کی کتابوں سے رائج الوقت معیارِ تعلیم کا پتہ چلتا ہے۔ فراعنہ مصر کے زمانے کا ایک قاعدہ بلکہ ایک تختی بھی مورخوں کے ہاتھ لگی ہے جو اس زمانے کے معیار تعلیم کا پتہ دیتی ہے اس تختی پر مدرس کی دی ہوئی اصلاح بھی ہے۔

اسی طرح اُس زمانے کے کاغذ پر ایک تصویر مورخوں کے ہاتھ لگی ہے جس میں مصور نے دکھایا ہے کہ مدرسہ کے بچّے گھر جانے کے لئے مدرسہ ختم ہونے کے بعد باہر نکل رہے ہیں۔ یہ بچے اسی طرح خوشی سے اُچھلتے کُودتے نکل رہے ہیں جیسے آج کل کے بچّے نکلتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمدّن خواہ کتنا ہی بدل جائے لیکن انسانی فطرت نہیں بدلتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مُدرّس ہمیشہ سے سخت گیر رہے ہیں اور بچّوں نے بھی کبھی مدرسے کی پابندیوں کو پسند نہیں کیا۔

میرا رُوحانی پہلو اور اس کے فیوض

میری ہزاروں سالہ زندگی میں ایک ایسا دور بھی گذرا ہے جس میں میرے روحانی پہلو کا تذکرہ مُلّا اور پادری کے سپرد تھا۔ جنہوں نے مذہب کو اس کی رُوح سے محروم کرکے بڑی تنگ و تاریک صورت میں پیش کیا۔ چنانچہ مذہب کو اس کی واجبی وسعت دینے کی خاطر مجھے اپنی اس سرگذشت میں ایک مخصوص باب موسومہ "میرا روحانی پہلو" شامل کرنا پڑا۔

میں اپنے اس دَور میں بادشاہوں کے کارنامے اور ان کی فتوحات قلم بند کرنے میں مصروف تھی۔ اس دور میں مذہب میرا جزو نہیں سمجھا جاتا تھا۔ حالانکہ میرا واسطہ ہمیشہ سے انسان کے ہر پہلو سے رہا ہے مذہب ہی کی بدولت انسان متمدن ہوا۔ اس دور کی تاریخوں میں عیسائیت اور اسلام جیسے تبلیغی مذاہب کی اشاعت کا حال نہیں ملتا۔ طبری جیسا دین دار مؤرخ بھی تبلیغِ اسلام کا ذکر شاذ و نادر ہی کرتا ہے۔ جب سر طامس ارنلڈ نے اپنی کتاب "اشاعت اسلام" لکھی تو ان کو سینکڑوں تاریخوں کا جائزہ

لینا پڑا۔

اس انگریز مورخ کو اپنی تاریخ کے لئے بیشتر مواد صوفیوں کے تذکروں سے ملا۔ خدا بھلا کرے ان صوفیوں کا جنہوں نے اپنے ہم مشرب لوگوں کے ضخیم تذکرے لکھ کر یہ مواد بہم پہنچایا۔ اب جب کہ باضابطہ طور سے مذہب بھی میرے حدود میں آ گیا ہے۔ یہ مواد بیش بہا ثابت ہو رہا ہے اس طرح صوفی بھی میرے محسن ہیں بلکہ ان کو میں "مورخ روحانیت" کا لقب دینے کو تیار ہوں۔

اپنا روحانی پہلو دکھانے میں مجھے آسمانی صحیفوں سے بڑی مدد ملی۔ چنانچہ میں ان صحیفوں کو فخریہ اپناتی ہوں۔ میں نے اپنے باب موسومہ "میرا روحانی پہلو" میں ان صحیفوں سے استفادہ کیا ہے۔ میں نے قرآن سے اخذ کر کے حضرت ابراہیمؑ کی روحانی قوت کا ذکر کیا ہے جس سے وہ آتش نمرود پر بھی غالب ہو گئے۔

خیر و شر کے تذکرے کے لئے مجھے جو کچھ مواد حاصل ہوا وہ انہیں آسمانی صحیفوں سے ہی ہوا۔ میں نے گذشتہ ابواب میں ابلیس کی صفائی کا حال مولانا روم کی زبانی سُنایا ہے کہ کس طرح ابلیس خدا کی بارگاہ میں اور فرشتوں کی موجودگی میں اپنی صفائی پیش کرتا ہے جس کو سن کر ابلیس پر لعنت کرنے والوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے ہیں اور یہ ملامت کرنے والے اس بات کے قائل ہو جاتے ہیں کہ خیر کو بیدار کرنے کے لئے شر کی للکار ضروری ہے۔ ساتھ ہی اس پرسوز حکایت میں ابلیس تقدیر کی کارفرمائی سے انکار کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے :۔

خوب را من زشت سازم رب نیم   خوب را و زشت را آئینہ ام

(میں اچھائی کو بُرائی میں کس طرح بدل سکتا ہوں کیونکہ میں خدا نہیں۔ میں تو صرف بُرائی اور بھلائی کا آئینہ ہوں جس کو دکھا کر میں انسان کو قائل کر دیتا ہوں کہ اپنی برائیوں کے وہ خود ذمّہ دار ہیں میں نہیں)

تاریخ "صبرِ ایوبی" کی بھی تلقین کرتی ہے

یہودیوں کی کتاب "ایوب" تو ایسی عبرت آموز قصّوں سے بھری ہوئی ہے جن کو پڑھ کر آج بھی مصیبت زدہ افراد اور اقوام کی روح تازہ ہو جاتی ہے۔ میرے سپرد رشد و ہدایت بھی ہے۔ اس لئے میں ان آسمانی صحیفوں سے استفادہ کرتی ہوں اور مایوسوں کو سہارا دیتی ہوں۔ اس معاملے میں یہ کتاب "ایوب" مجھے بڑی مدد دیتی ہے۔ چنانچہ میں مایوسوں کو ڈھارس دینے والی اس کتاب سے چند اقتباسات پیش کر رہی ہوں تاکہ میرا روحانی پہلو میرے ناظرین پر روشن ہو جائے۔ افراد کی طرح اقوام بھی آج مایوسی میں گرفتار ہیں بھارت کے مسلمان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آج مسیحا کی تلاش کر رہے ہیں جو ان کو اس متعصب قوم کے پنجے سے چھڑائے۔ ان بھارتی مسلمانوں کو میں اپنے صحیفے پڑھنے کا مشورہ دیتی ہوں جن کو پڑھ کر ان کو معلوم ہو جائے گا کہ چنگیز اور ہٹلر بھی آخر کار مٹ کر رہے۔ (حوالہ نمبر۲)

اب آپ حضرات ایوب کے صبر و استقلال کا ذکر سنئے کہ کس طرح ان کو ابلیس ورغلانے کی کوشش کرتا ہے حتّٰی کہ اس پیغمبر کی بیوی بھی ابلیس کی تائید کرتی ہے:۔ (اقتباس از کتاب "ایوب")

"تب اس کی (یعنی ایوب کی) بیوی اس سے کہنے لگی کہ کیا تو اب بھی اپنی راستی پر قائم رہے گا۔ خدا کی تکفیر کر اور مر جا"

اس کا جواب ایوب نے جو دیا اس کو سنئے :۔

"لیکن اس نے اس سے (یعنی بیوی سے) کہا کہ تو نادان عورتوں کی سی باتیں کرتی ہے۔ کیا ہم خدا کے ہاتھ سکھ پائیں اور دکھ نہ پائیں۔ ان سب باتوں میں ایوب نے اپنے لبوں سے خطا نہ کی"۔

سینکڑوں لوگ باوجود اپنی کامل اور راست باز زندگی کے اس دنیا میں ناکام رہتے ہیں۔ لوگ ان کی قدر کرنے کی بجائے ان کی ہنسی اڑاتے ہیں ایسے لوگوں کی دل جوئی کے لئے حضرت ایوب نے کہا :۔

"راست اور کامل آدمی ہنسی کا ہی نشانہ ہوتا ہے"۔

تاریخ گریۂ یعقوب سے رشد و ہدایت کا کام لیتی ہے

"دو ہر روح افزا تخیل جو ہمیں اپنے رسائی بھیس میں پیش کرتی ہوں وہ گریۂ یعقوب" ہے جو شاعروں نے بھی اپنا لیا۔ صبر ایوبی کی طرح میرا یہ تخیل بھی مصیبت زدہ لوگوں کو ڈھارس دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ امریکہ میں غلامی کے خلاف جو تحریک اٹھی اس کا باعث حضرت یوسف کا غلاموں کی طرح بیچا جانا ہو۔

حضرت یوسف کے ساتھ جو مظالم ان کے بھائیوں نے کئے ان کا حال کتاب پیدائش اور قرآن میں بڑی تفصیل سے درج ہے جس سے فطرتِ انسانی کے شر کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ بغض و حسد صرف افراد ہی میں نہیں بلکہ قوموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جرمن قوم کو انگریزوں کا عروج نہ بھاتا تھا۔ دونوں عالمگیر جنگوں کی وجہ بھی حسد تھا۔ برادران یوسف بھی اپنے بھائی سے حسد کرتے تھے۔ کیونکہ یوسف علاوہ خوبصورت ہونے کے اپنے عروج کے خواب بھی دیکھتے تھے۔ بالآخر ان کے حاسد بھائیوں

نے ان کو غلامی میں بیچا اور وہ مصر بحیثیت غلام پہنچے۔ گریہ یعقوب کے متعلق کتاب پیدائش کہتی ہے:۔ (حوالہ نمبر ۸)

"تب یعقوب نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کے لئے ماتم کرتا رہا اور اس کے سب بیٹے بیٹیاں اسے تسلّی دینے جاتے تھے پر اُسے تسلّی نہ ہوتی تھی۔ وہ یہ کہتا رہا کہ میں تو ماتم ہی کرتا ہوا قبر میں اپنے بیٹے سے جا ملوں گا۔ سو اس کا باپ اس کے لئے روتا رہا"

لیکن گریۂ یعقوب بیکار نہ گیا۔ یوسف کے خریداروں نے ان کو مصر لے جا کر حاکم فرعون فوطی فار نامی کے ہاتھ بیچا لیکن بقول "کتاب پیدائش" (حوالہ نمبر ۹) "خداوند یوسف کے ساتھ تھا اور وہ اقبال مند ہوا۔ اور اپنے مصری آقا کے گھر میں رہتا تھا۔ اور اس کے آقا نے دیکھا کہ خدا اس کے ساتھ ہے اور جس کام کو وہ ہاتھ لگاتا ہے خداوند اسے اقبال مند کرتا ہے .... خداوند نے اس مصری کے گھر میں برکت بخشی"

لیکن خدا امیدوارِ نبوّت کی آزمائش بھی کرتا ہے۔ چنانچہ زلیخا یوسف پر عاشق ہوئی لیکن یوسف اس آزمائش میں پورے اترے۔ باوجود اس کے کہ زلیخا نے ناکام ہو کر اُلٹا یوسف پر الزام لگایا لیکن خدا نے برابر یوسف کا ساتھ دیا حتّٰی کہ یوسف فرعون وقت کے منظورِ نظر ہو گئے۔ فرعون کے خوابوں کی یوسف نے تعبیریں کیں۔ جو صحیح ثابت ہوئیں۔ یہاں تک کہ فرعون نے یوسف کو "عزیز مصر" یعنی گورنر مقرر کر دیا۔ اس طرح گریۂ یعقوب بالآخر پھل لایا۔ یوسف نے اپنے حاسد بھائیوں سے کوئی بدلہ نہ لیا۔ یعقوب نے فرعون کے حق میں دعا دی جو خدا نے منظور کی۔

شاعروں کی بدولت "صبرِ ایوبی" اور "گریۂ یعقوب" کے چرچے آج تک عام زبان زد ہیں۔ جن سے صرف افراد ہی نہیں بلکہ قومیں بھی تسلی پاتی ہیں۔

میرا روحانی بھیس آج تک کارفرما ہے۔ فتح پور سیکری میں میرے روحانی بھیس کی نشانی سلیم چشتی کے مزار کی صورت میں آج تک موجود ہے جہاں سینکڑوں عورتیں جا کر اولاد کے لئے منتیں مانگتی ہیں جب ان کی منت پوری ہوتی ہے تو یہ اپنے بیٹے کا نام ان بزرگ کے نام "پر سلیم" رکھتی ہیں۔ یہ مزار شہنشاہ اکبر جیسے "ملحد" کا بنوایا ہوا ہے گویا میرا روحانی بھیس ملحدوں کی بھی رہنمائی کرتا ہے۔

میرے رُوحانی بھیس کی ایک عجیب نشانی!

میں اپنے روحانی بھیس کے تذکرے کا خاتمہ ایک عجیب و غریب کتاب پر کرتی ہوں جو "مثنوی معنوی" کے نام سے آج تک مقبول ہے۔ اس کے مصنف جلال الدین تھے جو "رومی" یا مولانا روم کے لقب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ان کا زمانہ زندگی ۱۲۰۷ء تا ۱۲۷۳ء ہے۔ اس مثنوی کے متعدد اشعار میں نے اپنی اس سرگذشت میں نقل کئے ہیں۔

اہل دل اس مثنوی کے متعلق کہتے کہ یہ "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" لیکن مُلّا جامی نے اس کے مصنف کے لئے کہا ہے:۔

من چہ گویم وصف آں عالی جناب
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب!

آسمانی صحیفے بھی میری روحانیت کی نشانیاں ہیں لیکن اس کتاب

مثنوی کو بھی اپنی روحانی نشانیوں میں شامل کرتی ہوں حالانکہ اس میں میرے متعلق صرف چند واقعات ہیں اور وہ بھی آسمانی صحیفوں سے اخذ کردہ ہیں۔ صبرِ ایوبی اور گریۂ یعقوب کی طرح یہ کتاب بھی مصیبت زدوں کی غم خواری کرتی ہے۔ اہلِ دل تو اس کے ذریعہ آسمان کی سیر کرتے ہیں لیکن اس کے اشعار کا اطلاق دُنیاوی معاملات پر بھی ہوتا ہے چنانچہ میں نے اس کے اشعار اپنے واقعات کے سلسلے میں نقل کئے ہیں۔ مثنوی بھی بشارت دیتی ہے۔ عثمانی ترک حکمران تو اس کتاب کو اپنے ساتھ معرکوں میں لے جاتے تھے۔ جب کوئی عثمانی سلطان تخت نشین ہوتا تھا تو اس کی کمر سے حضرت عمرؓ کی تلوار مصنف مثنوی کے مزار پر ہی باندھی جاتی تھی۔

ڈاکٹر اقبال جن کے پیغامِ بیداری کی بدولت پاکستان قائم ہوا اپنے آپ کو مولانا روم کا مرید کہتے تھے۔ اقبال نے اپنی "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" مثنوی معنوی کے طرز پر لکھی۔ مثنوی کے ترجمے کئی مغربی زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔

مولانا روم نے مسلمانوں کو ایسے وقت میں تسلّی و بشارت دی۔ جب چنگیزی عالمِ اسلام کو تباہ کر رہے تھے۔ ان کی مثنوی دیگر مذاہب کی رواداری کے حق میں تلقین کرتی ہے۔ مولانا روم کی بدولت مسخ شدہ تصوف پھر پاک ہوا۔ تصوف کو میں۔ "تاریخ گر" کہتی ہوں۔ ترک صوفیوں کی بدولت ہی مسلمان ہوئے۔

تیرھواں باب

میری وصیّت

وصیّت وہ لوگ کرتے ہیں جن کو اپنی موت قریب نظر آتی ہے۔ بظاہر مجھے بھی موت کا اندیشہ ہے۔ اس اندیشے کے اسباب یہ ہیں:۔

دورِ حاضر میں سائنس کا زور بے پناہ بڑھ رہا ہے۔ اس زور کا سبب یہ نہیں کہ لوگ سائنس کو سائنس کی خاطر پسند کرتے ہیں۔ اگر علم کو لوگ علم کی خاطر پسند کریں تو مجھے اپنے مستقبل کے متعلق کوئی اندیشہ نہیں لیکن درحقیقت آج کل لوگ علم صرف پیٹ کی خاطر حاصل کرتے ہیں۔ پیٹ کے تقاضے دن بدن بڑھ رہے ہیں۔ جو چیزیں کل تک اسباب تعیش سمجھی جاتی تھیں وہ آج ضروریاتِ زندگی میں داخل ہیں۔ آج کل ہر شخص موٹر کار کا آرزومند ہے۔ پہلے تو صرف خدا کی پوجا ہوتی تھی آج کل "معیارِ زندگی" پوجا جاتا ہے۔ یہ ایک نئی دیوی ہے جس کا وجود میرے ایامِ پیدائش میں نہ تھا۔ یہ دیوی "عہدِ مشین" کی پیداوار ہے۔ یہ عہد مغرب سے شروع ہوا۔ جہاں ہوس پرستوں نے مشین کو خدا بنا دیا۔ اس وقت مشرق قناعت کا شیدا تھا۔ اس لئے جملہ انبیاء اولیاء اور اہلِ فکر و نظر مشرق ہی میں پیدا ہوئے۔

میری موت کے آثار

یہ عجیب بات ہے کہ مغرب اپنی یونانی یعنی کلاسکی ابتدا پر تو ناز کرتا ہے لیکن سقراط۔ افلاطون اور

ارسطو کی قناعت شعاری کو ٹھکراتا ہے۔ مشرق پر جب ان مغربیوں کا غلبہ ہوا اور اپنے شعار انہوں نے اہل مشرق کو سکھائے تو ان شعاروں میں یہ "اعلیٰ" معیارِ زندگی بھی تھا۔ چنانچہ بوقت رخصت یہ مغربی اپنے سابق محکوموں کو اپنا عہدِ مشین بخشتے گئے۔ اب اہل مشرق بھی علم کو علم کی خاطر نہیں بلکہ اس کے ذریعہ کمائی کی خاطر حاصل کرتے ہیں۔ بہ نسبت میرے دیگر علوم اور خصوصاً علوم سائنس کے ذریعہ زیادہ دولت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس لئے مجھے چھوڑ کر سائنس کے پیچھے پھرتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب نصاب تعلیم میں میرا مقام نہایت اعلیٰ تھا۔ مسلمانوں کے دور میں تو میرے پرستار "تاریخ گو" کے نام سے گلی کوچوں میں پھرتے تھے بازاری لوگوں کی خاطر میرے نام پر کتابیں لکھی گئیں۔ گو ان کتابوں میں مجھ سے مشابہ افسانے ہوتے تھے۔ لیکن میرا نام عوام کے زبان زد تھا۔ عثمانی ترکوں کے لشکر تک کے ساتھ یہ تاریخ گو جاتے تھے اور میرے نام سے لشکریوں کی روح تازہ کرتے تھے۔ ہر مسلمان تعلیم یافتہ خاندان میں کوئی نہ کوئی میرا پرستار ہوتا تھا۔ اور میرے صحیفے تیار کرتا تھا۔

پانچویں جماعت پاس طبقہ کا ظہور!

دورِ حاضر میں صرف پیشہ ور مورخ ہی میرے اعلیٰ قسم کے صحیفے لکھتے ہیں۔ جن کو صرف چند لوگ پڑھتے ہیں۔ بیشک اس زمانے میں جبریہ تعلیم کی وجہ سے خواندہ لوگ بکثرت ہیں اور "پانچویں جماعت پاس" طبقہ روز بروز بڑھ رہا ہے لیکن ان کا مذاقِ طبیعت ناولوں کا طلب گار ہے میرا نہیں۔ چنانچہ آج کتب فروشوں کی دکانوں میں ناول تو بکثرت نظر آتے ہیں لیکن میں تقریباً

غائب ہوچکی ہوں۔ کیونکہ میری مانگ ہی نہیں۔ اس کے علاوہ اب اشاعت کے لئے کتابوں کا انتخاب کتب فروش کرتے ہیں جو اپنے آپ کو "ناشر" کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ناشر تو صرف وہ کتابیں شائع کرینگے جن کی مانگ ہے۔

نیم تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں جو میرا تصور ہے وہ "اخباری" یعنی صحافی قسم کا ہے۔ عالمانہ اور تاریخانہ نہیں۔ چنانچہ اب اگر کوئی مؤرخ قلم اٹھاتا ہے تو وہ صحافی قسم کی تاریخ لکھتا ہے تاکہ عوام میں مقبول ہو عوام زمانۂ ماضی کو صرف اسی حالت میں سمجھ سکتے ہیں جب زمانۂ ماضی کو بھی زمانۂ حال کی صورت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس زمانے کے مقبول مورخ اسی طرز کی کتابیں لکھتے ہیں جن کو وہ میرے نام پر "تاریخ" کہتے ہیں۔ میں نے گذشتہ ایک باب میں مقبول عام امریکی مؤرخ وِل ڈوران کا ذکر کیا ہے جس نے اسی طرز پر آٹھ جلدیں حال ہی میں شائع کی ہیں۔

اسی نیم تعلیم یافتہ طبقے کی بدولت جو حصولِ روزی میں بے طرح مشغول ہے۔ میرا نام اب صرف اخباروں اور رسالوں میں آتا ہے۔ ان روزانہ اخباروں اور ماہواری رسالوں میں کبھی کبھی مضامین نکلتے ہیں۔ جو "تاریخی" کہلاتے ہیں۔ لیکن یہ مضامین دانستہ "عام فہم" بنائے جاتے ہیں تاکہ ہر کس و ناکس ان کو پڑھ سکے۔ لیکن اس مقبولیت کی خاطر میری صورت مسخ کی جاتی ہے۔ جب کسی مفتوحہ قوم کو از سرِ نو آزادی ملتی ہے۔ تو اس قوم کے "مؤرخ" یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی قوم زمانۂ سابق میں بھی آزاد تھی۔ یہ تماشہ آج کل افریقہ کی نو آزاد قوموں میں نظر آرہا ہے۔ چونکہ آج کل جمہوریت کا زور ہے اس لئے ان مؤرخوں کو اپنی قوم کے زمانۂ ماضی میں بھی جمہوریت نظر آتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے

کہ پورا مشرق ہمیشہ سے جمہوریت سے بیگانہ رہا ہے۔

تصوّرِ تاریخ کی وسعت اور اس کے خطرے

اس کے علاوہ اب میرے متعلق تصور اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ اب میرے صحیفے لکھنا کسی فردِ واحد کے بس کا روگ نہیں۔

اب انسان کی ہر حرکت شائستہ اور ناشائستہ کا بیان میرے لئے لازمی ہو گیا ہے۔ ہر نئی سائنسی ایجاد کا ذکر میرے صحیفے میں ہونا چاہیئے۔ فلم اسٹاروں کی پے در پے طلاقوں کا ذکر بھی میرے ذمہ ہے۔ اگر کوئی نیا کپڑا بنایا جاتا ہے تو اس کا اندراج بھی لازم ہے۔ خواہ وہ

"شاہدے را حلّہ گرد دیا شہیدے را کفن"

ہر نئے فیشن کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ٹیڈی لباس کے عروج و زوال کا ذکر بھی مورخوں کو کرنا پڑے گا۔ آئندہ جب کوئی تاریخ لکھی جائے گی وہ "پنچائتی" ہو گی۔ اور ہر رکن پنچائت اپنے اپنے راگ گائے گا۔ ناظرین کتاب بڑی مشکل میں پڑ جائیں گے۔ کیونکہ ایک فردِ واحد ہر علم و فن کا ماہر نہیں ہو سکتا۔ ماہرینِ سائنس و صنعت کی بھی مدد لینی پڑے گی۔ لیکن یہ فیصلہ کہ ایسی تاریخ قابلِ اشاعت ہے یا نہیں صرف ناشرانِ کتب کے ہاتھ میں ہے۔ مورخ بے چارہ اپنے مسودہ کو بطور سائل ان ناشروں کے سامنے پیش کرے گا۔

تاریخی مواد کی کثرت اور آئندہ مؤرخوں کی مشکلات

مجھے اپنی موت تاریخی مواد کی کثرت کی صورت میں بھی نظر آتی ہے۔ میری وسعتِ حدود کی وجہ سے اب روزنامہ اخباروں کی ہر خبر تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ مغرب اور خصوصاً امریکہ

میں تو اخباروں کا حجم ایسا ہو گیا ہے کہ ایک اخبار کو پڑھنے کے لئے کئی دن درکار ہوتے ہیں۔ اگر تمام دنیا کے اخباروں کی خبروں کو یکجا کیا جائے تو میں اس بوجھ سے دب کر مر جاؤں۔ لامحالہ اب مورخوں کو خبروں میں سے "انتخاب" کرنا پڑے گا۔ لیکن یہ انتخاب حمایت اور جانب داری کا دروازہ کھول دے گا۔ مورخ صرف وہی خبریں منتخب کرے گا جن سے اس کے خیال اور عقیدے کی تائید ہوتی ہے۔ اس طرح ایک ہی واقعہ کی مختلف اور متضاد تاویلیں کی جائیں گی۔ بقول شاعر ؎

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا

خواب پریشان ہو تو ہو لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میرے صحیفے کے اوراق بھی پریشان ہو جائیں گے اور میرا لقب "اوراق پریشان" ہو جائے گا۔ خدا خدا کر کے ابن خلدون جیسے میرے خلف الرشید نے ان اوراق پریشان کو یکجا کیا تھا لیکن اب مجھے پھر وہی دور واپس آتا نظر آ رہا ہے۔

یہ بکثرت مواد صرف اخبار اور رسالے ہی مہیا نہیں کر رہے بلکہ حکومتوں نے بھی اپنے قدیم کاغذات اور تاریخی دستاویزات کے دفتر کے دروازے مورخوں کے لئے کھول دئے ہیں۔ پرانے زمانے کے مورخ بڑی بے باکی سے اور پورے یقین کے ساتھ واقعات لکھتے تھے لیکن اب جب کہ تمام حکومتوں نے مورخوں کو پرانے دستاویزات دیکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ مورخ کسی واقعہ کو پورے یقین کے ساتھ نہیں لکھ سکتے کہ مبادا کل کوئی اور مورخ کسی اور حکومت کے دفتر سے کوئی واقعہ ڈھونڈ نکالے جس سے پچھلے واقعہ کی تردید ہو جائے۔ چنانچہ اب مورخ اپنی رسائی کے مطابق ہی پاؤں پھیلاتے ہیں اور صرف ایک محدود میدان میں دوڑ

لگاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب مورخ صرف چند مخصوص واقعات کسی مخصوص عہد کے لکھتے ہیں۔ اس طرح میرا میدان بھی تنگ اور محدود ہو گیا ہے۔ ایسی محدود اور مخصوص تاریخوں کے پڑھنے سے میرے شائقین کی تسلّی نہیں ہوتی اور میں ان کو زاہد خشک نظر آتی ہوں۔ بیان میں رنگینی پیدا کرنے کے لئے وسیع میدان کی ضرورت ہے۔ اور ساتھ ہی مورخ میں اپنے واقعات کے متعلق یقین محکم بھی ہونا چاہیئے۔ لیکن جب مورخ خود ہی شک و شبہ کا شکار ہے تو یقین کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

آئے دن کے ہنگامے اور ان کے خطرے

اب تک میرے شائقوں کو مجھ میں آثار ترقی نظر آتے تھے۔ اور میں ترقی کا افسانہ سمجھی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک پوری متمدن دنیا راہِ ترقی پر گامزن تھی۔ ایک کارنامہ دوسرے کارنامہ کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ تمام دُنیا پر امن و امان کا راج تھا۔ ہنگاموں کو لوگ بھول چکے تھے۔ بیسویں صدی کے شروع میں جرمن قوم نے پاؤں پھیلانے شروع کئے۔ لیکن دُنیا کے بستر پر انگریز قوم دراز تھی۔ انہوں نے جرمن قوم کو غاصب قرار دے کر دُھتکارا جس سے ہنگاموں کا آغاز ہوا۔ اور بالآخر پہلی عالمگیر جنگ سنہ ۱۹۱۴ء میں نمودار ہوئی۔ جنگ کے دوران میں لوگ میرے صحیفوں کے بجائے اخبار پڑھتے ہیں جن میں سنسنی خیز خبریں ہوتی ہیں۔ جو میرے صحیفوں میں نہیں ہوتیں۔

جب پہلی عالمگیر جنگ سنہ ۱۹۱۸ء میں ختم ہوئی تو لوگ مجھے مظہرِ ترقی کے بجائے مظہرِ تنزل سمجھنے لگے اور وہ ترقی جس کی میں حامل سمجھی جاتی تھی رفوچکّر ہو گئی۔ دوسری عالمگیر جنگ (سنہ ۱۹۳۹ء تا سنہ ۱۹۴۵ء) نے تو دنیا

کا پانسہ بالکل پلٹ دیا۔ ترقی یافتہ قومیں اور خصوصاً انگریز تو یکایک قعرِ گمنامی میں جا گرے۔ روس اور امریکہ جن کی طرف کوئی دیکھتا بھی نہ تھا۔ میدان عمل میں پہلے ایک دوسرے کے معاون ہو کر اور بعد کو مخالف ہو کر آئے اب اخباروں اور باتصویر رسالوں کا زور ہوا۔ جنہوں نے مل کر مجھے بھی قعرِ گمنامی میں پھینک دیا۔ کیونکہ میں تو صرف ماضی کی باسی خبریں دیتی ہوں لیکن لوگ تو اب تازہ خبروں کے شائق ہو گئے کیونکہ تازہ خبریں سنسنی خیز ہوتی ہیں۔ الغرض اخباروں نے مجھے چت کر دیا۔

جب طاقتور قوموں نے شکست کھائی تو ان قوموں پر قنوطیت سوار ہو گئی اور اب یہ قومیں ترقی کے بجائے تنزل کا انتظار کرنے لگیں۔ جرمن اسپینگلر اور انگریز پروفیسر ٹوئن بی جن کا تذکرہ میں کر چکی ہوں اسی دورِ قنوطیت کی پیداوار ہیں۔ جن کو اب مستقبل میں مغرب کے لئے سوائے تنزل کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ان دونوں نے جو میرے نام سے فلسفہ پیش کیا وہ فلسفۂ تنزل ہے۔ لیکن لوگ تو پیغام ترقی کے عادی ہو چکے تھے اب ان کو بجائے ترقی کے مجھ میں پیغام تنزّل نظر آتا ہے اور اس لئے اب وہ مجھ پر توجہ نہیں کرتے۔

البتہ اب مجھے اگر اپنا مستقبل شاندار نظر آتا ہے تو وہ اس مشرق میں ہے۔ جو کل تک مغرب سے مغلوب تھا۔ گو یہ لوگ نئی آزادی میں بدمست ہو کر مجھ پر بُری طرح تصرّف کر رہے ہیں۔ اور میرے واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے آپ کو وارث اور مستحق جمہوریت سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ان کی بدولت میرا نام تو زندہ ہے۔ اس کے علاوہ آزادی کے یہ نئے علمبردار ایک دوسرے کی گردن پر ضرور سوار ہوں گے۔ اور اس طرح میرے صحیفوں کے لئے بڑی

تیزی سے واقعات فراہم ہوں گے۔ ان کی رفتارِ ترقی بھی تیز ہوگی اور یہ نئی قومیں دس سال میں وہ کرد کھائیں گی جس کی تکمیل میں مغرب کو سو سال صرف کرنے پڑے کیونکہ ان کا راستہ ترقی اہلِ مغرب ہموار کر چکے ہیں۔ الغرض اب میرے مؤرخوں کو واقعات اس تیزی سے فراہم ہوں گے کہ ان کو قلم بند کرنا مشکل ہو جائے گا اور اس طرح مشرق کی بدولت مجھے حیاتِ ثانیہ نصیب ہوگی۔ آمین۔ لیکن ساتھ ہی ان نوخیز قوموں کو چند ہدایات بھی پیش کرتی ہوں۔

میری صورت مسخ ہونے کا اندیشہ

باوجود موت کے ان آثاروں کے اگر بالفرض میں کسی طرح موت سے بچ بھی گئی تب بھی مجھے اندیشہ ہے کہ کم ازکم میری صورت ضرور مسخ ہو جائے گی۔ جیسا کہ میں بتا چکی ہوں نیم تعلیم یافتہ طبقہ اہلِ قلم کو مجبور کرے گا کہ وہ مجھے ایسی صورت میں پیش کریں جن کو ان کا ذہن خام سمجھ سکے۔ چنانچہ بعض اہلِ قلم مجھ کو ناولوں کی صورت میں پیش کرتے ہیں اور مجھے چڑانے کے لئے ان افسانوں کو "تاریخی ناول" کہتے ہیں۔ ان ناولوں کو دلکش بنانے کی خاطر وہ میرے متعلق واقعات بھی گڑھتے ہیں۔ چونکہ یہ نیم تعلیم یافتہ مجھ سے بالکل ناآشنا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ ان من گڑھت واقعات کو صحیح سمجھتے ہیں۔

ساتھ ہی مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ میری مسخ صورت کو دیکھ کر میرے مشہور مورخ مجھ سے شرمائیں گے۔ مشہور یونانی مؤرخ ہرودوتس باوجود اس کے کہ وہ خود گپّی تھا۔ میری مسخ صورت کو دیکھ کر کیا کہے گا۔ اسی طرح رومی عہد کا یونانی مورخ پولی بیوس بھی مجھ سے شرمائے گا مسلمان مؤرخ

طبری جس نے صحتِ واقعات کی خاطر میرے واقعات کے متعلق اسباب معلوم کرنے تک سے گریز کیا۔ میری مسخ صورت کو دیکھ کر مجھے اُٹھا کر پھینک دے گا۔ ابن خلدون جس نے صحیح واقعات درج کرنے کی خاطر اتنی خفّت اٹھائی اور مورخوں کو صحیح صحیح واقعات درج کرنے کے لئے تنبیہ کی مجھے ٹھکرائے گا۔ وہ مشہور مورخ ایڈورڈ گبن جس نے زوال روما الکبریٰ پر پہلی نامی کتاب لکھی مجھ پر لعنت بھیجے گا۔ اگر مسخ ہونے کے بعد میں زندہ بھی رہی تو ایسی زندگی سے کیا فائدہ ؟

سیاستِ حاضرہ کے ماتحت ہو کر تاریخ مسخ ہو جاتی ہے

مطلق العنان حکمرانوں کے تحت میں سیاست حاضرہ کی غلام رہی۔ جب مغرب میں دورِ نشاۃ ثانیہ کے زمانے میں مجھے آزادی ملنا شروع ہوئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ بیسویں صدی میں مجھے پھر سیاستِ حاضرہ کی لونڈی بنا دیا جائے گا۔ میں تو اس اُمید میں تھی کہ جوں جوں زمانہ گزرے گا اسی حساب سے میری آزادی بھی بڑھتی جائے گی۔ لیکن میری اُمید کے خلاف روس میں جو انقلاب اشتراکیت ۱۹۱۷ء میں برپا ہوا اس نے پھر مجھے سیاست حاضرہ کی بیڑیاں پہنا دیں۔

زارِ روس جیسے مطلق العنان حکمران کے تحت میں آج کی بہ نسبت زیادہ آزاد تھی اس انقلاب نے مزدوروں کو تو سرمایہ داروں کی بیڑیوں سے آزاد کیا۔ لیکن وہی بیڑیاں مورخوں کو پہنا دی گئیں بلکہ روس کے ادیب بھی پابہ زنجیر ہو گئے۔ جب مشہور روسی ادیب بورس پاسٹرنیک کو بین الاقوامی مشہور انعام موسومہ "نوبیل پرائز ملا" تو اس ادیب کو روسی اشتراکی حکومت کی طرف سے بجائے شاباشی کے تادیب ملی اور

اس کو اس مشہور انعام سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کو یہ انعام ۱۹۵۸ء میں ملا تھا۔ جس کتاب پر اس کو یہ انعام ملا وہ "ڈاکٹر ژواگو" کے نام سے موسوم تھی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

روس کے اشتراکی حکمرانانِ وقت کے نزدیک جو کام مورخ کے سپرد ہے وہ اس تقریر سے ظاہر ہے۔ جو روسی مورخوں کے ایک جلسے کے موقع پر دسمبر ۱۹۶۲ء میں مورخوں کی مرکزی کمیٹی کے سکریٹری نے کی اس سکریٹری کے نزدیک :-

"مورخ محض ایک غیر جانب دار نامہ نگار نہیں جو واقعات کو کسی باقاعدہ طریقہ سے کسی اصول کے تحت پیش کرتا ہے بلکہ مورخ بھی مجاہدِ اشتراکیت ہے۔ جس کا فرض ہے کہ وہ ماضی کی تاریخ کو بھی جہادِ اشتراکیت کے تحت کر دے"

آگے چل کر یہ سکریٹری کہتا ہے کہ مورخ کو یقین کامل ہونا چاہیئے کہ اشتراکیت کی فتح لازمی ہے۔ اس لئے مورخ کے لئے لازم ہے کہ وہ طلبائے تاریخ میں یقین پیدا کرے کہ ان کو سماج کے قوانین کے ترقی کو پوری طرح سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ ان قوانین کے تحت "سرمایہ داری کی تباہی اور اشتراکیت کی فتح لازمی ہے" یہ سکریٹری یہاں تک کہتا ہے کہ فرسودہ اور محدود اور غیر ضروری واقعات کو اشتراکیت کی خاطر حذف کر دینا چاہیئے گویا اب اشتراکیت کے تحت جو اصل چیز ہے وہ اسی اشتراکیت کی تلقین و ترویج ہے۔

چنانچہ آج روس کے اشتراکیت پسند مورخ کھلم کھلا میرے واقعات کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کر رہے ہیں کہ ماضی کے تمام واقعات صرف

اشتراکیت کی آمد کی خاطر رُونما ہوئے۔ گویا اشتراکیت کی آمد کی بشارت دُنیا کو صدیوں پہلے مل چکی تھی۔ واقعات کو توڑنے مروڑنے کا جواز ایک روسی مورخ آس ماموس نامی اس طرح پیش کرتا ہے :۔

"(واقعات کی پُشت پر جو خیالات ہوتے ہیں۔) ان خیالات کو سیدھے سادے طریقے سے منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ ان کو (رائج الوقت قدروں کے تحت) بدلا جاتا ہے تاکہ (یہ واقعات) رائج الوقت خیالات کی تائید کریں.... اس ضرورت کے تحت واقعات میں ترمیم اور ردّ و بدل کرنا بھی جائز ہے تاکہ رائج الوقت حقیقت کی تائید ہو۔"

اب تک مؤرخوں نے صرف تاویل بازی پر اکتفا کیا اور میرے واقعات کو بدلا نہیں لیکن آج کل کے اشتراکی مورخ تو میرے واقعات کا ردّ و بدل بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ واہ رے ترقی اور آزادی !!! اس قسم کے ردو بدل پادریوں اور مسلمان ملاؤں نے بھی نہ کئے۔ لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ اسی اشتراکی روس میں چند حق گو مورخ آج ایسے بھی نظر آتے ہیں جو اس ردّ و بدل کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ لیکن نقارخانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ بہرکیف میرا فرض ہے کہ میں اپنی اس وصیت میں دنیا کو آگاہ کر دوں کہ جب کبھی مجھ کو سیاست حاضرہ کے ماتحت کیا جائے گا میری صورت ضرور مسخ ہو گی۔

تاریخ کی پرستش اور اس کے نتائج

سب سے پہلی ہدایت یہ ہے کہ نوخیز قومیں میری پرستش سے گریز کریں۔ یونانیوں نے مجھے دیوی قرار دیا۔ خطۂ یونان میں دیویاں بکثرت تھیں۔

اُن کی راگ مالا دیویوں سے بھری پڑی ہے لیکن ساتھ ہی یہ راگ مالا بڑی معنی خیز ہے۔ ہر دیوی انسان کے کسی نہ کسی نصب العین کی نشانی ہے جس سے وہ روحانی تربیت حاصل کرتا ہے۔ مثلاً ایک دیوی رحم و کرم کی نشانی ہے۔ جس کا پوجنے والا اپنے میں رحم و کرم پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح ایک اور دیوی قہر و جبر کی نشانی ہے۔ اس کی پرستش سے انسان میں جبر و قہر پیدا ہو جاتا ہے۔

ان دیویوں کے پیدا کرنے سے حکمار یونان کا مدعا کیا تھا، عقل اس کا جواب یہ دیتی ہے کہ بقول شاعر "ہر کسے را بہر کارے ساختند"۔ یعنی قدرت نے ہر انسان کو کسی نہ کسی مخصوص کام کے لئے پیدا کیا۔ چنانچہ اپنی خلق کے مطابق انسان اپنا کام متعین کرتا ہے۔ ظلم پسند لوگ شمشیر زنی کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح مختلف طبیعتوں کے لوگ اپنے تقاضائے طبیعت کے مطابق مختلف دیویوں کی پرستش کرتے ہیں۔ شائقین علم مختلف علم کی دیویوں کو پوجتے ہیں۔ میں بھی ان مختلف علوم کی دیویوں میں سے ہوں۔ شائقین تاریخ میری پرستش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں میرا فرض ہے کہ میں اپنے مختلف پہلو بھی بتا دوں تاکہ میرے پرستار خبردار ہو جائیں۔ کیونکہ انسان اپنی نظر کا بندہ ہے اور نظر طبیعت سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی نظر کے مطابق انسان میرے مختلف پہلوؤں کو پسند کرتا ہے۔ میرے صحیفوں میں لڑائیوں کا بھی ذکر ہے اسلئے اہلِ سیف میرے اس جنگی پہلو کی پرستش کرتے ہیں۔ میں نے انبیاء اور اولیاء کی خدمت خلق کا بھی ذکر کیا ہے اس لئے خدمت پسند لوگ میرے اس پہلو کو دیکھ کر اپنی روح تازہ کرتے ہیں۔ میں نے

بادشاہوں اور قوموں کی حکومتوں کا ذکر کیا ہے۔ بلکہ میرے صحیفے میں سب سے زیادہ ذکر حکومت ہی کا ہے۔ کیونکہ میرے اکثر محرّر بادشاہوں کے ملازم تھے۔

چونکہ حکومت پسندی انسانوں کی فطرت میں داخل ہے اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ مبادا میرا یہ پہلو میرے دیگر پہلوؤں کو مغلوب کر دے۔ اور انسان مجھے پڑھ کر جنگجو ہو جائے۔ یہ محض اندیشہ ہی نہیں بلکہ بہت حد تک حقیقت بھی ہے۔ آئے دن کی جنگیں اس کا ثبوت ہیں۔ جنگجو قوموں کی نظر میں مَیں جنگ کی ہی تلقین کرتی ہوں حالانکہ میں جنگ کی بربادیوں کا سماں بھی دکھاتی ہوں۔ چنانچہ جرمن قوم نے مجھ سے صرف جنگ کا سبق سیکھا۔ کیونکہ یہ قوم فطرتاً جنگجو ہے۔ جنگجو قوم بڑی عمل پسند ہوتی ہے۔ محض نظریوں سے ایسی قوم کی تسلّی نہیں ہوتی۔ جرمنوں کا مشہور ترین شاعر گوئٹے جو بظاہر اہلِ قلم تھا کہتا ہے کہ

"مجھے ہر اس علم سے نفرت ہے جس سے مجھ میں قوت عمل نہ پیدا ہو"

کیا میں محض باتونی ہوں اور عمل کی تلقین نہیں کرتی۔ میرا مقصد تو تلقین عمل ہے اور اسی لئے عبرت آموزی کا کام میں نے اپنے سر لیا لیکن جنگجو قوموں کو میں محض باتونی نظر آتی ہوں۔ یہ میرا قصور ہے یا ان کی نظر کا؟ جرمن قوم کی نظر میں میں بالکل بیکار ہوں۔ اگر میں ان میں "زندگی" نہ پیدا کر سکوں۔ لیکن زندگی کے کیا معنی ہیں؟ انبیاء اور اولیا کی نظر میں زندگی کے معنی خدمتِ خلق ہیں۔ فلسفی کی نظر میں زندگی "فرصت خیال" کی متقاضی ہے۔ یہ فلسفی اپنے خیال ہی سے انسانی فطرت کے تقاضائے جنگ کو پورا کر لیتے ہیں۔ اور زورِ خیال سے خلوت کو جلوت میں بدل

دیتے ہیں۔ بقول شاعر ؎

ہے آدمی بجائے خود ایک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

مگر جرمن قوم کی نظر میں جلوت صرف وہ ہے جس میں تلوار کی جھنکار سنائی دے۔ محض عالمِ خیال سے اس قوم کی تسلّی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہ قوم میرے صحیفوں میں صرف جنگ کی کہانیوں کو پسند کرتی ہے اور ان سے اُلٹے سیدھے نتیجے نکالتی ہے۔

جرمن قوم کو یقین کامل ہے کہ میرا مقصدِ حیات صرف تلقین جنگ ہے۔ اس قوم کی نظر میں انسان جانوروں سے محض اس لئے افضل ہے کہ انسان کو گذشتہ ایام کی باتیں یاد رہتی ہیں اور جانور اس سعادت سے محروم ہیں۔ لیکن میں جو گذشتہ ایام کا ذکر کرتی ہوں اس ذکر میں امن و صلح کی بھی تلقین ہوتی ہے۔ جنگ کے بُرے نتائج سے بھی میں انسان کو آگاہ کرتی ہوں۔ لیکن جرمن لوگ اپنے تقاضئہ فطرت کے بموجب صرف جنگی داستانوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ مشہور جرمن فلسفی نیطشہ کہتا ہے :۔ (حوالہ نمبر ۱)

"ہمیں یقیناً تاریخ کی ضرورت ہے لیکن اس ضرورت کا تصور وہ نہیں ہے جو عام خیال کے شیداؤں کے دماغ میں ہے ..... ہمیں تاریخ کی ضرورت صرف زندگی اور عمل کی خاطر ہے۔ اس لئے نہیں کہ ہم تاریخ کی آڑ لے کر زندگی اور عمل کے تقاضوں سے بے خبر ہو جائیں اور خود غرضی اور بُزدلی کی زندگی بسر کریں ہم تاریخ کا احترام صرف اسی حد تک کرینگے جس حد تک وہ انسانی زندگی کا احترام کرتی ہے ... ہم تاریخ کی خدمت اسی حد تک کرینگے جس حد تک وہ انسانی زندگی کی خدمت کرتی ہے۔ اس سے زیادہ احترام کرنا انسانی زندگی کی توہین کرنی ہے"

بالفاظ دیگر نیطشہ کی نظر میں میں اسی حد تک محترم ہوں جس حد تک

میں جرمن قوم کی خدمت کر کے اس کو بام عروج پر پہنچاؤں۔ یعنی میں قوموں کے لئے حصول حکومت کا محض آلہ ہوں۔ لیکن یہ فلسفی اپنے دیگر ہم قوموں کی طرح یہ بھول گیا کہ میری عدالت میں سب قومیں فیصلے کے لئے پیش ہوتی ہیں۔ میں ہی قوموں کی نیک نیتی اور بد نیتی کا فیصلہ کرتی ہوں۔ قومیں تو مٹ جاتی ہیں لیکن میرا فیصلہ نہیں مٹتا۔ اس لئے میں جرمن قوم کو تنبیہ کرتی ہوں کہ وہ صرف اپنے روشن زمانے ہی کو نہ دیکھے بلکہ اپنی ناکامیوں کا بھی اعتراف کرے کہ کس طرح اس قوم نے دو مرتبہ دنیا کو مصیبت میں مبتلا کیا اور اس کے باوجود یہ قوم اپنے مقصد میں ناکام رہی۔

(حوالہ نمبر ۲) لیکن کیا یہ قوم میری وصیت پر عمل کرے گی؟ انہیں کا ایک فلسفی ہیگل میرے متعلق کہہ چکا ہے کہ میں کُل ایک بات بتاتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں بالکل بیکار شے ہوں کیونکہ مجھ سے کوئی قوم یا فرد کوئی سبق نہیں سیکھتا۔ ایک حد تک ہیگل کا یہ کہنا صحیح ہے کیونکہ باوجود میرے سینکڑوں عبرت آموز صحیفوں کے دنیا کی "وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی وہ اب بھی ہے"۔

لیکن مجھے شک ہے کہ جرمن اور دیگر قومیں میری اس وصیت پر عمل کریں گی۔ اگر میری اس تلقین پر قومیں عمل کریں تو دنیا جنگوں سے بری رہتی۔

دنیا میں جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں ان کا سب سے بڑا سبب ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ وہ سبب ہوس حکومت ہے۔ یہ ہوس علاوہ قوموں کے افراد میں بھی ہوتی ہے۔ میرا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ افراد ہی یہ ہوس اپنی قوم میں بھی پیدا کرتے ہیں۔ اور پوری قوم اپنے فائدہ کی ہوس کو

اپنا لیتی ہے۔

ہر فرد یا ہر قوم اپنی نظر کے مطابق میرے صحیفوں کو پڑھتی ہے اور ان سے اپنی فطرت کے مطابق نتیجے نکالتی ہے۔ بے چین اور زندہ قومیں مجھ سے جد و جہد کا سبق سیکھتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس انحطاط پذیر قومیں مجھ سے "قناعت" کا سبق سیکھتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس یہ انحطاط پذیر قومیں اپنی کاہلی کا جواز حاصل کرتی ہیں اور کاہل سے کاہل تر ہو جاتی ہیں۔

قبل از اسلام عربوں نے میری پرستش کے تحت اپنی لغت میں لفظ "بدعت" قائم کیا۔ اس بدعت سے خائف ہو کر ابو جہل نے اسلام کو "بدعت" قرار دیا۔ کیونکہ اسلام بھی ابو جہل کی نظر میں نیا ہونے کی وجہ سے بدعت تھا۔ اس ایک لفظ بدعت نے جتنے روڑے مسلمانوں کی ترقی میں اٹکائے ہیں۔ ایسے کسی لفظ نے نہ اٹکائے۔ ظہورِ اسلام کے بعد کاش عرب اس لفظ کو اپنی لغت سے خارج کر دیتے!

تاریخ افیون کا کام بھی کرتی ہے

جو قومیں ایک مرتبہ بامِ عروج پر پہنچ کر گر جاتی ہیں وہ مجھ سے افیون کا کام لیتی ہیں اپنے شاندار ماضی کا حال میرے صحیفے میں پڑھ کر وہ اپنے مستقبل سے بے خبر ہو جاتی ہیں "پدرم سلطان بود" کہہ کر اپنے دل کو تسلی دیتی ہیں۔ بیشک میں گری ہوئی قوموں میں جان ڈالنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اپنے ماضی کے کارنامے میرے صحیفوں میں پڑھ کر ان میں احساس زیاں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ قومیں تو اپنے ماضی کو پوجنے لگتی ہیں۔ اور اسی لئے مستقبل سے بے خبر ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے یہودی قوم سب سے زیادہ

خستہ حال تھی اور اس وقت انگریز بام عروج پر تھے۔ اتفاق سے ایک انگریز اور یہودی کی ایک ہوٹل میں ملاقات ہوئی۔ اور گفتگو شروع ہوئی۔

یہودی: آپ کو معلوم ہے کہ شہر یروشلم کے قریب حال میں کھدائی ہوئی اور بڑے بڑے آہنی ستون برآمد ہوئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم یہودیوں نے تم سے ہزاروں سال پیشتر ٹیلی گراف ایجاد کر لیا تھا۔

انگریز: لندن کے قریب بھی کھدائی ہوئی لیکن کوئی ستون یا کھمبا برآمد نہ ہوا اس سے ثابت ہے کہ ہم نے لاسلکی (وائرلیس) ایجاد کر لیا تھا۔

جس طرح انحطاط پذیر قومیں ماضی کے گانے گا کر اپنا دل بہلاتی ہیں اسی طرح نوآموز قومیں جن کا ماضی کورا ہوتا ہے وہ بھی فرضی عالیشان ماضی پیدا کر لیتی ہیں۔ گذشتہ پانچ سال میں افریقہ میں بکثرت حبشی قوموں کو آزادی ملی ہے۔ ان کو اگر نوآموز کہا جائے تو برا مانتے ہیں ان کے مورخ ان کے لئے ماضی "گڑھ رہے ہیں"۔ ایک نئی حبشی قوم کے ایک "مورخ" نے دعویٰ کیا کہ حضرت عیسیٰ نسلاً حبشی تھے!!! یہ صرف گڑھے مُردے ہی اُکھاڑنا نہیں ہے بلکہ زندوں کو مُردوں کے ہاتھوں دفن کرانا ہے۔ ترقی پذیر قومیں اپنے آپ کو ماضی میں غرق نہیں کرتیں بلکہ ان کی نظر برابر مستقبل پر رہتی ہے۔

جو لوگ میری پرستش کرتے ہیں وہ قدامت پسند ہو جاتے ہیں اور ماضی کی حماقتوں پر بھی فخر کرتے ہیں۔ اسی لئے ہر نبی نے ماضی کو فراموش کرنے کی تلقین کی اور اپنے زمانے سے پہلے زمانے کو "ایامِ جاہلیت" قرار دیا۔ ماضی کو پوجنے کے معنی یہ ہیں کہ حال اور مستقبل کوئی چیز نہیں۔

ماضی پرست قوم کوئی نئی چیز ایجاد نہیں کر سکتی۔ لیکن ترقی پسند قوموں کو ماضی میں عیوب بھی نظر آتے ہیں اور ان عیوب کو دُور کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر جو لوگ ماضی کو پوجتے ہیں ان کو نظر آتا ہے کہ اب بنی نوع انسان ضعیف العمر ہو گیا ہے اور اب بجائے ترقی کے اس کو موت کا انتظار کرنا ہے۔ ڈاکٹر اقبال جیسے دُور بین انسان کو بھی یورپ والوں کی موت قریب نظر آئی۔ انہوں نے اہل یورپ کو مخاطب کر کے کہا :۔

تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

جب کوئی انحطاط پذیر قوم کسی ترقی پذیر قوم کو دیکھتی ہے تو جل کر اُسے کوسنے دیتی ہے اور سمجھتی ہے کہ جس طرح میں تنذ بِ زوال ہوئی اسی طرح یہ ترقی پذیر قوم بھی بہت جلد ختم ہو گی۔

میں اپنی پرستش کے خلاف لوگوں کو اس لئے آگاہ کر رہی ہوں تاکہ یہ لوگ میرے صحیفوں کو پڑھیں تو ماضی کے عیوب کو بھی بغور دیکھیں اور ان عیوب سے عبرت حاصل کر کے ان کو دُور کرنے کی کوشش کریں۔ اسی لئے تقلید کی بجائے ماضی کی تنقید کی تلقین کرتی رہتی ہوں۔ اس سلسلے میں میں خاص طور سے انحطاط پذیر قوموں کو مخاطب کرنا چاہتی ہوں، تاکہ وہ "پدرم سلطان بود" کی عادت کو چھوڑ دیں۔

اُن لوگوں میں جو میری پرستش کا شکار ہوئے ونسٹن چرچل (۱۸۷۴ء تا ۱۹۶۵ء) خاص طور سے ممتاز ہے کیونکہ اس کی پرستش سے اپنے زمانے کا سب سے بڑا سامراج تنذ بِ زوال ہوا۔ اس کی نظر میری پرستش میں اس طرح محو ہو گئی کہ اس نے طے کر دیا کہ مشرق ہمیشہ سکون طلب رہا ہے اور

زمانے کے ساتھ یہ مشرق اپنے آپ کو نہ بدل سکے گا۔ اس لئے یہ ہمیشہ غلامی میں مبتلا رہے گا۔ میری پرستش نے اس کو ایسا ضدی بنادیا کہ اس نے اعلانیہ کہا کہ "میں سامراج برطانیہ کی موت کے موقع پر صدارت کرنے سے انکار کرتا ہوں"۔ اس اعلان میں علاوہ میری پرستش کے پیشین گوئی کا عنصر بھی نظر آتا ہے اس نے زمانۂ ماضی کی سکون طلبیٔ مشرق کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ ماضی کی طرح یہ مشرقی آئندہ بھی سکون طلب رہے گا اور غلامی میں مبتلا رہے گا۔

صرف سامراج برطانیہ ہی میری پرستش کا شکار نہیں ہوا بلکہ ہر قوم جو نذر زوال ہوئی ہے اسی پرستش کا شکار ہوئی ہے۔ ایرانی قوم بھی اسی مغالطے میں رہی کہ عرب ماضی کی طرح ہمیشہ قبائلی جنگوں میں آئندہ بھی گرفتار رہیں گے۔ یہ قوم اپنے ماضی کو لاثانی سمجھتی تھی۔ یعنی میری پرستش میں غرق تھی۔ ہندوؤں میں میرا وجود نوشتہ صورت میں نہ تھا لیکن ان کے ذہن پر میں سوار تھی۔ میری پرستش سے اس قوم کا ذہن کس طرح ماؤف ہوگیا تھا۔ اس کا ذکر البیرونی نے اپنی "کتاب الہند" میں تفصیل سے کیا ہے۔ اس کتاب میں وہ کہتا ہے :- (حوالہ نمبر ۱۳)

"ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ان کا سا ملک، ان کی سی قوم، ان کے سے راجہ، ان کا سا مذہب، ان کے سے علوم دنیا میں کہیں نہیں"

میری پرستش سے انسان پیشین گوئی بھی ہندوؤں اور چرچل کی طرح کرنے لگتا ہے جس سے بالآخر پیشین گو اور اس کی قوم کو نقصان پہنچتا ہے۔ چنانچہ میں اب ایسے مورخوں کی مذمت شروع کرتی ہوں جنہوں نے میرے نام سے پیشین گوئیاں کر کے مجھے بدنام کیا۔

مورخ پیشین گوئی سے گریز کرے

میرے سب سے بڑے دشمن وہ مورخ ہیں جو میرے نام سے پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ پیشین گوئی کرنے کے دو طریقے ہیں:۔

(۱) صاف لفظوں میں غیب کا حال بتانا۔ مثلاً یہ کہنا کہ اب یورپ کا دور ختم ہو چکا اور اب امریکہ یا روس کی باری ہے۔

(۲) بعض مورخ پیشین گوئی صاف صاف نہیں کرتے بلکہ چند شرائط کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور بجائے آئندہ کا حال بتانے کے ماضی کا حال بتاتے ہیں اس طرح کی پیشین گوئی میں وہ لفظ " اگر" لگاتے ہیں۔ معرکۂ تورس جو ۷۳۲ء میں عربوں اور فرانس کے نواب چارلس مارٹیل کے درمیان ہوا اور جس میں عرب ہارے۔ اس معرکے کے متعلق مغربی مورخین کہتے ہیں کہ "اگر" عرب جیت جاتے تو پورے یورپ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جاتا اور مذہب عیسوی "ہمیشہ" کے لئے مغلوب ہو جاتا۔ اسی طرح محاصرۂ وائنا واقع ۱۵۲۹ء کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر عثمانی ترک وائنا پر قبضہ کر لیتے تو پورا یورپ ترکوں کے ہاتھ آ جاتا۔ اس قسم کے "اگر" سراسر گمراہ کن ہوتے ہیں اور لوگوں کو مغالطے میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کی غیب دانی ہے۔ گویا ان مورخوں کو معلوم ہے کہ اگر عرب معرکۂ تورس میں جیت جاتے تو ان کو اور کوئی طاقت نہ روک سکتی۔ اس قسم کے پیشین گو مورخ بھول جاتے ہیں کہ میرے ترکش میں ایک نہیں بلکہ بہت سے قسم کے تیر ہیں جو میں حسب موقع چلاتی ہوں۔

لیکن ان پیشین گو مورخوں کی مذمت کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ میں چند ایسے دُور بین مورخوں کا بھی ذکر کروں جن کی پیشین گوئیاں درست

اور سچی ثابت ہوئیں۔ ان کے نام اور ان کی پیشین گوئیاں درج ذیل ہیں۔

(۱) مؤرخ توقویل (۱۸۰۵ء تا ۱۸۵۹ء)

اس مؤرخ نے ۱۸۳۵ء میں اپنی مشہور کتاب "جمہوریت امریکہ میں" ۱۸۳۵ء میں شائع کی جس میں اس نے یہ پیشین گوئی کی :۔ (حوالہ نمبر ۲)

"اس وقت دو بڑی قومیں ہیں جن کی منزل مقصود ایک نظر آتی ہے حالانکہ انہوں نے سفر مختلف مقامات سے شروع کیا۔ میری مراد روسیوں اور امریکیوں سے ہے ۔ دونوں قومیں بغیر اعلان و اظہار سن شعور کو پہنچیں۔ دنیا کی توجہ اور جانب تھی کہ یکایک انہوں نے اقوام عالم میں اپنے لئے اعلیٰ جگہ حاصل کر لی ۔ ان قوموں کی ہستی اور عظمت کا پتہ دنیا کو بیک وقت چلا .... باقی قومیں تو اپنے قدرتی منزلوں پر پہنچ چکی ہیں .... لیکن یہ قومیں بڑھ رہی ہیں"۔

اس پیشین گوئی کی تصدیق موجودہ دور کھلم کھلا کر رہا ہے اور آج بھی دونوں قومیں دنیا پر قابض ہونے کے لئے آپس میں برسرپیکار ہیں۔ گویا انھیں دو قوموں کے ہاتھ میں میری قلم ہے جس سے وہ جو چاہیں لکھیں۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں میرے ترکش میں عجیب عجیب قسم کے تیر رہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں ایک تیسری قوم کو ان کے مقابلے میں کھڑا کر دوں جس کو کل تک اہل مغرب "افیونی" سمجھتے رہے لیکن آج اس پر اشتراکیت کا نیا نشہ سوار ہے۔ جس سے اس کی رگوں میں نیا خون دوڑ رہا ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں پیشین گوئی

کے سخت خلاف ہوں۔ یہاں میری مراد چین سے ہے جس نے ایٹم بم بھی اب بنا لیا ہے۔

(۲) مؤرخ برک ہارٹ (۱۸۱۸ء تا ۱۸۷۰ء)

یہ مؤرخ سوئٹزرلینڈ کا باشندہ تھا۔ اس کی دُوربین آنکھوں نے ۱۸۷۰ء ہی میں اشتراکیت کا آئندہ عروج دیکھ لیا کیونکہ اس نے اسی سال لکھا:۔

"لوگ بجائے تہذیب کے زندہ رہنے کو ترجیح دیں گے۔ حکومت تہذیب پر بھی ہاتھ مارے گی اور اس تہذیب کو اپنے مذاق کے مطابق نیا جامہ پہنائے گی۔ تہذیب خود حکومت کی دست نگر ہو کر اپنی رہبری کے لئے حکومت سے اشارے طلب کرے گی.... صرف وہی چیزیں باقی رہیں گی جو کارآمد ہیں۔ فنون لطیفہ کا خاتمہ ہو جائے گا.... حکومت کی اپنی صورت اس طرح بدل جائے گی کہ دوسرے خیالات کے لوگ اس کو پہچان نہ سکیں گے۔ مجھے تو یہ نظر آ رہا ہے کہ .... حکومت صنعت گر بھی بن جائے گی...."

(۳) نیطشہ (۱۸۴۴ء تا ۱۹۰۰ء)

اس مجذوب جرمن کے زمانے میں مشین کا راج شروع ہو چکا تھا اور زندگی کا دارومدار مشینوں پر ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے نکلا "خدا فوت ہو گیا" اور ساتھ ہی اس نے لکھا کہ ہماری یورپین تہذیب جس راستے

پر چل رہی ہے اس کا انجام بربادی ہے۔ دریا کی طرح اس تہذیب کو پتہ نہیں کہ وہ کہاں جارہی ہے۔ آخری ایام میں یہ دنیا بوجہ کثرت آبادی چھوٹی ہو کر رہ جائے گی۔ لوگوں کی عمریں بڑھ جائیں گی۔ انسان حشرات الارض کی طرح ہر طرف نظر آئے گا۔ (حوالہ نمبر ۵)

مندرجہ بالا پیشین گوئیاں گو ایک حد تک درست ثابت ہوئیں لیکن یہ پیشین گو برابر ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ پرانے زمانے میں پیشین گوئیاں فال کی بنا پر کی جاتی تھیں۔ لیکن اب عقل کا دور ہے اس لئے اس زمانے میں فلسفی اس قسم کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ ان فلسفی پیشین گو کی یہ چال ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ جب آئندہ زمانہ آئے گا تو ان کو کوئی جھوٹا نہیں کہہ سکے گا۔ کیونکہ وہ خود مر چکے ہوں گے۔ لیکن میرے صحیفوں میں تو ان کا بطلان ضرور درج ہو گا۔

آج بھی جرمنی میں ایک فلسفی کارل جیس پر (ولادت ۱۸۸۳ء) نامی موجود ہے جو اس قسم کی مایوسانہ پیشین گوئیاں کر رہا ہے۔ اس نے میری ابتدا اور انتہا پر ایک کتاب لکھ ماری۔ میں عام طور سے فلسفیوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ لیکن جب یہ لوگ میرے نام پر مستقبل کے متعلق پیشین گوئیاں کرتے ہیں جو محض قیاس پر مبنی ہوتی ہیں تو مجھے ان کا بطلان کرنا پڑتا ہے کارل جیس پر لکھتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ٦)

"اگر عالمگیر واحد حکومت دنیا میں قائم ہو گئی تو وحشیوں کی طرف سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہے گا۔ اس وقت جو خطرہ ہو گا وہ فطرت کی طرف سے ہو گا۔ فطرت کے مہیا کردہ سامان محدود ہیں۔ اس لئے آئندہ مشکلات۔ اگر کوئلہ کا خرچ اسی

طرح جاری رہا تو ایک ہزار سال میں یہ ختم ہو جائے گا۔ مٹی کا
تیل اس سے بھی جلد ختم ہو گا۔ لوہا دو سو سال میں ختم ہو گا۔
... یورینیم دھات جو ایٹمی قوت کا ذریعہ ہے کب تک چلے گی
اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے.....“

یہ پیشین گو خواہ مورخ ہوں یا فلسفی اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ خدا کی ترکش میں میرے ترکش سے بھی زیادہ تیر ہیں۔ انہیں تیروں کی وجہ سے انسان ابھی تک قائم ہے۔ اگر ایک چیز ختم ہوتی ہے تو انسان اپنی خداداد عقل سے دوسری چیز مہیّا کر لیتا ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس جنگوں کی پرانی ترکیب موجود ہے۔ کثرت آبادی کا مسئلہ طے کرنے کے لئے صرف ایک جنگ کافی ہے کیونکہ اب جو جنگ ہو گی وہ عالمگیر ہی ہو گی۔

گو لوقویل۔ برگ ہارٹ اور نیطشہ کی پیشین گوئیاں ایک حد تک صحیح ثابت ہوئیں۔ لیکن اس سے یہ کلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا کہ ہر مورخ کی ہر پیشین گوئی صحیح ثابت ہوتی ہے۔ مورخ کی جو پیشین گوئی صحیح ثابت ہوتی ہے اس کو تو لوگ یاد رکھتے ہیں اور پیش کرتے ہیں لیکن جو پیشین گوئی غلط نکلتی ہے اس کا ذکر لوگ نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں سکندر کے متعلق ایک افسانہ اس طرح مشہور ہے کہ جب وہ فتح مشرق کے لئے روانہ ہوا تو راستے میں وہ ایک مشہور مندر کے پاس سے گذرا جس کے پجاری اس کے پاس آئے اور سکندر کو مندر میں آنے کی دعوت دی اور اس کو بتایا کہ ہمارے مندر میں ایسے بہت سے فاتحین کی تصویریں ہیں جنہوں نے ہمارے مندر میں فال نکلوائی اور وہ فتوحات میں کامیاب رہے۔ اس پر سکندر نے ان پجاریوں سے پوچھا کہ تمہارے مندر میں ایسے فاتحین کی

تصویریں بھی ہیں جن کے حق میں فال تو نکلی مگر ناکام رہے۔ اس سوال کا جواب یہ پجاری نہ دے سکے۔ اور اپنا سا منہ لے کر واپس چلے گئے۔

بجنسہٖ یہی حال ان مورخوں کا ہے جن کی دس پیشین گوئیوں میں سے صرف ایک دو صحیح نکلتی ہیں لیکن ایسی پیشین گوئیاں تو کراچی کی سڑکوں پر بیٹھے ہوئے نجومی بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس قسم کے پیشین گو مورخ اس زمانے میں دو خاص طور پر مشہور ہیں یعنی پروفیسر ٹوئن بی اور اسپینگلر جن کا ذکر میں نے ایک علیحدہ باب کے تحت کیا ہے۔

تاریخ تاریخ ہے شاعری نہیں

جیسا کہ میں بتا چکی ہوں مورخ پر لالچ سوار ہوتا ہے کہ اس کی نوشتہ تاریخ عوام میں مقبول ہو۔ لیکن عوام اور خصوصاً مشرق کے عوام کا مذاق طبیعت شاعری اور عبارت آرائی کا دلدادہ ہے۔ یہ لوگ "رنگین" تاریخ کو پسند کرتے ہیں۔ ان کو خالص تاریخ میں زہد خشک نظر آتا ہے۔ مشرق میں رنگین تاریخوں کا دستور بہت پرانا ہے۔ جو لوگ فارسی زبان میں تاریخیں لکھتے تھے۔ وہ خاص طور سے موردِ الزام ہیں۔ میں عطا ملک جوینی کی "تاریخ جہاں کشا" کا ذکر مسلمانوں کی تاریخ نگاری کے ضمن میں کر چکی ہوں۔ یہ فارسی مورخ جب عثمانی ترکوں میں پہنچے تو وہاں بھی انہوں نے یہ حرکت شروع کی جس سے ترک مورخ بھی متاثر ہوئے۔ سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ (۱۴۵۱ء تا ۱۴۸۱ء) کے زمانے میں ۱۴۵۶ء میں ایک فارسی شاعر کاشفی نامی نے "غزو نامہ روم" کے نام سے ایک منظوم تاریخ لکھی۔ منظوم تاریخوں کا سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ مورخ کو واقعات سے زیادہ ردیف و قافیہ کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ (حوالہ نمبر ۷)

اٹھارہویں صدی عیسوی میں مغربی مورخ بھی اسی خواہش مقبولیت کا شکار ہوئے۔ ایڈورڈ گبن (۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۴ء) نے زوال رومتہ الکبریٰ پر چھ جلدیں لکھیں جو آج تک مقبول ہیں۔ اس میں بیشتر طرز تحریر پر زور ہے واقعات پر نہیں۔ اس کے علاوہ اس قسم کی تاریخوں میں مورخ اپنے زمانے کے لوگوں کو مخاطب کرتا ہے۔ گو مورخین ہمیشہ سے یہ دعویٰ کرتے رہے کہ وہ اپنی تاریخیں متاخرین کے لئے لکھتے ہیں۔ چونکہ ہر زمانے کے لوگوں کا مذاقِ طبیعت مختلف ہوتا ہے اس لئے میری صورتیں بھی بدلتی رہتی ہیں لیکن یہ بہروپیہ پن مجھے پسند نہیں۔ اسی لئے میں ان مسلمان مورخوں کی مداح ہوں جنہوں نے روزنامچہ کے طرز پر تاریخیں لکھیں۔ اس طرز کو طبری نے تکمیل پر پہنچایا۔ اسی لئے اس کی تاریخ آج تک معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے میں اپنے محرّروں کو وصیت کرتی ہوں کہ وہ تاریخ کو ادب نہ بنائیں اور شاعری سے گریز کریں۔

مؤرخ کو رنگ روپ اور نسلی امتیاز پر زور نہ دینا چاہیئے

میں تسلیم کرتی ہوں کہ انسانی طبیعت میں مقابلہ کا مادّہ کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے اور وہ بغیر مقابلے کے نہیں رہ سکتا۔ لڑائیوں کا اصل سبب بھی خواہش مقابلہ ہے۔ اس مقابلے کی ابتدا سگے بھائیوں کے مقابلے سے ہوئی۔ پھر قبیلے اس مقابلے کا شکار ہوئے۔ جب انسان میں قومیت نمودار ہوئی تو رنگ روپ کا عنصر بھی آیا۔ اور کالے گوروں کے درمیان لڑائیاں شروع ہوئیں۔ گو مقابلے کی ابتدا "آدم علیہ السلام" کے تقاضوں سے ہوتی ہے لیکن اس کو فوراً امتیازِ رنگ روپ بھی ہوا دینے لگتا ہے۔

میرے جس نالائق اور بدبخت محرّر نے امتیازِ رنگ روپ کو سبب جنگ قرار دیا وہ یونانی ہرودوتس ہے جس نے پانچویں صدی قبل مسیح میں اپنی گمراہ کن تاریخ لکھی۔ اس زمانے میں ایرانی کسریٰ یونان کی چھوٹی چھوٹی شہری حکومتوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ ان حملوں کا مقصد سراسر حصولِ ملک ہوتا تھا۔ لیکن اس گپی ہرودوتس نے ان حملوں کو تصادمِ مشرق و مغرب قرار دیا۔ اس وقت تمام مغرب بجز یونان کے دورِ وحشت میں مبتلا تھا۔ اور مشرق مہذب اور متمدن ہو چکا تھا۔ جب مغرب کو صدیوں بعد ہوش آیا اور اہلِ مغرب نے ہرودوتس کی نوشتہ تاریخ کو پڑھا اور ان کو معلوم ہوا کہ مشرق مغرب سے اعلیٰ و افضل ہے۔ تو ان شکست خوردہ مغربیوں کے دماغ پر احساسِ کمتری سوار ہوا اور ایسا سوار ہوا کہ انہوں نے سکندر کے مشرق پر حملوں کو "انتقامی جنگ" قرار دیا۔ حالانکہ سکندر کی نیت محض حصولِ حکومت تھی۔ بعد فتح ایران سکندر کو مشرق کا تمدن اعلیٰ اور افضل نظر آیا اور وہ مشرق کا مرید ہو گیا۔ مشرقی لباس اختیار کیا جس پر اس کی یونانی فوج اس سے منحرف ہو گئی۔ کیونکہ یہ یونانی اس مغالطے کے شکار تھے کہ مشرق مغرب سے حقیر ہے۔ جب انہوں نے اصل حقیقت دیکھی تو بجائے قائل ہونے کے وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو گئے۔ (حوالہ نمبر ۸)

جب صدیوں بعد مسلمان اندلس اور قسطنطنیہ اور بعد کو مشرقی یورپ پر قابض ہوئے تو اہلِ مغرب نے مسلمانوں کی جنگوں کو "انتقامی جنگ" قرار دیا۔ اب ان کا احساسِ کمتری اور بڑھا۔ سترھویں صدی عیسوی کے بعد جب مغرب مشرق پر مسلط ہوا تو ان اہلِ مغرب نے اس تسلط

کو بھی "انتقام" قرار دیا۔ حالانکہ مغربیوں کی آوارہ گردی محض پیٹ کی خاطر تھی۔ الغرض مغربی مورخوں نے ان پیٹ کی خاطر جنگوں کو تصادم مشرق و مغرب قرار دیا اور "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا"۔ یہ سب تاویل بازی کی خرابیاں ہیں۔ مسلمانوں کی نوشتہ تاریخیں تو یہ بتاتی ہیں کہ مسلمانوں کا مقصد یا تو اشاعت اسلام تھا یا خالص ملک گیری۔ مشرق و مغرب کے تصادم کا تصور ان کے ذہن میں نہ تھا۔ یہ تصور تصادم مشرق و مغرب خالص مغربی ذہن کی پیداوار ہے۔

باوجود دو عالمگیر جنگوں کے اہل مغرب کی آنکھیں ابھی تک نہیں کھلیں دور حاضر میں جو تصادم اشتراکیت اور سرمایہ داری میں ہو رہا ہے اس تصادم کو بھی اہل مغرب اور خصوصاً امریکی تصادم مشرق و مغرب ہی سمجھتے ہیں اور اپنے اس لغو دعوے کے ثبوت میں کارل مارکس کو یہودی یعنی مشرقی کہتے ہیں۔

اس تصادم مشرق و مغرب کے لغو مفروضے سے مجھے اندیشہ ہے کہیں تیسری جنگ نہ شروع ہو جائے۔ اور حضرت انسان کی ہستی معدوم ہو جائے۔ اگر انسان مٹ گیا تو میرا خاتمہ بھی لازمی ہے۔ کیونکہ میں تو فطرت کے ساتھ نہیں بلکہ انسان کے ساتھ وابستہ ہوں۔ اور رہی ہوں۔ اس لئے انسان کا اپنا مفاد اور میرا مفاد دونوں مقتضی ہیں کہ تیسری جنگ نہ ہو۔ اس کے انسداد کے لئے ضروری ہے کہ تصادم مشرق و مغرب کے تصور کا خاتمہ کر دیا جائے۔ کیونکہ تیسری جنگ مشرق و مغرب ہی کے درمیان ہوگی۔ روس تو اپنی سفید چمڑی کی بنا پر مغرب سے مل گیا ہے۔ اب اشتراکیت کا اصل حامی چین ہے جو خالص مشرقی قوم ہے۔ لہذا میں اپنے محرروں کو وصیت کرتی ہوں کہ اب وہ رنگ روپ کے مطابق میری تاویلیں کریں۔

بلکہ جو اصلیت ہوں وہ تراشیں۔ وہ اصلیت تقاضائے شکم ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے تصادم کا باعث بھی یہی شکم ہے۔ مشرقیت یا مغربیت نہیں۔

اس قسم کی لغو تاویلیں اس لیئے کی جاتی ہیں کہ عام طور پر مورخ علم معیشت نہیں جانتے۔ ابن خلدون پہلا فلسفیٔ تاریخ ہے جس نے معاش کو تاریخ کا جزو اعظم قرار دیا۔ لیکن ساتھ ہی میرے اس خلف الرشید نے میری واقعات سے جو نتائج اخذ کیئے وہ حکمت و عبرت سے پُر ہیں۔ اس نے تمام عالم پر نظر دوڑائی ہر قوم کی خوبیاں اور خامیاں ڈھونڈ نکالیں۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی قوم عرب کو بھی نہ چھوڑا اور اس قوم کو برباد کن ٹھہرایا۔

ابن خلدون نے جس مقصد سے اپنا "مقدمہ" لکھا وہ مقصد عبرت آموزی تھا۔ اس نے کسی قوم کی طرفداری نہیں کی کیونکہ وہ امن و صلح کا حامی تھا۔ رنگ و روپ کا امتیاز اس کے خلاف مزاج تھا۔ وہ بجائے قوموں کے انسانیت کا علمبردار تھا۔ گو اس کو مجھ میں فلسفہ نظر آیا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھ دیا کہ فلسفہ سے اس کی مراد عبرت و حکمت ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی تاریخ کا نام جس کا یہ "مقدمہ" تمہید ہے "کتاب العبار" رکھا یعنی وہ کتاب جو عبرت سکھاتی ہے۔ برخلاف اس کے دَورِ قوم پرستی کی نوشتہ تاریخیں جنگ و جدال کی تلقین کرتی ہیں۔

تقدیر و تدبیر کے معاملے میں میری وصیت

میں تقدیر کی پابند ہوں یا تدبیر کی؟ یہ سوال مجھ سے ہزاروں برس سے پوچھا جا رہا ہے۔ میں نے گذشتہ باب دوئم و سوم میں تقدیر و تدبیر کا ذکر ضمناً کیا ہے۔ میں نے اب تک اس معاملے میں کوئی اپنا قطعی فیصلہ دانستہ پیش نہیں کیا کیونکہ یہ مسئلہ بڑا ٹیڑھا اور قدیم ہے اور اس کا جواب تفصیل طلب ہے

اب میں یہ تفصیل پیش کرتی ہوں۔

تقدیر و تدبیر کا تنازعہ اس وقت شروع ہوا جب استاد افلاطون اور شاگرد ارسطو کے درمیان خدا اور اس کے افعال کے متعلق اختلاف پیدا ہوا افلاطون یہ کہتا تھا کہ خدا اپنی مخلوق کی ہر قسم کی نگہبانی کرتا ہے حتیٰ کہ چیونٹی تک تک کی زندگی اور احتیاج پر نظر رکھتا ہے۔ جو راستہ خدا کو ٹھیک معلوم ہوتا ہے اس پر وہ اپنی مخلوق کو چلاتا ہے۔ لوگوں نے خدا کے اس مقررہ راستے کا نام تقدیر رکھ دیا یعنی اگر کوئی ذی روح اس راستہ کو خطرناک سمجھ کر ہٹنا چاہے تو نہیں ہٹ سکتا۔ اسی لئے یہ محاورہ رائج ہوا کہ "تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا"۔ اس کے برعکس ارسطو کا یہ نظریہ تھا کہ خدا نے بعد تخلیق کائنات اس کائنات کو چلانے کے لئے چند قوانین وضع کئے اور اپنی مخلوق کو ان قوانین کے حوالے کر کے اپنا پیچھا چھڑایا اور خود گوشہ نشین ہو گیا۔

ذی روح کے علاوہ غیر ذی روح چیزوں کو بھی اپنی اپنی علیحدہ "فطرت" عطا کی۔ مثلاً آگ کے سپرد جلانے کا کام کیا۔ اگر کوئی انسان اپنی انگلی آگ میں دے گا تو انگلی ضرور جلے گی۔ خدا اس میں کوئی دخل نہ دے گا۔ کیونکہ خدا نے انسان کی فطرت میں عقل شامل کر دی۔ جو اس کو بتاتی ہے کہ آگ میں انگلی نہ دو۔ لیکن اس کے باوجود لوگ آگ میں انگلی دیتے ہیں باوجود لڑائیوں کی بربادی کا حال جاننے کے قومیں آپس میں لڑتی ہیں۔ یعنی دانستہ آگ میں کودتی ہیں۔ قائلین تقدیر ایسی دانستہ بداعمالی کو تقدیر پر محمول کرتے ہیں۔ کیونکہ عقل ایسی دانستہ بداعمالیوں کی وجہ نہیں بتا سکتی لیکن قائلین تقدیر اس کی وجہ یہ بتلاتے ہیں کہ خدا نے خیر کے ساتھ شر کو بھی شیطان کی شکل میں پیدا کیا۔

عقل انسان کو خیر کی طرف کھینچتی ہے۔ شیطان اس کو شر کی طرف بلاتا ہے۔ اکثر لوگ شیطان کی دعوت قبول کر لیتے ہیں۔ کیا یہ قبولِ دعوت ان کی کم عقلی کی دلیل ہے۔ اگر ہے تو ان کی کم عقلی کی وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب قائلینِ تقدیر یہ دیتے ہیں کہ ایسے شخص کی تقدیر میں کم عقلی لکھی ہے۔

یہ واضح رہے کہ سینکڑوں اہلِ دماغ بھی تقدیر کے قائل رہے ہیں۔ قائلین کی فہرست میں بیشتر نام اہلِ مشرق کے ہیں۔ لیکن بعض مغربی مفکر بھی تقدیر کے قائل تھے۔ جن میں شکسپیئر بھی شامل ہے۔ یہ مشہورِ عالم ڈرامہ نویس ایک جگہ کہتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۹)

"اے کاش میں نوشتۂ تقدیر پڑھ سکتا"

مسلمانوں کے دور میں تقدیر و تدبیر کے مسئلہ نے ایسا زور پکڑا کہ اہل اسلام دو فرقوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک طبقہ جو تدبیر کے حق میں تھا وہ "اختیاری" کہلاتا تھا دوسرا "جبری" مولانا روم نے برابر جبریوں کی مذمت کی۔ اور اختیار یعنی تدبیر کے قائل رہے۔ احادیث جبر و اختیار دونوں کی تائید کرتی ہیں۔ اس لئے جبری اور اختیاری دونوں احادیث پیش کرتے ہیں۔ اور انسان مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ یونانی تو سراسر تقدیر کے قائل تھے۔ ان کے سب ڈرامے تقدیر کی تائید کرتے ہیں۔ مشہور یونانی ڈرامہ نویس ایسکائیلس نامی اپنے ایک ڈرامہ میں کہتا ہے:۔ (حوالہ نمبر ۱۰)

"ہر چیز اپنی جگہ پر نوشتۂ تقدیر کے مطابق ہے اور نوشتۂ تقدیر ضرور پورا ہو گا"

گو افراد سے بھی میرا تعلق ہے لیکن میرا اصل موضوع ملک یا قوم ہے قوموں کی تقدیر و تدبیر کے معاملے میں میرے بیشتر فلسفی اپنی قوم پر

اپنے زمانے میں یا بعد کو اثر انداز ہوئے۔ اس لئے قومیں بھی ان کے فلسفوں سے متاثر ہوئیں۔

گو بظاہر سائنس انسانی عقل کی پیداوار ہے۔ لیکن یہی سائنس تقدیر کی بھی حمایت کرتی ہے۔ مثلاً ہر شے کی نوعیت اس کی مقرّر کردہ "تقدیر" کے مطابق ہے۔ آگ کی قسمت میں جلانا لکھا ہے۔ آتش فشاں پہاڑ کی قسمت میں پھٹنا اور زلزلے پیدا کرنا لکھا ہے۔ حامیانِ تقدیر اپنی تائید میں سائنس اور سائنس کی ہر شے کے نوشتہ فرائض پیش کرتے ہیں لیکن حامیانِ تقدیر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے صاحب عقل و تدبیر بھی ہے۔ اور اس کو کامل اختیار ہے کہ وہ انگلی آگ میں نہ ڈالے۔ انسان کے صاحبِ اختیار ہونے کے قائل تو عہد قدیم کے لوگ بھی تھے۔ اس دورِ قدیم سے ایک روایت ہم تک پہنچی ہے جو آتشِ نمرود سے منسوب ہے کہ کس طرح نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا۔ لیکن آگ ان کو نہ جلا سکی۔ لیکن اس روایت کو حامیانِ تقدیر بھی اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اور ثابت کرتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی تقدیر میں جلنا نہ لکھا تھا اس لئے آگ بھی بے بس رہی۔

اسی طرح قوموں کا دانستہ لڑائی کی آگ میں کودنے کا سوال ہے یہ معاملہ افراد کا نہیں بلکہ ملکوں اور قوموں کا ہے۔ اس لئے یہ سوال مجھ سے پوچھا جا سکتا اور میں اس سوال کا جواب دینے سے گریز نہیں کر سکتی۔ اس سوال کا جواب میری طرف سے یہ ہے کہ قومیں اپنے اپنے فلسفیانِ تاریخ سے متاثر ہو کر لڑائی کی آگ میں کودتی ہیں۔ جرمن قوم دو مرتبہ لڑائی کی آگ میں کودی۔ کیونکہ ان کے مشہور فلسفیٔ تاریخ ہیگل اور نیطشہ تقدیر کے

قائل تھے۔ یہ دونوں فلسفی تقدیر کی حمایت میں قوانینِ فطرت کو پیش کرتے تھے۔ اور یہ قوانینِ فطرت ان کی نظر میں نوشتہ تقدیر کے مترادف ہیں۔

دنیا کے بیشتر لوگ اور اکثر قومیں تقدیر کی قائل کیوں رہی ہیں؟ اس سوال کا جواب مشکل نہیں۔ دنیا کے بیشتر لوگ آرام طلب ہیں تقدیر سے ان کو اپنی آرام طلبی کا جواز مل جاتا ہے۔ جنگجو قوموں کو جنگ شروع کرنے کا فتویٰ تقدیر ہی سے ملتا ہے۔ ایک شخص نے جب دوسری شادی کی اور اس کی پہلی بیوی نے اس پر لعن طعن کی تو اس نے جواب دیا "میں کیا کرتا۔ تیری قسمت ہی میں سوت لکھی تھی"۔

بیشتر جرمن فلسفیانِ تاریخ تقدیر کے قائل تھے۔ اور غالباً اسی لئے یہ قوم برابر لڑائیاں شروع کرتی رہی ہے۔ ہمارے زمانے میں اسپینگلر بھی جرمنی میں ہی پیدا ہوا۔ بیشتر قاتل بھی تقدیر کا شکار ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ تو تقدیر کو خدا بنا کر پوجتے ہیں۔ لڑائی کے دوران میں تو ہر شخص اور خصوصاً سپاہی تقدیر کا دامن پکڑتا ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ بعض اوقات قائلینِ تقدیر جو کارنامے کر دکھاتے ہیں وہ صاحبِ تدبیر نہیں کر سکتے۔ تقدیر انسان کو اندھا ضرور کر دیتی ہے لیکن جب ان اندھوں کو کوئی صاحبِ نظر قائد مل جاتا ہے تو یہ اندھے وہ کام کر دکھاتے ہیں جو آنکھوں والے نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ان اندھوں کو جو کامیابی حاصل ہوتی ہے وہ کسی صاحبِ تدبیر کی بدولت ہوتی ہے۔

تقدیر و تدبیر کے معاملے میں تاریخ کا فیصلہ

میں پہلے تسلیم کر چکی ہوں کہ یہ مسئلہ بڑا ٹیڑھا ہے۔ میرے صحیفوں میں جو

بے شمار واقعات درج ہیں ان میں تقدیر و تدبیر دونوں کارگر نظر آتی ہیں۔ جنگوں کا فیصلہ کبھی تقدیر کرتی ہے کبھی تدبیر لیکن اس معاملے میں مجاہدین اسلام کا نظریہ قابلِ تقلید ہے۔ وہ صرف خدا کے قائل تھے اور تقدیر کو بھی خدا کے حکم پر محمول کرتے تھے۔ یعنی وہ تقدیر کو خدا نہیں مانتے تھے۔ اس لئے ہر جہاد سے پہلے وہ تدبیر سے بھی کام لیتے تھے۔ جب ان کو فتح حاصل ہوتی تھی تو فتح کو بھی تقدیر سے نہیں بلکہ اسی خدائے واحد سے منسوب کرتے تھے۔

مسلمانوں کی فتوحات کی بنا پر میں کہہ سکتی ہوں کہ ان کی فتوحات کا باعث تقدیر و تدبیر دونوں ہوتی ہیں۔ اس لئے میں اپنے محرّروں کو مشورہ دیتی ہوں کہ وہ اس معاملے میں کوئی فیصلہ نہ دیں۔ تقدیر و تدبیر کا مسئلہ دراصل فلسفۂ الٰہیات سے وابستہ ہے نہ کہ مجھ سے۔ میرے واقعات تہ در تہ صورت میں رُونما ہوتے ہیں۔ گو میرے فلسفے کے ذمّے تلاشِ اسباب ضرور ہے لیکن ہر تہ کا کھولنا کسی انسان کے بس کا روگ نہیں۔ مورخ بھی آخر انسان ہے۔ وہ ناظرِ قلب نہیں ہو سکتا۔ ناظرِ قلب صرف خدا ہے۔ تقدیر و تدبیر دونوں میں نیت بھی کارگر ہوتی ہے۔ مؤرخ کو تو صرف زبانی یا تحریری شہادت دستیاب ہوتی ہے ایسی شہادت سے جنگ شروع کرنے والوں کی نیت کس طرح معلوم ہو سکتی ہے۔

میں کوئی علم حساب یا علمِ اقلیدس نہیں جس کا پہلا قدم دوسرے قدم کی نشانی دیتا ہے۔ انسان کی نیت میں بے شمار عنصر ہوتے ہیں۔ جتنے قسم کے انسان ہیں اتنے ہی قسم کے عناصر بھی ہوتے ہیں۔ مؤرخ جب یہ عناصر ڈھونڈ کر نکالتے ہیں تو وہ عناصر ان کے اپنے دل و دماغ

کے ہوتے ہیں۔ حقیقت کے نہیں۔ اس لئے میں اپنے محرّروں کو مشورہ دیتی ہوں کہ وہ تقدیر و تدبیر کے معاملے میں کوئی رائے زنی نہ کریں۔

اس کے علاوہ مجھے اپنی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے میری ایک غلط تاویل سے پوری دنیا جنگ میں مبتلا ہو سکتی ہے کیونکہ اب جو جنگیں ہوں گی وہ مقامی نہیں بلکہ عالمگیر ہی ہوں گی۔ اس لئے میرے محرّروں کو صرف محتاط ہی نہیں بلکہ مصلحت بین بھی ہونا چاہیئے۔ تقاضۂ مصلحت یہ ہے کہ وہ تقدیر کے حق میں فیصلہ کرنے سے گریز کریں۔ اور مولانا روم کی طرح تدبیر کی تلقین کریں۔ تقدیر کے حق میں فیصلہ کرنے سے کاہل قومیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں گی۔ بلکہ اس زمانے میں تو یہ خطرہ بھی ہے کہ انسان کا یکسر قلع قمع ہی ہو جائے گا۔ جب انسان ہی نہ رہے گا تو میری زندگی بھی بیکار ہے۔ کیونکہ میں انسان ہی سے وابستہ ہوں۔

میرے واقعات تو یہ بتاتے ہیں کہ انسان ایک دائرے میں ضرور محدود ہے لیکن یہ دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں وہ دل بھر کر دوڑ لگا سکتا ہے بلکہ وہ اس دائرے کو بھی وسعت دے سکتا ہے اس دائرے کے اندر وہ صاحبِ اختیار ہے لیکن وہ اس دائرے سے باہر نہیں جا سکتا۔ اور اس حد تک وہ تقدیر کا مقید ہے۔ فلسفۂ الٰہیات کچھ ہی کہے لیکن میرا فلسفہ تو یہی کہتا ہے کہ انسان بندۂ تقدیر بھی ہے اور صاحبِ تدبیر بھی۔ میرے تمام واقعات اسی فلسفے کی تائید کرتے ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ دائرہ کس نے قائم کیا۔ خدا نے یا قوانینِ فطرت

نے اس کا جواب میری حدود سے باہر ہے کیونکہ یہ عقیدے کا معاملہ ہے۔ اہلِ عقل کے نزدیک یہ دائرہ فطرت کا قائم کردہ ہے۔ اہلِ دل کا عقیدہ ہے کہ اس دائرے کا قائم کرنے والا خدا ہے۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ ہر عقیدے کا تذکرہ کروں۔ کسی عقیدے کے برحق یا باطل ہونے کا فیصلہ میرے ہاتھ میں نہیں۔ اور نہ میں اس کی اہل ہوں۔ اس لئے میری وصیت ہے کہ میرے محرّر بحیثِ تقدیر و تدبیر کے تنازعہ سے گریز کریں۔

فلسفۂ تاریخ کے بجائے حکمتِ تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہے

آخر میں ایک عرض داشت میں پیش کرتی ہوں۔ میں ہمیشہ لفظ "فلسفہ" سے گھبراتی رہی۔ یہ لفظ جو آج ایک مخصوص اصطلاح بن گیا ہے قدیم یونانی زبان سے مستعار ہے۔ یونان میں اس کے ابتدائی معنی حکمت یا اسباب معلوم کرنے کے تھے۔ چنانچہ میرا کام علاوہ واقعہ نگاری کے اسباب واقعات معلوم کرنا بھی ہے مگر میں اپنے جس فرض پر نازاں ہوں وہ حکمت آموزی ہے۔ یہ کام وہی ہے جو انبیاء اور اولیاء نے کیا۔ ہر بانیٔ مذہب نے میرے واقعات پیش کر کے لوگوں کو عبرت دلائی۔ آسمانی صحیفے میری کہانیوں سے پُر ہیں اور ہر آسمانی صحیفہ بذاتِ خود تاریخ ہے۔ جن کو لوگ بہ نظرِ حصولِ عبرت و حکمت پڑھتے ہیں۔

اس کے برعکس لفظ فلسفہ کے معنی اب قیاس آرائی اور عقل کی مریدی کے ہیں۔ فلسفی کا دارومدار محض قیاس آرائیوں پہ ہے جن میں وہ بُری طرح پھنس جاتا ہے اور اکثر اوقات گمراہ ہو جاتا ہے۔ فلسفہ

انسان کو متضاد راستوں پر چلانا ہے۔ اب تو لوگوں نے اخلاقیات کو بھی فلسفہ سے جدا کر دیا ہے۔ برعکس اس کے میرا دار و مدار قیاس پہ نہیں بلکہ ٹھوس واقعات پر ہے۔ ان واقعات سے جو نتائج اخذ کئے جاتے ہیں وہ قابل تصدیق ہوتے ہیں۔ ان نتائج کے ذریعہ حکمت اور عبرت آموزی کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ عوام لفظ فلسفہ سے اس قدر خائف ہیں کہ وہ اس نام سے بِدک جاتے ہیں۔ اگر کسی کتاب کا نام "فلسفہ تاریخ" رکھ دیا جائے تو لوگ اس کتاب سے گریز کرتے ہیں اسی لئے میں نے اپنے "فلسفہ" کو سرگذشت کی صورت میں پیش کیا۔ اس لئے میں بصد نیاز عرض کرتی ہوں کہ میرے فلسفہ کا نام اب "حکمت" رکھا جائے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

چودھواں باب

ایں رازِ نہاں گوید دیوانہ بہ دیوانہ

چند باتیں ایسی ہوتی ہیں جو سرِ بازار نہیں کہی جاسکتیں۔ بقول مولانا روم :۔

بر سماع راست ہر کس چیر نیست
طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

مَیں تقدیر کی برابر مذمت کرتی رہی ہوں لیکن یہ مذمت از روئے مصلحت تھی نہ کہ از روئے حقیقت۔ بے شک میرے واقعات بتاتے ہیں کہ تدبیر بھی کارگر ہوتی ہے۔ لیکن میرے صحیفوں کے بیشتر واقعات ایسے ہیں کہ ان کی وجہ محض تدبیر نہیں ہو سکتی۔ اسلام کا یکایک عروج۔ انگریزی سامراج کا یکایک خاتمہ وغیرہ وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن کے اسباب عقل نہیں قائم کر سکتی۔ یہاں مجھ کو بھی انسانوں کی طرح تقدیر کی کارفرمائی تسلیم کرنی پڑتی ہے۔

اسلام کے یکایک عروج کی کہانی تو پرانی ہو چکی اور اس عروج کے "چشم دید گواہ" مر مرا چکے۔ لیکن انگریزی سامراج کے یکایک زوال کے گواہ تو لاکھوں کی تعداد میں آج موجود ہیں۔ کیا یہ ہم عصر شاہد اصل اسباب زوال بتا سکتے ہیں۔ اگر انگریز آج اپنے تمام مخفی دستاویزات

کھول کر دنیا کے سامنے رکھ دیں تب بھی اصل اسباب معلوم نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ انگریز جیسی چالاک حکومت اپنے مراسلوں میں کبھی کوئی بات کھول کر نہیں لکھتی۔ ہندوستان سے انگریز کیوں فرار ہوا؟ اس کا جواب انگریزی حکومت کے مراسلات میں یہی ملے گا کہ "ہم اپنے پیارے ہندوستان کو آزاد دیکھنا پسند کرتے تھے"۔

اگر انگریزوں کے فرار کا اصل "سبب" روس اور امریکہ کا عروج تھا تو یہ سبب یکایک کیوں نمودار ہوا؟ زمانۂ ماضی میں جتنے سامراج ختم ہوئے ہیں ان کا خاتمہ آہستہ آہستہ ہوا۔ اسی طرح روس اور امریکہ نے یکایک ترقی نہیں کی اور نہ امریکہ نے انگریزوں کو ہندوستان سے ٹھوکر مار کر نکالا۔ جب لاکھوں شاہد انگریزی سامراج کے زوال کے اسباب نہیں بتا سکتے تو آئندہ کے مؤرخ ان اسباب کو کس طرح معلوم کر سکینگے۔

ایسے موقعوں پر مجھے بھی تقدیر کی کارفرمائی تسلیم کرنی پڑتی ہے لیکن اگر میں تقدیر کی کارفرمائی صاف صاف تسلیم کر لوں تو مجھے اندیشہ ہے کہ نو آزاد ملکوں کے لوگ ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں گے اس لئے میرے لئے یہی مناسب ہے کہ میں بجائے تقدیر کے حکم خداوندی کی کارفرمائی مانوں۔ میرا دل تو کہتا ہے کہ میں نوشتۂ تقدیر کو تسلیم کر دوں لیکن ؎

سر پنہاں است اندر زیر و بم
فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

لیکن اگر میں حکم ایزدی کو نوشتۂ تقدیر کا سبب بھی مان لوں تو "جہاں کے برہم" ہونے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا کیونکہ اس طرح خطاکاروں کے لئے توبہ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ قہار و جبار

ہونے کے ساتھ خدا رحیم و کریم بھی ہے بلکہ اس کا عفو و کرم اس کے قہر و جبر سے کہیں زیادہ ہے۔ اس نے اپنے خطاکار بندوں کے لئے توبہ کا دروازہ بھی کھول دیا ہے۔ افراد کی طرح قومیں بھی خطائیں کرتی ہیں لیکن افراد کی طرح قوموں کو بھی توبہ کا موقع مل جاتا ہے۔ جب خدا توبہ قبول کرتا ہے تو تائبوں کو نئے ماحول میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں ان کو از سرِ نو زندگی شروع کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

بنی آدم کی کہانی یعنی میرے صحیفوں کا آغاز ہی توبہ سے ہوتا ہے۔ جب آدمؑ و حواؑ اپنے گناہ سے تائب ہوئے تو انہیں ان کارناموں کا موقع ملا جن سے میرے صحیفے پُر ہیں۔ اگر توبہ قبول نہ ہوتی تو بنی آدمؑ تا ابد ناکام رہتا۔

جب کفارِ مکہ بانیٔ اسلام کی ہدایت سے اپنے کفر سے تائب ہوئے تو اسی توبہ سے ان کو نئی زندگی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہ تائبین بعد توبہ مدینہ پہنچے۔ ہجرت کے بعد جو کارنامے ان تائبین نے کئے اس سے تاریخِ اسلام آج تک مزیّن ہے۔ اسی طرح جب ترک کفر سے تائب ہو کر مسلمان ہو گئے اور بعد توبہ اپنے کفرستان سے ہجرت کر کے نئے ماحول میں پہنچے تو یہ بادیہ پیما اپنی دنیا کے مالک بن گئے۔ انہیں ترکوں کے متعلق ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب کہا ہے :۔

تازکرّاری نصیبے داشتند
درجہاں دیگر علم افراشتند

توبہ کی برکت کی مثالیں ہمارے زمانے میں بھی بکثرت نظر آتی ہیں۔ ملک آسٹریلیا جو آج کل راہِ ترقی پر گامزن ہے وہ کس طرح

آباد ہوا؟ اس طرح کہ اس ویران ملک میں انگلستان کے مجرم بھیجے گئے۔ نئے ماحول میں پہنچ کر ان مجرموں کا توبہ کا موقع ملا ان کی توبہ نے ان کو نئی تدبیروں کی تلقین کی۔ آج آسٹریلیا کی ترقی کا راز یہی قبول توبہ بتاتی ہے۔

اسی طرح وہ لوگ امریکہ گئے جو اپنے قدیم ملکوں میں ترقی سے مایوس ہو چکے تھے۔ امریکہ پہنچ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کی توبہ نے ان کو نئی تدبیروں پر آمادہ کیا۔ گویا توبہ کا مسئلہ تقدیر و تدبر کے مسئلہ کا بڑا اچھا حل پیش کرتا ہے۔

ہمارے زمانے میں ایک اور مثال روس کی ہے۔ جب روسیوں نے مطلق العنان حکومت اور سرمایہ داری کے گناہوں سے توبہ کی تو اس پسماندہ ملک کو حیات ثانیہ ملی اور ایسی ملی کہ اس قوم نے اپنا رویہ یکسر تبدیل کر دیا۔ رویہ کی اس تبدیلی کی بدولت روس آج دُنیا کی عظیم ترین طاقت امریکہ سے ٹکر لینے کے لئے تیار ہے۔

پسماندہ روسیوں میں کس چیز نے دوبارہ جان ڈالی؟ اصول اشتراکیت نے۔ جس طرح اسلام نے دوبارہ جان ڈال کر ایک گمنام قوم عرب کو سرفراز کیا۔ اسی طرح روسی بھی پیغام اشتراکیت سے بیدار ہوئے اور ایسے بیدار ہوئے کہ آج پورے یورپ میں کوئی طاقت روس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

توبہ کے ذریعہ تقدیر کی کارفرمائی کے ساتھ تدبیر کی تلقین بھی ہوتی ہے۔ حکم ایزدی کی کارفرمائی تسلیم کرنا تقدیر کی کارفرمائی تسلیم کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ اس کی بہترین اور زندہ مثال پاکستان

پیش کرتا ہے۔ یہ تو آزاد ملک ہندی مسلمانوں کی توبہ کا نتیجہ ہے۔ پاکستان میں بڑے بڑے پرانے خطا کاروں کو خدا نے ازسرِنو موقع دیا۔ ان میں سے بعض تو اب بامِ عروج پر ہیں۔ پاکستان کی ترقی کا راز یہی ہے۔

قبولِ توبہ کے مسئلہ کو مان کر میں تقدیر کی کارفرمائی بھی تسلیم کر رہی ہوں۔ اور ساتھ ہی تلقین تدبیر بھی کر رہی ہوں گویا میں خطاکاروں کے لئے توبہ کا دروازہ کھول رہی ہوں۔ اور آئندہ ترقی کی بشارت دے رہی ہوں۔ اسی بشارت پر میں اپنی سرگذشت ختم کرتی ہوں۔

ختم کرنے سے پہلے کاش میں اپنے ناظرین سے پوچھ سکتی کہ میری اس ہرزہ سرائی سے ان کے پلّے کیا پڑا؟ اگر میری اس کاوش سے وہ میرے فلسفے کے جملہ رموز سے واقف ہو گئے تو یہ ان کی سراسر غلط فہمی ہے میری شان و شوکت کا تو یہ تقاضا ہے کہ میرا فلسفہ قدرے پنہاں رہے۔ اکبر الہ آبادی کہہ گئے ہیں کہ "جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا" میں اس مصرعہ میں قدرے تبدیلی کر کے عرض کرتی ہوں۔

"جو سمجھ میں آگیا وہ فلسفہ کیوں کر ہوا"

کتابیات

اس فہرست میں وہ کتابیں شامل ہیں جن سے اس سرگذشت میں استفادہ کیا گیا ہے جسے ترتیب کے لحاظ سے دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے تاریخ سے متعلق کتابیں دی گئی ہیں اور اس کے بعد فلسفۂ تاریخ کی کتابیں درج کی گئی ہیں۔

A. Definition and scope of History

1. Gordon—Childe. What is History? (Schuman Paper Back).
2. E. H. Carr : What is History? (Penguin).
3. Brinton : The World of History (Mentor Books).
4. O'Brien : Writing of History (California).
5. Fortesque : The Writing of History (William and Norgate).
6. Butter Worth : Man on His Past (C. U. P.).
7. Fritz Stern (Editor) : The Varieties of History (Meridian Books).
8. Gustavson : A Preface to History (McGraw Hill).

B. History of Historiography

1. Franz Rosenthal : History of Muslim Historiography (Brill).
2. Lewis and Holt (Editors) : Historians of the Middle East (O. U. P.).
3. Trevelyan : Present Position of History (Longman).
4. G. P. Gooch : History and Historians in the 19th Century (Longman).
5. Barra Clough : History in a Changing World (Blackwell).
6. Powicke : Modern Historians and the Study of History (Odhams).
7. Antoni : From History of Sociology (Wayne University Press).
8. Schmitt : The Fashion and Future of History (Western Reserve University).
9. Jaspar : The Origin and Goal of History (Routledge Kegan Paul).

C. Uses of History

1. Rowse : The Use of History (English Universities Press).
2. Muller : Uses of the Past (Mentor Books).
3. Smellie : Why We Read History ? (Paul Elck).
4. Nietzsche : Use and Abuse of History (Library of Liberal Arts).
5. B. Russell : Understanding History (Philosophical Library)

D. Meaning in History

1. Lowith : Meaning in History (Phoenix Books).
2. Lampert : The Apocalypse of History (Faber and Faber).
3. D'Arey : The Meaning and Matter of History (Meridian Books).
4. Rickman (Editor) : Meaning in History (Allen and Unwin).
5. Muller : The Loom of History (Harper).

E. Factors in History

1. Croce : History as the Story of Liberty (Allen and Unwin)
2. Febvre : Geographical Introduction to History (Kegan Paul)
3. Fedren : Materialist Conception of History (Macmillan).
4. Bruckhardt : Force and Freedom (Meridian Books).
5. Bernal : Science in History (Watts).
6. Dawson : Dynamics of World History (Sheep and Ward).
7. Brifault : The Making of Humanity (Jonathan Cape).
8. Huntington : Mainsprings of Civilization (J. Wiley).
9. Bury : The Idea of Progress (Dover Books).
10. Goad : Language in History (Pelican).
11. Paul : Nature into History (Faber and Faber).
12. Bagby : Culture and History (Longmans).
13. Hook : The Hero in History (Beacon).
14. Mahan : Influence of Sea Power upon History (Sugmore Press).
15. Coponigri : History and Liberty (Routledge and Kegan Paul).
16. Avon : The Dawn of Universal History (Praeger Paper Books).
17. Muller : Freedom in Ancient World (Harper)

18. Mumford : The City in History Harcourt Brace).

19. Reade : The Martyrdom of Man (Watts).

20. Markhan : Climate and Energy of Nations (O. U. P.).

F. Theories of History

1. K. R. Popper : The Open Society and its Enemies, 2 Vols. (Routledge).
2. Croce : History : its Theory and Practice (Russel and Russel).
3. Ropper : The Poverty of Historicism (Kegan Paul).
4. Gardner : Theories of History (Free Press).
5. Teggart : Theory and Processes of History (University of California).
6. Kochan : Acton on History (A. Deutch).

G. Interpretations of History

1. Seligman : Economic Interpretation of History (Columbia).
2. St. Augustine : The City of God, 2 Vols. (Everyman).
3. Wise : Philosophic History of Civilization (Philosoph : Library).
4. Widgery : Interpretation of History (Allen and Uuwin).
5. Berlin : The Hedgehog and the Fox (Mentor Books).

H. Rise and Fall of Nations

1. Quigley : The Evolution of Civilizations (Macmillan).
2. Meclelland : The Achieving Society (Von Nostrand).
3. Cowell : History, Civilization and Culture (Black).
4. Katz : The Will to Civilization (Secker and Warburg).
5. Clough : Rise and Fall of Civilization (Columbia).
6. Taylor : Our Evolving Civilization (Toronto University Press).
7. Kohn : Breakdown of Nations (Routledge).
8. Spengler : Decline of the West (Allen and Unwin).
9. Adams : The Law of Civilization and Decay (Vintage Books).
10. Zaidi : A Short History of Civilization. (Urdu Academy Sind, Karachi.)

I. Philosophy of History

1. Ibn Khaldun : Muqaddimah
(English Translation by Rosenthal, 3 Vols,
(Pantheon Books.)
2. Ibn Khaldun : Muqaddimah (Urdu Translation by
Saad Hasan Khan Yusufi, Karachi).
3. Toynbee : A Study of History, 10 Vols. (O.U.P.).
4. Somer Ville : Abridgment of the above, 2 Vols (O.U.P.).
5. Vico : The New Science of Gembattista Vico
(Translated by Bergin and Fisch)
(Doubleday Anchor Books).
6. Avon : Introduction to the Philosophy of History
(Weidenfeld).
7. Meritain : On the Philosophy of History (Bles).
8. Hegel : Philosophy of History (Dover Books).
9. Mackinnon : On the Ivotion of a Philosophy of History
(O.U.P.).
10. Walsh : Philosophy of History (Harper Torch Books).

J. History & the Historian

1. Geyl : Debates with Historians.
2. Burckhatd : Judgement on History and Historians
(Allen & Unwin).
3. Montagu : Toynbee and History (Porter Sargent).
4. Geyl : Encounters in History (Meridian Books).
5. Toynbee : A Historian's Approach to Religion (O.U.P.).
6. Trevelyan : Recreations of a Historian (Nelson).
7. Trevor-Roper : Historical Essays (Macmillan).

K. Miscellaneous

1. Barfield : History in English Words (Faber and Faber).

—:o:—

حوالہ جات

پہلا باب: فلسفہ، تاریخ سے تعارف

1. The Shorter Oxford Dictionary, article on "Philosophy".
2. D. M. Mackinnon : On the Notion of Philosophy of History. P. 8, (O. U. P. 1954).
3. "مقدمہ" ابن خلدون - اردو ترجمہ از سعد حسن خان یوسفی صفحہ ٦٦ -
4. New Century Classical Hand Book, articles on CLIO and MUSES, (Edited by C. B. Avery, 1962).
5. Powicke Modern Historian and the Study of History, p. 174 (1955).

دوسرا باب: میں کون ہوں، کیا ہوں، کیا نہیں ہوں

1. Alberuni's India p. 22-23 (Chand Edition)
2. J. B. Bury : The Ancient Greek Historians p. 32-35, (Dover Edition).
3. J. B. Bury : p. 42.
4. J. B. Bury : p. 57.
5. Michael Grant : Roman Literature p. 85-93.
6. Julius Caesar : DeBello Gallico. p. 77 (Everyman's Edition)
7. Michael Grant : p. 103-107.
8. Introduction by A. H. Clough to Plutrach. p. IX-XXIII (Modern Library Edition).
9. Livy : Early History of Rome. p. 17-18 (Penguin).
10. Complete Works of Tacitus. p. 7 (Modern Library).
11. History of Herodotus p. 1 (Everyman's Library).
12. The Histories of Polybius p. 114 (Macmillan 1889).
13. Herodian's History of the Roman Empire p. 11. (University of California 1961).
14. Baynes and Moss : Byzantium p. 23.
15. J. B. Bury : p. 42.
16. C. A. Beard : Introduction to Bury's Idea of Progress p. XV.
17. J. B. Bury : p. 243.
18. Will Durant : Story of Civilization (Eight Volumes published so far).

19. K. R. Popper : Poverty of Historicism. p. 12-14 (Routledge, 1961)

تیسرا باب: مجھ پر فلسفہ کیوں اور کس طرح لادا گیا ؟

1. Benedotto Croce : History as the Story of Liberty (English Translation, 1949) p. 19. Allen and Unwin.
2. J. C. Herold : Bonaparte in Egypt p. 175.
3. Emil Ludgwig : Napoleon p. 8-9.
4. H. G. Wells : Outline of History p. 30-37 (1951 Edition)
5. St. Augustine, p. 163, Vol. II (Basic Writings of St. Augustine, New York).
6. J. A. Boyle : History of the World Conqueror (English Translation of Tarikh-i-Jahan Gusha, Vol. I, p. 104).
7. Hegel : Philosophy of History p. 1-8 (Dover Edition).
8. Karl Marx : Poverty of Philosophy (Translated by Quelch) p. 132.
9. H. A. L. Fisher : History of Europe, Preface to one Volume Edition.

چوتھا باب: میرا اپنا فلسفہ

1. The New Science of Giambattista Vico p. 3 (English Translation, p. 3, Anchor Book Edition 1962)
2. M. C. D'arcy : The Meaning and Matter of History. p. 123 (Meridian Book, 1961).
3. George Cary : The Medieval Alexander p. 105-106 (Cambridge).
4. George Cary : p. 130.
5. Croce : History as the Story of Liberty p. 19.
6. Croce : p. 59.
7. Croce : History, Its Theory and Practice p. 99-101 (New York, 1960)

پانچواں باب: عالم اسلام میں میری آمد اور قیام

1. Crose : History, Its Theory and Practice p. 201-202.
2. آردو ترجمہ موسومہ ''العلم و العلماء'' (ندوۃ المصنفین دہلی)
3. Islamic Culture, Vol. I, 1927 issue.
4. تاریخ طبری۔ اردو ترجمہ۔ جلد اول۔ حصہ سوئم صفحہ ۱۳۲
(جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

5. طبری - جلد سوئم - حصہ سوئم - صفحہ ۶۰۶-۶۰۲

6. ابن سعد - طبقات کبیر (جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

7. ابن سعد - طبقات کبیر - صفحہ ۳۳۳

8. F. Rosenthal : History of Muslim Historiography, p. 222-227.

9. J. B. Bury : The Idea of Progress, P. XIV (Dover Edition 1955).

10. English Translation of Dabistan by Shea and Troyer p, 369 (Dunne Edition, 1901).

11. Ibn Maskawiyah : Tajarib-ul-Umam, Text p. 7 (Gibb Memorial Series).

12. E. H. Carr : What is History? p. 22 (Penguin).

13. F. Rosenthal : Technique and Approach of Muslim Scholarship p. 19 (Rome. 1947).

چھٹا باب: میر خلف الرشید ابن خلدون

1. M. A. Enan : Ibn Khaldun p. 41-42 (Ashraf, Lahore).

2. Ibn Khaldun and Tamerlance (Translated by Fischel) p. 29-41 (University of California Press, 1952).
Urdu Translation by Z. A. Barni (Urdu Academy Sind, Karachi, 1968).

3. Toynbee : Study of History, Vol. III, p. 322 (Quotation from Flint's History of the Philosophy of History).

4. اردو ترجمہ "مقدمہ"، ابن خلدون (سعد حسن خان یوسفی) صفحہ ۳۵

5. "مقدمہ" صفحہ ۳۳

6. "مقدمہ" صفحہ ۱۱۰

7. "مقدمہ"، صفحہ ۶۵-۶۶

8. Plato : Georgias p. 483.

9. Westermann : Slave System of Greek and Roman Antiquity p. 17.

10. Westermann : p. 27.

11. "مقدمہ" ۵۹-۶۰

12. "مقدمہ" صفحہ ۶۵-۶۸

13. "مقدمہ" صفحہ ۶۸-۷۱

14. "مقدمہ" صفحہ ۱۵۴
15. "مقدمہ" صفحہ ۱۷۰
16. "مقدمہ" صفحہ ۳۰۳
17. Bertrand Russell : Understanding History p. 105 (Wisdom Library, New York, 1957).
18. "مقدمہ" صفحہ ۱۰۱-۱۲۶
19. "مقدمہ" صفحہ ۵۵۸
20. "مقدمہ" صفحہ ۱۸۵
21. "مقدمہ" صفحہ ۱۷۴
22. "مقدمہ" صفحہ ۱۷۶-۱۷۴

ساتواں باب: میرا ساز و سامان اور اس کی تباھی

1. کتاب "پیدائش" اردو ترجمہ ۱۲ آیات ۳۰۴
2. "پیدائش" اردو ترجمہ ۱۱ - آیات ۵-۹
3. C. W. Ceram : Gods. Graves and Scholars p. 286-87 (Gollancz, 1956).
4. Frankfort : Before Philosophy p. 176-177 (Penguin).
5. Frankfort : p. 224-28.
6. J. H. Breasted : A History of Egypt p. 14-15.
7. اردو ترجمہ کتاب "خروج" باب اول - آیات ۱۳-۱۴
8. L. Cotteral : Mountains of Pharoah p. 124 (Penguin).
9. Desroches-Noblecourt: Life and Death of Tutan Khamun
10. P. Fox : Tutan Khamu's Treasure (O. U. P. 1951).
11. I. E. S. Edwards : The Pyramids of Egypt (Penguin).
12. Scholem Asch : Moses (Cardinal Books 1958).
13. L. Cotteral : Wonders of Antiquity p. 40-45 (Longmans, 1960).
14. کتاب "پیدائش" باب ۱۸ - آیات ۱۳-۱۴
15. City of Akhneten, 2 Parts, (O. U. P. 1933).
16, Sir M. Wheeler : Indus Civilization } ان شہروں کے متعلق معلومات کا ماخذ
17. Piggot : Pre-historic India p. 139 (Pengiun 1952).
18. L. Woolley : A Forgotten Kingdom p. 103-104 (Pengiun 1953).

19. A Maluri : Pompeii (Translator Priestley, Rome 1947) p. 14.
20. Pompeii : p. 16.
21. Prescott : Conquest of Mexico, p. 75 Modern Library).
22. L. Cotteral : Lost Cities, p. 172.
23 Prescott : 313-39.
24. Rider Haggard : Montuzoma's Daughter (Novel).

آٹھواں باب : میرا روحانی پہلو

1. اردو ترجمہ متی کی انجیل باب ۲۳
2. اردو ترجمہ متی کی انجیل باب ۵
3. Hymns of Zoraster p. 16 (Translated by Guellimina) (John Murrary : 1952).
4. Hymns of Zoraster p. 35.
5. Percy Sykes : History of Persia, Vol. I p. 394-95.
6. Percy Sykes : p. 105-107.
7. Percy Sykes : p. 398.
8. Percy Sykes : p. 414.

ہندو مذہب کے متعلق جملہ معلومات کا ماخذ

9. A. L. Basham : The Wonder That was India, Chapter VII (Sidgwick, 1964).
10. Encyclo Pedia of Religion, Vol. II Article on Buddha,
11. Some Sayings of Buddha, p. 11-12 (Translated by Woodward, O. U. P. 1945).
12. محمد اکرام : رود کوثر صفحہ ۳۶۸ طبع ثانی
13. سیرت ابن ہشام جلد اول ۔ صفحہ ۱۰۰
14. ان جملہ منقولات کا ماخذ ہے ''رحمتہ اللعالمین''۔ سلیمان منصور پوری جلد اول (غلام علی اینڈ سنز ۱۳۹)
15. ''رحمتہ اللعالمین'' جلد اول
16. ''رحمتہ اللعالمین'' جلد اول

نواں باب ۔ میرے متعلق اغیار کے فیصلے

1. Van Loon : The Story of Mankind.
2. F. Gibbon : Decline and Fall of the Roman Empire.

3. Goethe : Table Talk.
4. G. W. Reynold : Mystries of the Court of London.
5. Edmund Burks : A Letter to a Noble Lord.
6. Carlyle : French Revolution p. 23 (Modern Library).
7. Thomas Jefferson : Writing Vol. XI p. 180.
8. Carlyle : French Revolution p. 202 (Modern Library).
9. Washington Irving : Sketch Book, Chapter on Westminister Abbey.
10. Milton : History of Britain, Book I and IV.
11. W. Cowper : The Task Book, L. P. 139.
12 Muller : The Uses of the Past, p. 335 (Mentor Books).

دسواں باب : تین پیشن گو قسم کے مورخ

1. H. G. Wells : Outline of History, p. 2 (Cassel 1951).
2. اردو ترجمہ مقدمہ ابن خلدون فصل ۱۶
3. H. G Wells : Chapter 13.
4. H. G. Wells : p. 678-9.
5. H. G. Wells : p. 1186-93.
6. C. Dawson : The Dynamics of World History p. 371. 1957 (Shed and Ward,).
7. O. Spengler : Decline of the West (Allen and Unwin).
8. Spenglar : Chap. I.
9. Abridgement by D. C. Somerville (O.U.P. 1951 and 1957).
10. A Toynbee : Civilization on Trial (1948) Preface.
11. Goethe : Faust, p. 40 Translated by P. Wayne, (Penguin, 1951).
12. A Toynbee : A Study of History Vol. 1 p. 129 (O. U. P. 1951).
13. Toynbee : Vol. I p. 51.
14. Toynbee : Vol. I p. 44-46.
15. Toynbee : Vol. III p. 27-28.
16. Abridgement by Somerville, Vol. I p. 217-30.
17. اردو ترجمہ کتاب ''خروج'' باب ۱۹ آیات ۳-۴ باب ۳۱ آیت ۱۸-
18. اردو ترجمہ ''کرنتھیون'' کے نام باب ۱۵ آیات ۲۴-۳۰
19. Toynbee : Vol. IV p. 3-4 (1951).
20. Toynbee : Vol. IV, p. 7.
21. Toynbee : Vol IX, part XII p. 406.

22. Toynbee : Vol. IV, 14-15.
23. اردو ترجمہ متی کی انجیل باب ۹ - آیات ۱۶-۱۷
24. Toynbee ; Vol. IX, p. 414-18.
25. Abridgement by Somerville, Vol. II p. 307.
26. Toynbee : Vol. I. p. 148.

گیارھواں باب : میرے چند مشہور صحیفے

1. Bishop Porteus' Lectures. Vol. II. p. 234, quoted by Translator of Josephus. Works in his preface.
2. W orks by Flavius Josephus p. 2 (Translated by Whitsun New York, undated).
3. History of Herodotus, p. IX-XII (Introduction by the Translator G. Rawlinson, (Everyman Edition. 1949) Vol. I.
4. History of Herodotus, Vol. I. p. 250.
5. M. Ginsberg : Sociology. (H. U. L.) Chap. I.
6. Histories of Polybius p. 114-115 (Translated by Shuck burgh Vol. II. 1889, Macmillan).
7. F. Rosenthal : History of Muslim Historiograph p. 410. —II. (Translation of Sakhawi's "Ilan").
8. اردو ترجمہ تاریخ طبری - جلد اول - حصہ چہارم صفحہ ۱۹۹-۲۰۸
9. فتوح البلدان (اردو ترجمہ : حیدرآباد) جزو اول - صفحہ ۲۱۸
10. فتوح البلدان جزو اول صفحہ ۲۲۰
11. فتوح البلدان جزو اول صفحہ ۲۲۳
12. Translation in Elliot and Dawson, Vol. II, p. 55-56 (Aligarh Edition).
13. Autobiography of Edward Gibbon p. I (Worlds' Classics. O. U. P. 1923).
14. Autobiography, p. 205.
15. Introduction in Everyman's Edition of Decline and Fall, p. XXII, 1941. Vol. I.
16. Decline and Fall, Vol. IV, p. 106.
17. Note I, Chapter L. Vol, V, (Decline and Fall).
18. Decline and Fall, Vol. V, Chapter L. p. 256.
19. Decline and Fall, Vol. V, Chapter L. p. 275.
20. Decline and Fall, Vol. V, Chapter L. p. 290-91.

بارھواں باب : لوگ مجھے کیوں پڑھتے ھیں؟

1. اقبال : اسرار خودی صفحہ ۲۶-۳۷ ، ایڈیشن ۱۹۴۰ء
2. Sir Neville Henderson : Failure of a Mission.

3. Aga Khan : The Memoirs of Aga Khan.
p. 36 (Cassell 1954).
4. Fritz Stern : The Varieties of History, p. 91.
(Meridian Books, N. Y. 1956).
5. E. S. Turner : History of Courtship (Pan Books).
6. Book of Costume by Davenport (Crown Publishing Co.).
History of World Costume by Bradley (Powen).
A History of Architecture, By B. Fletcher (Batsford).
How People Travelled, By C. M. Broadway (O. U. P.).
History of Music. By Miller (Barnes & Noble).
Sex in History. By G. R. Taylor (Thames & Hudson).
Women in Antiquity. By C. Seltman (Pan Books).
A Literary History of Persia. By E. G. Browne (O. U. P.).
The March of Literature. by Ford (Allen and Unwin).
Outline History of English Literature. By Needham
(Barnes and Noble).
7. اردو ترجمہ کتاب ''ایوب'' باب ۲ آیت ۹ - باب ۱۲ آیت ۴
8. اردو ترجمہ کتاب ''پیدائش'' باب ۳۷ آیت ۳۴-۳۵
9. کتاب ''پیدائش'' باب ۳۹ آیت ۶ - ۲

تیرھواں باب : میری وصیت

1. American Historical Review. Issue of October 1966.
p. 50—66. Article "Current Soviet Theory of History".
by Prof A. P. Mendel.
2. Nietzsche : Use and Abuse of History.
p. 3 (Liberal Arts Press, N. Y.).
3. Philosophy of Hegel, Section I (Modern Library).
4. Alberunis' India. p. 22 (Chand Edition, 1964).
5. Tocqueville : Democracy in America (Mentor).
6. Nietzsche : Thus Spoke Zarathustra.
7. Karl Jaspar : The Origin and Goal of History, p. 145.
(Routledge, 1953).
8. B. Lewis (Editor) : Historians of the Middle East
p. 163 (O. U. P.).
9. W. W. Tarn : Alexander the Great, p. 110—111
Boston, 1956).
10. Shakespeare : Henry IV, Act III, Scene I, 1 : 45.
11. Aeschylus. Agememnon 1 : 6.



تاریخ کی دیوی
"کلایو"